إِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (۶۸/۴)

(اے رسولؐ) یہ حقیقت ہے کہ تو اخلاقِ انسانیت کے بلند ترین مقام پر فائز ہے

معراجِ انسانیت

یعنی

قرآنِ کریم کی روشنی میں مرتب کردہ حضور نبیٔ اکرمؐ کی

سیرتِ طیّبہ

پرویز

شائع کردہ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) - ۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب — معراجِ انسانیت

مصنف — پرویزؔ

ایڈیشن اوّل — ۱۹۳۹ء

ایڈیشن ہفتم — اکتوبر ۲۰۰۲ء

ناشر — طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

۲۵۔ بی، گلبرگ ۲، لاہور ۵۴۶۶۰

Email: trust@toluislam.com ; Web: www.toluislam.com

طابع — طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

مطبع — اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز۔ لاہور

No part of this book may be reproduced by any mechanical, photographic, or electronic process, or in the form of a phonographic recording, nor may it be stored in a retrieval system, transmitted, or otherwise copied for public and private use, without written permission except in the case of brief quotations embodied in critical articles and reviews

"**معراج انسانیت**" کے ایڈیشن زیرِ نظر کی طباعت کے ضمن میں بزمِ طلوعِ اسلام لندن کی رکن کونسلر مسز شمع احمد کے خصوصی تعاون کیلئے ممنون ہیں۔ طلوعِ اسلام ٹرسٹ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

فہرست

مشمولاتِ معراجِ انسانیت

عنوان	صفحہ
فہرست مضامین	۳
فاتحۃ الکتاب	۲۲
(دیباچہ طبعِ اول)	
تعارف	۳۵
(طبعِ دوم)	
پس منظر	
تہذیبِ مصر	۴
اہرامِ مصر کی تعمیر	۴
کالڈیا کی تہذیب	۵
حمارابی کے قوانین	..
اشوری تہذیب	۶
خطۂ ایران	۶
عیش پرستی کا مذہب	۷
تہذیبِ یونان	۸

عنوان	صفحہ
یونانی تہذیب کا عروج اور زوال	۸
خدا کا منزہ اور حقیقی تصور کہیں نہیں ملتا۔	۹
توہم پرستی، جمود و تعطل۔	..
نظامِ جمہوری لیکن غلامی کی غیر جمہوری لعنت موجود۔	
عام اخلاقیات کی حالت۔	۱۰
رومۃ الکبریٰ	۱۱
رومن سلطنت کا شوکت و اجلال۔	..
عیسائیت ہی رومۃ الکبریٰ کے انحطاط کا	..
باعث ہوئی۔	۱۲
رومۃ الکبریٰ کے زوال کے متعلق مورخین	..
کی تحقیقات۔	۱۳
علم دشمنی	۲۲
باقی یورپ کی حالت	..
ہندوستان کی تہذیب	۲۳
ایک ہندو مورخ کی شہادت۔	..

عنوان	صفحہ
نگہِ بازگشت	۲۶
(۲) خود عرب کی حالت	۲۹
بنواسماعیل۔	..
بُت پرستی۔	۳۰
دُنیائے اَخلاق۔	۳۲
جہالت، وحشت و بربریّت۔	۳۳
(۳) ہُنرش نیز بگو	۳۹
عالمگیر انقلاب کے لیئے عرب کا اِنتخاب کیوں؟	۴۰
خِطّۂ حجاز کسی غیر کا محکوم نہیں رہا۔	۴۱
وہاں کسی خاص مذہب کا اثر نہ تھا۔	۴۲
وہ سیدھے سادے عملی انسان تھے۔	۴۳
ایفائے عہد۔	۴۴
رفاقت۔	۴۵
احسان شناسی۔	۴۵
شجاعت اور بہادری۔	..
احساسِ برتری۔	۴۶
جذبۂ اِنتقام۔	۴۸
یورپ کے اکثر مستشرقین کی غلط اندیشی	۵۰
ماحصل	۵۲
بشارات	
مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند۔	۵۳
دُنیا ہلاکت سے بچالی گئی۔ (تہذیب کا مورّخ)	۵۴
انقلابِ عظیم۔ (کارلائل)	۵۵

عنوان	صفحہ
دُنیا پر احسانِ عظیم (ڈورسی)	۵۶
نئی روشنی (برفو۔ گبن)	۵۷
دُنیا کا نقشہ بدل گیا (غیر مُسلم مؤرّخین)	۵۸
میثاقِ خُداوندی	۵۹
دُعائے خلیلؑ	۶۰
تمنّائے کلیمؑ	۶۱
نویدِ مسیحاؑ	۶۳
کتابِ مبین	۶۴
صُبحِ بہار	۶۵،۷۵
شجرۂ مقدّسہ	۷۶
طلوعِ آفتاب	
حضرت اسمٰعیلؑ کے بارہ بیٹے	۷۷
ان میں سے قیدار سب سے نامور تھا۔	..
اُسی کی نسل سے قریش آگے بڑھے۔	
آفتابِ جہاں تاب کا طلوع	۷۸
مُحمّدؐ و احمدؐ	
زمانہ قبل از نبوت کے احوال و کوائف۔	۷۹
حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے شادی	۸۱
اِس تمام زندگی کے متعلق ایک عدیم المثال	..
شہادت!	..
اُس وقت بھی اور آج بھی۔	۸۲

عنوان	صفحہ
وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى	۸۵
عہدِ جاہلیت کی ہنگامہ خیزیاں۔	"
لیکن اس ہمہمہ اور طنطنہ میں ایک انوکھا انسان، اسے	..
یہ جاذبیتیں قطعاً اپنی طرف نہیں کھینچ سکتیں۔	..
وہ کسی اور شے کی تلاش میں ہے۔	..
وہ حقیقت کی تلاش میں احبار و رہبان کے	۸۷
پاس جاتا ہے لیکن ناکام لوٹتا ہے۔	..
وہ صحراؤں اور پہاڑوں میں اپنی تسکین کا	۸۸
سامان ڈھونڈتا ہے۔	..
مظاہرِ فطرت پر غور و فکر کرتا ہے۔	..
اس جوئیائے حقیقت کی شدّتِ اضطراب کے بعد	۸۹
عروسِ حقیقت کی نقاب کشائی	..
لیلۃ القدر۔ نئے پیمانوں کی رات	۹۰
ادراکِ حقیقت کے بعد کی کیفیت۔	۹۱
انسان کی زندگی کے رازدار بیوی، نوکر،	..
بچے، دوست۔ انہی نے سب سے	..
پہلے اس صداقت کا اعتراف کیا۔	..
قُمْ فَاَنْذِرْ	
ادراکِ حقیقت کے بعد رسول کا فریضہ!	۹۳
قُمْ! کہ تیرے قیام میں نوعِ انسانی کے قیام	..
کا راز مضمر ہے۔	..
قریش کو پہلی دعوتِ حیات آور	۹۶

عنوان	صفحہ
مقامِ نبوت کی وضاحت نہایت دل نشین	۹۷
پیرایہ میں۔	..
پہلی دعوت کا جواب۔	۹۷
لیکن اس سے اس داعیٔ انقلاب کا حوصلہ نہیں	..
پست ہوگیا۔	..
دوسری دعوت۔ اقربین کو	۹۸
سرزمینِ حرم میں خونِ شہادت کا پہلا	۹۹
قطرہ!	..
تمام قوم کی طرف دعوت۔	۹۹
اور پھر تمام نوعِ انسانی کی طرف دعوت	۱۰۰
آویزشِ حق و باطل	
آویزشِ ابلیس و آدم شروع ہی سے چلی آرہی ہے۔	۱۰۱
صرف آلات و ظروف میں تبدیلی ہوتی ہے۔	..
یہ مخالفت دلائل و براہین کی رُو سے نہ تھی۔	۱۰۴
بلکہ عصبیت و تکبّر کی بنا پر۔	
وہی پرانا اعتراض کہ رسول ہمارے جیسا انسان	۱۰۷
کیوں ہے؟	..
اور وہی کورانہ تقلید کہ یہ تعلیم ہمارے اسلاف کی	۱۰۹
تعلیم سے مختلف ہے۔	..
لیڈر قسم کے لوگ اپنے مفاد کی خاطر کس طرح	۱۱۲
عوام کو مشتعل کرتے ہیں	..
یہی فرعون نے کیا تھا۔	۱۱۳
مترفین کا گروہ۔ دوسروں کی کمائی پر عیش کرنے والے۔	۱۱۴

عنوان	صفحہ
اور تقدیر کا بہانہ کرنے والے۔	۱۱۵
وہ دراصل اس دعوتِ انقلاب کی تکذیب کرتے	۱۱۶
تھے۔ نبیٔ اکرمؐ کو جھوٹا نہیں کہتے تھے لیکن	..
آپؐ کے دعوائے نبوت کو جھوٹا کہتے تھے۔	..
آپؐ کو (معاذاللہ) مفتری قرار دیتے	
تھے۔ اور ساحر و کذّاب۔	۱۱۸
قرآن کو مت سنو، نہ کسی اور کو سننے دو	۱۱۸
ولید ابنِ مغیرہ کا واقعہ۔	۱۱۹
اِن مخالفین میں اہلِ کتاب بھی تھے۔	۱۲۴
حالانکہ ان کی اپنی مقدس کتابوں میں	..
اِس آنے والے کا تذکرہ موجود تھا۔	..
اب ان تمام مخالفین نے متبعینِ حق و صداقت	
پر سختیاں کرنی شروع کیں۔	۱۲۷
بلاکشانِ محبت کے صبر آزما مراحل	۱۲۸
اور ان کا کوہ شکن عزم اور استقامت	..
حبش کی طرف ہجرت۔	۱۳۱
لیکن مخالفین کا تعاقب	..
نجاشی کے دربار میں سوال و جواب	۱۳۲
خود نبیٔ اکرمؐ پر شدائد و مظالم	۱۳۴
بالآخر یہ لوگ ابوطالب کے پاس	
پہنچے۔	
بنو ہاشم کا مقاطعہ اور محاصرہ	۱۳۵
ابوطالب اور حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی	..
وفات۔	..

عنوان	صفحہ
اہلِ طائف کو دعوتِ انقلاب۔	
ان کی طرف سے ذلت آمیز سلوک۔	
یہ مخالفت کیوں تھی؟ حضورؐ اُن سے	۱۳۷
کیا کہتے تھے	
یہ پیغام کوئی نیا پیغام نہیں تھا۔	۱۳۸
اِس پیغام کا مقصود قیامِ دین تھا۔	۱۳۹
دین کا مفہوم!	..
اس نظام میں ہر غیر فطری قوت و اقتدار	۱۴۰
کی موت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اِس لیے	
ہر صاحبِ اقتدار اس کی مخالفت	
کرتا ہے۔	
اربابِ مذہب، اربابِ دولت، اربابِ	
حکومت، اربابِ حشمت اور اربابِ	
نسب کی مخالفت۔	
یہی "ارباباً من دون اللہ" ہیں۔	
پیغامِ توحید سے یہی مراد ہے۔	۱۴۱
اِسی کے خلاف سارا عرب، ابوجہل کی زبان	
سے فریاد کناں تھا۔	۱۴۳
اِستقامت	
ہجومِ مشکلات و شدائد میں ایک داعیٔ انقلاب	۱۴۵
کا فریضہ۔ وہ اپنی پکار کو برابر جاری	..
رکھتا ہے۔	..
یہی نبیٔ اکرمؐ نے کیا۔	..

عنوان	صفحہ
مخالفتوں کے اس بحرِ متلاطم میں اِس ننھی سی جماعت کا یہ سفینۂ برگِ گُل جانبِ ساحل چلا جا رہا تھا۔	۱۵۰
تاریخی شواہد سے تثبیتِ قلب کا سامان فراہم کیا گیا۔	۱۵۱
اِن امثال و نظائر سے مقصود تثبیتِ خاطر تھا۔	۱۵۷
ایسی ہی تکالیف و مشکلات کا سامنا انبیاءؑ سابقہ کو کرنا پڑا تھا۔	
مخالفت کا دُوسرا اسلوب۔	۱۶۰
تخویف و ترہیب کے بجائے ترغیب و تحریص۔	
عتبہ بن ربیعہ کی پیش کش اور اُس کا جواب۔	
کارلائل کی شہادت	۱۶۱
تیسرا اسلوب۔ مصالحت و مفاہمت کی کوشش۔	۱۶۲
مصالحت! ایک بہت بڑا فریب!!	
حق اپنی جگہ پر اٹل ہوتا ہے۔	
اگر حق اپنی جگہ سے ہل جائے تو نظامِ کائنات درہم برہم ہو جائے۔	۱۶۳
اس لیے حضورؐ کو تاکید کی گئی کہ باطل سے کسی شرط پر بھی مصالحت نہیں ہو سکتی۔	..

عنوان	صفحہ
ضیقِ صدر اور شرحِ صدر کا مفہوم	۱۶۸
جدّ و جہد اور پیہم جدّ و جہد۔	۱۷۰
دن کی تگ و تاز کے بعد رات کی تنہائیوں میں غور و فکر، تدبّر و تفکّر	
سوال یہ ہے کہ نبیِ اکرمؐ یہ سب مصائب کیوں برداشت کرتے تھے۔ آپؐ کی اِس سے غرض کیا تھی؟	۱۷۲
اِس سوال کے گُوناگُوں جوابات۔	..
مغرب کے متعصّب مؤرّخین کی طرف۔	۱۷۳
غیر متعصّب مستشرقین کی طرف۔	..
اور ہمارے مذہب پرست طبقہ کی طرف سے۔	..
لیکن سب غلط!	۱۷۵
پھر صحیح کیا ہے؟	..
انسانیّت کی فلاح و بہبُود کا بے پناہ درد۔	..
رسُول اس کے لیے کسی معاوضہ کا خواہاں نہیں ہوتا۔	..
اس لیے رسُول کا تعلق مخالفین سے معاندانہ نہیں بلکہ مشفقانہ ہوتا ہے۔	۱۷۷
اس غم میں حضورؐ اپنی جان گھلا رہے تھے۔	
اگر ایسا ہی تھا تو پھر وہ سلسلۂ جنگ و قتال کیوں؟ اس لیے کہ ناسُور لاعلاج	۱۷۸

عنوان	صفحہ
ہو چکا تھا اور اس سے باقی جسم میں	
زہر پھیل جانے کا اندیشہ تھا۔	
یہ تھا مقصودِ جدّوجہدِ رسالت	۱۸۰
اِستدراک	
(۱) حضورؐ شاعر نہ تھے۔	۱۸۱
شاعری کے متعلق قرآن کا حکم۔	..
مسلمان ایک عرصے سے "شاعروں" کی قوم بن	
چکے ہیں۔	۱۸۳
(۲) حضورؐ کو کفار رجلِ مسحور کہتے تھے۔	۱۸۴
قرآن اس کی تردید کرتا ہے۔	
لیکن مسلمان اس کے اعتراف پر	
مُصر ہیں۔	
وہ کس طرح؟ بخاری کی ایک روایت	
کی بنا پر۔	
(۳) حضورؐ اجرِ رسالت نہیں مانگتے تھے۔	۱۸۶
ایک آیت کا غلط مفہوم۔	۱۸۷
تشکیلِ جماعت	
مخالفت کے مقابلہ سے کہیں زیادہ اہم کام	۱۹۱
یعنی جماعت کی تشکیل	..
حزبُ اللہ اور حزبُ الشّیطان	۱۹۳
یہ بڑا کٹھن مرحلہ تھا۔	
اس کے لیے ان کے قلوب کی تبدیلی ضروری	
تھی کہ اس تبدیلی کے بغیر خارجی	

عنوان	صفحہ
دُنیا میں انقلاب پیدا نہیں ہو سکتا۔	
قرآن ایسی جماعت کی تشکیل کرتا ہے جن کے	۱۹۶
قلوب مزکّی ہوتے ہیں۔	..
حضورؐ نے کوئی باطنی تعلیم نہیں دی۔	۱۹۷
تزکیۂ نفس نظامِ اسلامی کی اطاعت سے	۱۹۸
ہوتا ہے۔	
یہ جماعت رفتہ رفتہ بڑھتی گئی	۱۹۹
اس میں ابتداءً غریب لوگ کیوں شامل ہوتے تھے۔	
حج کے زمانہ میں دعوتِ حق وصداقت۔	۲۰۱
انصار کا اِسلام۔	،،
بیعت کا مفہوم۔ عرب و عجم سے جنگ کا	۲۰۲
اعلان۔	..
اور آج کا اِسلام۔	..
یہ تمہیدی عرصہ قریب تیرہ برس تک رہا۔	
لیکن یہ بتدریج پختگی ہی آئندہ کے	۲۰۳
نتائج کی کفیل تھی۔	..
اس لیے مکّی اور مدنی زندگی ایک ہی جُوئے	..
رواں کی منازل تھیں۔ ان میں کوئی	..
حدِّ فاصل نہ تھی۔	۲۰۴
ہجرت	
جن قلوب میں قبولِ حق کی صلاحیت تھی	۲۰۵
وہ ان سے الگ ہو گئے جن میں ایسی	..
صلاحیت باقی نہیں رہی تھی۔	..

عنوان	صفحہ
اِن سے اعراض کا حکم۔	۲۰۶
لیکن حضورؐ جذبۂ رافت و غمگساری کی شدت	۲۰۸
میں قدم پیچھے نہیں ہٹاتے تھے۔	..
تحریکِ انقلابِ حق وصداقت کے تین مراحل	۲۱۰
دعوت و تبلیغ، برأت و ہجرت اور	..
فتح و کامرانی۔	..
یہ درمیانی مرحلہ بہت نازک ہوتا ہے۔	..
تمام انبیائے کرامؑ کو یہ مرحلہ پیش آیا۔	۲۱۱
حضورؐ کا اعلانِ برأت۔	۲۱۳
بحث کا دوسرا گوشہ۔	
رسُول کا مقصدِ حیات حکومتِ خداوندی	
کا قیام ہوتا ہے۔	
اگر وطن اس کی راہ میں حائل ہو تو وہ	۲۱۴
وطن کو بھی چھوڑ دیتا ہے۔	..
وطن کی محبت کا مقام اور اس سے قطعِ	
علائق کا وقت	۲۱۵
اس قطعِ علائق کو ہجرت کہتے ہیں۔	..
مہاجرین کے مدارج۔	۲۱۷
جماعتِ صحابہؓ کی مدینہ کی طرف ہجرت	۲۱۸
یہ بظاہر شکست خوردگی اور فرار کی شکل نظر	
آتی تھی، لیکن درحقیقت فتح وکامرانی	
کا دیباچہ تھی۔	
قرآن کریم کی آخری سورتیں انہی احوال و کوائف	۲۱۹
کی تصریحات پیش کرتی ہیں۔	

عنوان	صفحہ
حضورؐ کے قتل کی سازش۔	۲۲۰
گھر کا محاصرہ اور حضورؐ کا تردّد!	
کس چیز کا تردّد؟	۲۲۱
دشمنوں کی امانتیں واپس دینے کا!	..
حضورؐ کی ہجرت۔ ۱۲ر ستمبر ۶۲۱ء	..
غار کی تنہائیوں میں دشمن کے پاؤں	۲۲۲
کی آہٹ۔	..
اور اللہ پر ایمان کا مظاہرہ۔	..
متعاقب دشمن کا ایمان۔	
مدینہ میں تشریف آوری۔	۲۲۳
جہانِ نو کی تشکیل کا آغاز۔ مسجدِ نبویؐ کی	..
تعمیر۔	..
سلسلۂ مواخات۔	۲۲۴
یورپ کا "سوداگر" اس مواخات کو کیا سمجھے؟	۲۲۷
مدینہ کے یہود سے معاہدہ	..
معاہدہ کی نمایاں خصوصیت۔	۲۲۸

مرکزِ ملت (قبلہ)

عنوان	صفحہ
قوموں کی زندگی میں مرکز کی اہمیت	۲۳۰
ملتِ اسلامیہ کا فکرِ خصوصی۔	
اس کی عملی قوت کا مرکز مشہود بیت الحرام	۲۳۱
ہے۔	
بیت الحرام نوعِ انسانی کے لیے امن و سلامتی	۲۳۲

عنوان	صفحہ
کا ضامن اور حقیقی آزادی کا کفیل۔	۲۳۲
ایسے مرکز کی تولیت کے مستحق وہی ہو سکتے ہیں جو خود قوانینِ الٰہیہ کے تابع اور ان کے نفاذ کے اہل ہوں۔	۲۳۳
اِس اہمیت کے پیشِ نظر حضورؐ کی نگہِ انتخاب بار بار آسمان کی طرف اُٹھتی تھی۔	۲۳۵
اِس تبدیلی سے مقصود، ملت کی تشکیل ہے۔	۲۳۷
یہی افرادِ ملت کے لیے وجہِ جامعیت ہیں۔	
آج قبلہ کی کیا حیثیت رہ گئی ہے؟	۲۳۸
اِس کا نتیجہ!	..
اور علاج؟	۲۳۹
کعبہ کو اس کا صحیح مقام دینا۔	-
سلسلۂ غزوات	
(۱) غزوۂ بدر	۲۴۱
پس منظر	
قریش کا لشکرِ جرار حملہ کے لیے اُمنڈ آیا۔	۲۴۲
انتخابِ مقامِ جنگ اور حضرت حبابؓ بن منذر کی رائے۔	
سب سے پہلا رمضان اور اس کی سترہ تاریخ۔	۲۴۳
۱۷ رمضان ۲ھ کو دو جماعتیں ایک دوسرے کے مقابل تھیں۔	

عنوان	صفحہ
بدر کی متخاصم جماعتیں اور تقسیمِ قومیت۔	
عین میدانِ جنگ میں ایفائے عہد کا عدیم النظیر واقعہ	۲۴۴
اور ایک فقید المثال فیصلہ۔	..
جنگ کی قرآنی تفاصیل۔	۲۴۵
فرشتوں کے ذریعے امداد۔	۲۴۶
فرشتوں نے کیا کیا؟	..
بارش نے میدانِ جنگ کا نقشہ بدل دیا۔	۲۴۷
میدانِ جنگ میں ثابت قدمی کی تاکید۔	۲۴۸
ہاتھ تمہارے لیکن تیر اندازی خدا کی طرف سے۔	۲۴۹
جنگ کے قیدی	۲۵۰
احساسِ احسان کا عدیم النظیر واقعہ۔	..
دل کے نرم گوشے کی دھڑکن۔ ایک لطیف واقعہ۔	۲۵۲
سب سے پہلی عید	..
(۲) جنگِ اُحد	
جنگِ بدر کی شکست کے انتقام کے لیے قریش کا لشکرِ جرار پھر حملہ آور ہوا۔	۲۵۴
شوقِ شہادت۔	۲۵۵
فتح مبدل بہ شکست ہو گئی، کیونکہ ایک دستہ نے اپنے مقام کو چھوڑ دیا۔	..
یہ غلط خبر مشہور ہو گئی کہ حضورؐ نے شہادت پالی ہے۔	۲۵۵
اِس خلفشار و اضطراب میں صحابہؓ کی حالت۔	..
اور خود حضورؐ کی ثابت قدمی	..

عنوان	صفحہ
قرآنی تفاصیل	۲۵۶
جنگ میں خواتین کی شرکت۔	۲۵۷
شہداء کی تدفین عالمِ بے سروسامانی میں۔	..
عشق کی اک جست نے طے کر دیے قصّے تمام	۲۵۸
یعنی ایک نماز تک نہ پڑھی اور سیدھے جنّت میں جا پہنچے۔	..
قزمان کی موت، حالانکہ مسلمانوں کی طرف سے جنگ میں ہوئی، لیکن اُسے جہنم سے باہر نہ لا سکی۔	۲۵۹
اِس لیے کہ وہ اعلائے کلمۃ الحق کے لیے جان دینے کے لیے نہیں آیا تھا۔	..
(۳) جنگِ احزاب یا خندق	
مدینے کے یہود مارِ آستین تھے۔	۲۶۰
وہ ہمیشہ منافقت برتتے تھے۔	..
اُن سے متاثر ہو کر قبائلِ عرب میں سے بھی بعض نے غدّاری شروع کر دی۔	۲۶۱
مسلم مبلغین کی جماعت سے غدّاری اور ان کی شہادت۔	..
ایک اور جماعت سے اسی طرح کی غدّاری۔	..
حضرت خبیبؓ اور حضرت زیدؓ کا قتل	..
یہود کی عہد شکنی۔	۲۶۲

عنوان	صفحہ
جنگِ احزاب، جس میں تمام طاغوتی قوتیں ایک محاذ پر جمع ہو گئیں۔	۲۶۳
مسلمانوں نے مدافعت کے لیے خندق کھودی۔	۲۶۴
منافقین کی تفصیلی کیفیات زبانِ وحی میں۔	..
انصار کا استقلال۔	۲۶۵
شکستِ احزاب۔	..
بنی قریظہ کی عہد شکنی کی سزا۔	۲۶۶
۴۔ حدیبیہ	
اشتیاقِ کعبہ۔	۲۶۷
عمرہ کی غرض سے جانبِ مکّہ روانگی۔	..
قافلۂ شوق کی ولولہ انگیزیاں۔	
قریش نے جنگ کی تیاری شروع کر دی۔	۲۶۸
اور ایک دستۂ فوج مقابلہ کے لیے بھیج دیا۔	
اس دستہ کی شکست اور عفوِ عام۔	..
حضرت عثمانؓ گفتگوئے صلح کے لیے مکّہ تشریف لے گئے۔	..
یہ خبر اُڑ گئی کہ حضرت عثمانؓ شہید کر دیے گئے ہیں۔	..
بیعتِ رضوان۔	
شرائطِ صلح۔	۲۶۹
حضرت جندل کی پابجولاں آمد کا دردانگیز واقعہ	۲۷۰

عنوان	صفحہ
یہ صُلح، جو بظاہر شکست نظر آتی تھی، بعد کی کامرانیوں کے لیے کشادہ راہ ثابت ہوئی۔	۲۷۱
قرآنی تفاصیل	۲۷۱
لہلہاتی کھیتی۔	..
جماعتِ مؤمنین کی خصوصیاتِ کبریٰ۔	..
اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ۔	
۵۔ غزوۂ خیبر	
خیبر مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا مرکز بن چکا تھا۔	۲۷۶
خیبر پر چڑھائی۔	..
فتحِ خیبر۔ معاہدہ۔ صُلح۔	۲۷۷
حضورؐ کے کھانے میں زہر ملا دیا گیا۔	..
اسود راعی کا واقعہ۔ حفظِ امانت کی نادر مثال۔	..
جزیہ سے کیا مفہوم ہے؟	..
غیر مسلم رعایا سے فوجی خدمت کے معاوضہ میں خفیف سا ٹیکس	۲۷۸
اس کے برعکس مسلمانوں سے فوجی خدمت بھی اور زکوٰۃ کا ٹیکس بھی لیا جاتا ہے۔	۲۷۹

عنوان	صفحہ
جزیہ کی مقدار۔ اس سے مستثنیات۔	۲۷۹
عہدِ حفاظت کی پابندی۔ حمص کا فقید المثال واقعہ۔	..
۶۔ فتحِ مکّہ	
ہجرت کی یاس انگیز فضائیں آنے والی درخشندگی کی خاموش جھلک	۲۸۰
سورۂ لہب کی اہمیت۔	۲۸۱
ابولہب کی خصوصیت۔	..
تولیتِ کعبہ کی بنا پر یہ مرکزِ حکومتِ خداوندی کا سب سے بڑا دشمن تھا۔	۲۸۲
اس کی شکستِ بدر کی تنذیر، درحقیقت فتحِ مکّہ کی بشارت تھی۔	۲۸۳
قریش نے معاہدۂ حدیبیہ کی خلاف ورزی کی اور بالآخر اُسے توڑ دیا۔	..
ایک صحابی کی لغزش۔ صدرِ اوّل کی تاریخ میں ایک ہی واقعہ جس میں کسی مسلمان نے اپنی جماعت کی مخبری کی ہو۔	..
مکّہ کی طرف روانگی۔	۲۸۴
ابوسفیان لشکر کا پتا لینے کے لیے آیا لیکن گرفتار ہو گیا۔ حضورؐ کے سامنے آتے ہی اُس نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔	..
لہٰذا تمام سابقہ جرائم معاف ہو گئے۔	..

عنوان	صفحہ
لشکرِ اسلام بلا مقابلہ مکّہ میں داخل ہوگیا۔	..
خطبۂ فتحِ مکّہ۔	۲۸۵
عفوِ عام	۲۸۶
عثمان شیبی، کلید بردارِ کعبہ کا واقعہ۔	۲۸۷

۷۔ جنگِ حنین

عنوان	صفحہ
ہوازن اور ثقیف کے قبائل کی آتشِ حسد۔	۲۸۸
میدانِ حنین۔	..
مسلمان فوج کے دِل میں اپنی قوت پر گھمنڈ پیدا ہوگیا۔	..
اور اس کا نتیجہ ـــ شکست!	
لیکن استقامتِ نبویؐ نے اِس شکست کو فتح سے بدل دیا۔	۲۸۹
طائف کا محاصرہ۔	۲۹۰
مالِ غنیمت میں مؤلفۃ القلوب کا زیادہ حصّہ۔	..
اس پر بعض لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا ہوگئی۔	..
اِس بدگمانی کا ازالہ	..
حضورؐ کا عدیم النظیر خطبہ۔ انصار کے ساتھ تعلقات کی وضاحت۔	..
حنین کے قیدیوں کو احساناً چھوڑ دیا۔	۲۹۱

۸۔ غزوۂ تبوک

عنوان	صفحہ
رُومیوں کو مسلمانوں کی بڑھتی ہُوئی قوت سے خدشہ پیدا ہوگیا۔	۲۹۲
مسلمانوں کے لیے اس کی روک تھام ضروری تھی۔	..
لیکن حالات سخت نامساعد تھے	..
اس لیے یہ غزوہ، سخت امتحان گاہ تھا۔	..
صحابہؓ کا ایثار۔	..
لیکن اس کے باوجود مجاہدین کے لیے سواریوں تک کا انتظام نہیں ہوسکتا تھا۔	..
دوسری طرف منافقین طرح طرح کی بہانہ سازیاں کرتے تھے۔	۲۹۳
منافقین کے علاوہ بدّوی لوگ بھی تھے کہ ہنوز ایمان ان کے دلوں میں جاگزیں نہیں ہُوا تھا۔	..
بغیر جنگ کیے کامیابی۔	۲۹۴
اللہ نے اس سفر کے ہر قدم اور ہر صعوبت کو عملِ صالحہ کہہ کر پکارا ہے۔	
مدینہ کی واپسی پر "پیچھے رہ جانے والوں" کا معاملہ پیش ہوا۔	۲۹۵
ان میں حضرت کعب بن مالکؓ بھی تھے	..

عنوان	صفحہ
اُن کی داستانِ اَلم انگیز بڑی عبرت آموز ہے۔	۲۹۶
ایک بہت بڑا امتحان — ملکِ غسّان کی طرف سے دعوت نامہ۔	..
اور اس کا جواب! تنور کی آگ !!	..
عفو کی بشارت۔	..
یہ واقعہ آج بھی صد سامانِ عبرت اپنے اندر رکھتا ہے۔	۲۹۷
تبوک سے واپسی کے بعد حج۔	۲۹۸
تمام غزوات وسرایا میں مقتولین کی تعداد اور	۲۹۹
ان جنگوں کا نتیجہ۔	..
دنیا سے فتنہ وفساد کا استیصال	۳۰۰
اور ایک جہانِ نو کی تخلیق۔	..

سلسلۂ دعوت وارشاد اور تعلیم وتبلیغ

عنوان	صفحہ
سلسلۂ غزوات کے ساتھ ساتھ سلسلۂ دعوت وارشاد بھی جاری تھا۔	۳۰۲
دعاۃ ومبلّغین کی کوئی الگ جماعت نہ تھی۔	..
ہر مسلمان مبلّغ تھا۔	
مبلّغین کی قبائل کی طرف روانگی کا سلسلہ۔	۳۰۳
خود قبائل مدینہ میں اسلام لاکر حاضر ہوتے تھے۔	..
نجران کے عیسائیوں کا وفد	..
تربیت گاہِ مدینہ میں تفقّہ فی الدّین کی غرض سے	۳۰۴
نمائندگانِ قبائل کی آمد۔	..
یہ تربیت گاہیں مساجد تھیں۔	۳۰۵
مقدّمات کے فیصلے۔ فریضۂ احتساب۔	۳۰۶
باہر گورنر مقرر کیے جاتے۔	..
غیر مسلم حکمرانوں کے نام دعوت نامے۔	۳۰۷
قیصر کے دربار میں ابوسفیان کی شہادت۔	..
حضورؐ اَن پڑھ نہیں تھے۔	۳۰۸

نظامِ مملکت

عنوان	صفحہ
اسلامی نظریۂ حکومت کی اصل واساس۔	۳۰۹
حکومت کا حق خدا کے سوا کسی کو نہیں۔	..
اسی کا نام توحید ہے۔	۳۱۰
ہر ایک رسُول یہی پیغام لاتا رہا۔	۳۱۱
یہی نبیؐ اکرمؐ کا پیغام تھا۔	..
خدا پر ایمان کا مفہوم یہی ہے کہ اس کی حاکمیت کو تسلیم کیا جائے۔	۳۱۲
اطاعت ومحکومیت قوانین کی ہوتی ہے۔	۳۱۳
خُدائی قوانین کا لانے والا رسول اور قوانین کے	..
مجموعہ کا نام کتاب اللہ ہے۔	۳۱۴
رسُول کا پہلا فریضہ اس پیغام کو دوسروں تک پہنچانا ہوتا ہے۔ اسے رسالت کہتے ہیں۔	..
وہ خود بھی ان احکام کی اطاعت کرتا ہے۔	۳۱۵
رسول کی دوسری حیثیت احکامِ خداوندی	۳۱۶
کے نافذ کرنے والے کی ہے۔	..

عنوان	صفحہ
اس کا نام منصبِ امارت ہے۔	۳۱۶
امیر، اپنا حکم نہیں منواتا، صرف خدا کے احکام نافذ کرتا ہے۔	
"اللہ اور رسول" کی اطاعت سے مراد، مرکزِ ملت کی اطاعت ہے۔	۳۱۸
اس کی تائید میں نصوص و شواہد۔	..
اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ کا صحیح مفہوم۔	۳۲۱
یعنی مرکزِ نظامِ اسلامی اور ماتحت حکام۔	۳۲۲
اِس نظام کا تیسرا عنصر، جماعت (یعنی ملتِ اسلامیہ) ہے۔	..
جماعت کی اہمیت	۳۲۴
اس کا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔	..
شریعت آئینِ خداوندی کا نام ہے جسے یہ جماعت نافذ کرے گی۔	۳۲۵
یہ شریعت قرآن ہی میں ہے۔	..
لیکن قرآن میں بعض امور محض اصولی طور پر بیان ہوئے ہیں اور بعض ایسے ہیں جن کی جزئیات بھی متعین کر دی گئی ہیں۔	..
ایسا کیوں ہے؟ ایک اہم اور بنیادی بحث۔	۳۲۶
قرآن، اُن مسائلِ زندگی کا اصولی حل تجویز کرتا ہے جن کی جزئیات حالاتِ زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلنے والی ہوں۔	۳۲۷
اور ایسے احکام جن کی جزئیات بھی ناقابلِ تغیر ہوں، جزئیات کے ساتھ بیان کرتا ہے۔	۳۲۸
اوّل الذکر اصولی احکام کی جزئیات کا تعین ملت (نظامِ حکومتِ خداوندی) کے ذمہ ہے۔	..
مرکزِ ملت کو ملت سے مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔	..
اب سوال یہ ہے کہ یہ سلسلہ آگے کیسے چلے گا۔	۳۳۰
اِس نظام کو یہ جماعت آگے چلائے گی۔	..
رسول اللہ سب سے پہلے امیرِ ملت تھے۔	۳۳۰
اس کے بعد، امارت کا فیصلہ انتخاب سے ہوگا۔	..
اور اس انتخاب کا معیار تقویٰ۔	..
اب اس امیر کی اطاعت، "خدا اور رسول" کی اطاعت کے مرادف ہوگی۔	۳۳۱
وہ، ان امور کو، جن کی جزئیات قرآن نے متعین کر دی ہیں، علیٰ حالہٖ نافذ کرے گا لیکن جن امور کی جزئیات قرآن نے متعین نہیں کیں ان کی جزئیات اپنی مجلسِ مشاورت کے تعاون سے متعین کرے گا۔	..
ان فیصلوں کا اتباع قوم پر لازم ہوگا۔	..
اسی کا نام تمسک بالجماعت اور اطاعتِ امیر ہے، جس کے لیے کتبِ روایات میں شدت سے تاکید آئی ہے۔	
نظامِ دین میں تفرقہ انگیزی شرک ہے۔	۳۳۵

عنوان	صفحہ
رسُول کی تیسری حیثیت ۔ معلّم و مربّی	۳۳۶
تعلیم و تربیت سے مقصود کیا ہوتا ہے؟	..
انسان کی اندرونی استعدادوں کا اُجاگر کرنا اور انہیں صحیح نتائج مرتّب کرنے کے قابل بنا دینا۔	
اور ان تمام زنجیروں کو توڑ ڈالنا جو اس راہ میں حائل ہوں۔	۳۳۷
ملوکیت ۔ مذہبی پیشوائیت ۔	۳۳۸
لیکن رسُول کی مختلف حیثیتوں کو سامنے رکھیے۔	۳۳۹
منصبِ رسالت، جس پر ایمان لانا ہر مُسلم کے لیے ضروری ہے۔	..
منصبِ امارت، جس کی اطاعت ہر مومن پر فرض ہے۔	..
اور منصبِ تعلیم و تربیت جس میں جماعتِ مؤمنین کی حرّیتِ فکر و عمل کو وسیع سے وسیع تر کرنا مقصود ہے۔	..
غور کیجیے۔ ان تینوں حیثیتوں کو یک جا کرنا کس قدر مُشکل ہے۔	
رسول، اسی مقامِ بلند پر فائز ہوتا ہے جہاں وہ ان حیثیتوں کو قائم رکھتا ہے۔	..
اس کے لیے سب سے پہلے رسُول کی بشریّت کو نمایاں طور پر سامنے لایا جاتا ہے۔	۳۴۱ ..
نظامِ دین کے قیام کا انحصار، اشخاص پر	۳۴۳

عنوان	صفحہ
نہیں۔ حتّٰی کہ نبیِ اکرمؐ کی وفات سے بھی اس میں کوئی کمی نہیں واقع ہوئی۔ اسے سلسلہ وار آگے بڑھتے جانا تھا۔	۳۴۳
قرآن نے یہ بھی بتا دیا کہ حضورؐ کے ذاتی اجتہاد میں غلطی واقع ہو سکتی تھی۔	۳۴۴
توہّم پرستی کا استیصال۔	۳۴۵
اپنی طرزِ معاشرت اور وضعِ زندگی میں بھی کوئی امتیازی خصوصیت پیدا نہ ہونے دی۔	۳۴۶ .. ..
لیکن یہ سادگی، استغناء کا فقر تھا، محتاجی و نکبت کے آثار نہ تھے۔	۳۴۸ ..
نہ ہی رہبانیت کا نتیجہ تھی۔	..
آپؐ کے فیصلے احوال و ظروف اور واقعات و بیانات سے استنباطِ نتائج پر مبنی ہوتے تھے۔ لہٰذا، ان میں غلطی کا بھی امکان ہوتا تھا۔	۳۴۹ ..
آپؐ کے ذاتی فیصلوں کے متعلق ہر ایک کو حقِ اختلاف حاصل تھا۔	..
محفلِ نبویؐ میں یا بس تقشّف نہیں بلکہ شگفتہ متانت ہوتی تھی۔	۳۵۲
ذاتی انتقام کبھی نہیں لیا۔	۳۵۴
لیکن دینی معاملات میں قانونی سزاؤں کو بغیر تسامح اور نرمی کے جاری کیا۔	..
محمد رسولؐ اللہ اور محمدؐ ابن عبداللہ میں فرق۔	..

عنوان	صفحہ
حضرت زیدؓ کا واقعہ ۔ ذاتی حکم اور وحی کے فیصلے (یا حکم بہ حیثیت امیر) میں فرق کی بیّن مثال۔	۳۵۵
نگہ بازگشت۔	۳۵۶
حضورؐ کے بعد یہ سلسلہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہا۔	۳۵۷
معاشی زندگی	
اِسلامی مملکت خدا کی ربُوبیتِ عالمینی کی ذمّہ داری کو پُورا کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔	۳۵۹
اِس ذمّہ داری کو حضورؐ نے کیسے پورا کیا؛	۳۶۰
مکّی زندگی	,,
مدنی زندگی ۔ جب آپؐ ایک مملکت کے سربراہ تھے۔	۳۶۱
دوسروں کی ضرُوریات مقدّم تھیں۔	۳۶۳
آپؐ کا ذریعہ معاش کیا تھا؟	۳۶۴
ضرورت سے زاید کسی کے پاس نہیں رہنا چاہیئے۔	۳۶۵
حضورؐ کا ترکہ	,,
زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔	۳۶۷
زمین کو بٹائی یا کرایہ پر دینا جائز نہیں۔	۳۶۸
سرمایہ کا معاوضہ لینا حرام ہے۔	۳۶۹

درُونِ خانہ

عائلی اور معاشرتی زندگی

عنوان	صفحہ
پرائیویٹ اور پبلک زندگی کی ثنویّت کا نظریہ مغربی فکر کا پیدا کردہ ہے۔	۳۷۰
اسلام زندگی کی سیرت تمامًا و کمالًا چاہتا ہے۔	,,
بیوی انسان کی پرائیویٹ زندگی کی سب سے بڑی رازدار ہوتی ہے۔	
حضورؐ کی صداقت کی سب سے پہلی شہادت خود آپؐ کی بیوی نے دی۔	۳۷۱
بیوی کے بعد، ذاتی ملازم انسان کی پرائیویٹ زندگی کا رازدار ہوتا ہے۔	۳۷۲
حضرت زیدؓ (غلام) کی حضورؐ کے ساتھ موانست۔ باپ کو چھوڑ کر حضورؐ کے ساتھ رہنا پسند کیا۔	,,
حضورؐ کی تعددِ ازواج پر اعتراضات اور ان کا جواب۔	,,
	,,
حضرت سودہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت زینبؓ حضرت اُمِّ سلمہؓ۔	۳۷۶
	,,
حضرت زینبؓ کا نکاح۔	,,
حضرت اُمِّ حبیبہؓ، حضرت میمونہؓ	۳۷۷
حضرت جویریہؓ، حضرت صفیہؓ، حضرت عائشہؓ	۳۷۸
باسورتھ سمتھ اور کارلائل کا اعترافِ حقیقت۔	۳۸۰
جب عورتوں کی مشکلات کا زمانہ ختم ہوگیا	۳۸۱

عنوان	صفحہ
تو بیویوں کو اجازت دے دی گئی کہ	۳۸۱
وہ چاہیں تو اور جگہ جاسکتی ہیں لیکن	..
ان میں سے کسی نے بھی علاحدگی پسند	..
نہیں کی۔	..
کاشانۂ نبوی مرکزِ تعلیم و تبلیغ تھا۔	۳۸۳
واقعۂ افک	..
حُسنِ سلوک۔ نہ صرف گھر والوں سے بلکہ	..
ہمسایوں سے بھی۔	
بلندیٔ کیریکٹر۔	۳۸۵

تکمیلِ کار

عنوان	صفحہ
حضورؐ کی زندگی کی کتابِ مقدس کے تیئس ۲۳	۳۸۷
اوراق پیچھے اُلٹیے۔	
اور ان پر ایک نگہ بازگشت ڈالیے۔	..
زندگی نہیں، ایک پوری کائنات۔	..
جوئے رواں کی طرح رواں دواں نظر	..
آئے گی۔	
ایک غریب، یتیم، اَن پڑھ انسان اور اس	۳۸۸
کے سامنے حقیقت بے نقاب۔	..
انسانی دنیا کی ہر شے اُسے اپنی اصلی جگہ سے ہٹی	..
ہوئی دکھائی دیتی ہے۔	
وہ اسے اپنے صحیح مقام پر رکھنا چاہتا ہے۔	..
اس میں اس کی انتہائی مخالفت ہوتی ہے۔	-
لیکن سعید رُوحیں اس کے گرد جمع ہونی	

عنوان	صفحہ
شروع ہو جاتی ہیں۔	۳۸۹
تیئس ۲۳ سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد	
اس مقصدِ عظیم کی تکمیل ہوتی ہے۔	..
اس کے اعلان کے لیے جانبِ مکہ روانہ	
ہوتے ہیں۔	۳۹۰
قافلۂ بہار را انجمن انجمن نگر!	..
مکہ میں داخلہ۔	..
خطبۂ حجۃ الوداع۔	۳۹۱
قیامِ نوعِ انسانی کا منشورِ ابدی۔	..
تکمیلِ دین کا اعلانِ خداوندی۔	۳۹۴
لیجیے آج زمانہ پھر پھرا کر اس نقطہ پر آگیا جس پر	
فطرت نے اسے پیدا کیا تھا۔	۳۹۵
مدینہ کی طرف واپسی	..
استقبالِ خسروانہ۔	۳۹۶
زمین و آسمان سے تبریک و تہنیت کے پھول۔	..
فریضہ کی تکمیل ہوگئی۔	..
اور حضورؐ کی واپسی کا وقت قریب آگیا	..
آخری لمحاتِ زندگی۔	۳۹۷
رفیقِ اعلیٰ کی طرف مراجعت۔	..
"رفیقِ اعلیٰ" کا تصور دنیائے مذاہب میں	۳۹۸
ایک انوکھے اور بلند نظریہ کا حامل	
ہے۔	
وفاتِ رسالتمآبؐ سے جماعت کی حالت	۳۹۹
اس ہجومِ اضطراب و درد میں حضرت ابوبکرؓ	

عنوان	صفحہ
صدیق کا بصیرت افروز اعلان	۳۹۹
اِسلام کا نظام شخصیتوں کا وابستہ دامن نہیں۔	۴۰۰
جہانِ نو	
انسانی زندگی کی کامیابی کا معیار یہ ہے کہ اس نے دنیا میں کتنا اور کس قسم کا اِنقلاب پیدا کیا۔	۴۰۱
حضورؐ کی بعثت کے وقت دُنیا کے تہذیب تمدن کی حالت۔	۴۰۲
اِس کے بعد حضورؐ کس قسم کا اِنقلاب لائے؟	۴۰۳
اِس کی شہادات۔	..
دُنیا بھر کے مفکّرین اور مؤرخین کی زبانی سُنیئے۔	..
پرنسپل کینیڈی	..
کارلائل	..
براؤن	۴۰۴
حِطّی	..
سٹیفن سن	..
باشورتھ سمتھ	۴۰۵
سروِلیم میور	..
ڈاکٹر مارکس ڈاڈس	۴۰۶
سپالڈنگ	..
جارجز ریوزے	۴۰۷
ریمنڈ لیروگ	..

عنوان	صفحہ
ڈاکٹر راڈون۔	۴۰۷
تور اینڈرے۔	۴۰۸
حِطّی۔	..
گب۔	..
گِبن۔	۴۰۹
مارگولیتھ	۴۱۰
سر رچرڈ گریگوری۔	..
ایک انقلاب عظیم و مستقل۔	
"دی سائنس آف ہسٹری"	۴۱۱
ڈورسے۔	..
برفو۔	۴۱۲
مارگولیتھ۔	۴۱۳
برنارڈ شا۔	..
ہنڈمین	۴۱۴
انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔	..
مقامِ محمودیت	..
جس قدر انقلاب آتے ہیں سب اسی حرکت سے متحرک ہوتے ہیں۔	۴۱۵
غور کیجئے، کہ دُنیا رفتہ رفتہ کس طرح اسی انقلاب کی طرف آرہی ہے جو ذاتِ رسالتمآب نے رونما کیا۔	
بعثتِ رسُولِ اکرمؐ زمانہ قدیم و عصرِ جدید کے درمیان حدِّ فاصل قائم ہے۔	۴۱۶
گوئٹے کا خراجِ تحسین۔	۴۱۷

عنوان	صفحہ
اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ	
اتنی عظمتوں کا مالک ہونے کے باوجود یہ اعلان کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔	۴۱۸
ذہنِ انسانی اپنے عہدِ طفولیت میں ہر عجیب شے سے متاثر ہو جاتا تھا۔	۴۱۹
عربوں کی بھی یہی ذہنیت تھی۔	..
اِس لیے وہ سمجھ ہی نہیں پاتے تھے	۴۲۰
کہ ایک عام انسان رسول کیسے ہو سکتا ہے۔	..
وہ معجزوں کا تقاضا کرتے۔	۴۲۳
لیکن اس سے ہمیشہ انکار ہوتا۔	..
اس کی وجہ کیا تھی؟ ایک عظیم حقیقت۔	۴۲۴
علم و عقل سے کام لے کر سوچو۔	۴۲۶
کائنات کی ہر شے معجزہ نظر آئے گی۔	۴۲۷
اور اقوامِ سابقہ کی سرگذشتوں میں	۴۳۰
قرآن ہی معجزہ ہے۔	۴۳۳
اور رسول کی زندگی —	۴۳۵
رسول اللہؐ نے جو کچھ کر کے دکھایا ایک انسان کی حیثیت سے	۴۳۶
اپنے اختیار و ارادہ سے کر کے دکھایا۔	..
اِسی سے حضورؐ کی سیرت ہمارے لیے ماڈل بنتی ہے۔	

عنوان	صفحہ
ختمِ نبوّت	
ختمِ نبوت کا صحیح مفہوم — یہ نظریہ کس طرح استقرائی علم کی ابتدا کرتا ہے۔	۴۳۸
عالمِ طفولیت میں انسانی بچے کی حالت۔	۴۳۹
قدم قدم پہ آسرے کی ضرورت۔	
لیکن جوانی کے زمانہ میں صرف اتنی ضرورت	..
کہ راستہ واضح ہو اور اس پر نشاناتِ راہ بنیں۔	..
یہی کیفیت نوعِ انسانی کی تھی۔	..
ذہنِ انسانی کے ایامِ طفولیت میں راہ نمائی کا سلسلہ متواتر و غیر منقطع چلا آتا رہا۔	۴۴۱
اس وقت زندگی کے تقاضے بھی مختصر تھے۔	..
اور جلدی جلدی بدل جانے والے۔	..
اس لیے آسمانی تعلیم کے جلد جلد آنے کی ضرورت تھی۔	..
قرآن میں ناسخ و منسوخ سے یہی مفہوم ہے۔	۴۴۲
اس کے بعد انسانیت عہدِ شباب کو پہنچ گئی۔	
اب ایک آخری ہدایت آگئی جو شاہراہِ زندگی پر نشاناتِ راہ کا کام دینے کے لیے تھی۔	۴۴۳
یہ ہدایت تمام نوعِ انسانی کے لیے تھی۔	..
اس کے بعد آسروں کی ضرورت نہ تھی۔	۴۴۵

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
لہٰذا، دین کی تکمیل اور نبوّت کا اختتام ہوگیا۔	۴۴۶	دعوٰے باطل ہے۔	۴۵۳
اِس کے بعد اسلامی نظام کو آگے چلنا تھا۔	۴۴۷	وحیِ متلو اور غیر متلو کی تفریق بھی غلط ہے۔	۴۵۴
قرنِ اوّل میں اس کے متعلق کبھی کوئی سوال ہی نہیں اُٹھا۔	۔۔	ختمِ نبوّت نوعِ انسانی پر احسانِ عظیم ہے۔	
		معراجِ انسانیت	
کسی آنے والے کا عقیدہ، ہمیشہ نکبت و ادبار کی پیداوار ہوتا ہے۔	۔۔	رُوسی مفکّر اوسپنسکی کے تاثرات کہ انسانوں کا مستقبل وحی کے ساتھ وابستہ ہے۔	۴۵۷
کشف والہام کا عقیدہ ختمِ نبوّت کے منافی ہے۔	۴۴۸	برگسان کا اعتراف کہ مستقبل ان انسانوں کے ہاتھ میں ہے جو عقل کو 'وحی' کے ذریعے لاہُوتی سند عطا کرتے ہیں۔	
وحی کے معنی	۴۴۹		
وحی کے تین طریقے۔	۔۔		۴۵۸
اس میں نبی کے ذاتی فکر کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔	۴۵۱	لامارٹائن کا اعلان کہ دُنیا میں محمدؐ سے عظیم تر انسان کوئی نہیں۔	۔۔
ختمِ نبوّت کے بعد خدا سے ہم کلام ہونے کا			

فاتحۃ الکتاب

(طبعِ اوّل)

آنچہ من در بزمِ شوق آوردہ ام، دانی کہ چیست؟
یک چمن گُل، یک نیستاں نالہ، یک خُم خانہ مے

معارفُ القرآن جلد سوم[1] کے عنوان "تِلۡکَ الرُّسُل" کا آغاز ان الفاظ سے ہُوا تھا۔
طائرانِ حظیرۂ قدس کا وہ کاروانِ شوق جو صبحِ ازل، جھلملاتے تاروں کی سکوت افزا، شبنمی چھاؤں میں، جانبِ منزل روانہ ہُوا تھا، قندیلِ آسمانی کی بصیرت افروز و جہاں تاب روشنی میں زمزمہ سنج و نغمہ بار، جذب و کیف کی نُورانی وادیاں طے کرتا، اس مقام تک آپہنچا ہے جہاں سے چراغِ منزل، روشنی کے جگمگاتے مینار کی طرح، دُور سے مُسکراتا نظر آرہا ہے۔ وہ مقام جہاں اس منزل کی تکمیل ہوگی جس کے لیے خاک کے ذرے، مختلف ارتقائی ادوار طے کرکے، پیکرِ آدم میں متشکل ہوئے اور یہ پیکرِ آب و گل، مقامِ شرف و مجدِ انسانیت کی طرف رواں دواں جادہ پیما ہُوا۔ یہ راحلۂ شوق اس وقت میقات میں پہنچ چکا ہے۔ وہ دیکھئے ہر فردِ کارواں مصروفِ احرام بندی ہے کہ اب اگلا قدم حریمِ کعبہ ہوگا۔ جب تک یہ کارواں تیاریوں میں مصروف ہے، آئیے ہم ان قطع کردہ راہوں

[1] اس کتاب کے نئے ایڈیشن کا نام — شعلۂ مستور — ہے

پر ایک طائرانہ نگہِ بازگشت ڈالیں تاکہ گزری ہوئی منازل کی یاد پھر سے تازہ ہو جاتے اور ہم ان شگفتہ وشاداب پھولوں کو دامن نگاہ میں لیے' اُن کے ساتھ آگے بڑھیں کہ اس سے آگے فاران کی مقدس وادی میں پہنچ کر' جہاں کا ہر سنگ ریزہ جلوہ فروش صد طور اور ہر ذرہ آئینہ نمائے ہزار سینا ہے، اس کی فرصت نہ مل سکے گی، اس لیے کہ وہاں قلب کی ہر حرکت صرفِ نیاز اور نگاہ کی ہر جنبش وقفِ سجود ہوگی۔

میقات پر پہنچ کر ہر زائرِ حریم قدس کا ولولہ شوق تیز اور راحلۂ ذوق عناں گسیختہ ہو جاتا ہے کہ منزل کا قرب اور عیدِ نظارہ کی کشش اس کے رگ و پے میں بجلیاں بھر دیتی ہے۔ لیکن اس مقام پر میرا یہ عالم ہے کہ ذوق وشوق کی تمام برق آسا بے قراریاں اور جذب وکیف کی والہانہ سرمستیاں یکسر حیرت بن گئیں کہ یہ وہ مقام ہے جہاں کا ہر ذرہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ:-

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا!

معارفُ القرآن کی پہلی جلدیں اس منزل تک پہنچنے کی تمہید تھیں لیکن یہاں پہنچ کر اس سدرۃ المنتہیٰ کی بلندی اور اپنے دستِ شوق کی کوتاہی مشہوداً سامنے آگئی جس سے کیفیت یہ ہوگئی کہ جب بھی قلم اٹھانے کا ارادہ کیا؛

چشم بر دوتے اُو کشا، باز بخویشتن نگر!

کا احساس فوراً عناں گیر ہوگیا۔ لیکن اس مقام پر بھی اسی توفیقِ ایزدی اور رفاقتِ خداوندی نے میری دستگیری فرمائی جس نے بایں شکستہ بالی وناتوانی مجھے یہاں تک پہنچنے کی ہمت عطا فرمائی تھی۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک نعم المولیٰ ونعم الوکیل۔

آسمانی سلسلۂ رشد وہدایت سے مقصود و مطلوب کیا ہے؟ اس کی تشریح وتبئین میں کتابوں پر کتابیں لکھی جاسکتی ہیں لیکن اگر اسے مجملاً چند الفاظ میں سمجھنا ہو تو اس سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی تمدنی اور معاشی زندگی، یعنی ہیئتِ اجتماعیہ کو کس طرح اُن مستقل اقدار سے ہم آہنگ رکھ سکتا ہے جو ایک ہمہ گیر آفاقی ضابطۂ قوانین کی حیثیت سے، کارگہِ ہستی کو اس نظم وضبط، توازن واعتدال اور حسن ورعنائی سے نہ صرف سرگرمِ عمل رکھ رہی ہیں بلکہ اس کے تعمیری پہلوؤں کو بروئے کار لاکر، اسے تخلیقی ارتقاء کے مراحل طے کراتے ہوئے رواں دواں جانبِ منزل

لہ جدید ایڈیشنوں میں ان کے نام من ویزداں، ابلیس وآدم، جوئے نور، برقِ طور، شعلۂ مستور رکھے گئے ہیں۔

لیے جارہی ہیں۔ قرآنِ کریم میں اقوام و مِلل سابقہ کے احوال و کوائف اور حضرات انبیاء کرامؑ کے تذکارِ جلیلہ سے بھی یہی بتانا مقصود ہے کہ جب انسان نے اپنے تمدّنی اور معاشی نظام (یعنی حیاتِ اجتماعیہ) کو قوانینِ خداوندی سے الگ کر لیا تو اس کا نتیجہ زندگی کی اُن ناہمواریوں کی شکل میں سامنے آگیا جسے وہ فساد کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور جس سے کاروانِ انسانیت، شرف و مزیّت کی طرف جانے کی بجائے سَبُعیت و بہیمیت کی پستیوں کے جہنّم میں جاگرا اور اس کے برعکس، جب انہوں نے اپنی "زمینی زندگی" (حیاتِ ارضی۔ معاشی نظام) اور آسمانی اقدار میں توافق اور ہم آہنگی پیدا کر لی، (جسے تقویٰ کہا جاتا ہے)، تو کس طرح زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اُٹھی اور عالمِ انفس و آفاق میں کس طرح شگفتگی و شادابی کی جنّتیں کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ بعثتِ نبیٔ اکرمؐ کے وقت یہ فساد اپنی وسعتوں اور گہرائیوں کے اعتبار سے پوری شدّت اختیار کر چکا تھا لیکن نوعِ انسانی کے اس محسنِ اعظم اور آسمانی انقلاب کے اس داعیٔ اکبرؐ کے تئیس سالہ سعی و عمل سے انسانی نظامِ حیات کے یہ تمام ناہموار گوشے یکسر ہمواریوں اور استواریوں میں بدل گئے اور انسانیت نے اُس فردوسِ گم گشتہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے تبسّم ریز و کوثر فشاں دیکھ لیا جس کی تلاش میں وہ قرنہا قرن سے حیران و سرگرداں پھر رہی تھی۔ لہٰذا سیرتِ محمّدیہ درحقیقت تعارف و تاریخ ہے اُس انقلاب کی جس سے انسانیت پستیوں اور ناہمواریوں کے اُس ذلّت آمیز و کرب انگیز جہنّم سے نکل کر جس میں اسے ملوکیت کی مستبدانہ دراز دستیوں، پیشوائیت کی ابلیسانہ دسیسہ کاریوں اور مفاد پرست گروہوں کی سفاکانہ خون آشامیوں نے دھکیل رکھا تھا، بلندیوں اور ہمواریوں کی اُس رُوح پرور و نشاط انگیز جنّت میں جا پہنچی جس میں ہر متنفّس کے مضمر جوہروں کی بالیدگی اور ثمرباری کے اسباب و مواقع بلا روک ٹوک موجود تھے کَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿۲۴/۱۴﴾ اس شجرِ طیّب کی طرح جس کی جڑیں زمین (کے معاشی اور تمدّنی نظام) میں محکم و استوار ہوں اور جس کی شاخیں آسمانی (اقدارِ مستقلہ کی) جنّت در آغوش فضاؤں میں مسرّتوں کے جھولے جھول رہی ہوں۔ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔

قرآن نے اس انقلابِ عظیم کی تاریخ کو اپنی لوحِ محفوظ میں منقوش کر رکھا ہے تاکہ آنے والی نسلیں جب کبھی اپنے نظامِ زندگی کو صحیح خطوط پر متشکّل کرنا چاہیں تو یہ تاریخی یادداشتیں (ذکریٰ للعٰلمین) اُن کے لیے چراغِ راہ بن سکیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ تئیس برس پر پھیلے ہوئے اس انقلابِ انسانیت کی تمام تفاصیل و جزئیات قرآن کے اندر نہیں مل سکیں گی، کہ قرآن کا انداز یہی ہے کہ وہ اصولوں سے بیشتر اور جزئیات سے قلیل تر

بحث کرتا ہے۔ اس لیے ان جزئیات کے لیے انسانوں کی جمع کردہ و ترتیب دادہ تاریخی یادداشتوں سے بھی استفادہ ضروری ہو جاتا ہے۔ بظاہر یہ چیز بڑی آسان سی نظر آتی ہے اس لیے کہ ہمارے ہاں کتبِ سِیَر و روایات میں سیرتِ طیّبہ کے متعلق بڑا ذخیرہ موجود ہے، لیکن ایک قرآنی سیرت نگار کے لیے یہی مرحلہ سب سے زیادہ دشوار گزار ہے اور یہ دشواری ہے قرآن اور حدیث کی صحیح حیثیت کا تعیّن۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان فکر و نظر کی جس پریشانی و خلفشار اور خیالات و مُعتقدات کے جس تشتّت و افتراق میں مبتلا چلا آرہا ہے، اس کی ایک بڑی وجہ قرآن اور تاریخ کے صحیح تعلّق کا عدم تعیّن ہے۔ یعنی اُس نے قرآن اور تاریخ کا صحیح صحیح مقام متعیّن نہیں کیا جس کی وجہ سے زندگی کی کوئی حقیقت اور دین کا صحیح مقام اس کے سامنے واضح طور پر نہیں آتا۔ اگر ہم قرآن کو اس کا صحیح مقام دے دیں اور تاریخ کو اس کی حد سے آگے نہ بڑھنے دیں، تو ہماری بیشتر مشکلات کا حل آج ہی مل جائے۔

قرآن ایک حقیقتِ ثابتہ اور ایک یقینی صحیفہ ہے جس کا ایک ایک لفظ وہی ہے جو نبیِ اکرمؐ کے حُسنِ توسّط سے اُمّت کو ملا تھا۔ اس میں نہ کسی ریب و تشکیک کی گنجائش ہے نہ تغیّر و تبدّل کا امکان۔ لہٰذا، جو کچھ قرآن میں ہے اُسے بلا توقّف و تأمّل حتمی اور یقینی قرار دیا جائے گا۔ لیکن تاریخ کی یہ حیثیت نہیں۔ تاریخ کی تدوین انسانوں کی انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہے اور ان کوششوں میں کتنی ہی احتیاط کیوں نہ برتی جائے، ان کا ماحصل، بہرکیف ظنّی اور قیاسی رہے گا۔ لہٰذا، تاریخ کو بہرحال قرآن کے تابع رکھنا چاہیئے۔ لیکن ہمارے ہاں بدقسمتی سے اس باب میں غلوّ برتا گیا اور تاریخ کو نہ صرف قرآن کے ہم پایہ (مثلہٗ معہٗ) سمجھ لیا گیا بلکہ اسے قرآن پر قاضی اور اس کا ناسخ تک قرار دے دیا گیا۔ یعنی ایک حتمی اور یقینی علم کو، جس کی حفاظت کا ذمّہ خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے، قیاسی اور ظنّی ذریعۂ علم کے تابع کر دیا اور اس بحث کو صرف علمی دائرہ تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے جزوِ عقیدہ اور عین دین بنا دیا۔ چنانچہ جب اس طرح تاریخ، دین کا جزو بن گئی تو تنقید کی حد سے بالا ہو گئی۔ اس غلط نگہی سے دین میں جس قدر تضاد اور ملّت میں جس قدر انتشار پیدا ہوا، وہ ہماری ہزار سالہ تاریخ اور مسلمانانِ عالم کی موجودہ تأسف انگیز حالت سے ظاہر ہے۔ اگر اس غلط بینی کا اثر صرف ہماری ذات تک محدود رہتا تو بھی خیر، اسے طوعاً و کرہاً جھیل لیا جاتا۔ لیکن سب سے زیادہ جگر سوز اور دل دوز یہ جانکاہ حدیثِ الم ہے کہ ہم نے تاریخ کو دین کی حیثیت دے کر، خود سیرتِ حضورِ سرورِ کائناتؐ کو مخالفین کی ہرزہ سرائیوں کا ہدف بنا کر رکھ دیا۔ اس "ظلمِ عظیم" کا اندازہ وہی شخص لگا سکتا ہے جس نے غیر مسلم مصنّفین کی مرتّب کردہ کتبِ سیرت، کا

مطالعہ کیا ہے۔ یہ کتابیں اس قسم کی خرافات و مزخرفات سے بھری ہوئی ہیں جن کے تصوّر سے ہماری آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے۔ لیکن ان کی بنیاد ان روایات پر ہوتی ہے جو ہمارے ہاں کی "صحیح ترین" کتبِ احادیث میں دَرج ہیں۔ ہم اُن غیر مسلم مصنفین کو تو مُورِدِ طعن و تشنیع اور گردن زدنی و کُشتنی قرار دیتے ہیں لیکن ان روایات کے معصوم اور منزّہ عن الخطاء ہونے کے عقیدہ کو بدستور اپنے سینوں میں محفوظ رکھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ اِس لیے کہ ہم نے تاریخ کی ان یادداشتوں کو دین کا جزو اور تنقید سے بالا قرار دے رکھا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ نبئ اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ، قرآن کے عین مُطابق تھی۔ قرآنِ کریم میں حضورؐ سے بار بار ارشاد ہے کہ آپؐ وحی کا اتباع کریں اور اس کے سوا کسی اور راستہ پر نہ چلیں۔ خود حضورؐ نے بار بار اس کا اعلان فرمایا ہے کہ میں صرف وحی کا اتباع کرتا ہوں۔ اگر قرآن میں یہ کچھ بہ صراحت مذکور نہ بھی ہوتا تو بھی اس حقیقتِ باہرہ میں کسی شبہہ کی گنجائش نہ تھی کہ حضورؐ کی سیرتِ مُقدّسہ اِتّباعِ قرآنی کی مشہُود صورت تھی۔ اس لیے کہ اگر رسول بھی اپنی وحی کا کامل اتباع نہیں کرے گا، تو اور کون اس کے مطابق چلے گا۔ قرآن ہمارے پاس اپنی اصلی شکل میں بلفظہٖ موجود ہے۔ بالفاظِ دیگر، ہمارے پاس ایک ایسا یقینی اور حتمی ذریعۂ علم موجود ہے جس کی رُو سے ہم بآسانی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ تاریخ کا کون کون سا بیان درست ہے اور کون سا حصّہ قابلِ اعتماد۔ یعنی اگر ہم دیکھیں کہ قرآن میں ایک حکم ہے اور کتبِ سِیَر و احادیث میں نبئ اکرمؐ کا کوئی قول یا عمل اس کے خلاف مذکور ہے، تو ہم بلا تردد اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ تاریخ نے اس واقعہ کو ہم تک صحیح شکل میں نہیں پہنچایا۔ اس لیے کہ جب کبھی ظن اور یقین میں تصادم واقع ہو تو یقین کو بہر حال صحیح تسلیم کیا جائے گا۔ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (۱۰/۳۶)۔ ایک مثال سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔ قرآن میں ہے کہ کفار نبئ اکرمؐ کے متعلق کہا کرتے تھے کہ آپ (معاذ اللہ) رَجُلٌ مَّسْحُوْرٌ ہیں، یعنی آپؐ پر کسی نے جادو کر رکھا ہے جس کی وجہ سے آپ (پناہ بخدا) اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کرتے رہتے ہیں۔

اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ○ (۱۷/۴۷)

جب یہ ظالم کہتے ہیں کہ تم ایسے آدمی کی پیروی کرتے ہو جس پر کسی نے جادو کر رکھا ہے۔

یہ کفار کا طعن تھا جسے قرآن نے "ظالمین کا عمل" کہہ کر پکارا ہے اور حضورؐ کے دامنِ شرف و مجد کو اس الزام سے پاک ٹھہرایا ہے۔ لیکن بخاری شریف میں حضرت عائشہؓ کی زبانی یہ روایت مذکور ہے کہ "حضورؐ پر کسی نے جادو کر دیا تھا جس کی وجہ سے یہ حالت ہو گئی تھی کہ آپ سمجھ لیتے تھے کہ میں فلاں کام کر چکا ہوں،

حالانکہ آپ نے وہ کام نہیں کیا ہوتا تھا (بخاری، جلد دوم، صفحہ ۱۳۷، مطبوعہ مصر)۔ اب ظاہر ہے کہ قرآن کی مذکورہ صدر تصریح کے بعد اس روایت کا غلط ہونا کسی دلیل کا محتاج نہیں رہ سکتا۔ لیکن چونکہ بخاری شریف دین کا جزو قرار پا چکی ہے اس لیے اس روایت کے غلط سمجھنے والے کو "منکرِ حدیث" (لہٰذا دائرۂ اسلام سے خارج) قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ تاریخ کو یقینیات کا درجہ دے کر اور دین کا جزو ٹھہرا کر ہم نے کس قدر مشکلات پیدا کر رکھی ہیں اور اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آگئی ہوگی کہ ایک قرآنی سیرت نگار کے لیے تاریخ کے ان ذخائر سے صحیح معلومات کا الگ کرنا کس قدر دشوار گزار مرحلہ ہوگا۔ میں چونکہ تاریخی نظائر و شواہد کی صحت و سقم کے لیے صرف قرآن کو محور و معیار قرار دیتا ہوں، اس لیے معارف القرآن کی پیش نظر جلد میں، جو قرآن کی رُو سے مرتب کردہ سیرتِ طیبہ پر مشتمل ہے، یہی محکم اصول سامنے رکھا گیا ہے کہ تاریخ کی انہی جزئیات کو قابلِ قبول سمجھا جائے جو قرآنی تعلیم کے مطابق ہیں۔

اس مرحلہ سے آگے ایک اور دشوار گزار گھاٹی بھی قرآنی سیرت نگار کے راستہ میں حائل ہوتی ہے۔ ہماری کتبِ سیر و آثار میں، مخالفین کی تحریفات و تلبیسات کے علاوہ (جس کی ایک مثال اوپر آچکی ہے) عقیدتمندوں کی شدت و غلو نے بھی کچھ کم مفتریات کا اضافہ نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح لوگوں نے خدا کو اپنے اپنے ذہن کے مطابق تراش رکھا ہے، اسی طرح رسول کو بھی اپنے اپنے تصورات کے قالب میں ڈھال رکھا ہے۔ جو تصور کسی کو محبوب تھا اُس نے ویسا ہی رسول بنا کر پیش کر دیا۔ اس لیے رسولِ اکرمؐ کی سیرتِ عظمیٰ کے بیشتر گوشے عقیدت مندوں کے اپنے اپنے محبوب و مرغوب تصورات کے افسانوی پیکر ہیں جنہیں انہوں نے عقیدت و ارادت کے نگاہ فریب پردوں میں لپیٹ رکھا ہے۔ ان عقیدت مندوں نے نبیٔ اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کے صحیح خط و خال کو، محیّر العقول، ما فوق البشریّت اور تحیّر انگیز خوارق کے دھندلکے میں اس طرح چھپا رکھا ہے کہ سیرتِ مقدسہ کا حقیقی پیکر نگاہوں کے سامنے آنے نہیں پاتا۔ قرآنِ کریم نے اس ذاتِ گرامیؐ کا جو مرقع پیش کیا ہے وہ ایک چلتے پھرتے انسان کا سیدھا سادہ نقشہ ہے جو اپنے بیوی بچوں میں رہتا ہے، دوستوں سے ملتا جلتا ہے، کاروبار کرتا ہے جس میں اسے نفع بھی ہوتا ہے نقصان بھی۔ زندگی کے مراحل میں اسے رنج بھی ہوتا ہے راحت بھی، فتح بھی ہوتی ہے شکست بھی۔ وہ اپنے مقصدِ پیشِ نظر کے لیے انسانوں کی طرح تدبیریں کرتا ہے، اس میں اپنے رفقاءِ کار سے مشورہ بھی لیتا ہے اور ان کی رائے پر عمل بھی کرتا ہے۔ ان تدابیر میں کبھی سقم بھی رہ جاتا ہے جس کا علم ہو جانے پر اس کی تلافی کی جاتی ہے۔ وہ زندگی کے تضادات (CONFLICTS) سے آنکھیں بند کرکے

اپنے آپ کو فریب نہیں دیتا کہ وہ تضادات مٹ گئے ہیں۔ وہ ان کا خندہ پیشانی سے سامنا کرتا ہے اور اپنے قلب کے پورے سکون اور نگاہ کی کامل گہرائیوں سے ان میں عدیم النّظیر اعتدال اور فقید المثال ہم آہنگی (HARMONY) پیدا کرتا ہے جس سے حالات کی نامساعدت، حسین خوشگواریوں اور شگفتہ کامرانیوں میں تبدیل ہو جاتی ہے قرآن اس کی ان کامیابیوں کا راز، اس کے اپنی دعوت کی صداقت پر ایمانِ محکم اور اپنے نصب العین کے حصول کے لیے سعیٔ پیہم میں قرار دیتا ہے۔ اس کے پاس سب سے بڑا معجزہ اس کی اپنی سیرت ہے۔ وہ سیرت جسے وہ مخالفین کے ہجوم اور دشمنوں کے اژدہام میں، اپنی صداقت کے ثبوت میں بطورِ شہادت پیش کرتا ہے اور اس شہادت کے خلاف کہیں سے ایک اُنگلی بھی نہیں اُٹھتی۔ یہ ہے وہ رسول جسے قرآن پیش کرتا ہے اور پیش اس لیے کرتا ہے کہ آنے والے انسانوں کو بتا دیا جائے کہ جو شخص انسانیّت کے شرفِ اعلیٰ کے مقامِ بلند پر فائز ہوتا ہے، اس کے خصائص و امتیازات ایسے ہوتے ہیں۔ تم اپنے آپ کو اس معیار پر پرکھ کر دیکھو کہ تم کہاں تک شرفِ انسانیت کے حامل ہو، تم جس قدر اس معیار پر پورے اُترتے جاؤ گے، اُسی قدر تمہاری انفرادی صلاحیتیں نکھرتی اور اجتماعی زندگی سنورتی جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ رسولؐ کو فوق البشر قرار ہی اس وقت دیا جاتا ہے جب قوم میں جذبۂ عمل اور جوشِ کردار باقی نہ رہے۔ اس وقت جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ تمہارے رسولؐ نے یہ کچھ کر کے دکھایا تھا، لٰہذا تم بھی وہی کچھ کرو، تو وہ اپنی کوتاہیٔ ذوقِ عمل کو اس فریبِ نفس سے چھُپانے کی سعیٔ ناکام کرتے ہیں کہ صاحب! وہ تو خدا کے رسولؐ تھے۔ ان کا مقام کچھ اور تھا۔ بھلا ہم "عاجز بندوں" کے لیے یہ کب ممکن ہے کہ ہم بھی وہی کچھ کر سکیں جو اُنہوں نے کیا۔ ہمیں ان سے کیا نسبت؟ فقدانِ عمل کا یہی وہ فریب تھا جس سے مسلمانوں نے خدا کو "رفیقِ اعلیٰ" کے بجائے "پرستش کا محل" OBJECT OF WORSHIP قرار دے لیا اور رسولؐ کو ایک انقلاب آفریں تصوّرِ حیات کا عملی معمار اور ملّت کی ہیئتِ اجتماعیہ کا اوّلین مرکز سمجھنے کے بجائے، عجائب آفرینیوں کا مظہر اور چیستانِ خیال کا پیکر تصوّر کر لیا۔ مسلمان نے خدا کا مفہوم اتنا ہی سمجھ رکھا ہے کہ اس کے نام کی قسم کھائی جاتی ہے اور رسولؐ سے اتنا ہی واسطہ کہ حضورؐ کے زلف و خط و خال کی تعریف میں قوالوں سے نعتیں سُنی جاتی ہیں یا سال میں ایک مرتبہ عیدِ میلاد کا جلوس نکال لیا جاتا ہے۔ زندگی کے عملی مسائل کا نہ خدا کے قانون سے کچھ تعلق ہے، نہ اس کے رسول کے متشکّل فرمودہ نظام سے کچھ واسطہ!

معراجِ انسانیّت میں آپ کے سامنے حضورِ رسالتمآبؐ کا وہی پیکرِ حسن و خوبی آئے گا جسے قرآن نے ایک

جیتے جاگتے، چلتے پھرتے، ایمان وعمل کے بلند ترین مقام پر فائز انسان کی سیرت کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور جو ہر اس قوم کے لیے جو دنیا میں اس قسم کا خوشگوار انقلاب پیدا کرنا چاہے جسے نبیٔ اکرمؐ نے متشکل کر کے دکھایا تھا' بہترین نصب العین بن سکتا ہے۔ اس سیرتِ طیبہ اور حیاتِ نیّرہ میں کوئی پیچ وخم راہ نہیں، کوئی راز مستور نہیں، کوئی سرِ پسِ پردہ نہیں۔ ایک جگمگاتے ہوئے چراغ کی روشنی ہے (سراجًا منیرًا) جو ایک طرف خود چراغ کے ہر پہلو کو، دیدۂ بینا کے سامنے بے نقاب کر دیتی ہے اور دوسری طرف ہر شے کا اصلی مقام بھی متعین کر دیتی ہے۔ لیکن مسلمانوں نے جس طرح قرآن جیسے نیرِ درخشندہ کو انسانی تصورات وتخیلات کے بادلوں میں چھپا رکھا اور اس طرح اس کی روشنی اور حرارت سے نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ ساری دُنیا کو محروم کر رکھا ہے، اسی طرح انہوں نے سیرتِ محمدیہ کے جگمگاتے چراغ کو بھی اپنے توہمات اور معتقدات کے دبیز پردوں میں مستور کر رکھا ہے۔ آج ساری دُنیا اس روشنی کے لیے مضطرب وبے قرار پھر رہی ہے (اور بوالعجبی کہ ان ہی حیران وسرگرداں پھرنے والوں میں یہ قوم بھی شامل ہے جس نے اس نیرِ درخشندہ وضیائے تابندہ کو اپنے ہی دامن میں چھپا رکھا ہے) اور کوئی نہیں جو انہیں اس کا سراغ تک بھی بتائے۔ میرا ایمان ہے اور میں اس ایمان کے سہارے زندہ ہوں کہ اگر آج بھی قرآن سے تُو بر تُو پردوں کو الگ کر دیا جائے جو انسانی تصورات نے اس پر ڈال رکھے ہیں اور سیرتِ محمدیہ کو ان حشو وزواید سے پاک کر دیا جائے جو ہماری عاقبت نااندیشیوں اور غلط عقیدت مندیوں نے اس ذاتِ اقدسؐ واطہر کی طرف منسوب کر رکھے ہیں تو اندھیرے میں بھٹکنے والی انسانیت اب بھی زندگی کی اس متوازن وہموار راہ پر لگ سکتی ہے جو اسے سیدھے شادابیوں اور کامرانیوں کی جنت کی طرف لے جانے والی ہے۔ اس لیے کہ قرآن کا مقصود انسانیت سازی ہے جس کا مشہود پیکر ذاتِ محمدیؐ ہے (لیکن وہی مشہود پیکر جسے قرآن نے پیش کیا ہے) جب تک دُنیا اس مقام تک نہیں پہنچ جاتی، شرف ومزیت کی فیروزمندیاں اس کے حصے میں نہیں آسکتیں اور اس مقام تک پہنچنا اسی صورت میں ممکن ہے کہ قرآن اور سیرتِ صاحبِ قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) دنیا کے سامنے اصلی شکل میں آجائے۔ معارف القرآن کا سلسلہ اسی مقصد کے حصول کی کوششِ ناتمام ہے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

زیرِ نظر کتاب میں آپ کو ضمنی طور پر بعض ایسے مباحث دکھائی دیں گے جن کا تعلق تقسیم ہند سے پیشتر کے زمانہ سے ہے اور جن کی آج وہ اہمیت نہیں رہی جو اُن حالات میں تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس جلد کا مسودہ اوائل ۱۹۴۷ء تک مکمل ہو چکا تھا اور بہت سے حصوں کی کتابت بھی وہیں ہو چکی تھی۔ اس کتابت شدہ حصہ میں ردّ وبدل اُسی صورت

یں ممکن تھا کہ اس تمام حصہ کو ضائع کر کے از سرِنو کتابت کرائی جائے۔ اس کے لیے نہ وقت تھا نہ حالات سازگار۔ اس لیے ان مقامات کو علیٰ حالہٖ رہنے دیا گیا ہے۔ آپ انہیں پڑھتے وقت صرف اس حقیقت کو سامنے رکھیے کہ یہ ۱۹۴۷ء سے پہلے کی لکھی ہوئی باتیں ہیں۔ یوں بھی ان وقائع و حوادث کا تذکرہ محض ضمناً آگیا ہے۔ اصل موضوع پر ان کا کوئی اثر نہیں۔

معارف القرآن کی دوسری اور تیسری جلدیں ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ یہ چوتھی جلد ۱۹۴۶ء یا زیادہ سے زیادہ ۱۹۴۷ء میں شائع ہو جائے۔ اس لیے اس کے مسودہ کی تبییض اور کتابت ساتھ کے ساتھ ہوتی جارہی تھی کہ اتنے میں تقسیمِ ہند کے عواقب میں پیدا کردہ خلفشار کی قیامت خیز آندھیاں اُٹھیں۔ ہم مشرقی پنجاب والوں پر اس رستاخیز میں کیا گزری، اس کی یاد نہ ہی دلائی جائے تو اچھا ہے۔ البتہ معارف القرآن کے مسودہ اور کاپیوں پر کیا گزری، اس کا مختصر سا تذکرہ ناگزیر ہے۔ میرے دہلی چھوڑتے وقت ان کی کیفیت یہ تھی کہ

چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی تھی داستاں میری

کچھ حصے دہلی میں، کچھ دیوبند میں، کچھ سہارنپور میں، چند ورق میرے ساتھ کراچی پہنچ گئے۔ باقی وہاں دوستوں اور کاتبوں کے پاس رہ گئے۔ اس سانحۂ ہوش رُبا کا صحیح اندازہ وہی مصنف لگا سکتا ہے جس کا مدت العمر کا سرمایہ اس مسودہ کی صورت میں اس طرح منتشر ہو جائے جس کی نقل بھی اُس کے پاس نہ ہو۔ یہ مسودہ میری ذہنی کاوشوں ہی کا نتیجہ نہ تھا، میری قلبی عشق سامانیوں کا بھی ماحصل تھا۔ اس کی تسوید قلم کی روشنائی ہی کی رہینِ منت نہ تھی، اس میں خونِ جگر کی سُرخی بھی شامل تھی۔ ایک مدت اسی بیم و رجا میں گزر گئی کہ نہ معلوم یہ متاعِ عزیز، وجہِ نورانیتِ دیدۂ یعقوب بنتی ہے یا نہیں۔ اس کے بعد اس مبداء فیض کی عاجز نوازیوں کے تصدق، یہ منتشر اوراق رفتہ رفتہ جمع ہونے شروع ہو گئے، لیکن بایں نمط کہ اگر اصل ہے تو نقل نہیں اور اگر کہیں نقل ہے تو اصل نہیں۔ بایں ہمہ، یہ جگر لخت لخت کسی نہ کسی شکل میں مجتمع ضرور ہو گیا۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔ اس مقام پر جی بہت چاہتا ہے کہ ان مخلص احباب کا نام بہ نام شکریہ ادا کروں جنہوں نے میری اس متاعِ عزیز کی اس طرح حفاظت کی کہ انہوں نے گولیوں کی بوچھاڑ اور سنگینوں کی یلغار میں بھی ان اوراق کو اپنے سینے سے الگ نہ کیا۔ لیکن اُن کا یہ اصرار کہ شکریہ کا اظہار خندیدہ و دزدیدہ سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے، عنان گیر ہو جاتا ہے اور قلم کو ان حدود سے آگے نہیں بڑھنے دیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ رشتہ جو قرآن کی رُو سے پیدا ہو جاتا ہے، رسمیات سے بہت بلند ہوتا ہے۔

ویسے تو میں معارف القرآن کی ہر جلد کے متعلق چاہتا تھا کہ وہ صُوری حیثیت سے بھی "بالائے ہر بالاتر" ہو، لیکن جلد زیرِ نظر کے متعلق تو خاص طور پر میرا ارادہ تھا کہ اسے محبوب ترین انداز میں پیش کروں گا کہ یہ میرے شوق کی سدرۃ المنتہیٰ اور میرے ذوق کی جنّت الماوٰی ہے۔ لیکن اس کے منتشر اوراق کی بازیافتگی کے بعد اسے جن حالات میں طبع کرانا پڑا، ان میں محض کتاب کا چھپ جانا ہی غنیمت جانا۔ خطرہ تھا کہ اگر مساعد حالات کے انتظار میں کچھ مدّت اور گزر گئی، تو تمام کتابت شدہ کاپیاں ضائع ہو جائیں گی۔ لہٰذا جس طرح بن پڑا، کتاب کو محفوظ کر لینے کی کوشش کی گئی۔ اس کے باوجود میری خوش بختی تھی کہ میرے نادیدہ کرم فرما، محترم عبدالرحمٰن صاحب چغتائی کے خلوص و محبت نے وہ مرصّع جدولیں عطا کر دیں جو "صبحِ بہار" کے دل آویز عنوان سے متّصل، باعثِ تزئینِ اوراق ہیں۔ اس کے ساتھ ہی 'دورِ حاضرہ کے بے مثل خوشنویس منشی محمد یوسف صاحب دہلوی' بروقت کراچی آپہنچے اور ان جدولوں کے خاکہ میں، اپنے قلمِ سحر کار کی گہر ریزیوں سے تابندگیٔ حسن کا موجب بن گئے۔ اس قسم کا قِران السعدین بہت کم نصیب ہُوا کرتا ہے۔

جاں نذر کرنی بھُول گیا اضطراب میں

لیکن میرے لیے طباعت کے نقصِ زیبائی سے کہیں زیادہ سوہانِ روح وہ غلطیاں ہیں جو اس افراتفری میں، کتاب کے قریب قریب ہر صفحے پر موجود ہیں۔ میری کیفیت یہ ہے کہ اگر میرے کسی عام مضمون میں بھی کتابت کی غلطی رہ جائے تو میرے کلیجہ پر چھُری چل جاتی ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ احساس کی اس شدّت کے بعد کتاب زیرِ نظر میں اس قدر غلطیوں کی موجودگی میرے لیے کس قدر المناک، ذہنی کوفت اور درد انگیز قلبی اذیّت کا موجب ہوئی ہوگی۔ لیکن۔ قہرِ درویش برجانِ درویش سے زیادہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ ایک رفیق نے ہمّت کر کے اغلاط نامہ مرتب کر دیا ہے جو چند صفحات بعد آپ کے سامنے آجائے گا[1]۔ اگر آپ کتاب پڑھنے سے پہلے ان غلطیوں کی تصحیح کی زحمت گوارا فرما لیں، تو آپ راستہ میں قدم قدم پر پاؤں سے کانٹے نکالنے کی کوفت سے بچ جائیں گے۔

سلسلۂ معارف القرآن میں اب ہم اس مقام تک پہنچ گئے ہیں جہاں خدا کی طرف سے متعین کردہ دین حضور خاتم النبیین کی حسنِ وساطت سے اپنی مکمل صورت میں، انسانوں تک پہنچ گیا اور جسے اب اُس وقت تک غیر متبدل رہنا ہے جب تک انسانی کتابِ زندگی کا دوسرا ورق نہیں اُلٹا جاتا۔ لہٰذا اب ہمارے سامنے یہ سوال آئے گا کہ یہ دین ہے کیا؟ اسلام کہتے کسے ہیں؟ آپ کہیں گے کہ یہ سوال کون سا مشکل ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اسلام کسے کہتے ہیں؟ لیکن جب آپ اس

---

[1] بعد میں شائع ہونے والے تصحیح شدہ ایڈیشن کے بعد یہ اغلاط نامہ حذف کر دیا گیا۔

سوال کی سطح سے ذرا نیچے اُتریں گے، تو آپ خود محسوس کریں گے کہ اس سوال کا جواب ایسا آسان نہیں جیسا بظاہر نظر آتا ہے۔ اس کا جواب دقّتِ نظر اور عمقِ فکر کا محتاج ہے۔

یہ ہمارا دعویٰ ہے (اور ہر مسلمان کا ایمان) کہ خدا کی طرف سے متعیّن کردہ دین، صرف اسلام ہے۔ اس کے سوا کوئی اور راہ، حق و صداقت کی راہ نہیں۔ اس کے مقابلہ میں کوئی مذہب نہیں آسکتا۔ اس کی نظیر و مثیل پیش کرنا ناممکن ہے۔ لیکن جب آپ یہ پوچھیں گے کہ اسلام کی وہ کون سی تعلیم ہے جس کی بناء پر اس کا شریک و سہیم اور مثیل و نظیر نہیں ہو سکتا، تو اس کے جواب میں یا تو کہہ دیا جائے گا کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جھوٹ نہ بولو، چوری نہ کرو، زنا کے مرتکب مت ہو، کسی پر ظلم نہ کرو وغیرہ یا اس کے ارکانِ خمسہ کلمہ، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ گنا دیئے جائیں گے لیکن ذرا غور کیجیے کہ ان میں سے کون سی چیز ایسی ہے جو ہمارے اس دعویٰ کی دلیل بن سکتی ہے کہ اسلام ہی دنیا میں حق و صداقت کی راہ ہے، اس کا مثیل و نظیر ناممکن ہے؟ جھوٹ نہ بولو، چوری نہ کرو وغیرہ انداز کے اخلاقی نصائح دنیا کے تمام مذاہب میں موجود ہیں[1]۔ حتّیٰ کہ وہ لوگ جو کسی مذہب کے قائل نہیں اور خدا کی ہستی تک کے بھی منکر ہیں وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ جھوٹ بولنا اچھا ہے اور چوری کرنا قابلِ ستائش عمل ہے۔ باقی رہے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ شعائر و مناسک، تو ان کے بےمثیل ہونے کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ آخرت کی نجات ان ہی ارکان و مناسک کے ساتھ وابستہ ہے لیکن یہ دلیل بجائے خویش محتاجِ ثبوت ہے، یعنی فریقِ مخالف پوچھ سکتا ہے کہ اس کا ثبوت کیا ہے کہ آخرت کی نجات ان ہی رسوم و مناسک سے مختص ہے، دیگر مذاہب کے انداز و طرقِ پرستش سے نجات نہیں سکتی[2]۔ لہٰذا، اگر اسلام کی تعلیم کا ماحصل یہی چند اخلاقی

---

[1] اسی بنا پر ابوالکلام صاحب آزاد نے کہہ دیا ہے کہ "عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں" اس لیے کہ ان کے سامنے اسلام کی تعلیم یہی چند اخلاقی مواعظ ہیں اور یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ اگر اسلام کا صحیح تصوّر ان کے سامنے ہوتا، تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ جو کچھ اسلام پیش کرتا ہے وہ کہیں اور نہیں مل سکتا۔

[2] یہی دلیل ابوالکلام آزاد صاحب نے پیش کی ہے جب انہوں نے لکھا ہے کہ "دینِ حق کی اس اصلِ عظیم کا اعلان کہ سعادت و نجات کی یہ راہ نہیں کہ عبادات کی کوئی خاص شکل یا کھانے پینے کی کوئی خاص پابندی یا اسی قسم کی کوئی دوسری بات اختیار کر لی جائے، بلکہ وہ سچی خدا پرستی اور نیک عملی سے حاصل ہوتی ہے۔" (ترجمان القرآن)

ان کے نزدیک خدا پرستی خدا کی پوجا پاٹ ہے اور نیک عملی ان اخلاقی نصائح کی پابندی جنہیں وہ عالمگیر سچائیاں قرار دے رہے ہیں۔ لہٰذا اس اعتبار سے اسلام کو فی الواقع کسی دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہو سکتی!

نصائح اور پرستش کے شعائر و مناسک ہیں تو یہ کچھ تو اس کے بے مثل و بے نظیر ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتا ہم زیادہ سے زیادہ اپنے "ارکانِ دین" کے مصالح و حکم کو بطور شہادت پیش کر سکیں گے لیکن اس سے بھی اتنا ہی کہا جا سکے گا کہ عبادت کے یہ طریقے اور طریقوں سے اچھے ہیں۔ اس لیے یہ مقام بڑے غور و فکر کا مقام ہے۔ اگر اسلام فی الواقع، یہی کچھ پیش کرتا ہے تو ہم اپنے آپ کو لاکھ اطمینان دلائیں، دُنیا ہمارے اس دعوٰی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو گی کہ اسلام ہی حق و صداقت کی راہ اور خدا کا سچا دین ہے۔ اگر ہم اس دعوٰی کو دُنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں تو ہمیں یہ بتانا ہو گا کہ وہ اسلام کیا ہے جس کی مثل و نظیر کہیں اور نہیں مل سکتی۔

معارف القرآن کی آئندہ جلد جو اس وقت زیرِ ترتیب ہے، اسی سوال کا جواب ہو گی۔ جہاں تک میری بصیرتِ قرآنی میری راہ نمائی کر سکی ہے، میں یہ سمجھا ہوں کہ قرآن، انسانی زندگی کے مسائل (PROBLEMS OF LIFE) کا حل پیش کرتا ہے اور انسانیت کے سامنے ایسی راہیں کھولتا ہے جو اسے ان مشکلات سے نکال کر جن میں آج دُنیا اس بُری طرح سے گرفتار ہے، کاروانِ انسانیت کو اس کے مقصود و منتہیٰ کی طرف لے جاتا ہے۔ بتانا یہ ہو گا کہ مسائلِ حیات کے وہ کون سے حل ہیں جو قرآن پیش کرتا ہے اور وہ کون سی منزل ہے جس کی طرف وہ کاروانِ انسانیت کو لے جانا چاہتا ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہو گا کہ مسائلِ حیات کے حل، دنیا کے اربابِ فکر و سیاست بھی پیش کرتے چلے آرہے ہیں اور آج بھی پیش کر رہے ہیں۔ کیا اُن کے پیش کردہ حل قابلِ اطمینان نہیں؟ اگر یہ قابلِ اطمینان نہیں تو کیسے اور ان کے مقابلہ میں قرآنی حل کامیاب قرار دیئے جائیں گے تو کس طرح؟ پھر اس سے یہ اعتراض پیدا ہو گا کہ اگر قرآنی حل ایسے کامیاب اور قابلِ اطمینان ہیں، تو سب سے پہلے یہ اُس قوم کے مسائلِ حیات کو حل کیوں نہیں کرتے جو قرآن پر ایمان رکھتی ہے۔ اس قوم کی حالت تو یہ ہے کہ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی مشکلات کے لیے بھی مختلف دروازوں پر دستک دیتی نظر آرہی ہے۔ یہ وہ اعتراض ہے جس نے غیر تو غیر، اکثر مسلمانوں کے دلوں کو بھی ان شکوک و شبہات کی آماجگاہ بنا رکھا ہے جن کی بنا پر وہ بالعموم دبے الفاظ میں اور بسا اوقات کھلے بندوں، یہ کہتے دکھائی دیتے ہیں کہ قرآن نے ایک خاص زمانہ کے مخصوص حالات کے ماتحت ایک نتیجہ پیدا کر دیا تھا۔ اب اس میں اس کی صلاحیت نہیں کہ زمانہ کے اس قدر بدلے ہوئے حالات اور ایسے ایسے پیچیدہ مسائل کا خاطر خواہ حل پیش کر سکے۔ لہٰذا ہمیں اس "رجعت پسندانہ" مسلک کے بجائے، ان تحریکات کا ساتھ دینا چاہیے جو دُنیا کی قومیں، اپنے تجربہ کے بعد اختیار کر رہی ہیں۔ یہ شکوک و اعتراضات ایسے نہیں جنھیں محض ایک استہزائی لاحول کے ساتھ ٹھکرا دیا جائے۔ اگر ہم قرآن کو ایک زندہ تحریک کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں جو دورِ حاضرہ کے مسائلِ حیات

کا اطمینان بخش حل اپنے اندر رکھتی ہے تو ہمیں ان تمام اعتراضات و شکوک کا سامنا علیٰ وجہ البصیرت کرنا ہوگا اور ان کا جواب دیانت اور متانت سے دینا ہوگا۔

یہ تمام مسائل و مشکلات اور شبہات و اعتراضات میرے سامنے ہیں۔ آیندہ جلد انہی مباحث پر مشتمل ہوگی۔

واللہ المستعان علیہ توکّلت والیہ انیب۔

اس حقیقت کو میں معارف القرآن کی سابقہ مجلدات میں بار بار پیش کر چکا ہوں اور اب پھر اس کا اعادہ ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں ہو سکتا کہ وہ سہو و خطا سے منزّہ ہے۔ یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ لہٰذا میری تحریریں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو و خطا دکھائی دے وہ میرے ذہن کی نارسائی۔

۲۳/۱ فاؤلرز لائن،
نیپئر بارکس، کراچی
۱۰ محرم ۱۳۶۹ھ

پرویز
۲ نومبر ۱۹۴۹ء

باسمہٖ تعالیٰ

مُقدّمہ

طبعِ ثانی

اگر محض حروف و نقوش میں لکھی ہوئی تعلیم انسانی راہ نمائی کے لیے کافی ہوتی، تو خدا کے لیے کیا مشکل تھا کہ وہ آسمان سے لکھی لکھائی کتاب انسانوں کی طرف بھیج دیتا یا اسے کسی چٹان پر منقوش کر دیتا۔ لیکن اُس نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا۔ اُس نے اپنا ضابطۂ ہدایت، انسانوں کی وساطت سے دُوسرے انسانوں تک بھیجا۔ جس انسان کی وساطت سے خُدا کی کتاب، دوسرے انسانوں کو ملتی تھی، اسے خُدا کا رسُول (پیغامبر) کہا جاتا ہے۔ یہ رسُول، خدا کا پیغام انسانوں تک پہنچاتا اور اس کے ساتھ ہی اس پر عمل کر کے دکھاتا اور اس طرح انسانی معاشرہ کو اُن خطوط پر متشکل کرتا جو اس ضابطۂ خداوندی کا مقصُود تھا۔ یہ وجہ تھی کہ خدا کا رسول، اس امر کا واضح الفاظ میں اعلان کرتا کہ

اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (۱۸/۱۱۰)

میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔

اس اعلان کا مقصد یہ بتانا تھا کہ خدا کی یہ تعلیم ایسی ہے جس پر ہر انسان عمل کر سکتا ہے۔ یعنی رسُول اُن سے یہ کہتا کہ:

(۱) تم دیکھتے ہو کہ میں اس تعلیم پر عمل کرتا ہوں۔ اور

(۲) میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ لہٰذا

(۳) اگر میں اس کے مطابق عمل کر سکتا ہوں تو تم بھی ایسا کر سکتے ہو۔ خدا کی تعلیم ناممکن العمل نہیں۔

خدا کے رسولؐ کا یہی عمل تھا جسے دوسرے انسانوں کے لیے اُسوۂ حسنہ یعنی بہترین ماڈل قرار دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ رسولؐ کا یہ عمل انہی لوگوں کے لیے ماڈل ہو سکتا تھا جن کے سامنے وہ ایسا عمل کرتا تھا۔ لیکن رسولؐ کی پیش کردہ تعلیم تو انہی لوگوں کے لیے نہیں تھی جو اس کے اوّلین مخاطب تھے۔ وہ تعلیم آنے والے لوگوں کے لیے بھی ضابطۂ ہدایت تھی۔ اور اس رسولؐ کی تعلیم جس کے بعد کسی اور رسول نے نہیں آنا تھا، تو قیامت تک کے آنے والے انسانوں کے لیے ضابطۂ زندگی تھی۔ لہٰذا، انہیں ماڈل کہاں سے ملتا؟ اس کا انتظام بھی خود خدا ہی نے کر دیا، یعنی رسولؐ کی زندگی کے وہ اصولی سوانح و کوائف جنہیں ابدی طور پر نوعِ انسانی کے لیے ماڈل بننا تھا، اُنہیں خدا نے خود اپنی کتاب میں منضبط کر کے اس کتاب کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا۔ اس طریق سے، رسولؐ کی حیاتِ طیبہ کے اصولی خط و خال آنے والوں کے لیے بھی ماڈل قرار پا گئے۔

قرآنِ کریم میں دو مقامات پر اُسوۂ حسنہ کا ذکر آیا ہے۔ ایک سورۂ ممتحنہ میں، جہاں کہا گیا ہے کہ قَدۡ كَانَتۡ لَكُمۡ أُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ فِيٓ إِبۡرَٰهِيمَ وَٱلَّذِينَ مَعَهُۥٓ (۶۰/۴) "تمہارے لیے ابراہیمؑ اور اس کے ساتھیوں میں بہترین نمونہ ہے"۔ اس کے بعد کہا کہ: إِذۡ قَالُواْ لِقَوۡمِهِمۡ... جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ تم میں اور ہم میں کوئی تعلق اور واسطہ نہیں جب تک تم خدائے واحد پر ایمان نہ لے آؤ۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ ہمارے لیے حضرت ابراہیمؑ اور ان کے رفقاء کا صرف یہ واقعہ ماڈل قرار دیا گیا ہے جس میں اُنہوں نے حق و صداقت سے انکار کرنے والوں سے اپنے تعلقات منقطع کر لیے تھے۔ لیکن قرآنِ کریم میں حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کے اور بھی بہت سے گوشے مذکور ہیں جو اتنے ہی اہم ہیں۔ اس سے مستنبط کیا جا سکتا ہے کہ "اُسوۂ حسنہ" سے متعلق آیت کا تعلق اگرچہ ایک خاص واقعہ سے ہے لیکن اس کا اطلاق ان دیگر واقعات پر بھی کیا جا سکتا ہے جن کا قرآنِ کریم نے خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔

اُسوۂ حسنہ سے متعلق دوسرا مقام (رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ میں) جنگِ احزاب کا ہے۔ اس جنگ میں مسلمانوں کی فوجوں کو کس قدر جانگسل مشکلات کا سامنا تھا، اس کا تفصیلی تذکرہ سورۂ احزاب میں آیا ہے۔ اس تذکرہ کے عین درمیان، جب مقابلہ کی شدت اپنی انتہا تک پہنچ گئی تھی، مسلمانوں سے کہا گیا کہ:

لَّقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِي رَسُولِ ٱللَّهِ أُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳/۲۱)

تمہارے لیے رسول کی اس روش میں بہترین نمونہ ہے۔

کہ وہ مصائب و نوائب کی اِن تلاطم خیزیوں میں، روشنی کے مینار کی طرح، اپنے مقام پر جم کر کھڑے تھے۔ نہ آپؐ کے پائے ثبات میں کسی قسم کی لغزش آئی تھی اور نہ ہی حضورؐ کے دل میں کسی قسم کا خوف و ہراس پیدا ہوا تھا۔

اس سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے اس خاص واقعہ کو بطور ماڈل پیش کیا گیا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم میں حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کے اہم کوائف اس کثرت سے بیان ہوئے ہیں کہ ان سے آپؐ کی پوری سیرت آئینے کی طرح سامنے آجاتی ہے۔ اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ حضورؐ کی حیاتِ مقدسہ کا کوئی ایک واقعہ نہیں، بلکہ اس کے وہ تمام گوشے جنھیں قرآنِ کریم نے اپنی دفتین میں محفوظ کر لیا ہے، آنے والوں کے لیے اُسوۂ حسنہ ہیں۔

ان واقعات کو خود قرآن نے اپنے دامن میں اس لیے محفوظ کر لیا کہ تاریخ اِس پر شاہد تھی کہ جہاں انبیائے سابقہؑ کی پیش کردہ تعلیم، کائناتی حوادث یا انسانی دست بُرد کی نذر ہوگئی، وہاں اُن حضرات کی سیرت بھی اس قدر مسخ کر دی گئی کہ وہ آنے والوں کے لیے اُسوۂ حسنہ بننے کے بجائے، اُلٹی ضلالت و غوایت کا موجب بن گئی۔ اسی خدشہ کے پیشِ نظر، قرآنِ کریم نے حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے تمام اہم گوشوں کو خود اپنے صفحات میں محفوظ کر لیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس طرح خدا کی تعلیم ہمارے پاس حرفاً حرفاً اپنی اصلی شکل میں موجود ہے، اسی طرح خدا کے رسولؐ کی سیرتِ مقدسہ کے اصولی گوشے، نقشاً نقشاً اپنے حقیقی رنگ میں ہمارے لیے وجۂ تابانیٔ قلب و نظر ہیں۔ اس خدائی احتیاط کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ حضورؐ کی سیرتِ مقدسہ کے متعلق بعد میں جو کچھ لکھا گیا، اس میں بھی اس قسم کی آمیزشیں راہ پا گئیں جن سے انبیاء سابقہ کے کوائفِ حیات اپنی منزہ شکل میں باقی نہ رہے تھے۔ اگر حضورؐ کی سیرت آغوشِ قرآنی میں محفوظ نہ رہتی، تو پیکرِ نبویؐ کی بے لوث گھرنابیوں سے ہماری بے تابنگاہیں بھی اسی طرح محروم رہتیں جس طرح انبیائے سابقہؑ کے نام لیوا اُن کے حُسنِ سیرت و کردار کی گُل فشانیوں سے تہی داماں ہیں۔

اب صورت یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں حضور نبیٔ اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کے اجمالی گوشے ہیں اور کتبِ سِیَر و روایات میں تفصیلی واقعات مذکور ہیں۔ جو کچھ قرآن میں ہے، اس کے کسی ایک حرف کے غلط یا محرّف ہونے کا امکان نہیں، لیکن جو کچھ کتبِ سِیَر و روایات میں ہے، اس میں صحیح کے ساتھ غلط اور اصلی کے ساتھ وضعی کی بھی آمیزش ہوگئی ہے۔ لہٰذا، ذاتِ رسالت مآبؐ کی سیرت نگاری کے سلسلہ میں راہِ صواب یہی ہے کہ جو کچھ قرآنِ کریم میں ہے، اسے اصلِ عنوان قرار دیا جائے اور کتبِ سِیَر و روایات سے صرف انہی واقعات کو لیا جائے جو اس اصل کی تائید کرتے ہوں۔

مجھے معلوم نہیں کہ اس سے پہلے بھی اس قسم کی کوشش کی گئی تھی یا نہیں (کم از کم میری نظروں سے ایسی کوئی

کتاب نہیں گزری)، لیکن میں نے حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کی تالیف و ترتیب میں اسی اصول کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ قرآنِ کریم میں اس سلسلہ میں کتنا کچھ آیا ہے، اس کا اندازہ آپ کو زیرِ نظر کتاب کے مطالعہ سے لگ سکے گا۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ بڑی تقطیع کے قریب نو سو صفحات پر پھیلی ہوئی کتاب اپنے انداز کی پہلی کوشش تھی اس لیے خیال تھا کہ اس کی طلب کی رفتار بہت سُست رہے گی لیکن واقعات نے اس خیال کی تغلیط کی اور جس ذوق و شوق سے اِسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اس سے اندازہ ہوا کہ قوم کے تعلیم یافتہ طبقہ کا رُجحان قرآنی تعلیم کی طرف کس تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِكَ۔

دوسرے ایڈیشن کے سلسلہ میں قارئین کی طرف سے جو مشورے موصول ہوئے، اُن میں یہ تجویز قریب قریب مشترک تھی کہ کتاب اتنی ضخیم نہیں ہونی چاہیئے۔ اس تجویز پر غور کرنے سے یہ بات سامنے آئی کہ اس میں چند ابواب ایسے ہیں جنھیں اگر الگ کر دیا جائے تو اس سے کتاب کے متن اور مضامین کے تسلسل پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اس خیال سے، اس نئے ایڈیشن میں حسبِ ذیل ابواب شامل نہیں کیے گئے۔

(۱) "ظہر الفساد" کا وہ حصہ جو مختلف مذاہب کی مبیّنہ آسمانی کتابوں کی تاریخ پر مشتمل تھا۔

(۲) "جہاد" سے متعلق باب۔

(یہ دونوں حصے الگ الگ کتابی شکل میں شائع کر دیئے گئے ہیں)۔

(۳) ختمِ نبوّت کا وہ حصہ جس کا تعلّق "قادیانیت" سے تھا۔ (یہ موضوع ایک مستقل تصنیف کا متقاضی ہے جو الگ شائع ہو چکی ہے)

(۴) ایسے مباحث جو بعض مقامات پر مکرّر آ گئے تھے۔

کتاب پر نظرِ ثانی کے وقت یہ بھی دیکھا گیا کہ اس میں بسیار احتیاط کے باوجود، دوچار ایسی روایات راہ پاگئی تھیں جو قرآن کے مطابق نہیں قرار پا سکتیں۔ اس ایڈیشن میں، ان مقامات کی تصحیح بھی کر دی گئی ہے اور بعض ابواب کو تو گویا ازسرِنو لکھا گیا ہے۔ بنا بریں، یہ نقشِ ثانی، نقشِ اوّل سے، کئی اعتبار سے، مختلف ہی نہیں بہتر بھی ہو گیا ہے۔

"فاتحۃ الکتاب" میں ایک ایسی کتاب کا ذکر آیا ہے جس کے متعلق کہا گیا تھا کہ اس میں بتایا جائے گا کہ اسلام کیا ہے؟ اس پروگرام پر مزید غور کرنے سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ قبل اس کے کہ یہ بتایا جائے کہ انسانی زندگی کے اہم معاملات کا حل وحیٔ خداوندی نے کیا بتایا ہے، یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ ان معاملات سے متعلق، تنہا عقلِ انسانی نے (وحی کی مدد کے بغیر) کیا سوچا ہے اور اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ چنانچہ اس پروگرام کے مطابق، میں نے پہلے وہ کتاب شائع کی جس کا عنوان ہے —— انسان نے کیا سوچا؟ —— اس میں بتایا گیا ہے کہ حکمائے یونان سے لے کر عصرِ حاضر تک' دنیا کے بڑے بڑے مفکرین، مؤرخین، مصلحین اور سائنس دانوں نے انسانی زندگی کے مسائل کے متعلق کیا سوچا اور ان کا حل کیا بتایا ہے۔ اس کے بعد میں نے وہ کتاب شائع کی جس کی طرف فاتحۃ الکتاب میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کا عنوان ہے — اسلام کیا ہے؟ — یہ دونوں کتابیں بھی بڑی مقبول ہوئی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب' سلسلۂ معارف القرآن کی ایک کڑی ہے۔ میں نے اس سلسلہ کی ترتیب حسبِ ذیل انداز سے رکھی ہے۔

(۱) **ابلیس و آدم**: اس میں انسان، آدم، ملائکہ، جنات، وحی و رسالت سے متعلق مباحث آ گئے ہیں۔

(۲) **من و یزداں**: اس میں صفاتِ خداوندی کی تفصیل اور انسان اور خدا کے باہمی تعلق پر بحث کی گئی ہے۔

(۳) **جوئے نور**: حضرات انبیاء کرامؑ کی سیرت اور اقوامِ سابقہ کی سرگزشت۔ اس جلد میں حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت شعیبؑ تک کے احوال و کوائف آ گئے ہیں۔

(۴) **برقِ طور**: کشمکشِ صاحبِ ضربِ کلیمؑ و فرعون و ہامان و قارون، بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی عبرت آموز داستان، حضرت عیسٰیؑ سے پہلے تک کے انبیاءؑ بنی اسرائیل کا تذکرۂ جلیلہ۔

(۵) **شعلۂ مستور**: حضرت عیسٰیؑ کی سوانح حیات اور آپ کی انقلاب آفریں تعلیم اور جدوجہد کا حقیقت کشا تذکرہ۔

(۶) **معراجِ انسانیت**: سیرتِ طیبہ حضور خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم۔

(۷) انسان نے کیا سوچا؟ } قرآنی تعلیم کے حقائق و معارف، عقلِ انسانی کے
(۸) اِسلام کیا ہے ؟ } پس منظر کی روشنی میں۔

اس سلسلہ کی آخری کڑی کا تعلق "حیاتِ آخرت" سے ہے جس کی طرف میں نے اکثر مقامات پر اشارہ کیا ہے۔ بعونہٖ تعالیٰ اس کا مسوّدہ تیار ہو چکا ہے اور بتوفیقِ ایزدی اس کے جلد شائع ہو جانے کی امید ہے۔ اس سے اس سلسلۃ الذہب کی تکمیل ہو جائے گی۔ (میری دیگر تصانیف بھی قرآنی تعلیم ہی سے متعلق ہیں لیکن اس مقام پر میں نے صرف سلسلۂ معارف القرآن کا ذکر ضروری سمجھا ہے جس کی ایک کڑی زیرِ نظر تصنیف ہے)۔

میں جب پیچھے مڑ کر ایک طرف اس طویل مسافت پر نگاہ ڈالتا ہوں اور دوسری طرف اپنی بے سر و سامانی کو دیکھتا ہوں، تو میرا سرِ نیاز بے ساختہ، بدرگاہِ ربّ العزّت جھک جاتا ہے جس نے مجھے ان حوصلہ آزما مراحل کے بہ حسن و خوبی طے کرنے کی ہمّت عطا فرمائی۔

آخر میں، میں اس حقیقت کو پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ یہ ایک انسانی کوشش ہے جس میں سہو و خطا کا بہر حال امکان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنی کسی تحریر کو بھی حرفِ آخر قرار نہیں دیا کرتا۔ میں نے اپنی بصیرت کے مطابق، سیرتِ نبی اکرمؐ کو قرآنِ کریم کے آئینے میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر یہ انداز مفید ثابت ہوا تو مجھ سے بہتر استعداد رکھنے والے حضرات، ان بنیادوں پر اس سے زیادہ حسین عمارت استوار کریں گے جس سے مجھے بڑی مسرت ہو گی۔

والسّلام

پرویز

۲۵/ بی، گلبرگ، لاہور

مئی ۱۹۶۳ء

پس منظر

مغرب ز تو بے گانہ، مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ در عالم نقشِ دگر انگیزی

"محمدِ عربی کی محیّر العقول کامیابی کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپؐ کے زمانہ میں دنیا کی جو حالت تھی، اس کا مطالعہ کیا جائے۔ آپؐ کی بعثت کے وقت حضرت عیسےٰؑ کی تشریف آوری کو بھی ساڑھے پانچ سو سے بھی زیادہ برس گزر چکے تھے۔ اس زمانہ میں یونان، روم اور بحیرہ روم کے گرد و پیش کی صدہا ریاستوں کے قدیم مذاہب سب اپنی توانائی کھو چکے تھے اور ان کی جگہ قیصریت ایک زندہ مسلک کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ سلطنت کی پرستش رومۃ الکبرٰی کا مذہب تھا اور سلطنت نام تھا بر سرِ اقتدار قیصر کا۔ یہ صحیح ہے کہ کچھ دوسرے مذاہب بھی موجود تھے لیکن ان کے لیے بھی ضروری ہو گیا تھا کہ اس مسلکِ جدید (قیصر پرستی) کو اپنے پہلو میں جگہ دیں اور اس حیثیت سے جگہ دیں کہ یہ مسلک بہرحال اُن پر غالب رہے۔ لیکن قیصر پرستی بھی انہیں مطمئن رکھنے میں ناکام رہی۔ مشرقی مذاہب اور توہمات (مصری، شامی اور ایرانی) بھی اکثر مقامات پر مقبول تھے اور ان کے ماننے والے کئی جگہ موجود، لیکن یہ مسالک و مشارب کئی حیثیتوں سے نفرت انگیز پستیوں میں گر چکے تھے (ایران میں) مذہب متِرا (مجوسیتِ جدیدہ) کی اٹھان عمدہ تھی اور ان سعید روحوں میں ہنوز مقبول تھا جن میں اسرارِ کائنات (کی تجسّس) کا جذبہ اور احساس باقی تھا کہ مافوق قوتوں کی پرستش محض رسومات کی ادائیگی کا نام نہیں لیکن اس کے لیے مشکل یہ تھی کہ یہ پارتھیا اور فارس کی رقیب سلطنتوں کے مذہب کی پیداوار تھا۔ شروع شروع میں عیسائیت نے قیصر پرستی سے مصالحت نہیں کی لیکن چوتھی صدی عیسوی میں یہ خود اس مسلک میں تبدیل ہو گئی اور وہ (اصلی) مذہبِ عیسائیت ختم ہو گیا جس کی تبلیغ شروع میں کی گئی تھی۔ اب یہ مذہب روحانیت سے خالی رسومات کا مجموعہ اور مادیت کا پیکر بن کر رہ گیا۔ رواداری کے بجائے احساسِ برتری اور احساسِ برتری کے بعد دیگر اہلِ مذاہب پر مظالم، یہ تھے اس تبدیلی کے مدارج۔ باقی رہی یہودیت، سو چھٹی صدی عیسوی میں اگر کسی کو کہیں "مجموعہ رسُومات" کی تلاش ہوتی تو وہ اسے اس مذہب میں پالیتا.....
(دنیائے مذاہب کو چھوڑ کر اگر تہذیب و تمدّن کے گوشوں کی طرف آئیے تو اس زمانہ میں) آرٹ پر افسردگی چھا چکی تھی اور عقل و دانش مُردہ ہو چکی تھی۔"

(PRINGLE KENNEDY -- Arabian Society at the time of MOHAMMAD -- PP. 9-17)

ظہورِ قدسی سے پہلے

پرنجل کینیڈی اور ان جیسے دیگر مؤرخین اور مفکرین کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ یہ سمجھنے کے لیے کہ نبیٔ اکرمؐ دُنیا میں کس قسم کا انقلاب لائے تھے، یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جس وقت حضورؐ دنیا میں تشریف لائے اس وقت دُنیا کی حالت کیا تھی۔ اُس انقلاب کی عظمت و اہمیت کا اندازہ لگانے کے لیے اِس قسم کا تقابل ضروری ہے۔

لطافت، بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

جہاں تک مذاہبِ عالم کا تعلق ہے، ہم اپنی کتاب، صحفِ آسمانی کی تاریخ میں اس حقیقت کو واضح کر چکے ہیں کہ اُس وقت، دنیا کے کسی مذہب کے پرستاروں کے پاس بھی، اُس مذہب کے بانی کی حقیقی اور منزّہ تعلیم موجود نہیں تھی۔ جس تعلیم کو وہ آسمانی راہ نمائی کہہ کر پیش کرتے تھے وہ انسانی خیالات کا مجموعہ اور عجیب و غریب قسم کی توہّم پرستیوں کا مرقّع تھی۔ اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اُس زمانے میں، دُنیائے تہذیب و تمدّن کی کیا حالت تھی۔ اس لیے کہ جو تعلیم نبیٔ اکرمؐ لائے تھے، اس کا مقصد خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلّق قائم کرنا نہیں تھا۔ اس سے مقصود انسانی معاشرہ کو نئے خطوط پر متشکّل کر کے یہ دکھانا تھا کہ انسان کس طرح اس دُنیا میں بھی جنّتی زندگی بسر کر سکتا ہے اور اس کے بعد کی دنیا میں بھی۔ اس دنیا میں انسانی معاشرہ کی کیفیت کو تمدّن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس لیے نبیٔ اکرمؐ نے جس جدید تمدّن کی بنیاد ڈالی تھی اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ اُس زمانے کی عام تمدّنی حالت کا جائزہ لیا جائے۔ اس مقصد کے لیے ہمیں، حضورؐ کے زمانہ، یعنی چھٹی صدی عیسوی تک پہنچنے کے لیے ذرا پیچھے سے چلنا پڑے گا۔ کیونکہ کسی خاص زمانہ کی تمدّنی زندگی کی پوری تصویر نمایاں ہو کر سامنے نہیں آتی جب تک اُس کا پس منظر بھی پیشِ نظر نہ ہو۔

تہذیب کے مؤرخوں کا خیال ہے کہ انسانی تہذیب کی ابتدا مصر سے ہوئی۔ جب اُس ملک کو سکندرِ اعظم

نے فتح کیا ہے تو اس وقت تک اس پر تیس (۳۰) خاندان حکمران ہو چکے تھے۔ اندازہ یہ ہے کہ سب سے پہلے خاندان

تہذیبِ مصر

کی حکومت قریب ۳۴۰۰ سال ق م شروع ہوئی لیکن مصر کے اثری انکشافات وہاں کی تہذیب کا سراغ اس سے بھی بہت پیچھے تک لے جاتے ہیں۔ چنانچہ حال کے مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ دنیا میں تقویم (کیلنڈر) کی ابتدا مصر سے ہوئی اور سب سے پہلا کیلنڈر[1] ۴۲۴۱ ق م میں مرتب ہوا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ملک، باقاعدہ خاندانوں کی حکومت سے بھی بہت پہلے، تہذیب و تمدن کی زندگی سے آشنا ہو چکا تھا۔ اہرامِ مصر میں سب سے بڑا اہرم (GREAT PYRAMID) شاہنشاہ خوفو (KHUFU) کا مقبرہ ہے جو چوتھے خاندان کا دوسرا بادشاہ تھا (اگرچہ اس سے پہلے اور بھی اہرام تعمیر ہو چکے تھے)۔ چنانچہ قیاس یہ ہے کہ ان اہرام میں سے (STEP PYRAMID) سب سے پہلا ہرم ہے جسے شہنشاہ زوسر کے لیے اس کے ماہرِ تعمیر (INHOTEP) نے تیار کرایا تھا۔ ہرمِ عظیم پر، ہیروڈوٹس کے بیان کے مطابق، ایک لاکھ مزدور بیس سال تک کام کرتے رہے جن کے صرف لہسن اور پیاز وغیرہ کے خرچ کا تخمینہ ساٹھ ستر لاکھ روپے سے کم نہیں ہوتا۔ اس زمانہ میں فنِ تعمیر، مصوری، طب، جراحت وغیرہ کے ماہرین فراعنۂ مصر کے درباروں میں موجود تھے۔ اٹھارہویں خاندان کے زمانہ میں (جو حضرت موسیٰؑ کا عہد ہے) بادشاہوں کے ساتھ مذہبی پیشواؤں (PRIESTS) کا اقتدار شروع ہو گیا۔ یہ اقتدار بیسویں خاندان کے زمانہ میں اوجِ کمال تک پہنچ گیا۔ چنانچہ اس وقت حکومت درحقیقت مندروں کے پجاریوں کے ہاتھ میں تھی۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔ ایوانِ حکومت میں "شمشیر و سناں" کی جگہ "طاؤس و رباب" نے لے لی اور ان پجاریوں کی ریشہ دوانیوں اور دسیسہ کاریوں نے ملک کی جمعیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اکیسویں خاندان (قریب ایک ہزار ق م) کے زمانہ سے انحطاط شروع ہو گیا اور جب چھٹی صدی ق م میں اہلِ فارس نے اس پر قبضہ کیا ہے، تو اس کے بعد، اس ملک کے ہر گوشے پر جمود و تعطل کی افسردگی چھا گئی اور زندگی کی وہ سرگرمیاں جنہوں نے اس شاہراہِ تہذیب پر قیادت کا شرف بخشا تھا، ہمیشہ کے لیے سرد ہو گئیں۔ چھٹی صدی عیسوی میں ان اہرام کے سوا جو اس کی عظمتِ رفتہ کے عبرت انگیز نقوش تھے، اس ملک کی تہذیب و تمدن کی زندگی میں کوئی شے قابلِ ذکر باقی نہ تھی۔

مصر کے بعد تہذیب کے دھارے کا رُخ دجلہ اور فرات کی وادیوں کی طرف مڑ جاتا ہے۔ ازمنۂ قدیمہ میں

---

[1] (History of the world, Edited by WEECH: P.377)

میں اس وادی کا شمالی حصّہ اکادی (AKKAD) کہلاتا تھا جس کا سب سے بڑا شہر بابل تھا اور جنوبی علاقہ سمیر (SUMER) جس میں کالڈیا یعنی (CHALDEA) اور اُر (UR) مشہور شہر تھے۔ اثری انکشافات نے اکادی اور کالدی تہذیب کے متعلق حیرت انگیز معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ تین ہزار ق م سے ان کی تہذیب کے عروج کے آثار دکھائی دینے شروع ہو جاتے ہیں۔ اُر (د) کا پہلا خاندان قریب ۳۱۰۰ ق م سے سامنے آتا ہے۔ اس زمانہ کی قبروں سے مصوری اور مرصع کاری کے عجیب و غریب نوادرات نکلے ہیں۔ تیسرے خاندان کا بانی (UR NAMU) (۲۲۷۸ ق م کے قریب) غالباً حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ کا نمرود تھا۔ اس کے بارہویں سنِ جلوس میں تمام اہلِ سمیر نے اس کے بیٹے (DUNGO) کو خدا تسلیم کر لیا۔ اس زمانہ کے بڑے بڑے مندروں کے کھنڈرات، زمین کے تہ خانوں سے برآمد ہوئے ہیں۔ اُن کے مکانات بالعموم دو منزلہ تھے اور ہر گھر میں قریب ۱۴ کمرے، ان کے باورچی خانے، پختہ آتش دان، غسل خانے، نالیاں، میزیں، پلنگ، تانبے اور مٹی کے برتن، قالین، کمبل وغیرہ ان کی تہذیب کے آئینہ دار ہیں۔ بادشاہ کی بڑی لڑکی، چاند دیوی کے مندر کی پجارن (HEAD PRIESTESS) ہوتی تھی۔ پجاریوں کا اثر وہاں بھی غالب نظر آتا ہے۔ ایک مٹی کی لوح پر کندہ عبارت سے پتا چلتا ہے کہ ایک پجاری کو قبر کے سرہانے دُعا پڑھنے کے معاوضے میں سات مٹکے شراب (۴۲۰) روٹیاں (۱۲۰) پیمانے غلّہ، ایک خلعت اور دیگر ضروریات کی چیزیں ملتی تھیں۔

کالڈیا کی تہذیب

اکاوی تہذیب میں، بابل کے پہلے خاندان کے چھٹے بادشاہ حماراَبی (۲۱۲۳ ق م) کے قوانین آج تک مشہور ہیں۔ یہ قوانین مٹی کی تختیوں پر کندہ کیے جاتے تھے۔ ان کی کثرت اور پہنائی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ زمین دوز کھنڈرات میں سے جو کچھ برآمد ہو سکا ہے ان میں سے قریب تیس ہزار تختیاں برٹش میوزیم میں جمع ہیں۔ اس کے قوانین عدل و مساوات پر مبنی دکھائی دیتے ہیں، اگرچہ اُن میں شدّت کا پہلو نمایاں ہے۔ مثلاً یہ کہ اگر کسی کا نو تعمیر شدہ مکان گر جائے تو معمار کو پھانسی دے دی جائے یا اگر کسی ڈاکٹر کے علاج سے کسی کا نوکر مر جائے تو وہ ڈاکٹر اپنے نوکروں میں سے ایک اس شخص کو دے۔

حماراَبی کے قوانین

تہذیب کے اس عروج و کمال کے بعد ان میں بھی ہبوط و زوال شروع ہو گیا۔ شاہی گھرانے عیش پرستی کی سیہ مستیوں میں کھو گئے۔ مندروں کی چار دیواریاں بد اخلاقی اور فواحش کاری کا اڈہ بن گئیں۔ نوبت بایں جا رسید کہ،

ہیروڈوٹس کے بیان کے مطابق، پانچویں صدی ق م میں، بابل میں ہر نوجوان لڑکی کو اپنے آپ کو کسی مندر میں کسی اجنبی سے ہم آغوش کرنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد اس کی شادی ہو سکتی تھی۔ چھٹی صدی ق م میں، فارس کے مشہور بادشاہ کیخسرو (ذوالقرنین) نے اس ملک پر قبضہ کر لیا اور چھٹی صدی عیسوی میں ان ٹھیکریوں کے سوا، جو اس ملک کی سطوتِ رفتہ کی داستان گو تھیں، ان کی تہذیب و تمدن کا کوئی نشان باقی نہ رہا۔

اشوری تہذیب

سمیری اور کالڈی تہذیب کے ساتھ ساتھ ان کی ہمسایہ سلطنت شوریا (ASSYRIANS) بھی ہمارے سامنے آتی ہے۔ اگرچہ "یہ تہذیب" اپنی سبعیت اور بربریت، سفاکی اور خوں ریزی کے لیے دنیا میں مشہور ہے لیکن، بایں ہمہ تاریخ تہذیب کے سلسلہ میں اشوری تہذیب کی کڑی بھی ایک نمایاں خصوصیت رکھتی ہے۔ بابل سے قریب دو سو میل جانب شمال، اشور (ASSHUR) کے شہر میں، (قریب ۳۰۰۰ ق م)، اس سلطنت کی بنیاد رکھی گئی۔ زمانۂ عروج میں اس کا دارالسلطنت نینوا تھا۔ سارگوند (SARGOND) جس نے یہودیوں کو تباہ و برباد کیا تھا، اس سلطنت کا بادشاہ تھا اور اسی قوم نے بابل کی اینٹ سے اینٹ بجائی تھی۔ اس قوم کے قوانین بڑے سخت اور وحشیانہ تھے۔ جنگ کے دیوتا اسور (ASSUR) اور زراعت کی دیوی اشتر (ISHTAR) کی پرستش خصوصیت سے ہوتی تھی۔ ساتویں صدی ق م میں اہلِ مادیا اور بابل کے ہاتھوں اس عظیم الشّان سلطنت کی تباہی ہوئی اور اب لندن کے عجائب گھر سے باہر ان کا نشان تک باقی نہیں۔

یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ بابل کو کیخسرو نے فتح کیا تھا۔ اس لیے اب تہذیب کے دھارے کا رخ فارس کی طرف مڑنا چاہیئے۔

خطۂ ایران

فارس اور مادیا کی الگ الگ سلطنتیں ایک زمانہ سے موجود تھیں، لیکن کیخسرو کے زمانہ (۵۵۸ تا ۵۲۸ ق م) میں یہ دونوں مل کر ایک عظیم الشّان سلطنت کی شکل میں صفحۂ تاریخ پر ابھریں۔ کیخسرو (ذوالقرنین) کی شخصیت جریدۂ عالم میں شہرتِ دوام حاصل کر چکی تھی۔ اس کے عہد میں فارس کی دولت اور سطوت نے برق رفتاری سے عروج حاصل کرنا شروع کیا اور دارا کے زمانہ (۴۸۵-۵۲۱ ق م) میں یہ اپنے انتہائی نقطہ تک جا پہنچی۔ الواحِ بہستون (BEHISTUN TABLETS) اس کی شوکت و ثروت اور جاہ و جلال کی شاہد ہیں۔ اس کے بعد سکندرِ اعظم کے حملہ (۳۳۳ ق م) نے فارس کی بڑھتی ہوئی ترقی کو روک دیا اور رفتہ رفتہ

ان میں انحطاط شروع ہو گیا۔ اس سے قریب ایک سو سال بعد (۲۴۹ھ ق م) میں پارتھین نے فارس میں ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ یہ سلطنت بھی تاریخ میں ایک ممتاز حیثیت لیے نظر آتی ہے لیکن سلطنتِ روما کے ساتھ ان کے پیہم تصادمات نے انہیں بہت کمزور کر دیا۔ ۲۱۲ء میں اردشیر نے، جس کی رگوں میں کیخسرو اور دارا کا خون موجزن تھا، عَلَمِ بغاوت بلند کیا اور پارتھین سلطنت کو ختم کر کے فارس میں ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو تاریخ کے صفحات پر ساسانی سلطنت کے نام سے مشہور ہے۔ اردشیر نے نہ صرف قدیم فارسی تہذیب و روایات ہی کو زندہ کرنے کی کوشش کی بلکہ مذہب زرتشت کو بھی از سرِ نو رائج کیا۔ لیکن یہ زرتشتی مذہب اصلی زرتشتی مذہب سے مختلف تھا۔ اب اس میں انسانی خیالات و معتقدات کی آمیزش اس حد تک ہو چکی تھی کہ حقیقی تصویر کے خط و خال پہچان ہی میں نہیں آسکتے تھے۔ ساسانی خاندان کے زمانہ میں فارس کی سلطنت پھر بڑی وسیع ہو گئی۔ مصر کی فتح نے ان کے حوصلے اور بھی بڑھا دیئے۔ خسرو (دوم) کے زمانہ میں ان کی فتوحات کا سلسلہ یروشلم کی مقدس دیواروں تک جا پہنچا (اگرچہ ۶۲۴ء میں، ہرقل نے صلیبِ مقدس کی بازیابی کے لیے ایران پر کامیاب حملہ کیا)۔ ظہورِ اسلام کے وقت ساسانی خاندان ہی ایران پر حکمران تھا لیکن اس وقت اس کی شوکت و عظمت کے محض افسانے باقی رہ گئے تھے۔ قوت کے انحطاط کے ساتھ ہی وہاں کی معاشرتی اور تمدنی حالت بھی انتہائی پستی تک پہنچ چکی تھی جیسا کہ ابھی ابھی کہا جا چکا ہے۔ اگرچہ وہاں نام کو مجوسیت (زرتشتیت) رائج تھی لیکن درحقیقت یہ وہ مذہب تھا جس کا قوام مانی نے مجوسیت اور مسیحیت کی آمیزش سے تیار کیا تھا اور جس کی بنیادیں رہبانیت یعنی ترکِ علائق، زاویہ نشینی اور گوشہ گیری کی زندگی تھی جس کا فطری نتیجہ یہ تھا کہ خانقاہیں اور آتش کدے بداخلاقی اور فحش کاری کے مراکز بن چکے تھے۔ عام معاشرتی حالت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ باپ کا اپنی بیٹی کو اور بھائی کا اپنی بہن کو بیوی بنا لینا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ (چنانچہ یزدگرد ثانی نے خود اپنی بیٹی سے شادی کی تھی)، وہاں پہلے ہی یہ کیفیت تھی۔ مزدکیت نے سمندِ ناز پہ اک اور تازیانہ دیا۔ اس "مذہب" کی رُو سے، (اس لیے کہ اسے مذہبی حیثیت سے ہی رائج کیا گیا تھا)، عورت سوسائٹی کی عام ملکیت سمجھی جاتی تھی اور وہ ہر شخص کے ساتھ شب باش ہو سکتی تھی۔ اگرچہ اس قسم کے "مذہب" کی ترویج کچھ حیرت انگیز سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن اس زمانہ کے اہلِ ایران اخلاق کی جس پستی تک پہنچ چکے تھے اس کے پیشِ نظر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا یہ مذہب ان کی مسخ شدہ فطرت ہی کی صدائے بازگشت تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کے عیش پرست امراء کے طبقہ میں اس مذہب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور خود بادشاہ (قباد) نے اس کی ترویج و اشاعت میں نمایاں

حصہ لیا۔ استبداد کا یہ عالم تھا کہ بادشاہ اور امراء کی پرستش ہوتی تھی۔ ان کے حضور سجدے کیے جاتے اور ان کی شان میں الوہیت کے گیت گائے جاتے تھے۔ مستبدانہ اور قاہرانہ اندازِ حکومت میں حریت اور مساوات کا تصور تک جرمِ عظیم ہوتا ہے۔ اس لیے ان لوگوں کی عام ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔ توہم پرستی اور جہالت زندگی کے ہر گوشے پر مسلط تھی۔ اہرمن نے اپنی نظرِ بد سے (99,999) چڑیلیں پیدا کر رکھی تھیں جو بیماریوں کے نقاب میں انسانوں پر مسلط ہوتی تھیں۔ غرضیکہ بقول سرجان ملکم ظہورِ اسلام کے وقت "فارس کی سلطنت عیش پرستی کے ہاتھوں لاغر و نحیف ہو چکی تھی۔ اندرونی مناقشات کی وجہ سے انتہائی بدنظمی پھیل چکی تھی۔ بیرونی محاربات نے اسے خستہ اور ناتواں کر دیا تھا اور اس طرح وہ قعرِ زوال کی طرف کشاں کشاں کھنچی جا رہی تھی۔"[۱] یہ تھی چھٹی صدی عیسوی میں ایران اور اس کی اس تہذیب کی حالت جو کسی زمانہ میں تاریخ کے صفحات پر روشنی کے مینار کی طرح چمک رہی تھی۔

تہذیبِ یونان

ہم دیکھ چکے ہیں کہ سکندرِ اعظم (یونانی) نے اپنی سلطنت فارس اور مصر تک پھیلائی۔ اس سے ہم یونانیوں سے متعارف ہوتے ہیں۔ لیکن یونانیوں کی تہذیب، سکندر کی فتوحات کے زمانہ سے بہت پہلے کی ہے۔ اس کا اولین سراغ قریب ۲۰۰۰ ق م سے ملتا ہے جب کریٹ (CRETE) کا جزیرہ ایک ممتاز تہذیب کا گہوارہ تھا۔ ۱۶۰۰ ق م کے قریب وہاں کی تہذیب اپنے نقطۂ عروج تک جا پہنچی تھی۔ ٹرائے (TROY) کا محاصرہ جس کی دلچسپ تفاصیل ہومر کی نظموں سے حیاتِ جاوید حاصل کر چکی ہیں، اسی زمانہ سے متعلق ہے۔ اس کے بعد یونانی تہذیب کا مرکز ایتھنز قرار پایا جہاں ۶۰۰ ق م کے قریب سولن (SOLON) جیسے مدبر کی اصلاحات ہمارے سامنے آتی ہیں۔ یہ تہذیب پانچویں اور چوتھی صدی ق م میں اپنے معراجِ کمال پر پہنچی جب یونان علم و حکمت اور سیاست و فراست کا گہوارہ قرار پا گیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں جہاں ایک طرف (SOPHOCLES) جیسا ادیب، ڈرامہ کی دنیا میں ایسے شاہکار پیش کرتا ہے جن کی شگفتگی اور شادابی میں آج تک فرق نہیں آیا تو دوسری طرف ہمیں (THUCYDIDES) اور (HERODOTUS) جیسے مؤرخ دکھائی دیتے ہیں جن کی وقائع نویسی اس زمانہ کی متمدن دنیا کی زندہ ترجمان ہے۔ فنِ تعمیر میں دیکھیے تو "معبدِ دوشیزہ" (TEMPLE OF VIRGIN) جیسے نادر نمونے ہمارے سامنے آتے

[۱] تاریخِ ایران جلد اول

ہیں اور مجسمہ سازی کی طرف آئیے تو یقیناً کے مہیب، کوہ آسا فلزائی پیکر سے لے کر، حسن کی دیویوں کے نفیس و نازک سرمریں تماثیل تک، نادرہ کاری اور اعجاز نگاری کی خاموش داستانیں دنیا کے سامنے موجود ہیں علم و حکمت کی درس گاہوں میں جائیے تو سقراط (SOCRATES) المتوفّی ۳۹۹؁ ق م، افلاطون (PLATO) المتوفّی ۳۴۷؁ ق م اور ارسطو (ARISTOTLE) المتوفّی ۳۲۲؁ ق م جیسی شخصیتیں دکھائی دیتی ہیں جن کی شہرت کو مرورِ زمانہ ذرا بھی متاثر نہیں کر سکا۔ یونان سے نکل کر مصر کی طرف آئیے تو وہاں سکندر کے سپہ سالار بطلیموس (PTOLEMY) نے ایک نئی سلطنت کی طرح ڈالی جو علم و حکمت کے میدان میں بجائے خویش ایک دوسرا "یونان" بن گئی۔ اقلیدس (EUCLID) جیسا ریاضی دان اور ارشمیدس (ARCHIMEDES) جیسا سائنس دان اسی دور کی پیداوار ہے۔ اسکندریہ کی لائبریری جو عیسائی احبار و رہبان کے ہاتھوں نذرِ آتش ہوئی، اپنی نظیر آپ تھی۔

لیکن یہ سب کچھ پہلی صدی ق م سے پہلے پہلے ہو گزرا۔ ۳۱؁ ق م میں یونانی علم و حکمت اور ثروت و سطوت کی شمعِ فروزاں، قلوپطرہ کی خودکشی کے ساتھ بجھ گئی اور اس کا ترکہ سلطنتِ روما کی طرف منتقل ہو گیا۔ لہٰذا چھٹی صدی عیسوی میں، جس تک پہنچنے کے لیے ہم ان تمام وادیوں اور شاہراہوں سے گزر رہے ہیں، یونان کے فلسفہ اور حکمت کے نقوش، کتابوں کی دفتین سے باہر کہیں دکھائی نہیں دیتے تھے۔

اب ہمیں روم کی طرف چلنا چاہیئے۔ لیکن توسنِ فکر کا رُخ اس طرف موڑنے سے پہلے، یونانی تہذیب کے ایک اور گوشے کو بھی سامنے لے آنا ضروری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یونان میں علم و حکمت کی روشنی اتنی تیز ہے کہ ان سے نگاہوں میں خیرگی پیدا ہو جاتی ہے لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ برقائم ہے کہ اس تمام روشنی میں خدا کا منزہ اور حقیقی تصور کہیں نہیں ملتا۔ عین اس دور میں جب سقراط اور افلاطون، رموزِ کائنات کی عقدہ کُشائیوں میں مستغرق دکھائی دیتے ہیں، پورا یونان ہزاروں دیوی دیوتاؤں کے معبدوں میں اپنے ہاتھوں کے گھڑے ہوئے پتھروں کے سامنے سجدہ ریز نظر آتا ہے۔ اصنامیاتِ یونان کے دل کش افسانے، ان ہی دیوی دیوتاؤں کی رنگین داستانیں ہیں۔ ۴۸۰؁ ق م میں جب یونان میں حکمت اور تمدن اپنے اوج پر تھا، یہ شاہی حکم بھی وہاں موجود تھا کہ "ہر فصل کا پہلا پھل (ELASIS) کے مندر پر بطور چڑھاوا چڑھایا جائے۔"

اصنام پرستی کا لازمی نتیجہ توہّم پرستی ہے۔ اس لیے وہاں زندگی کا کوئی قدم، شگون لیے بغیر نہیں اٹھتا تھا۔ جب یونانیوں کی فوج صقلیہ پر حملہ کرنے کے لیے نکلی ہے تو اُس کا جرنیل اس لیے آگے بڑھنے سے رک گیا

کہ اس رات چاند گرہن تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کی فتح بہت بری شکست میں بدل گئی اور تباہی و بربادی نے سارے یونان کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ پھر، یہی وہ یونان تھا جس کے افلاطون اور زینو (ZENO) نے دنیا کو وہ تصوف دیا جس نے خونِ رگِ کائنات کو سرد ہی نہیں، منجمد کر کے رکھ دیا اور جس کے فلسفۂ ترک و تعطل نے انسانوں کی چلتی پھرتی دنیا کو پتھروں کی بستی بنا دیا اور اس کا اثر آج تک کم نہیں ہوا (حتیٰ کہ مسلمانوں جیسی قوم بھی، جس کے پاس عمل و حرکت اور قوت و حرارت کا قرآن جیسا چشمۂ سرمدی موجود ہے، ان برف کی سلوں کی اثر اندازی سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکی اور اس موت کو عینِ حیات سمجھ کر خود فریبی و خود فراموشی کی "کوکناری جنت" میں محوِ خواب ہو گئی)۔

مذہبی دنیا سے نیچے اُتر کر سیاسی دنیا کی طرف آئیے تو وہاں بھی یونانی تدبر کوئی صحیح راہِ زندگی متعین نہیں کر سکا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ یونان اپنے آئینِ جمہوریت کے لیے دنیا میں مشہور ہے لیکن یہ وہی جمہوری نظام تھا جس میں غلامی جیسی غیر جمہوری، بلکہ غیر انسانی لعنت، زندگی کا عام معمول تھی اور اس کی پہنائیوں کا یہ عالم تھا کہ ایک لاکھ یونانیوں کے لیے تین لاکھ پینسٹھ ہزار غلام موجود تھے۔ "مساوات" کی یہ کیفیت تھی کہ ارسطو جیسا مصلح اپنی کتاب "سیاست" میں لکھتا ہے۔

> فطرت کا منشاء یہ ہے کہ تمام غیر یونانی، یونانیوں کے غلام ہوں۔
>
> (POLITICS -- BOOK, 1 -- CHAPT. 7)

عالمِ اخلاقیات میں جو حالت تھی اس کا اندازہ (MHAFFY) کے اس ایک ریمارک سے لگ سکتا ہے جو اُس نے اپنی کتاب (SURVEY OF GREEK CIVILISATION) میں دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

> جن اقوام کو اُن سے واسطہ پڑا، ان میں یونانیوں کی بد دیانتی ضرب المثل تھی۔

ان کے اصنامیات میں یوں تو عورتوں کو دیویوں کی حیثیت حاصل تھی لیکن ان کی سوسائٹی میں عورت کی جو حیثیت تھی اس کے متعلق (G.L. DICKENSEN) رقمطراز ہے۔

> اس عہد میں عورتوں کا درجہ مردوں سے اس درجہ کمتر تھا کہ عورت کا مقصد سوائے شہوت رانی اور بچہ کشی کے اور کچھ نہیں سمجھا جاتا تھا۔
>
> (THE GREEK VIEW OF LIFE -- P.169)

پھر، جیسا کہ ہر فلسفیانہ تعلیم کا خاصّہ ہے، حکمتِ یونان بھی محض نظری مسائل تک محدود تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یونان میں کوئی اہم صنعتی ایجاد نہیں ہو سکی۔ ان کے حکماء کی بھی یہ کیفیت تھی کہ اپنی اپنی فکر گاہوں کی خلوتوں میں نظری مسائل کی موشگافیوں میں محو رہتے اور مشاہدات و تجربات کی دنیا سے کچھ واسطہ نہ رکھتے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ارسطو جیسا حکیم، باآں ہمہ علم و حکمت، اس قسم کے عقاید رکھتا تھا کہ تمام حیوانات میں صرف انسان کا دل حرکت کرتا ہے۔ مرد کے منہ میں عورت سے زیادہ دانت ہوتے ہیں۔ انڈا سمندر میں تیرتا ہے وقس علیٰ ہذا۔ اسی لیے راجر بیکن، جس نے مسلمانوں سے استقرائی اندازِ تحقیق سیکھا، کہا کرتا تھا کہ ارسطو کی تمام کتابیں نظرِ آتش کر دینے کے قابل ہیں۔

اب چلیے رومن تہذیب کی طرف۔ ہمارے موضوع کے اعتبار سے اس تہذیب کو اس لیے خاص اہمیت حاصل ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت یہی تہذیب تھی جس کا مسکن عرب سے ہمکنار تھا۔ قریب ۱۲۰۰ء ق م

رومتہ الکبریٰ

میں، جب کریٹ (CRETE) کی سلطنت کا شیرازہ بکھرا، تو وہاں کی آبادی کا ایک حصہ اٹلی کی طرف منتقل ہو گیا جہاں پہنچ کر انہوں نے، وہاں کے قدیمی باشندوں سے مل کر ایک جدید سلطنت کی بنیاد ڈالی جو بعد میں سمائے تاریخ پر رومن امپائر (رومتہ الکبریٰ) کا درخشندہ ستارہ بن کر چمکی۔ وہاں کے قدیم باشندے زراعت پیشہ تھے اس لیے ہندوستان کے قدیم آریوں کی طرح وہ بھی بارش، ہوا، سورج، آگ وغیرہ کی پرستش کرتے تھے۔ ۷۵۳ء ق م کے قریب روم کا شہر آباد ہوا جو رفتہ رفتہ رومن تہذیب کا مرکز بن گیا۔ اس سلطنت کی شوکت و جلال کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس کے ایک بادشاہ (CAESAR) کا نام دنیا کی لغت میں لفظ شاہنشاہ کا مرادف ہو گیا۔ چنانچہ آج بھی جب لفظ قیصر بولا جاتا ہے تو اس سے ذہن ۴۹ء ق م کے کسی خاص بادشاہ کی طرف منتقل نہیں ہوتا بلکہ شاہنشاہ کا عام مفہوم نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اسی قیصر کا جانشین شہنشاہ آگسٹس تھا جس کی سیاست کی اسٹیج پر حسنِ قلوپطرہ کی داستانِ رنگین کا آخری کھیل کھیلا گیا اور یوں، یونان کی تہذیب کے آثار بقایا روم کی طرف منتقل ہو گئے۔ یہی وہ عہد تھا جس میں (HORACE) اور (VIRGIL) جیسے شعراء پیدا ہوئے۔ یہیں سے دو قدم آگے بڑھ کر نیرو (NERO) المتوفی ۶۹ء جیسے مستبد حکمران کا عہدِ آتش بار و عالم سوز سامنے آتا ہے۔

اب ہم پہلی صدی عیسوی تک آپہنچے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں رومن تہذیب کی تاریخ میں ایک بہت بڑا موڑ آتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب رومتہ الکبریٰ کا دماغ ایک عالمگیر سلطنت کے حسین تصور سے سامان

صد ہزار چراغاں کیے ہوئے تھا اور (PHILIPSON) کے الفاظ میں، انہیں زعم تھا کہ "تمام کرۂ ارض کے مالک رومن ہیں۔"

(INTERNATIONAL LAWS AND CUSTOMS -- VOL.I, P.109)

عین اس زمانہ میں پولوس (ST. PAUL) کی مخترع عیسائیت، چپکے سے روم میں داخل ہو گئی اور آہستہ آہستہ اس درجہ اثر انداز ہو گئی کہ ۳۲۳ء میں شاہنشاہ قسطنطین (CONSTANTINE) نے اسے سلطنت کا مذہب قرار دیا۔ سطح بین یا یوں کہیے کہ جذبات سے متاثر مؤرخ اس واقعۂ عظیم (یعنی عیسائیت کے اثر و نفوذ) کو نہایت مبارک انقلاب قرار دیتے ہیں لیکن جن مؤرخین کی نگاہیں حوادثِ زمانہ کو ان کی گہرائیوں میں اُتر کر دیکھتی ہیں، وہ اس حقیقت کے اعتراف میں تامّل نہیں کرتے کہ یہی "مبارک انقلاب" "درحقیقت رومۃ الکبریٰ کے انحطاط و سقوط کا باعث ہوا۔ چنانچہ (BRIFFAULT) لکھتا ہے کہ:

عیسائیت کا اثر

روم اپنی ہستی کے بقا کے لیے مشرق کے ساتھ موت و حیات کی لڑائی لڑتا رہا اور یونان کی طرح اس نے مشرق کو بالآخر زیر بھی کر لیا۔ لیکن مشرق بھی اپنا انتقام لیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اور یہ انتقام یونان کے مقابلہ میں کہیں زیادہ نمایاں اور مکمل تھا۔ جس سال روم کو ہنی بال پر فتح عظیم حاصل ہوئی ہے، عین اسی سال "خدائی بادشاہت" کا ہراول دستہ روم کی چار دیواری میں داخل ہو گیا اور وہاں اپنے قدم جما لیے... بس اسی دن سے کالڈیا کے نجومی، مصر کے شعبدہ باز، یہودی علماء اسرار و بواطن، ایرانی جادوگر، شامی فسوں ساز، ہندی فقیر، لشکر در لشکر اور فوج در فوج یورش کرتے آ گئے تاکہ اس عالمِ بآغوش شہر پر اپنا تسلط جما لیں۔

(THE MAKING OF HUMANITY -- P.155)

یہی وہ اجمال ہے جس کی تفصیل آپ کو گبن کی "تاریخ زوال و سقوطِ سلطنتِ روما" کی آٹھ مبسوط جلدوں میں ملے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ عیسائیت کی وہ تعلیم جس کی اختراع و ترویج پولوس کی رہینِ منت ہے، تہذیب و تمدن، علم و حکمت، شوکت و ثروت، عمرانیت و معاشرت، غرضیکہ انسانیت کے ہر روشن پہلو کے لیے زہرِ قاتل کا حکم رکھتی ہے اور جس معاشرہ میں یہ تعلیم سرایت کر جائے اس کا زوال لابدی اور اس کی موت یقینی ہے۔ یہی وہ خطرہ

تھا جس کی بناء پر یورپ نے مذہب کو گرجا کی چار دیواری میں محدود کر کے رکھ دیا تاکہ اسے زندگی کے کسی معاملہ سے کچھ واسطہ نہ رہے۔

بہرکیف، یہ تھا وہ انقلاب جو پہلی صدی عیسوی میں رومن تہذیب کے حصار میں در آیا۔ شاہنشاہ قسطنطین روم کو چھوڑ کر بازنطین کی طرف منتقل ہو گیا اور قسطنطنیہ کو اپنا دار السلطنت قرار دے دیا۔ رومن سلطنت کی یہ شاخ دنیا میں بازنطینی حکومت کے نام سے روشناس ہوئی۔ یہی وہ حکومت تھی جو اسلامی انقلاب کے منہ آئی جب اس کی زمامِ اختیار ہرقل (HERACLIUS) کے ہاتھوں میں تھی۔ رومۃ الکبریٰ (اور بازنطینی حکومت) کے زوال و سقوط کے اسباب کے متعلق مؤرخین نے بڑی کد و کاوش کی ہے اور اس موضوع پر بڑی بڑی ضخیم کتابیں وجود میں آ چکی ہیں، لیکن ان تمام تحقیقات کا نچوڑ ایک لفظ میں سمٹ کر آ گیا ہے جسے فساد (CORRUPTION) کہا گیا ہے۔ یہ فساد، اعیانِ حکومت اور اربابِ مذہب' دونوں میں پیدا ہو گیا تھا اور یہی اس کی تباہی و بربادی کا بنیادی سبب ہوا لیکن یہ فساد کہیں باہر سے نہیں آیا تھا بلکہ اُس بُنیاد میں داخل تھا جس پر اس تہذیب کی فلک بوس عمارت قائم تھی، یعنی اس کی تعمیر میں خرابی کی صُورت مضمر تھی۔ (BRIFFAULT) کے الفاظ میں:۔

فساد

> رومۃ الکبریٰ کے زوال و تخریب کا بنیادی سبب کوئی بتدریج بڑھنے والا فساد نہ تھا، بلکہ وہ فسادِ منشہ اور حقائق سے عدم توافق کا نقص تھا جو اس تہذیب کی بنیاد اور ہستی میں موجود تھا۔ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصُولوں پر رکھی گئی ہو، کبھی قائم نہیں رہ سکتا خواہ اس باطل نظام کو کتنے ہی تدبّر اور دانش مندی سے کیوں نہ چلایا جائے۔ اس کی بنیادی کمزوری، خارجی نظم و ضبط اور اِدھر اُدھر کی جزئی مرمّت سے کبھی رفع نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس کی اصل باقی ہے' اس کے لیے تباہی مقدّر ہے۔ روما کی سلطنت عوام کو لُوٹ کھسُوٹ کر خواص کو متموّل بنانے کا ذریعہ تھی۔ انہوں نے اس "سوداگری" کو نہایت قابلیت اور تدبّر، خلوص اور دیانت سے چلایا لیکن (حسنِ انتظام کی) یہ تمام خوبیاں، بنیادی باطل کو اس کے فطری نتائج سے نہ بچا سکیں۔ غلط بنیادوں کے اثرات بلا رُو رعایت نتیجہ خیز ہو کر رہے۔

(THE MAKING OF HUMANITY -- P.159)

غلط بنیادوں پر اُٹھی ہوئی تہذیب کا نتیجہ تھا کہ رومیوں کی ترقی کے انتہائی عروج کے زمانہ میں بھی،

زندگی ایک الجھاؤ بن چکی تھی، برق رفتار لیکن بے سکون، فوری تغیرات سے معمور،
انتہا درجہ تک غمناک اور اندوہ گین، مبتلائے کشاکش، بے پناہ خواہشات اور
پھر مایوسیاں اور ناکامیاں۔ (صفحہ ۱۵۵)

یہ تو تھی اصل — اور اس کے برگ و بار؟

سرکاری حکّام، انتظامِ سلطنت میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ اس لیے کہ پیہم
خانہ جنگیوں کی وجہ سے انہیں اپنے مستقبل کے متعلق کبھی اطمینان نہیں ہوتا تھا۔
وہاں کسی شے کو ثبات ہی نہ تھا۔ لہٰذا ان کے نزدیک کرنے کا کام صرف یہ تھا
کہ قوت یا فریب سے، جس طرح بھی ہوسکے، دولت اکٹھی کر لی جائے اور جب تک یہ
سلسلہ چل سکے، اسے (اپنی کامرانیوں پر) صرف کیا جائے۔

(HISTORY OF THE WORLD EDITED BY WEECH -- P.230)

اس فساد کا نتیجہ یہ تھا کہ

رومن حکومت، مخالفین کی نظروں میں روز بروز کمزور اور خود اپنی رعایا کی نگاہوں
میں ظالمانہ اور ناقابلِ برداشت ہوتی چلی جارہی تھی ...... جس نسبت سے رعایا
کے مصائب روز افزوں تھے اسی نسبت سے ٹیکسوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا تھا۔

(GIBBON -- DECLINE AND FALL)

اور حالت یہاں تک آپہنچی تھی کہ

اگر اس وقت روم کے تمام بیرونی وحشی مخالفین فنا بھی ہو جاتے، تو ان کی فنا بھی
سلطنت کے مغربی بازو کو زوال اور تباہی سے نہیں بچا سکتی تھی۔ (ایضاً)

یہ تو تھی "مغربی بازو" (سلطنتِ روم) کی حالت! مشرقی بازو (بازنطین) کی کیفیت یہ تھی کہ۔

اس تہذیب نے انسانیت کے نشوو ارتقاء میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ یہ تہذیب
ارتقائے انسانیت کی جوئے رواں سے بالکل باہر رہی۔ تہذیب کیا تھی؛ فقط اسلاف کا

تبرک، ایک ممی شدہ بقیہ، ناکامی (کا مجموعہ)۔ اس ہزار سالہ عہد میں یہ تہذیب ترقی اور زندگی کا کوئی خفیف ساشعلہ بھی تو پیدا نہ کرسکی۔ اس کے گردان انسانوں کا ہجوم تھا جو (جہالت کی) تاریکیوں سے نکلنے کے لیے المدد المدد پکارتے تھے، لیکن اس نے نہ انہیں کچھ سکھایا نہ خود ہی کچھ سیکھا.... اس کے چہرے پر بظاہر تہذیب کا غازہ جلوہ بار تھا، لیکن اس کے نیچے پوری وحشت اور بربریت پوشیدہ تھی — وہ بربریت جو عہد بہ عہد زیادہ سے زیادہ تر ہوتی چلی گئی ......

وحشیانہ مظالم کی یہ کیفیت تھی کہ آنکھیں نکلوا دینا، زبان کٹوا دینا، مختلف اعضاء کی قطع و برید کر دینا، سُولی پر لٹکا دینا یا زندہ جلا دینا، عام سزائیں تھیں ....

باسل دوم نے پندرہ ہزار جنگی قیدیوں کی آنکھیں نکلوا دیں اور صرف ایک فی صد باقی چھوڑیں۔ (تاکہ وہ وحشت و سبعیت کا یہ تماشا دیکھ سکیں ص ۱۷۷ تا ص ۱۸۱)۔

یہ تھی وہ تہذیب جو ظہورِ اسلام کے وقت، دنیا کی سب سے درخشندہ اور تابناک تہذیب قرار دی جاتی تھی۔ وہ تہذیب جس نے

"ان ممالک (مثل روس اور بلقان) کو جو اس سے اثر پذیر ہوئے، وہ عناصر عطا کیے جو ان کی تہذیب کے نہیں بلکہ بربریت کے اجزاء بنے" (ایضاً ص ۱۸۲)

لیکن ان سیاسی اور تمدنی خرابیوں سے کہیں بڑھ کر وجۂ فساد وہ خرابیاں تھیں جو وہاں مذہب کے راستے داخل ہوئیں۔ یونان کے اصنام و اوثان اور توہمات و مزخرفات، ایک ایک کر کے رومیوں کے ہاں منتقل ہو کر آ چکے تھے.

مذہبی دُنیا

جب عیسائیت آئی تو سینٹ پال کی وساطت سے یہ تمام مجموعۂ خرافات اس جدید مذہب کا سرمایہ قرار پا گیا۔ یہ کس طرح ہوا؟ اس کی مختصر سی تفصیل، ڈریپر کے الفاظ میں سنیئے۔ وہ لکھتا ہے :-

اگرچہ عیسائی جماعت اس قدر قوی ہو چکی تھی کہ جس شخص کو اس نے اپنے مفیدِ مطلب سمجھا اسے تخت پر بٹھا دیا، لیکن یہ قدرت اسے پھر بھی حاصل نہ ہوئی تھی کہ اپنے حریف یعنی بُت پرستی کا استیصالِ کلی کر سکے۔ دونوں کی باہمی کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے اصول شیر و شکر ہو گئے اور ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا جس میں

بُت پرستی اور عیسائیت کی شاخیں پہلو بہ پہلو جلوہ گر تھیں۔عیسائیت اور اسلام میں اس باب میں بڑا فرق یہ ہے کہ اسلام نے اپنے مدِمقابل کو مطلقاً نیست و نابود کر دیا اور اپنے عقاید کو بلاکسی آمیزش کے شائع کیا..... جوں جوں زمانہ گزرتا گیا وہ مذہبی عقاید جن کی تفصیل ٹرٹلین نے بیان کی ہے ایک عام پسند مگر پایۂ اخلاق سے گرے ہوئے مذہب کی شکل اختیار کرتے گئے۔ان عقاید میں قدیم یونانی اصنام پرستی کا عنصر مخلوط ہوگیا۔اولمپس وہی پہلا سا پھر وجود میں آگیا صرف دیوتاؤں کے نام بدل دیئے گئے۔عقیدۂ تثلیث قدیم مصری روایات کے سانچے میں ڈھال لیا گیا...... چنانچہ فاسٹس نے قیصر آگسٹائن سے برملا ان ملامت آمیز الفاظ میں خطاب کیا۔

تم میں اور بُت پرستوں میں کیا فرق باقی رہا۔اگر فرق ہے تو بس اتنا کہ تمہاری جماعت علٰحدہ ہے اور ان کی جماعت علٰحدہ، ورنہ افعال دونوں کے ایک ہی ہیں۔

(CONFLICT BETWEEN RELIGION AND SCIENCE)

ذرا آگے چل کر یہی مصنف لکھتا ہے:۔

اس مقام پر تھوڑی دیر کے لیے رُک کر ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ عیسائیت کے ساتھ بُت پرستی کے شامل کر دینے کی اس چال نے بالآخر لوگوں کو انحطاطِ عقلی کے کس طبقۂ اسفل تک پہنچا دیا۔بُت پرستی کی رسمیں اختیار کر لی گئیں۔پرستش کے نمائشی اور بھڑکیلے طریقے جاری ہوگئے۔پادریوں نے پُرتکلف لباس، ٹوپیاں اور تاج پہننے شروع کر دیئے۔کافوری شمعیں، سونے چاندی کے گلدان، مراسم مذہبی کے لوازم میں داخل ہوگئے۔عبادت میں براتوں کے جلوس کی سی دھوم دھام نظر آنے لگی۔قربانی کے ذریعے پاکیزگیٔ نفس ہونے لگی۔رومی بُت پرست کاہنوں کی جادو کی چھڑی، عیسائی اُسقُف کی حکومتِ ملّی کا عصا بن گئی۔گرجے شہداء کے مزاروں پر بنائے جانے لگے اور ان کی تطہیر و تقدیس ان رسموں کے ذریعے ہونے

لگی جو سلف میں بُت پرست پجاریوں کے ہاں رائج تھیں۔ جھوٹ سچ، جہاں کہیں کسی شہید کے کچھ آثار بہم پہنچ گئے فوراً اُن کی یادگار میں میلے اور عرس قائم کر دیئے گئے۔ خدا کے غضب کو فرو کرنے اور آسیب اُتارنے کا سب سے بڑا ذریعہ فاقہ کشی قرار دیا گیا۔ بیت المقدس اور شہداء کے مزاروں کی زیارت وطواف کے لیے لوگ ہزار ہا کوس چل کر جاتے تھے۔ بیت المقدس سے منوں خاک ڈھو لا کر لوگ موتیوں کے مول بیچتے تھے اور اس مٹی کو شیطان کے دفعیہ کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ دَم کیے ہوئے پانی کے اوصاف وخواص میں تو کسی کو کلام ہی نہ تھا۔ مورتیں اور تبرکات گرجاؤں کے لوازم تھے اور خوش عقیدہ لوگ بتوں کی طرح ان کو بھی پوجتے تھے۔ جس طرح زمانۂ سابق میں بُت پرستوں نے بعض مقامات کو خوارقِ عادات اور معجزات کے لیے مخصوص کر رکھا تھا، اسی طرح خاص خاص مقامات عیسائی دنیا میں بھی اعجاز وکرامات کے مرکز قرار دیئے گئے۔ عیسائیوں کی نجات یافتہ روحوں کو حاضرات کے طریقہ پر طلب کیا جاتا تھا اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ روحیں اطرافِ عالم میں بھٹکتی پھرتی ہیں یا اپنے مقابر کے اوپر منڈلا رہی ہیں۔ مندروں اور قربان گاہوں کی تعداد خارج از حد وشمار تھی۔ توبہ اور ازالۂ معصیت کے لیے خاطی کو جو تکلیف دہ اور ایذا رساں لباس پہننا پڑتا تھا، اس کی بہت سی قسمیں تھیں۔ حضرت مریمؑ کی عیدِ تطہیر کا تیوہار اس غرض سے قائم کیا گیا کہ جو بُت پرست نئے نئے عیسائی ہوئے تھے ان کے دلوں سے بین دیوتا کے یومِ جشن کے منسوخ ہونے کی کھٹک جاتی رہے۔ مورتوں، صلیب کے ٹکڑوں، ہڈیوں کیلوں اور دوسرے تبرکات کی پرستش عام رواج پا گئی، گویا اچھی خاصی جماد پرستی رائج ہو گئی۔ ان آثارِ متبرکہ کی تصدیق کا انحصار براہین پر تھا، یعنی پادریوں کے حکم یا معجزات کے اظہار پر اولیاء کے پھٹے پرانے کپڑوں اور ان کی قبروں کی خاک تک متبرک سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ فلسطین سے کچھ بوسیدہ ہڈیاں لائی گئیں اور ان کی نسبت بوثوق تمام یہ مشہور کیا گیا کہ یہ حضرت مرقس اور حضرت جیمس اور دوسرے

اولیائے عہدِ سابق کے آثارِ جسمانی ہیں۔ بُت پرستی کے زمانہ میں انسان کو دیوتا بنا دیا جاتا تھا۔ عیسائیوں نے اسے ولی کر دکھایا کہ اس کا تصرف بھی معاملاتِ انسانی میں ربّانی مداخلت سے کسی طرح کم نہ سمجھا جاتا تھا۔ مقامی دیوتاؤں کی جگہ مقامی پیر اور اولیاء قائم ہو گئے۔ اس کے بعد عشائے ربّانی کی پُراسرار رسم کا ظہور ہوا جس کا مطلب یہ ہے کہ پادری کے عمل سے روٹی اور شراب مسیح کے گوشت اور خون کی صورت میں منتقل ہو جاتی ہے۔ مُرورِ زمانہ نے عیسائیت اور بُت پرستی کے اس الحاق کو اور زیادہ کامل اور مکمّل کر دیا۔ نئے نئے تیوہار منائے جانے لگے، جن میں سے ایک تو اس برچھے کی یادگار میں قائم کیا گیا تھا جس سے حضرت عیسیٰؑ کے پہلو میں چرکا دیا گیا تھا۔ ایک ان میخوں کی یاد تازہ رکھنے کے لیے قائم کیا گیا تھا جن سے آپ کا جسم صلیب میں جڑ دیا گیا تھا اور ایک سے کانٹوں کے اس تاج کی یاد کو تازہ رکھنا مقصود تھا جو مصلوب کرتے وقت آپ کو پہنا دیا گیا تھا۔ اگرچہ بیسیوں خانقاہوں میں کانٹوں کا یہ بے بہا تاج موجود تھا، لیکن زمانہ کا یہ رنگ تھا کہ کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ سب کے سب تاج اصلی ہوں۔

گبنؔ اس باب میں رقمطراز ہے:۔

ساتویں صدی کی عیسائیت نہایت غیر معقول طریق پر عہدِ تاریک کی یادگار بن کر رہ گئی تھی۔ وہ پرانے تبرکات اور ان مجسّموں سے اپنی مرادیں مانگتے تھے جو مشرق میں کلیساؤں کے لیے باعثِ عار تھے۔ خدا کے جلال کا تخت ولیوں، شہیدوں اور فرشتوں کے بادلوں میں گھر چکا تھا جو عوام کی عقیدت کا مرکز تھے۔ تثلیث اور الوہیت کے مسئلے خدا کی توحید کی کھُلی ہوئی تردید کر رہے تھے .... چھ سو برس تک بائبل ان کے لیے صداقت اور نجات کا راستہ بنی رہی لیکن اب عیسائیوں نے بائبل کے قوانین اور حضرت مسیحؑ کے مسلک دونوں کو بُری طرح فراموش کر دیا۔

(جلد ششم صفحہ ۲۹۶ - ۲۸۷)

یہ تھی وہ "آسمانی روشنی" جو اس زمانہ میں عیسائیت کے نام سے دنیا میں پھیلائی جا رہی تھی۔ فرقہ بندیوں اور گروہ سازیوں نے ان عیسائیوں میں اختلافات و منافشات کو اس درجہ شدید کر رکھا تھا کہ ذرا ذرا سے اختلاف پر قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو جاتا تھا۔ (SALE) اپنے ترجمۂ قرآنِ کریم کے مقدمہ میں لکھتا ہے:

"گرجا کے پادریوں (CLERGY) نے مذہب کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے اور امن، محبت اور نیکی کو مفقود کر دیا تھا۔ اصل مذہب کو بھول گئے تھے اور اس کے متعلق اپنی خیال آرائیوں پر جھگڑتے تھے، اسی تاریک زمانہ میں اکثر وہ توہمات جو رومن چرچ کے لیے باعثِ ننگ ہیں، مذہبی صورت میں قائم کئے گئے خصوصاً ولیوں اور مجسموں کی پرستش نہایت بے شرمی سے ہونے لگی۔ ایرینس کی کونسل کے بعد مشرقی چرچ آئے دن کے مناظرات میں مشغول ہو گیا اور ایرینس، سبلینس، نسطورینس اور یوٹیکینس کے جھگڑوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ انصاف علانیہ فروخت کیا جاتا تھا اور ہر طرح کی بدعنوانیاں ہوتی تھیں مغربی چرچ میں ڈیس اور ارسینی نس نے بشپ کی جگہ حاصل کرنے کے لیے قتل تک نوبت پہنچا دی اور آخر ڈیس کی فتح ہوئی۔ اس موقع پر کہا جاتا ہے کہ سسی نینس کے گرجا میں ایک دن میں (۱۳۷) آدمی قتل کیے ہوئے پائے گئے اور کوئی حیرت نہیں کہ یہ لوگ ان جگہوں کے اس قدر خواہاں ہوتے تھے۔ اس لیے کہ اس ذریعہ سے ان کو گراں بہا تحفے ملتے تھے۔ اپنی گاڑیوں پر نہایت تزک و احتشام سے نکلتے تھے اور ان کے دسترخوان پر بادشاہوں سے زیادہ شان و شوکت ہوتی تھی۔

ان منافشات کا سبب زیادہ تر شہنشاہ ہوا کرتے تھے۔ جسٹینین کے وقت میں حالت اور زیادہ خراب ہو گئی۔ اس کے نزدیک اپنے عقیدہ کے مخالفوں کو مار ڈالنا کوئی جرم ہی نہ تھا۔

بادشاہوں اور پادریوں میں عقاید اور اخلاق کی جو خرابیاں پھیلی ہوئی تھیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عوام کی حالت بھی مبتذل ہو گئی اور ان کا مقصد صرف

> روپیہ پیدا کرنا رہ گیا، خواہ کسی ذریعہ سے ہو اور اس روپیہ کو وہ نفاست اور عیاشی میں اُڑاتے تھے۔
>
> عقاید کی خرابی کے علاوہ، روم اور فارس کی سلطنتیں بھی کمزور ہو گئی تھیں شہنشاہ قسطنطین کے بعد روم کی سلطنت روز بروز کمزور ہوتی گئی۔ عام طور سے اس کے جانشین بُزدلی اور مظالم کے لیے مشہور تھے۔ آنحضرتؐ کے وقت تک ملک کا مغربی حصّہ گاتھ لوگوں (GOTHS) نے روند ڈالا تھا... یونانیوں کی عیش پسندی اور اخلاقی خرابیوں نے ان کی قوت کو زائل کر دیا تھا۔

صرف قتل وخوں ریزی ہی نہیں بلکہ یہ "ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال سامنے کر دیتے" کی تعلیم کے مدعی، اپنے مخالفین پر اس قدر انسانیت سوز مظالم برپا کرتے تھے جن کے تصور سے روح کانپتی ہے۔ ان کی تفصیل گبن اور ڈریپر کے ہاں دیکھئے۔ ایک اسقفِ اعظم (سینٹ سدل) کا حریف، ارمٹس نامی ایک پادری تھا۔ ایک روز سرِ راہ، پانصد راہبوں کی جماعت اس پر ٹوٹ پڑی اور اسے پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا۔ اس کے حامیوں کی باری آئی تو وہ سدل کو تو نہ پا سکے اس کی ایک خاتون دوست کو راستہ میں پکڑ لیا۔ اسے برہنہ کیا گیا اور اسی حالت میں تمام شہر کے گلی کوچوں سے اسے کشاں کشاں کلیسا میں لائے جہاں پہنچ کر اسے پیٹر کے مقدس گرز سے ہلاک کیا گیا۔ پھر اس کا گوشت ہڈیوں سے جدا کیا گیا اور لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے جلا دیا گیا۔ اس قسم کے واقعات وہاں کا معمول بن چکے تھے پھر پوپ اپنی پرستش الگ کراتے تھے۔ بادشاہ (قیصر آگسٹس) الگ پوجا جاتا تھا۔ ان تمام مفاسد سے بڑھ کر فتنہ خانقاہیت تھا جس نے ان کے دل اور دماغ دونوں کو بے کار کر دیا تھا۔ برفو لکھتا ہے:-

زوال

> اگر ہم بازنطینی حکومت کے جمود و تعطل کے اسباب وعلل دریافت کرنا چاہیں، تو یہ تین عنوانات کے تابع آجائیں گے۔ سب سے پہلے جاہل اور متعصب راہبوں کا وہ ہجوم جو اس سلطنت کی قوت کو چاروں طرف گھیرے ہوئے تھا۔ وہ ہر صوبہ اور ہر قریہ میں ٹڈی دل کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ صرف ایک قسطنطنیہ میں کوئی ایک سو سے زیادہ خانقاہیں تھیں (STOUDION) میں قریب ایک ہزار راہب ہوں گے اتھوس، آئیڈا، اولمپس کی پہاڑیاں اور مارمورا کا جزیرہ خانقاہوں سے پٹا پڑا تھا۔ ہر دس قدم پر آپ کو گیسو دراز، کوتاہ آستین، "راس پوٹن نما" مشائخ

دکھائی دیتے تھے جن کے گرد معتقدین کا ہجوم ان کی دست بوسی کے لیے حلقہ بنائے رہتا۔ ہر شریف آدمی، ہر سوداگر، ہر دولت مند، ہر نیک خاتون کوئی نہ کوئی خانقاہ بنواتی..... ان فقیروں کا تسلط عوام کے قلوب پر بہت گہرا تھا۔ وہ اپنی کرامات، معجزات اور تذکارِ اولیاء سے لوگوں کو مرعوب کرتے..... ان کے خوارق وکرامات اور گزشتہ اولیاء کی تماثیل کی پرستش ہوتی۔ ہر مشکل میں ان سے مدد مانگی جاتی۔ تجارت میں کامیابی، متاعِ گم گشتہ کی بازیافت اور بیماری سے شفا کے لیے ان کی طرف رجوع کیا جاتا۔ چونکہ ان لوگوں کو عوام کی اندھی عقیدت حاصل تھی اس لیے وہ حکّامِ وقت کی کچھ پرواہ نہیں کرتے تھے۔ (صفحہ ۱۷۸)

چوتھی صدی عیسوی میں یہ سلسلۂ خانقاہیت رُو بہ ترقّی تھا۔ چھٹی صدی عیسوی میں یہ اپنی انتہا تک پہنچ گیا، جب سینٹ بینیڈکٹ (ST.BENEDICT) نے اسے ایک منظم ادارہ کی صورت میں متشکل کر دیا۔ تجرّد و خلوت گزینی کی اس زندگی میں وہ اپنے آپ کو طرح طرح کی تکالیف میں مبتلا رکھتے اور اس کو قربِ الٰہی کا ذریعہ سمجھتے۔ نہ صرف تکالیف و مصائب بلکہ نہایت گھناؤنی اور نفرت انگیز حرکات، انتہائی عبادت سمجھی جاتیں۔ کوئی قسم کھا لیتا کہ تمام عمر غسل نہیں کروں گا۔ کوئی اپنے آپ کو عمر بھر دلدل میں ڈالے رکھتا۔ کوئی غلاظت کے حصار میں بیٹھے رہنے میں عافیت سمجھتا۔ کوئی اندھیری کوٹھڑی میں پڑا رہتا۔ جب زندگی کا تصور اس قدر نفرت انگیز ہو جائے تو حسنِ ذوق اور احساساتِ لطیفہ کی جو مٹی خراب ہوگی وہ ظاہر ہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ ان کی فطرت اس قدر مسخ ہو گئی کہ وہ ہر حسین و لطیف شے سے ابا کرتی تھی۔ حتیٰ کہ بقول (WHITE) ''وہ کسی حسین شے کی موجودگی میں خدا کی عبادت ہی نہیں کر سکتے تھے'' اور جس جگہ انہیں ذوقِ سلیم کا کچھ بھی مظاہرہ دکھائی دیتا وہ اسے تباہ و برباد کرنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے تھے چنانچہ جہاں عیسائی پادریوں (اربابِ شریعت) نے یہ اپنا مقدّس فریضہ سمجھ رکھا تھا کہ علم و بصیرت کے ہر مظاہرے کو نذرِ آتش کر دیا جائے، وہاں ان احبار و مشائخ نے اسے تزکیۂ نفس اور ارتقائے روح کا ذریعہ قرار دے رکھا تھا کہ دنیا میں کوئی حسین شے دکھائی نہ دے۔ یہی وہ زاویۂ نگاہ تھا جس کا ماتم کرتے ہوئے (DORSEY) لکھتا ہے کہ:۔

ہمارے پاس رومیوں کے حماموں کے متعلق اس لیے معلومات موجود ہیں کہ انہیں آتش فشاں پہاڑ (VESUVIUS) کی راکھ نے ڈھانپ دیا تھا لیکن ہم

اسپین میں مسلمانوں کے حماموں کے متعلق کچھ نہیں جانتے اس لیے کہ وہاں (بدقسمتی سے) کوئی (VESUVIUS) نہ تھا جو انہیں اپنی راکھ سے ڈھانپ دیتا بلکہ وہاں عیسائی فرڈیننڈ اور ازبلا تھے جنہوں نے اپنے احکامِ شاہی سے ان سب کو مسمار کرادیا۔ (CIVILISATION -- P.410)

حسین ونفیس حمام ہی کیا، ان کی جہالت نے تو دنیا کی ہر مہذب شے کو تباہ اور برباد کر دیا۔ یہی مؤرخ دوسرے مقام پر لکھتا ہے:۔

دنیائے قدیم کی تہذیب، عیسائی راہبوں کے ہاتھوں ایک ہزار سال کی نیند سو گئی۔ نوعِ انسانی کی تاریخ میں کسی واقعہ نے اتنی تباہی یا نگاہ کے زاویہ میں ایسی تبدیلی پیدا نہیں کی جتنی عیسائیت نے کی ہے۔ انسان نے ہزارہا سال کی محنتِ شاقہ کے بعد جو کچھ بنایا، حتیٰ کہ دنیا اور زندگی کی تمام مسرتیں، بیوی، گھر بار، دولت، صحت، خوشی، سب ایک نجات دہندہ کے نام پر قربان کر دیئے گئے اور وہ بھی دنیا میں امن نہیں، بلکہ فساد پھیلانے کے لیے۔ (صفحہ ۴۵۵)

علم دشمنی

ان کی علم دشمنی کی یہ کیفیت تھی کہ پوپ گریگری نے (CICERO) اور (LIVY) کی ان تمام کتابوں کو جلا دیا جو اُس کے ہاتھ لگیں۔ اُس نے ایک مرتبہ سُنا کہ وی آنا کے ایک بشپ کو ادب سے کچھ لگاؤ ہے تو اُس نے نہایت برافروختہ ہو کر لکھا کہ "ہم نے سُنا ہے کہ تم ادب پر لیکچر دیتے ہو۔ ہمیں تمہاری طرف سے یہ سُننے کی توقع ہے کہ تمہیں اس قسم کی لغویات سے کچھ تعلق نہیں"۔ اور جیسا کہ خانقاہی نظریۂ حیات کا لازمی نتیجہ ہے، ان کے قوائے عملیہ کے اضمحلال اور توہم پرستی کا یہ عالم تھا کہ جب ۴۱۰ء میں (ALANIC) نے روم پر چڑھائی کی ہے تو تمام علاقہ تباہی اور بربادی اور آگ اور خون کے چُنگل میں تھا اور شہر کے اندر سینٹ آگسٹائن، اس "اہم مسئلہ" کے حل میں مصروف تھے کہ اس بربریت میں جن کنواری لڑکیوں کی عصمت دری ہوگی وہ حیاتِ اُخروی میں تاجِ عذارت (CROWN OF VIRGINHOOD) سے سرفراز ہو سکیں گی یا نہیں!

یہ تھی مجملاً اس "تہذیب" کی حالت جو چھٹی صدی عیسوی کی سب سے بڑی "مہذب دُنیا" کا طرۂ امتیاز تھی۔ اور

باقی یورپ

جب مہذب دُنیا کی یہ حالت تھی، تو یورپ کے باقی غیر مہذب علاقہ کی جو کیفیت ہوگی، وہ

محتاجِ بیان نہیں۔ ہمارے خیال میں ان وحشی قبائل کی زندگی کا تصور کرنے کے لیے (BRIFFAULT) کا ایک اقتباس کافی ہوگا۔ وہ لکھتا ہے:-

> وہ جنگلات اور دلدلی زمینوں پر جھونپڑیوں میں رہتے۔ ان کے پاس چند گھریلو ضروریات کی چیزیں، کچھ آلاتِ کشاورزی اور دیہاتی گیت ہوتے۔ اس کے بعد وہ مدہوش شرابی، خونخوار قاتل، غدّار اور سخت فحش کار تھے۔ ان کی جہالت انتہائی کمینہ پن اور بہیمانہ انداز کی تھی۔ شراب کے نشہ میں بدمست ہوکر اونچے اونچے چلاّنا اور خرمستیاں کرنا اُن کا سب سے بڑا جشنِ طرب تھا۔ قتل و غارت گری، سفاکی، حیا سوز تشدّد، ان کی قوتوں کے مظاہرے رہتے اور جب ان چیزوں سے فارغ ہوتے تو بیٹھے آگ تاپتے اور اُن کی عورتیں کام کاج کرتیں۔" (صفحہ ۱۶۷)

یہ تھی یورپ کی حالت، وہ حالت جس کے متعلق گبن لکھتا ہے کہ "اتنے سے عرصۂ تاریخ میں خرابیوں میں زیادتی اور خوبیوں میں کمی اور کہیں نہیں مل سکتی۔

ہندوستان کی تہذیب

ہمارا تاریخ تہذیب کا کارواں اب منزل کے قریب آپہنچا ہے۔ اب ہمیں حدودِ عرب میں داخل ہوجانا چاہیئے۔ لیکن یہ داستان نامکمل رہ جائے گی اگر اس میں ہندوستان کی تہذیبی حالت کا ٹکڑا شامل نہ کیا جائے۔

ہندوستان کی قدیم تہذیب کے متعلق کچھ لکھنے کے سلسلہ میں سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ اُن کے ہاں تاریخ کا کوئی باقاعدہ سلسلہ ہی نہیں۔ جو واقعات ابھی (مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد سے پہلے) کل گزرے ہیں، جب ان سے اُن کے متعلق پوچھئے تو یہ انہیں لاکھوں سال پہلے کی بات بتائیں گے۔ اب خدا خدا کر کے اُن کے ہاں کچھ ایسے لکھنے والے پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے اس دشواری کا احساس کر کے، اپنے ہاں کی تاریخ اور تہذیب کے متعلق کچھ سنبھل کر پیش کرنے کی ہمت کی ہے۔ ان میں ایک صاحب (M.R.C. DUTT) ہیں جن کی کتاب (A HISTORY OF CIVILISATION IN ANCIENT INDIA) پراچین تہذیب پر مستند صحیفہ سمجھی جاتی ہے۔ مسٹر دت نے ہندوستان کی تہذیب کو مختلف حصّوں میں تقسیم کیا ہے اور پانچویں

صدی عیسوی سے مسلمانوں کی آمد تک کا زمانہ "پرانک تہذیب" کا زمانہ قرار دیا ہے۔ چونکہ ہمارے موضوع کا تعلق اسی زمانہ سے ہے، اس لیے ہم اس زمانہ کے متعلق مسٹر دت کی شہادات پیش کرتے ہیں تاکہ یہ حقیقت سامنے آ جائے کہ اُس وقت ہندوستان میں تہذیب کی کیا حالت تھی؟ اس عہد کا تعارف کراتے ہوئے مسٹر دت اپنی کتاب کی جلد دوم کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں:۔

اُس زمانہ کے کوائف کو پیش کرتے ہوئے میں نے اس باب میں بالکل تامّل نہیں برتا کہ میں نہایت تکرار اور شدّت سے اس حقیقت کو واضح کر دوں کہ قدیم ہندی داروں میں جو کچھ صحت بخش، آزاد، غیر مقید اور حیات آور عنصر تھا اس کا کس قدر فقدان ہو چکا تھا۔ یہ وہ صداقت ہے، جسے ہم ہندوؤں کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ (مقدمہ صفحہ vii)[1]

اب آگے بڑھیئے۔ بُت پرستی اُن کا عام مسلک ہو چکا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

بُت پرستی کا رواج عام تھا۔ انسان کے دل پر بُت پرستی کبھی شرافت آمیز اثر نہیں چھوڑتی۔ لیکن ہندوستان میں تو بُت پرستی کے ساتھ اور بھی (بہت سی) خرابیاں شامل تھیں.... مندروں کے پجاری (برہمن)، لوگوں کی گردنوں میں اپنی پرستش کی زنجیریں بھی ڈالے ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ مذہب اس قدر پستی کی حالت تک پہنچ گیا کہ مٹی کی مورتیوں اور برہمنوں کی اندھی پرستش کے سوا اور کچھ باقی نہ رہ گیا۔ (صفحہ ۱۹۵)

مذہب کی عمومی حالت پر تبصرہ کرنے کے بعد یہ مؤرخ لکھتا ہے:۔

یہ ہیں وہ افسانوی معتقدات، یہ ہیں وہ مذہبی رسُوم و مناسک جو ان اسلاف کے جانشین عمل میں لاتے تھے، جو ویدوں کے منتر گاتے اور اُپ نشدوں کے مسائل میں تجسّس و تفحّص کرتے تھے۔ (صفحہ ۲۱۲)

تنتر لٹریچر کے متعلق جو اُس زمانہ کی نمایاں خصوصیت تھی، مسٹر دت کی رائے سُننے کے قابل ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

مؤرخین کے لیے تنتر لٹریچر ہندو فکر کا کوئی خاص گوشہ پیش نہیں کرتے بلکہ وہ انسانی ذہنیت کی وہ مسخ شدہ صورت پیش کرتے ہیں جو محض اُس وقت ممکن ہو سکتی ہے جب قومی زندگی فنا ہو چکی، سیاسی شعور مٹ چکا اور علم کی شمع گُل ہو چکی ہو۔ (صفحہ ۲۱۳)

---

[1] ہمارے سامنے اس کتاب کا ۱۸۹۳ء کا ایڈیشن ہے۔

پیدائش کے اعتبار سے انسانوں کی طبقاتی تقسیم، وحدتِ خلق اور مساواتِ انسانی کے بنیادی اصول کے خلاف ہے لیکن ہندو سوسائٹی کا مدار ہی اس تقسیم پر ہے، اس لیے کہ ان کے مذہب کا اصل الاصول نظریہ تناسخ ہے۔ اور مسئلۂ تناسخ کا فطری نتیجہ ذاتوں کی تقسیم ہے۔ یہ غیر فطری تقسیم مندروں کی چار دیواری سے لے کر عدالت کی انصاف گاہوں تک زندگی کے ہر شعبہ میں دخیل اور کار فرما تھی۔ مثلاً لین دین کے معاملات تک میں یہ حالت تھی کہ اگر برہمن قرض لے، تو اس سے ۲۴ فی صد سُود لیا جاتا تھا، کھشتری سے ۳۶ فی صد، ویش سے ۴۸ فی صد اور شودر سے ۶۰ فی صد (صفہ ۱۰۹) یا جرائم کے معاملہ میں ایک ہی جرم کی سزا، برہمن، کھشتری، ویش اور شودر کے لیے مختلف تھی۔ اگر کوئی اچھوت کسی اُونچی ذات والے کو چھُو بھی لے تو موت کی سزا کا مستوجب ہو جاتا تھا۔ لیکن برہمن کسی کو قتل بھی کر ڈالے، تو اُسے سزائے موت نہیں دی جا سکتی تھی (صفہ ۱۱۲) نتیجہ اس کا یہ کہ:۔

> ذاتوں کی تقسیم کا، جس نے برہمنوں کے وقار اور مفاد کو بہت بلندی پر پہنچا دیا، لابدی نتیجہ یہ تھا کہ اس نے تمام دیانت دارانہ تجارت اور حرفت کو تباہ کر ڈالا اور فقط برہمنوں کی تجارت باقی رہ گئی ..... اس نے صرف یہی نہیں کیا کہ قوم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور باہمی تنفّر پیدا کر دیا بلکہ اس نے برہمن کے وقار کو بلند کرنے کے لیے قوم کی قوم کو قعرِ مذلت میں ڈال دیا (صفہ ۲۱۹)۔

اسی ورنوں کی تقسیم کے متعلق ایک دوسرے مقام پر مسٹر دت ان الفاظ میں تنقید کرتے ہیں:۔

> ذاتوں کی تقسیم کا نظریہ، قدامت پسند ہندوؤں کے تخیّل اور اعتقاد میں (قرنہا قرن) سے بہے چلا آ رہا ہے۔ ایک اندھی عقیدت، ایک جذبۂ مستحسن کی حیثیت سے، جس پر کبھی تنقیدی نگاہ نہیں ڈالی گئی، جسے واقعات کی کسوٹی پر نہیں پرکھا گیا، جسے کسی نے کبھی مستفسرانہ دیکھا ہی نہیں اور بایں ہمہ، یہ نظریہ جو بظاہر ایسا منظم اور ہمہ گیر، مکمل اور نقائص سے مبّرا دکھائی دیتا ہے، اس کی حالت یہ ہے کہ جونہی اُسے تنقید کے ناخن سے چھیڑا جائے، تو یہ اس طرح فضا میں گم ہو جاتا ہے جس طرح وہ رنگین بلبلے جو بچے صابون اور پانی سے اُبھارا کرتے ہیں۔ (صفہ ۹۲)

اس معاشرت میں شودروں کا وجود بجائے خویش ایک کھلی ہوئی غلامی کی شکل تھی لیکن ان کے علاوہ مستقل غلامی (SLAVERY) کا رواج بھی کچھ کم نہ تھا۔ چنانچہ:۔

امیر آدمیوں کی جائیداد اور املاک میں غلام سب سے زیادہ قیمتی متاع تصور کیے جاتے تھے۔ ہندوستانِ قدیم میں گھر کے غلام کی اسی طرح خرید و فروخت ہوتی تھی جس طرح ازمنۂ قدیمہ میں دیگر ممالک میں (صفحہ ۳۱۴)..... قرضہ لینے والا اپنی لونڈیوں کو قرض دینے والے کے پاس رہن رکھ دیتا تھا (صفحہ ۱۰۸) غلاموں کی سات قسمیں ہوتی تھیں جن میں علاوہ دیگر اقسام، جنگ کے قیدی، غلاموں کی اولاد اور زر خرید غلام سب اہم تھیں۔ (صفحہ ۱۱۳)

معاشی نظام یکسر سرمایہ دارانہ تھا۔ چنانچہ منوجی، وسستھ دھرم شاستر کے حوالہ سے، بیاج کی شرح و آئین کے متعلق تفصیلی احکام بیان کرتے ہیں (صفحہ ۱۰۱) راجاؤں کے محلات میں بادہ نوشی کثرت سے رائج تھی۔ مندروں اور دیگر مقدس مقامات میں جن انسانیت سوز حرکات کا ارتکاب ہوتا تھا، ان کے بیان سے حیا تھرتھراتی ہے۔ اس لیے اس کی تفصیل کی ہمیں جرأت نہیں۔ اس کے لیے سوامی دیانند کی ستیارتھ پرکاش کا گیارھواں سمدلاس دیکھیے۔

بہرحال، یہ تھی چھٹی صدی عیسوی میں ہندوستان کی تہذیب کی عمومی حالت!

نگہ بازگشت

گزشتہ اوراق میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس پر نگہ بازگشت ڈالئے اور دیکھئے کہ چھٹی صدی عیسوی میں دُنیائے تہذیب و تمدن اور جہانِ عمرانیت و معاشرت کی کیا حالت ہو چکی تھی۔ مذہب کی دنیا کو دیکھئے تو خدائے واحد القہار کا صحیح تصور کسی مقام پر بھی موجود نہ تھا۔ شرک اپنی جلی اور خفی شکلوں میں ہر جگہ مسلط تھا اور انسان کی وہ پیشانی جو ایک خدا کے قانون کے سوا کسی کے سامنے جھکنے کے لیے پیدا نہیں کی گئی تھی، اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی مٹی اور پتھر کی مورتیوں، درختوں اور حیوانوں، دریاؤں اور پہاڑوں، اجرامِ سماوی اور عناصرِ ارضی ہر ایک کے حضور سجدہ ریز تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ انسان اپنے مقام سے یکسر ناآشنا تھا اور وہ جس کے لیے ارض و سمٰوٰت کی ہر شے مسخر کر دی گئی تھی، ارض و سمٰوٰت کی ہر شے سے خائف اور ہراساں، ترساں و لرزاں زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔ چونکہ یہ اپنے مقام سے بے خبر اور اپنی حقیقت سے ناآشنا تھا، اس لیے مذہبی پیشوائیت کی انسانیت سوز لعنت اس کی زندگی کے ہر گوشے پر غالب تھی۔ جو اس سے ذرا آگے بڑھتے تھے، ان کے لیے خانقاہیت کا بحرِ منجمد موجود تھا، جہاں پہنچ کر زندگی کی ہر حرارت افسردگی اور ہر تازگی پژمردگی میں بدل جاتی تھی۔ کہیں افلاطون کا فلسفۂ اعیانِ نامشہود ہر حقیقت کو سراب میں بدل رہا تھا اور کہیں بُدھ مت کا قنوطی تصورِ حیات "اس جہانِ کیف و رنگ کو مجلسِ آب و گل

بنائے ہوئے تھا۔ کہیں تناسخ کا نظریہ انسان کے ارادہ و اختیار کو سلب کر کے اسے مجبورِ محض قیدی کی طرح دنیا کے جیل خانے میں بند کیے تھا جہاں وہ کسی گزشتہ جنم کے موہوم گناہوں کی سزا بھگتنے کے لیے بھیج دیا گیا تھا اور کہیں مزدکیت کا عقیدہ اسے فطری قوانین کی حدود و قیود سے بھی آزاد کر کے شترِ بے مہار کی طرح وادیٔ بہیمیت میں بے باکانہ چھوڑ رہا تھا۔ جہالت کی یہ کیفیت تھی کہ وہ معلول (EFFECT) جس کی علت (CAUSE) اُن کی سمجھ میں نہیں آتی تھی، مافوق الفطرت قوت سے موسوم ہو کر دیوی دیوتا بن جاتا تھا۔

نظامِ تمدن و سیاست کی طرف آیئے، تو شخصی حکمرانوں کے آہنی پنجوں کی مستبدانہ و قاہرانہ گرفت، حریتِ فکر اور آزادیٔ خیالات کی ہر رمق کا گلا گھونٹ رہی تھی اور اس خیال سے کہ کہیں ان اطواق و سلاسل کی گرفت ڈھیلی نہ ہونے پائے، بادشاہ کو ایشور کا اوتار، سایۂ یزداں اور خدا کی صفات کا حامل قرار دے رکھا تھا اور یوں اس کی ہر جگہ پرستش ہوتی تھی۔ زبانِ سیاست "انسانی حقوق" کے الفاظ تک سے ناآشنا اور مساوات کے مفہوم تک سے بے خبر تھی۔ ذاتوں کی تقسیم نے قبائے وحدتِ نوعِ انسانی کی دھجیاں بکھیر رکھی تھیں۔ غلامی اس زمانہ کی معاشرت کا جزوِ لاینفک بن چکی تھی اور ارسطو جیسا حکیم اسے انسانی معاشرت کے لیے ناگزیر خیال کرتا تھا۔ معاشی نظام میں سرمایہ داری کی خباثت معمول قرار پا چکی تھی۔ سُود کی شرحیں شاستروں کی رُو سے متعین ہوتی تھیں۔ "SENECA" جیسا مصلح جو عمر بھر غریبوں اور مفلسوں کی ہمدردی میں سرد آہیں کھینچتا رہا، قریب ساڑھے چار کروڑ روپیہ کی جائیداد چھوڑ کر مرا۔

اخلاق کی دنیا میں شرم ایک طرف سر جھکائے کھڑی تھی تو حیا دوسری طرف منہ چھپائے تھی۔ فحش کاری کی کوئی صنف نہ تھی جسے اس زمانہ میں سندِ جواز نہ مل چکی ہو اور سیہ مستی کی کوئی لغزش نہ تھی جس پر کوئی پابندی باقی رہ گئی ہو۔ شاہی محلات اور امراء کی محفلیں تو ایک طرف "تقدس و عقیدت" کے مذہبی مراکز تک شرمناک فواحش کے اڈے بن چکے تھے۔

غرضیکہ یہ تھی وہ دنیا جس میں انسانیت اس درجہ مسخ ہو چکی تھی کہ حقیقت کی کوئی جھلک کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

بود انساں در جہاں انساں پرست	ناکس و نابُود مند و زیر دست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش	بندہا در دست و پا و گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر	بہرِ یک نخچیر صد نخچیر گیر

صاحبِ اورنگ و ہم پیرِ کنشت باج بر کشتِ خرابِ اُو نوشت
در کلیسا اُسقُفِ رضواں فروش بہرِ ایں صیدِ زبوں دامے بدوش
برہمن گُل از خیابانش ببُرد خرمنش مُغ زادہ با آتش سپُرد
از غلامی فطرتِ اُو دُوں شُدہ
نغمہ ہا اندر رئے اُو خوں شُدہ

یہ تھی وہ دنیا جس کی تفاصیل و اطناب کو قرآنِ کریم نے ایک مختصر سے ٹکڑے میں اِس حسن و خوبی سے سمیٹ کر رکھ دیا ہے کہ اس کی جامعیّت پر ہر حقیقت بیں نگاہ وجد آگیں دکھائی دیتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اُس وقت حالت یہ ہو چکی تھی کہ

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ ... (۳۰/۴۱)

اُس وقت انسانی دسیسہ کاریوں سے حالت یہ ہو چکی تھی کہ خشکی اور تری میں، ہر جگہ، فساد ہی فساد نظر آتا تھا۔ کوئی شے اپنے صحیح مقام پر نہیں رہی تھی۔
یہ تھی دُنیائے تہذیب و تمدّن کی حالت، نبی اکرمؐ کے ظہورِ قدسی کے وقت۔

خودعربؑ کی حالت

گزشتہ اوراق میں ہم دنیائے تہذیب وتمدّن پر طائرانہ نگاہ ڈال چکے ہیں جس سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آچکی ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں کس طرح ہر شے اپنی اصل سے ہٹ چکی تھی اور بساطِ عالم کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جس میں فساد برپا نہ ہوچکا ہو۔ لیکن اس تنقید وتبصرہ میں خودعربؑ کی سرزمین ابھی تک ہمارے سامنے نہیں آئی جسے، اس کے بعد، شرفِ انسانیّت کی نشوو ارتقاء کا گہوارہ اور نوعِ انسانی کی فلاح و اصلاح کا مرکز قرار پانا تھا۔

قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ معمارِ حرم حضرت ابراہیمؑ نے کس طرح اپنی عزیز ترین متاع یعنی حضرت اسمٰعیلؑ کو فاران کی بے برگ وگیاہ وادی میں، دُنیا میں "خدا کے گھر"[1] کی تولیّت کے لیے وقف کر دیا تھا۔[2] جب حضرت اسمٰعیلؑ یہاں آکر بسے ہیں تو یہ قطعۂ ارض قریب قریب ویرانہ تھا لیکن آپ کی حُسنِ نیّت اور آپ کی پیش کردہ تعلیم کی جاذبیّت سے یہی ویرانہ دنیا بھر کی شادابیوں اور آبادیوں کا مرکز بن گیا۔ حضرت اسمٰعیلؑ کے بارہ بیٹے تھے جو تورات کے الفاظ میں بارہ قبیلوں کے سردار تھے (تکوین $\frac{۱۷}{۲۲}$)۔ اُس زمانہ میں تجارت کے قافلے یمن سے

بنو اسمٰعیلؑ

چلتے اور مکہ کی راہ شام اور مصر تک جاتے۔ بنو اسمٰعیلؑ نے بھی تجارتی کاروبار شروع کیا اور تھوڑے سے عرصہ میں نمایاں کامیابی حاصل کرلی۔ حضرت موسیٰؑ کے عہد میں

---

[1] اس وقت ہمارے پیشِ نظر پورے عرب کی مذہبی تاریخ کا استقصا نہیں بلکہ صرف اس خطۂ ارض کی اجمالی کیفیت بیان کرنا مقصود ہے جہاں حضرت اسمٰعیلؑ آکر بسے اور جہاں سے پھر اس آفتابِ ہدایت وسعادت کا طلوع ہُوا جس نے دنیا کی ہر ظلمت کو مبدّل بہ نور کر دیا۔

[2] تفصیل کے لیے دیکھئے میری کتاب "جوئے نور"۔

بنو اسمٰعیلؑ حجاز سے شام تک پھیل چکے تھے اور ان کا شمار دنیا کی دولت مند قوموں میں ہوتا تھا۔ ان کے مختلف قبائل (بالخصوص بنو قیدار جو قریش کے مورثِ اعلیٰ تھے) کی عظمت و ثروت اور شان و شکوہ کی داستانیں عہدِ عتیق کی کتبِ مقدسہ اور تاریخ و سیر کے صفحات پر نمایاں طور پر پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ تو تھی ان کی قوت و ثروت کی کیفیت، لیکن جہاں تک آسمانی ہدایت کا تعلق ہے، معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کے بعد ان کی طرف کوئی اور رسول مبعوث نہیں ہوا۔ اب اندازہ لگائیے ایک ایسے ملک کا جس میں مختلف اقوام و ملل کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہو اور اس کی اپنی مرکزی تعلیم موجود نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا ملک رفتہ رفتہ مختلف مذہبی تصورات کی آماجگاہ بن کر رہ جائے گا۔ چنانچہ چھٹی صدی عیسوی میں یہی کیفیت اس خطۂ ارض کی ہو چکی تھی۔ حضرت اسمٰعیلؑ کے بعد ان کی اولاد کچھ عرصہ تک ملّتِ ابراہیمی (اسلام) پر قائم رہی۔ اس کے بعد (جیسا کہ ہر مقام پر ہوتا رہا ہے) ہدایتِ آسمانی کے بے دُرد و صاف آبگینہ میں ذہنِ انسانی کی آمیزش شروع ہوئی اور کچھ عرصہ بعد وہ اس قدر مکدّر ہو گیا کہ اس کی اصلیت کا نشان تک بھی باقی نہ رہا۔ خانۂ کعبہ جسے خدائے واحد کی عبودیت کا مرکز قرار دیا گیا تھا، ان کے نزدیک مقدس تھا۔ جب انسان کی نگاہوں سے حقیقت اوجھل ہو جائے، تو مجاز اصل مقصود بن جاتا ہے۔ خانۂ کعبہ کا حقیقی مفہوم مستور ہوا تو اس کی چار دیواری کی پوجا شروع ہو گئی۔ جب وہ مکّہ میں ہوتے تو ان دیواروں کی پرستش کرتے اور جب وہاں سے کسی اور طرف جانا ہوتا تو اس کا ایک پتھر ساتھ رکھ لیتے۔ رفتہ رفتہ کعبہ کا امتیاز بھی اُٹھ گیا اور جو اچھا سا پتھر سامنے آیا اسی کو معبود بنا لیا۔ اس

بُت پرستی

طرح اصنام شکن (حضرت) ابراہیمؑ کی اولاد (اور اُمت) نے پھر سے شیوۂ آزری اختیار کر لیا۔ اہلِ بابل اور قومِ سبا میں اجرامِ سماوی کی پرستش ہوتی تھی۔ ان کے میل جول سے ان میں بھی ستارہ پرستی آ گئی۔ یہودیت بہت پرانا مذہب تھا۔ اس کے اثرات لازمی تھے۔ عیسائیت آخری مذہب تھا۔ اس نے بھی اس سرزمین کو متاثر کیا۔ ان کے علاوہ ایسے لوگ بھی موجود تھے جو یکسر دہریہ اور ملحد تھے۔ غرضیکہ یہ خطۂ ارض، مذہب اور لامذہبیت کے متنوع تخیلات کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ خاص خانۂ کعبہ میں عدنانی قبیلہ کا سب سے بڑا بُت ہُبل نصب تھا۔ طائف میں لات کا ہیکل تھا۔ دوسری طرف مکّہ سے تھوڑی دُور عزّیٰ دیوی کا معبد تھا۔ یہ تو بڑے بڑے بُت تھے۔ چھوٹے چھوٹے بُت ہر قبیلہ کے الگ الگ موجود تھے۔ صابئیت کے اثر سے قبیلہ قیس ستارۂ شعریٰ کا پرستار تھا۔ قبیلہ کنانہ چاند کی پرستش کرتا تھا۔ اسد کا قبیلہ عطارد کو پوجتا تھا۔ ان کے علاوہ ارواحِ خبیثہ، بھوت پریت پر بھی ان کا اعتقاد تھا جنہیں یہ خدا

کا مقرب سمجھ کر پوجتے تھے۔ جنوں اور فرشتوں کی بھی پرستش ہوتی تھی۔ ایران کی مجوسیت کا اثر گو زیادہ گہرا نہیں تھا، لیکن بایں ہمہ اس کی جھلک بھی کہیں کہیں اعاظم پرستی اور ثنویت کے رنگ میں نظر آتی تھی اس اجمالی کیفیت سے آپ کے سامنے یہ حقیقت آگئی ہوگی کہ چھٹی صدی عیسوی میں خود اہلِ عرب میں مذہب کی کیا حالت تھی۔

مشرکین، یہود، نصارٰی، مجوس اور صابئین کے علاوہ، اُس زمانہ کے عربوں میں ایک اور مسلک بھی تاریخ کے طالبِ علم کے سامنے آتا ہے جسے حنیفیت کہا جاتا ہے۔ اہلِ عرب کے نزدیک حنیف حضرت ابراہیمؑ کا لقب تھا، لیکن دینِ حنیفی میں سے ان کے پاس سوائے ختنہ اور حج کی رسوم کے کچھ باقی نہ تھا۔ چنانچہ اصطلاحی طور پر اسے حنیف کہتے تھے جو مختون ہو اور اس نے حج بھی کیا ہو۔ لیکن جن حنفاء کا ذکر ہمارے پیشِ نظر ہے، ان میں ان اصطلاحی علامات کے علاوہ کچھ معنوی خصوصیات بھی تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو طبعًا اُن غلط عقاید اور باطل مسالک سے متنفر تھے جو ان کے گردوپیش پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ صحیح عقاید کیا ہیں اور مسلکِ حقہ کہاں سے ملے گا۔ یوں سمجھیئے کہ یہ وہ لوگ تھے جو اپنے ماحول سے غیر مطمئن تھے لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ اطمینان بخش ماحول کیسے پیدا ہو سکے گا۔ انہیں حق کی تلاش تھی لیکن حق کا سراغ کہیں نہیں پاتے تھے۔ وہ اپنی تشنگی کی سیرابی کے لیے دشت و صحرا میں مارے مارے پھرتے لیکن انہیں زندگی کے چشمۂ شیریں کا کوئی نشان نہ ملتا۔ ان کے پاس جو کچھ تھا، سلبی تھا، ایجابی کچھ بھی نہ تھا۔ وہ لاالٰہ کی وادیوں میں سرگرداں پھر رہے تھے لیکن الّا اللہ کی مثبت دُنیا انہیں کہیں نہیں ملتی تھی۔ (HITTI) کے الفاظ میں:۔

> عرب جاہلیت کا مذہب و مسلک اس نقطہ پر پہنچ چکا تھا جہاں وہ لوگوں کے روحانی تقاضوں کی تسکین نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی وجہ سے وہاں ایسے لوگ پیدا ہو گئے جو اس مسلک سے غیر مطمئن تھے۔ انہوں نے مسلکِ توحید کے دھندلے سے تصور پیدا کر لیے۔ اُن کا نام حنیف تھا۔
>
> (HISTORY OF ARABS -- P.108)

ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو حق کی تلاش میں مضطرب و بیتاب اس دُنیا سے چل بسے (مثلاً زید بن عمر بن نفیل یا امیہ بن صلت)، یا عیسائی ہو گئے (مثلاً قیس بن ساعدہ اور ورقہ بن نوفل)۔ اس لیے کہ:۔

تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

اور کچھ ایسے خوش بخت اور طالع مند بھی تھے جن کی زندگی میں آفتابِ رسالتؐ طلوع ہوا اور ان کی متجسس اور حیران نگاہوں نے اس حقیقتِ منتظر کو بے نقاب دیکھ لیا جس کی تلاش میں اُنہوں نے اپنی عمر صحرانوردیوں اور دشت پیمائیوں میں گزار دی تھی (مثلاً عثمان بن حویرث اور قیس بن نشید)۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔

لیکن تلاشِ حقیقت کی یہ تڑپ محض انفرادی تھی، کسی اجتماعی شکل میں نہیں تھی۔ اس لئے اس کا شمار اُس وقت کے مروجہ مذاہب میں نہیں کیا جا سکتا۔ مذہبی حیثیت سے سب سے زیادہ وسعت شرک ہی کو حاصل تھی یا اس سے نیچے اُتر کر، یہودیت، عیسائیت اور مجوسیتؐ کی مسخ شدہ صورتوں کو یا بابل کی صابئیتؐ کو جو ستارہ پرستی کی شکل میں دُنیا کے سامنے تھی۔

جب مذہب کی یہ کیفیت تھی تو ظاہر ہے کہ حیاتِ اُخروی کا بھی اُن کے ہاں کوئی متعین تصور نہ تھا حتیٰ کہ ایسے لوگ بھی موجود تھے جو سرے سے اس کے قائل ہی نہ تھے۔

وَ قَالُوْۤا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝ (۶/۲۹ ; ۳۷/۱۹)

اور یہ کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے اور ہم (مرنے کے بعد) اُٹھائے نہیں جائیں گے۔

(HITTI) اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:۔

حیاتِ اُخروی کے متعلق عربوں کے قدیم مستند لٹریچر میں کسی جگہ بھی کوئی چیز بصراحت نہیں ملتی۔ (صفحہ ۱۰۱)

یہ تھی ان کی مذہبی حالت۔ اب ان کی اخلاقی دُنیا کی طرف آئیے۔ جس قوم میں خدا اور آخرت کے متعلق صحیح تصور موجود نہ ہو، اُن کی اخلاقی حالت کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہو سکتی۔ یہی تو وہ بنیادیں ہیں جن پر صحیح اخلاقیات کی عمارت استوار ہوتی ہے حتیٰ کہ اگر کوئی قوم تمدنی زندگی کے تقاضوں سے حسنِ معاملہ اور خوش آیند اخلاق پر زور بھی دیتی ہے،

دُنیائے اخلاقیات

۱؎ مجوس کا لفظ قرآنِ کریم میں ایک ہی مرتبہ آیا ہے (۲۲/۱۷) اگرچہ سورۂ نحل میں ان کے عقیدۂ ثنویت کا بھی ابطال ہے (۱۶/۵۱)۔

۲؎ صابئین کا ذکر سورۂ بقرہ (۲/۶۲) سورۂ مائدہ (۵/۶۹) اور سورۂ حج (۲۲/۱۷) میں آیا ہے۔

تو یہ چیز محض مصلحت کوشی اور حکمتِ عملی (EXPEDIENCY) کی حیثیت اختیار کر سکتی ہے جس کا دائرہ ظاہری حدود و قیود تک ہوتا ہے۔ قلبِ انسانی، جو تمام اعمال و کردارِ حیات کا سرچشمہ ہے، اس سے متاثر نہیں ہوتا۔ اس لیے اس قسم کے نظامِ اخلاقیات کی عمارت ریت کی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے۔ پھر جس قوم میں جہالت بھی موجود ہو، ان کے ذمائمِ اخلاق کی کیفیت اور نوعیت کا اندازہ کچھ مشکل نہیں۔ ان کی جہالت، تمدن و تہذیب کی بلند سطح تو ایک طرف، روزمرہ کے حوائجِ زندگی میں بھی چلتی پھرتی نظر آتی تھی۔ مثلاً کھانے پینے میں حلال و حرام تو ایک طرف لطیف و خبیث کی بھی تمیز نہ تھی۔ حشرات الارض ان کی عام غذا تھی۔ چھپکلیوں تک کو کھا جاتے تھے۔ خون کو جما لیتے اور مزہ لے لے کر کھاتے۔ مُردہ جانوروں حتّٰی کہ چمڑہ تک کو بھُون کر کھا جاتے۔ درندگی کا یہ عالم کہ زندہ اونٹ کا کوہان اور دُنبے کے دُم کی چکّی کاٹ کر کھا جاتے۔

عائلی زندگی میں عجیب عجیب قسم کی رسُوماتِ قبیحہ اُن کے ہاں رائج تھیں۔ باپ کے مرنے کے بعد اس کی تمام بیویاں (بجز حقیقی ماں) بیٹے کی وراثت میں آجاتیں اور اس کی جائز بیویاں سمجھی جاتیں۔ بیویوں کی تعداد پر کوئی حد نہیں لگائی گئی تھی۔ عورت بیوہ ہو جاتی تو سال بھر تک اُسے تنگ و تاریک کوٹھڑی میں رہنا پڑتا۔ اس کے بعد کوئی جانور (گدھا وغیرہ) لاتے جس سے مَس کرنے کے بعد وہ کوٹھڑی سے باہر نکلتی۔ عارضی نکاح (متعہ) کا عام رواج تھا۔ اس کے علاوہ بدکاری کی اور بھی عجیب عجیب قسمیں تھیں۔ مثلاً شجاعت اور بہادری میں کسی کی شہرت سنتے تو اپنی بیوی اس کے پاس بھیج دیتے تاکہ اس سے شجاع اور بہادر بچّہ پیدا ہو۔ زنا کی اولاد کے متعلق عورت جس کی طرف انگلی اُٹھا دیتی وہی اس کا باپ قرار پا جاتا۔ اس پر طُرفہ یہ کہ وہ ان فواحشات پر فخر کرتے اور اس کا ڈھنڈورا پیٹتے۔ امراء القیس کے قصیدۂ لامیہ کو اُٹھا کر دیکھیے خود اپنی عزیز عورتوں کے ساتھ جو جو بے حیائیاں اس نے کی ہیں کس کس انداز سے ان کا ذکر کرتا ہے اور یہ ان قصائد میں سے ہے جن کے اشعار عرب کے بچّے بچّے کی زبان پر تھے۔ شرم و حیا کے فقدان کا یہ عالم کہ حج کعبہ میں ہزاروں لوگ جمع ہوتے لیکن قریش کے سوا سب (مرد و عورت) مادر زاد ننگے، طوافِ کعبہ کرتے۔ جب حج کے وقت برہنگی کا یہ عالم تھا تو غسل یا جائے ضروریہ میں پردہ کی کیا ضرورت تھی۔ چنانچہ کھُلے میدان میں کھُلے بندوں نہاتے اور ضروریات سے فارغ ہوتے۔

شراب، پانی کی طرح بے تکلفی سے پی جاتی تھی۔ گھروں میں شراب کی مجلسیں قائم ہوتیں اور عورتیں اور بچے ساقی گری کرتے۔ اس کے بعد نشے کے عالم میں جو بدمستیاں ہوتیں ظاہر ہیں۔ شراب سے تو ایّامِ جاہلیت کے عربوں کو عشق سا نظر آتا ہے۔ ان کے شعر کیا ہیں، تاکستان کی لچکتی جھومتی شاخیں ہیں کہ ہوا بھی ان کو چھُو جائے تو

لڑکھڑاتی پھرے۔ لٹریچر میں اس کی محبوبیت کا یہ عالم ہے کہ عربی زبان میں شراب کے قریب ڈھائی سو نام ہیں "فردوس بیک خوشۂ انگور فروشم" کی حیثیت آپ کے نزدیک ایک مخمور کی ترنگ سے زیادہ نہیں لیکن تاریخ نے یہ واقعۂ کیف انگیز بھی اپنے دامن میں محفوظ کر رکھا ہے کہ خانۂ کعبہ کے متولّی، ابن غبشان خزاعی نے خود کعبہ کی تولیت کو قریش کے جدِّ امجد قصیٰ ابن کلاب کے ہاتھوں ایک مشکیزۂ شراب کے عوض بیچ دیا تھا۔

شراب نوشی کے ساتھ قمار بازی کچھ لازم و ملزوم سی نظر آتی ہے بعصرِ حاضر کی غازہ بہ رخسار شام ہو یا ازمنۂ قدیمہ کی کاکل بدوش رات، ہر محفل میں یہ توام بہنیں یکجا رہزنِ ایمان و ہوش دکھائی دیتی ہیں۔ عربوں کی متاع اونٹوں کے گلّے تھے۔ وہ فخر سے کہتے کہ ونشرب فی اثمانها و نقامر دہم ان کی قیمت سے شراب پیتے اور جُوا کھیلتے ہیں) جوئے کے بھی عجیب عجیب طریق تھے لیکن ان میں سب سے زیادہ مروّج و مشہور تیروں کے ذریعہ قرعہ اندازی کا طریقہ تھا۔ قمار بازی کا شمار بھی ان کے ہاں قومی مفاخر میں ہوتا تھا۔ چنانچہ ان مجالس میں شریک نہ ہونا قومی عار خیال کیا جاتا تھا۔ جو ان مجالس میں شرکت نہ کرتا اسے برَم کا خطاب دے دیتے اور جنہیں قوم کی طرف سے یہ خطاب مل جاتا ان سے شادی بیاہ کرنا باعثِ ننگ و عار خیال کیا جاتا۔ قمار بازی اس طرح ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی کہ وہ اہم معاملاتِ زندگی کا فیصلہ اسی سے کرتے۔ چنانچہ جب وہ کسی بڑے کام یا سفر کا ارادہ کرتے تو بُتوں کے مجاوروں کے پاس فال لینے کے لیے جاتے۔ وہ بے پیکان کے تیروں سے (جنہیں ازلام کہتے تھے) فال لیتے اور اُس کے مطابق فیصلہ ہو جاتا۔ یہ رُسومات اس قدر تقدّس حاصل کر چکی تھیں کہ خانۂ کعبہ میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے جو بُت بنا رکھے تھے ان کے ہاتھوں میں بھی فال کے تیر دے رکھے تھے۔ یہی وہ ازلام ہیں جنہیں قرآن نے شیطانی فعل قرار دیا ہے۔

یہ تو تھی ان کی معاشرتی زندگی۔ معاشی زندگی میں سُود خواری جیسی لعنت عام تھی اور اس کی وسعتیں اس حد تک ہمہ گیر ہو چکی تھیں کہ عورتوں اور بچّوں تک کو رہن رکھوا لیا جاتا تھا۔ اگر راہن معیّنہ میعاد کے اندر اشیاءِ مرہونہ واگزار نہ کرا لیتا، تو مرتہن ان کا مالک ہو جاتا تھا۔ (جیسا ہر جگہ ہوتا ہے) مزدوروں اور کاشتکاروں کا طبقہ سُود خواروں کے پنجۂ آہنی میں سب سے محکم طور پر گرفتار تھا اور سرمایہ دار طبقہ (جن میں اکثر یہود تھے) انسانیت سوز طریقوں سے ان کا خون چُوس لیتا تھا۔ معاشی نظام کی اس بنیادی خرابی کا لازمی نتیجہ تھا کہ سرکش طبائع لُوٹ مار پر اُتر آئیں چنانچہ رفتہ رفتہ ملک میں یہ کیفیت پیدا ہو چکی تھی کہ بعض قبائل میں ایسے منظّم گروہ موجود تھے جن کا ذریعۂ معاش ہی رہزنی اور غارت گری تھا۔ ان پیشہ ور ڈاکوؤں کے علاوہ عام طور پر ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کے مال مویشی پر

ڈاکہ زنی کے لیے ہر وقت تیار رہتا۔ حتّٰی کہ ان کی عورتوں اور بچّوں تک کو لوٹ کر دوسری جگہ فروخت کر دیا جاتا۔ اس پر طرفہ یہ کہ ان حرکاتِ مذمومہ کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ ان "کارناموں" کا تذکرہ بڑے فخر سے کیا جاتا جو جرأت و بیباکی میں دوسروں سے پیچھے رہ جاتے وہ علانیہ ڈاکے کی جگہ خفیہ چوری پر اُتر آتے۔ اور تو اور خود کعبہ کے خزانے میں چوری کرنے سے بھی نہ چوکتے۔ مردوں سے آگے بڑھ کر یہ زہر عورتوں تک میں بھی سرایت کر چکا تھا۔ اس معاشرہ میں عورت کی کیا حیثیت تھی، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ان کے ہاں لڑکی کا پیدا ہو جانا، موجب ہزار شرم و عار سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس عار سے بچنے کی شکل یہ پیدا کی تھی کہ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ یہ بھی نہیں کہ پہلے انہیں مار ڈالیں اور پھر دفن کریں، بلکہ جیتی جاگتی، چلتی پھرتی، ابّا ابّا پکارتی بچی کو اپنے ہاتھوں گڑھے میں دھکیل کر مٹی میں دبا دیتے۔ قبیلۂ بنی تمیم کے رئیس قیس بن عاصم جب ایمان لائے ہیں تو انہوں نے خود اقرار کیا کہ میں نے اپنے ہاتھوں آٹھ زندہ لڑکیاں دفن کی ہیں۔ پھر تماشا یہ کہ اس قساوت و شقاوت میں عورتیں بھی مردوں کے ساتھ برابر کی شریک تھیں۔ مائیں خود اپنی بچّیوں کو بنا سنوار کر زندہ گاڑنے کے لیے ان کے باپ کے حوالہ کرتیں۔ حالانکہ "ماں کی ممتا" ایک مسلّمہ حقیقت تسلیم کی جاتی ہے۔

تاریخ کی ان تصریحات کو سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ جس عہد کا ذکر ہمارے پیشِ نظر ہے اسے عہدِ جاہلیت[1] کہنا کس قدر صحیح تھا! یہ ایک لفظ 'جاہلیت' ان کی سوسائٹی کا پورا نقشہ کھینچ کر رکھ دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب صحیح علم کی روشنی مفقود ہو تو فکرِ انسانی کی بساط کے ہر گوشے پر تاریکی چھا جاتی ہے۔ اسی تاریکی سے اعتقادات میں توہّم پرستی اور اعمال میں غیر صالحیت پیدا ہوتی ہے۔ سب سے بڑی توہّم پرستی خود بُت پرستی ہے لیکن اس کے متعلقات بھی کچھ کم حیثیت نہیں رکھتے۔ اس باب میں عربِ جاہلیّت میں عجیب عجیب رسُومات رائج تھیں، مثلاً:۔

بحیرہ: اونٹنی کے کان چیر کر اس کو کسی بُت کی طرف منسُوب کر دیتے۔ پھر نہ اس پر سواری کی جاتی تھی نہ اس کی اوُن تراشی جاتی۔ سوائے فقیروں کے کوئی اس کا دودھ نہ پیتا۔

سائبہ: نذر مانتے تھے کہ بیماری سے شفا یا مصیبت سے نجات مِل جائے گی تو بُت کے نام پر اُونٹ چھوڑیں گے۔ اس اُونٹ کو سائبہ کہتے تھے۔ یہ ہندوستانی سانڈوں کی طرح جہاں چاہتا چرتا پھرتا۔ اس سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا۔

---

[1] اگرچہ لفظ جاہلیت، جہالت سے الگ مفہوم کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن جہالت تو بہرحال اُس عہد کا طرّۂ امتیاز تھی۔

وصیلہ : جو بکری سات بار دو دو مادہ بچّے جنتی اور آٹھویں بار صرف ایک نر، تو اُسے بُت کے استھان پر ذبح کر دیتے تھے۔

حام : وہ اُونٹ جس کی چوتھی نسل پیدا ہو جائے تو اُسے بُت کے نام پر آزاد کر دیا جاتا اور اس سے پھر کوئی کام نہ لیا جاتا۔

اوہام پرستی کا یہ عالم تھا کہ سفر میں جاتے تو کسی درخت وغیرہ میں تاگا باندھ کر گرہ لگا دیتے۔ واپس آکر دیکھتے اگر گرہ کھُل گئی ہے تو سمجھتے کہ ان کی بیوی بدکاری کی مرتکب ہوئی ہے۔ قحط پڑتا تو بھیڑ کی دُم میں گھاس پھونس باندھ کر آگ لگا دیتے اور سمجھتے کہ اس سے بارش ہو جائے گی۔ سفر میں راستہ بھُول جاتے تو کپڑے اُلٹا کر پہن لیتے اور سمجھتے کہ اس سے راستہ مل جائے گا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد روح ایک پرندہ کی شکل میں اُڑتی رہتی ہے۔ ارواحِ خبیثہ، بھُوت پریت، غولِ بیابانی سب کو مانتے تھے۔ جنوں کے متعلق ان کے ہاں عجیب وغریب قسم کے افسانے مشہور تھے (ایسے ہی جیسے ہمارے ہاں جہلاء کے طبقہ میں آج تک مشہور چلے آتے ہیں) آدمیوں کے ساتھ مِل جُل کر رہنے والے جنات (جنہیں عامر کہتے تھے)، بچّوں کو اُٹھا کر لے جانے والے جنات (جنہیں رُوح کہا جاتا تھا)، بڑے بڑے سرکش جنات (جو عفریت کہلاتے تھے) صحراؤں اور جنگلوں میں گانے بجانے والے جنات، بدّوؤں کے ساتھ راتوں کو آگ تاپنے والے جنات، بڑے بڑے جنات کے ساتھ نبرد آزمائیوں کے قصّے اور اسی قسم کی دیگر خرافات دلچسپ قصّوں کی شکل میں ان کے ہاں باعثِ گرمیٔ محفل بنتے تھے۔ کہانت کا بازار بھی انہی جنات کی بدولت گرم تھا۔ عرب میں ہر مقام پر کاہن موجود تھے جو غیب کی باتیں بتایا کرتے تھے۔ ان کے متعلق عقیدہ یہ تھا کہ ان کے ساتھ ایک جنّ رہتا ہے جو ان پر امُورِ غیبی کا اِلقا کرتا ہے (ان ہی جنات کو شیاطین بھی کہا جاتا تھا) یہ کاہن بُت کدوں کے پُجاری ہوتے تھے، اس لیے کہانت کو مذہبی تقدس بھی حاصل تھا۔ اور جیسا کہ اس قسم کے معاملات میں ہوتا ہے، ان لوگوں کو اپنی مکاریوں کی کامیابی کے لیے عجیب عجیب قسم کے فریب کارانہ جال بچھانے پڑتے۔ کاہنوں کی طرح شاعروں کے متعلق بھی ان کا عقیدہ تھا کہ یہی جنات یا شیاطین ان پر شاعرانہ خیالات کا اِلقا کرتے ہیں۔ شعراء خود اس کا اعتراف کرتے اور اپنے شیاطین جنات کا تذکرہ بڑے فخر سے کرتے۔

یہ تھی اُن کی ذہنی حالت!

لیکن ان تمام خرابیوں سے بڑھ کر ان کے ہاں خانہ جنگی کی خرابی تھی۔ ان میں کوئی اجتماعی نظام نہ تھا،

نہ کوئی مرکزیت۔ بس قبائلی زندگی تھی جس میں ایک قبیلہ دوسرے قبیلے اور ایک خاندان دوسرے خاندان کے خون کا پیاسا ہوتا تھا۔ ان میں انتقام کا جذبہ نسلاً بعد نسل، وراثتاً منتقل ہوتا چلا جاتا۔ اس لیے ان لڑائیوں کا سلسلہ بھی سالہا سال

خانہ جنگی

تک متواتر قائم رہتا۔ گھوڑدوڑ میں ایک فریق نے کسی قاعدہ کی خلاف ورزی کی تو فریقین کی تلواریں نیام سے باہر آگئیں اور یہ سلسلۂ پیکار، چالیس سال تک قائم رہا۔ ایک اُونٹنی کا تھن دوسرے قبیلہ والوں کے تیر سے زخمی ہوگیا اور برسوں تک جنگ کا سلسلہ قائم ہوگیا۔ عکاظ کے میلے میں کہیں باہمی مناقشہ ہؤا اور خون کی ندیاں بہ گئیں۔ جنگ ویسے ہی جنگ ہوتی ہے لیکن جب وہ ایسے فریقین میں برپا ہو جن کی وحشت اور جہالت، سبُعیت اور بربریت کا وہ عالم ہو جسے ہم گزشتہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں، تو ان لڑائیوں میں جس قسم کی سفاکی اور بے رحمی سے کام لیا جاتا ہوگا اُن کے تصوّر سے رُوح کانپ اُٹھتی ہے۔ عربوں میں حضریّت (شہری زندگی) اور بدویّت (صحرا نشینوں کی زندگی) دو الگ الگ مستقل حیثیت رکھتی تھیں[1]۔ ان دونوں کی معاشرت اور معیشت کے طریق جُداگانہ تھے۔ خانہ بدوش بادیہ نشین قبائل، شہر والوں کی نگاہوں سے دور صحراؤں اور بیابانوں میں رہتے تھے۔ کبھی اِس نخلستان کے قریب، کبھی اُس وادی سے پار، کبھی یہاں کبھی وہاں۔ اپنی ان ضروریات کے لیے جو صحرا ہیں میسّر نہ آتیں، وہ شہر والوں کے دست نگر ہوتے۔ شہر والے ان کی مصنوعات اور صحرائی پیداوار کی اشیاء کے ضرورت مند ہوتے۔ اس طرح ان لوگوں کا کبھی کبھی قریوں اور بستیوں کی طرف آنا ہوتا۔ یہ تو باہمی تمتّع کی امن پسندانہ روش تھی لیکن جب ان کی ضرورت سخت اور اشیائے مبادلہ کی قلّت ہوتی تو وہ لوٹ کھسوٹ سے بھی باز نہ رہتے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ شہریوں سے زیادہ تُند خُو اور دُرشت مزاج ہوتے۔ یہی وہ اعراب ہیں جنہیں قرآنِ کریم نے "کفر و نفاق" میں سخت اور حدُود اللہ سے یکسر ناآشنا کہا ہے (۹/۹۷)۔ عرب میں شہر تو چند ایک تھے۔ آبادی کا زیادہ حصّہ انہی شعلہ مزاج، دُرشت خُو، تُند و تیز، تہذیب و تمدّن کی حدُود سے ناآشنا، آئین و دساتیر کی قیود سے ناواقف، جاہل اور وحشی قبائل پر مشتمل تھا۔ اب ذرا تصوّر میں لائیے ایک ایسے ملک کو جس میں کسی منظّم حکومت کا نام تک نہ ہو اور آبادی کا بیشتر حصّہ اس قسم کے بادیہ نشین قبائل پر مشتمل ہو۔ اس ملک میں امن و عافیت کی جو کیفیت ہوگی اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ شہریوں کا ذریعۂ معاش زیادہ تر تجارت تھا۔ لیکن جب ملک اس قسم کی سرزمینِ بے آئین ہو تو تجارت کے قافلوں کی حفاظت و صیانت کی ضمانت کیا ہو سکتی ہے؟ عام لوگوں کے قافلے تو ایک طرف، اربابِ قوّت و سطوت تک کا سامانِ تجارت بھی اُن کی

---

[1] انہیں قرآن "جن و انس" کہہ کر پکارتا ہے۔

غارت گری سے محفوظ نہیں رہتا تھا۔ حیرۃ کے بادشاہ شمالی عربستان میں کافی اقتدار کے مالک سمجھے جاتے تھے۔ بایں ہمہ ان کے کاروانِ تجارت بھی عکاظ کے بازاروں میں امن وسلامتی سے نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اشہرِ حُرم[1] (حرمت والے مہینوں) کا زمانہ البتہ ایسا تھا جس میں جنگ وغارت گری کا سلسلہ ملتوی سمجھا جاتا تھا لیکن جن قبائل کا ذریعۂ معاش ہی لوٹ اور غارت گری ہو، وہ مسلسل تین ماہ تک بھلا کیسے خاموش بیٹھ سکتے تھے۔ اس لیے وہ کبھی ان مہینوں میں ردّ وبدل کر دیتے[2] اور کبھی ان کی حرمت کو بالائے طاق رکھ کر عین موسمِ حج میں لوٹ کھسوٹ شروع کر دیتے۔ حتیٰ کہ نواحِ کعبہ تک کو بھی اپنی شورشوں کی جولانگاہ کی حد سے باہر نہ سمجھتے (دیکھئے ۲۹ پ)۔ اسی لیے عملاً ملک سال بھر شورش واضطراب اور بدامنی اور غارت گری کی آماجگاہ بنا رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب نبئ اکرمؐ نے یہ بشارت دی کہ ایک زمانہ آئے گا کہ ایک عورت صنعا سے مکہ تک کا سفر تنہا کرے گی اور خدا کے سوا اسے کسی کا خوف نہ ہوگا[3]، تو لوگوں کو اس پر تعجب آیا اور وہ حضورؐ کو مجنون کہنے لگے یا شاعر۔ اس لیے کہ اُن کے نزدیک اس قسم کے انقلاب کا تصوّر کرنے والا یا تو پاگل ہو سکتا تھا یا شاعر! ان کا ذہن اس قسم کی تبدیلی کو ممکن ہی نہیں خیال کر سکتا تھا!) یہ تھی اس ملک میں امن وانتظام کی حالت[4]!

گزشتہ صفحات میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر نگۂ بازگشت ڈالیے اور دیکھئے کہ سرزمینِ عرب میں افکار وکردار کا کون سا زاویہ اور عقاید واعمال کا کون سا گوشہ ایسا تھا جس میں اس زمانے میں فساد رُونما نہ ہو چکا ہو! اس دنیا کی کوئی شے اپنی اصل وحقیقت پر قائم نہ تھی۔ (اسی کو قرآن کی اصطلاح میں فساد کہا گیا ہے)۔ جتنے مذاہب متعارف تھے، ان کی حقیقی صورتیں یکسر مسخ ہو چکی تھیں۔ انسان کا سر اس کے اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے مٹی اور پتھروں کے پیکروں یا ان کی کارگاہِ فکر میں ڈھلے ہوئے خیالی معبودوں کے حضور سجدہ ریز تھا۔ علم کی

---

[1] رجب، ذیقعدہ، ذی الحجہ اور محرم۔

[2] اس کو نسیٔ کہتے تھے جسے قرآنِ کریم نے "زیادۃ فی الکفر" کہا ہے۔

[3] بخاری، باب علامات النبوۃ۔

[4] اس تمام بدامنی اور شورش میں البتہ قریش کے قافلے غارت گری سے محفوظ رہتے اس لیے کہ قریش کعبہ کے متولی، لہٰذا جیران اللہ (خدا کے پڑوسی) سمجھے جاتے تھے۔ اہلِ عرب کے دل میں کعبہ کی عظمت ابھی تک قائم تھی۔ اس لیے وہ جیران اللہ پر ہاتھ اٹھانا بہت بڑا جرم سمجھتے تھے اور اس کے ارتکاب کی کبھی جرأت نہیں کرتے تھے۔

شمعیں خاموش اور وحشت وجہالت کی تاریکیاں بزمِ انسانیت پر مستولی تھیں۔ معاشرتی، معاشی، عائلی، تمدّنی غرضیکہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی کوئی بساط ایسی نہ تھی جس میں غیر فطری سلوٹوں سے تفاوت وفتور نہ آچکا ہو۔ قتل، غارت گری، خوں ریزی، رہزنی، سفاکی، بے رحمی، ان کی قساوتِ قلبی کے مظاہر اور شراب خوری، قماربازی، فحش کاری، عُریاں نگاری ان کی کثافتِ اخلاقی کے آئینہ دار تھے اور ان مصائب وذمائم نے سوسائٹی میں ایسی ہمہ گیریت حاصل کر رکھی تھی کہ وہ لوگ نادم وشرمسار ہونے کے بجائے ان پر فخر وناز کرتے تھے۔ جس معاشرہ میں عیبؔ عیبؔ نہ رہے بلکہ ہنر بن جائے اس کی اساسی اور بُنیادی خرابیاں کسی تصریح کی محتاج نہیں ہوتیں۔

یہ تھی چھٹی صدی عیسوی میں "دُنیائے مذاہب" اور جہانِ تہذیب وتمدن کی حالت — عرب اور عجم، دونوں میں —!

ہُنرش نیز بگو!

اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ رسُول کی بعثت ایک ہنگامی واقعہ نہیں ہوتا کہ یونہی اتّفاقی طور پر ظہور میں آجائے، بلکہ یہ ایک اہم کڑی ہوتی ہے اُس عظیم الشّان سلسلہ کی جس کی رُو سے انسانوں تک وحی کی رہنمائی پہنچائی جاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی واقعہ ایک ایسے مبنی علی الحکمت پروگرام کے مطابق ظہور میں آئے گا، تو اس کے متعلّقات وتضمنات بھی اسی حکمت پر مبنی ہوں گے۔ نبیؐ اکرمؐ کی بعثت سے پہلے، جس قدر انبیائے کرامؑ تشریف لائے (جن کا ذکر قرآنِ کریم میں آیا ہے) ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ ایک خاص قوم کی طرف مبعوث ہوتے۔ ان کے پیشِ نظر اسی قوم کی اصلاح وبہبود ہوتی۔ پھر ان کی تعلیم ایک خاص وقت تک اپنی اصلی شکل میں رہتی۔ اس کے بعد اس میں تحریف ہو جاتی یا وہ حوادثِ ارضی وسماوی کی نذر ہو جاتی۔ لہٰذا انبیائے سابقہ کی تعلیم کا دائرۂ اثر ونفوذ زمان اور مکاں کی حدود میں گھِرا ہوتا۔ لیکن اب ہمارے سامنے ایک ایسی تعلیم آتی ہے جس کی غایت تمام نوعِ انسانی کی راہ نمائی ہے اور جس کا زمانۂ اثر ونفوذ ابدیّت سے ہمکنار۔ اس لیے یہ پیغام

عارضی امیال و عواطف سے بے نیاز اور وقتی احوال و ظروف سے بلند و بالا ہوگا۔ لیکن بایں ہمہ یہ حقیقت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کسی انقلاب کی غایات، زمان و مکاں کی حدود و ثغور سے بے نیاز ہی کیوں نہ ہوں، اس کی ابتداء ایک خاص زمانہ میں ایک خاص مقام سے ہوگی اور اس کی اوّلین مخاطب بھی ایک خاص قوم ہوگی۔ یہ قوم اس عالمگیر انقلاب کے لیے بطور خمیر تیار کی جائے گی کہ وہ جس آٹے میں جا کر ملے اس میں بھی ایسا ہی خمیر پیدا کر دے۔ اس طرح اس انقلاب کی حدود وسیع سے وسیع تر ہوتی جائیں گی۔

ہم سابقہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ ظہورِ اسلام کے وقت کس طرح حقیقت دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی اور ہر جگہ فساد ہی فساد برپا ہو چکا تھا۔ یہ بھی ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس زمانہ میں خود عرب کی کیا

عرب کا انتخاب کیوں؟

حالت تھی۔ لیکن یہ سوال ابھی اپنی جگہ پر موجود ہے کہ اس عالمگیر انقلاب کی تخم ریزی کے لیے عرب کی سرزمین کو کیوں منتخب کیا گیا؟ عربوں میں وہ کون سی خصوصیات تھیں جن کی بناء پر انہیں اس قابل سمجھا گیا کہ وہ اس ابدیت بآغوش انقلاب کے لیے اوّلین خمیر کا کام دیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ آنے والا انقلاب کوئی معمولی انقلاب نہ تھا بلکہ یہ ساری دنیا کی طاغوتی قوتوں کے خلاف اعلانِ جنگ تھا، خواہ وہ مذہب کے نقاب میں قلوب و اذہان کو اپنی عقیدت مندیوں کے اغلال و سلاسل میں جکڑے ہوئے تھیں یا جہانداری و جہانبانی کے پردے میں اپنے جذبۂ حکومت کی تسکین کا سامان فراہم کرنے کے لیے اجسام و ابدان کو استبداد کے پنجۂ آہنی میں دبوچے ہوئے ۔۔۔ سوال یہ ہے کہ اس اہم مقصد کے لیے نگہ انتخاب اسی سرزمین پر کیوں پڑی؟

عربوں کی جہالت و وحشت اور سبعیت و بربریت کی تفاصیل ہمارے سامنے آچکی ہیں۔ ان کے عیوب و نقائص ہم دیکھ چکے ہیں۔ اجتماعی عیوب و نقائص کو اصولی طور پر دو شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو غلامی اور محکومی سے پیدا ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جو نشۂ قوت کی بدمستی اور جذبۂ تفوّق کی بدلگامی کی تخلیق ہوتے ہیں۔ پہلی شق میں دنایت، کمینگی، بے حمیتی، بے غیرتی، دوں ہمتی، پست فطرتی، تنگ نظری، بدعہدی، غداری، دروغ بافی، بہانہ سازی، فریب دہی، مکاری، عیاری، منافقت، تلوّن مزاجی، بددیانتی، عدم اعتمادی، سہل انگاری، تن آسانی غرضیکہ ضعفِ خودی اور عدمِ یقین کے انسانیت کُش جراثیم ان کے رگ و پے میں سرایت کر جاتے ہیں۔ نہ ان کی بات کا اعتبار نہ وعدے کا یقین۔ نہ ان کے کفر میں پختگی نہ ایمان میں استقلال۔ ادنیٰ سے لالچ پر بڑی سے بڑی متاعِ انسانیت کو بیچ ڈالنے پر آمادہ اور ذرا سا خوف، زندگی کے ہر گوشے پر موت طاری کر

دینے کے لیے کافی يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ۚ کہیں کسی پتے کی کھڑکھڑاہٹ ہوئی اور وہ لگے کانپنے کہ موت آئی۔ نہ ان کی اطاعت میں کیفیتِ جاں نثاری نہ ان کی سرکشی میں رنگِ خود اعتمادی۔ نہ ان کے قیام میں شکوہِ خسروی نہ ان کے رکوع میں فطرتِ روح الامینی۔ کھڑے ہیں تو کٹھ پتلیوں کی طرح کسی دوسرے کی تار کے سہارے اور جھکے ہیں تو جذبۂ تشکّر و احسان مندی سے نہیں بلکہ اس لیے کہ کھڑے ہونے کی ہمّت نہیں۔ نہ اِس میں صداقت نہ اُس میں خلوص، یہ بھی خود فریبی وہ بھی خود فریبی۔ اس لیے کہ ؎

دین و دانش را غلام ارزاں دہد
تا بدن را زندہ دارد جاں دہد

دوسری طرف افراط میں جائیے تو نشۂ قوّت و حکومت سے استیلاء و تغلّب اور استبداد و تمرّد کی شعلہ بداماں بدمستیاں پیدا ہوجاتی ہیں جس سے انسان انا الموجود لا غیری کے ابلیسانہ تصوّر میں اپنے سوا کسی اور کو جینے کا حق دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ غریبوں اور کمزوروں کو زندہ رہنے دیا جاتا ہے تو اس لیے کہ ان کا خون اس کی عطشِ حکمرانی اور جوع الارضی کی تسکین کا سامان فراہم کرے اور اگر اس جذبۂ حکومت و استعماریت کے ساتھ دورِ حاضرہ کی مغربی سیاست کا بھی امتزاج ہوجائے تو ــــ اس کا نتیجہ وہ جہنّم ہوتا ہے جس میں انسانیت کا ہر شرف جل کر خاکستر ہوجاتا ہے۔ ؎

اس سَیلِ سُبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

خصوصیّتِ کُبریٰ

خطّۂ حجاز کا عرب نہ کسی کا محکوم تھا اور نہ ہی اس میں ہوسِ ملک گیری پیدا ہوئی تھی۔ اس سرزمین کو یہ خصوصیّت حاصل تھی کہ اس پر جب سے زندگی کی نمود ہوئی، کسی غیر نے ان پر حکومت نہیں کی (غیر تو ایک طرف خود اپنے ہاں بھی کوئی خاص منظّم حکومت قائم نہیں ہوئی)۔ یمن کی حمیری اور حبشی حکومت، ایران کی سلطنت اور رومۃ الکبریٰ کی قوّتیں اس ملک پر مختلف اوقات میں حملہ آور ہوئیں لیکن ہمیشہ ناکام لوٹیں۔ جب اسکندریہ میں یونانیوں کی حکومت تھی تو انہوں نے چاہا کہ عرب کو اپنی سلطنت کا مرکزی مقام قرار دیں، لیکن اس کا سلطنتِ یونان کا مرکزی مقام بننا تو ایک طرف، مشہور جغرافیہ نویس (STRABO) المتوفّی ۲۴ء کے بیان کے مطابق، عربوں نے اپنا سفیر تک ان کے ہاں نہیں بھیجا۔

(HITTI) P.46)

گبنؔ اس سلسلہ میں لکھتا ہے :۔

عربوں کی آزادی یونان اور رُوم کی نفیس لیکن مصنوعی جمہوریتوں سے بالکل مختلف چیز تھی۔ اس آزادی میں ہر فرد اپنی قوم کے ملکی و سیاسی حقوق میں برابر کا حصّہ دار تھا۔ ان کے ہاں قوم اس لیے آزاد تھی کہ فرزندانِ قوم کسی آقا کے سامنے ذلّت آمیز اطاعت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے سینے حوصلے، استقامت اور متانت کے جوہروں سے لبریز تھے۔

(DECLINE AND FALL -- VOL.VI, P.267)

یہ تو تھی دُنیائے سیاست میں ان کی آزادی کی حالت۔ مذہب کی دُنیا میں بھی وہ اس سے کم آزاد نہ تھے، یعنی وہاں کسی خاص مذہب کا کوئی اثر ہی نہ تھا۔ یہود و نصاریٰ کے کچھ قبائل ضرور موجود تھے لیکن وہ ان سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ یہ کسی منظّم مذہب کے پَیرو نہ تھے۔ اپنے ذوقِ بندگی کی تسکین کے لیے انہوں نے کچھ معبود وضع کر رکھے تھے۔ جس طرح جی میں آتا، اُن کی پرستش کر چھوڑتے تھے۔ لیکن اس پرستش میں بھی وہ اپنے معبُودوں کے محکوم نہیں تھے۔ انہوں نے انہیں اپنی مقصد براری کا ذریعہ قرار دے رکھا تھا۔ جب تک وہ ان کی مرضی کے مطابق چلتا رہا، معبود رہا۔ جب اس کے خلاف گیا، اُٹھا کر دے مارا۔ بُت ساز اور توہّم پرست قوموں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ان کی حریّتِ فکر و آراء کی تمام قوّتیں سلب ہو جاتی ہیں اور اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی مورتیوں کا خوف ہر وقت ان کے قلب و دماغ پر مسلّط رہتا ہے۔ لیکن یہ خصوصیت عربوں ہی کے حصّہ میں آئی تھی کہ بُت گری اور توہّم پرستی بھی ان کی فطری آزادی پر اثر انداز نہ ہو سکی۔ چنانچہ اس باب میں بڑے دلچسپ واقعات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ امراء القیس کا ذکر ہے کہ وہ اپنے باپ کے قتل کا انتقام لینے کے لیے گھر سے نکلا تو پہلے اپنے بُت کے مندر میں گیا تاکہ اپنے معبود سے اس باب میں استصواب کر لے۔ اس استصواب کا طریقہ یہ تھا کہ تیر پھینک کر فال لیا کرتے تھے۔ چنانچہ پہلا تیر پھینکا تو جواب نفی میں نکلا۔ دوسرا پھینکا تو بھی نفی میں اور تیسرا تیر پھینکا، تو بھی جواب نفی میں نکلا۔ اس نے ترکش اُٹھا کر بُت کے منہ پر مارا اور کہا کہ ملعون! اگر تیرا باپ قتل کر دیا جاتا تو میں دیکھتا کہ تو کس طرح کہتا کہ انتقام نہیں لینا چاہیئے[1]

[1] کتاب الاغانی، صفحہ ۷۰، جلد ۸۔

غور فرمائیے! کیا بندگی میں اس قسم کی آزادی کی مثال آپ کو کہیں اور بھی ملتی ہے؟

پھر، چونکہ وہ لوگ تعلیم سے بے بہرہ تھے اس لیے ان کا ذہن خارجی اثرات سے غیر متاثر تھا۔ نہ ہند و یونان کے فلسفہ نے ان کے دماغ کو خیالی گتھیوں کے سلجھانے میں الجھایا تھا، نہ ایرانی بزم آرائیوں نے انہیں نکتہ آفرینیوں اور موشگافیوں کے فریب میں پھنسایا تھا۔ وہ سیدھے سادے عملی انسان تھے۔ ان کی زندگی تکلفات سے بے نیاز اور تصنعات سے بری تھی۔ راتوں کو سفر کرتے تو ستاروں کی مشعلوں سے نشانِ راہ متعین کر لیتے جو انہیں کبھی دھوکا نہ دیتے (کہ فطرت کے قائم کردہ نشانات (آیات اللہ) کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا کرتے) سارے ملک میں گنتی کی چند بستیاں تھیں۔ باقی تمام لوگ صحراؤں میں زندگی بسر کرتے تھے جہاں "میری اور تیری" کے امتیازات ہی نہ تھے جو ان کی نگاہوں کو باہمی خیانتوں اور دلوں کو بد دیانتیوں پر آمادہ کرتے۔ جہاں کوئی صاف اور شیریں چشمہ اور کھجوروں کا جھنڈ دکھائی دیا، وہی، کچھ دنوں کے لیے نشیمن بن گیا۔ جب اٹھ گئے تو کسی ٹوٹی ہوئی طناب اور بجھی ہوئی آگ کے علاوہ کوئی ترکہ پیچھے نہ چھوڑا کہ جس کی کشش آگے جانے سے عناں گیر اور پیچھے لوٹنے کے لیے دامن کش ہو۔ فطرت کے اس سیدھے سادے ماحول نے انہیں اپنے رنگ میں رنگ رکھا تھا۔ دامنِ صحرا پر ان کی نگاہ اٹھتی تو تا بحدِ نظر کوئی رکاوٹ سامنے نہ نظر آتی۔ اس سے ان کی نگاہوں میں کشاد اور سینے میں فراخی پیدا ہو جاتی۔ مائدۂ فطرت سے انہیں جو کچھ ملتا، بلا مزد و معاوضہ ملتا۔ اس لیے اسے کسی اور ضرورت مند کو دے دینے میں اجر اور معاوضہ کا سوال ہی ان کے ذہن میں پیدا نہ ہوتا۔ ان حالات کا نتیجہ تھا کہ ان کے سینوں میں صحراؤں کی سی وسعت، ان کی نگاہوں میں چشموں کی سی پاکیزگی اور سیر چشمی، اُن کے ارادوں میں رطب و نخیل کی سی بلندی، ان کے عزم میں کوہساروں کی سی پختگی اور ان کی پیشانیوں میں متبسم ستاروں کی فرخندگی آچکی تھی۔ اسی لیے ان کی مہمان نوازی دنیا بھر میں بطور ضرب المثل مشہور تھی۔ انتہائی غریب آدمی جس کے پاس اپنے اور اپنے بال بچوں کی کفالت کا ذریعہ ایک ہی اونٹنی ہے، اگر اس کے ہاں کوئی مہمان آگیا اور پاس کچھ نہیں، تو بلا ادنیٰ تامل، اس اونٹنی کو ذبح کر کے نہایت خندہ پیشانی سے مہمان کے سامنے حاضر کر دیا، بلا امتیاز اس کے کہ مہمان کون ہے؟ کوئی راہ رَو جسے شام اس کے ہاں آگئی اس کا مہمان تھا۔

ایفائے عہد کا یہ عالم کہ جان پر بن جائے، بیوی بچے قتل ہو جائیں، گھر بار تباہ ہو جائے، دنیا بھر سے لڑائی مول لینی پڑے، ہرچہ بادا باد، کیا مجال کہ جسے ایک مرتبہ عہد دے دیا پھر اس سے پھر جائے۔ کسریٰ (شاہنشاہِ ایران) حیرہ کے حاکم، نعمان بن منذر سے کسی بات پر ناراض ہو گیا۔

نعمانؔ قبیلہ بنی شیبان کے رئیس ہانی بن مسعود کے ہاں پہنچا۔ ہانی نے اسے پناہ دی۔ لیکن اس نے اس خیال سے کہ اس کی پناہ دہی سے ہانی خود مصیبت میں گرفتار ہو جائے گا اپنا مال اور اولاد ہانی کی حفاظت میں چھوڑا اور خود کسریٰ کے پاس چلا گیا۔ کسریٰ نے اسے قید کر لیا اور ہانی کو کہلا بھیجا کہ اس کا مال اور اولاد دربار میں بھیج دے۔ اندازہ لگائیے کہ شہنشاہِ ایران کا یہ حکم ایک معمولی سردار کے نام تھا جو خود اس شہنشاہ کا جاگیر یافتہ بھی تھا۔ لیکن عرب تھا، اس لیے یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ جسے اپنی حفاظت میں لے لیا ہے اُسے دوسرے کے حوالہ کر دے؟ صاف جواب دے دیا۔ کسریٰ نے فوج کشی کر دی۔ قبیلہ شیبان مقابلہ کے لیے تیار ہو گیا۔ چنانچہ جنگ ہوئی اور یہ قبیلہ اس بہادری سے لڑا کہ ایرانیوں کو شکست ہو گئی۔

ایک مرتبہ امراء القیس نے اپنی تلواریں اور زرہیں سموال کے پاس بطور امانت رکھیں۔ حارث غسانی نے انہیں سموال سے طلب کیا تو اس نے امانت داری کے خلاف سمجھ کر اس سے صاف انکار کر دیا۔ حارث نے ایک جرار لشکر لے کر چڑھائی کر دی۔ سموال میں تابِ مقاومت نہ تھی، اس لیے اپنے قلعہ میں محصور ہو گیا۔ اتفاقاً سموال کا بیٹا قلعہ سے باہر رہ گیا تھا۔ حارث نے اسے گرفتار کر لیا اور سموال کو پکارا۔ وہ قلعہ کے برج پر آیا تو اس سے کہا کہ امراء القیس کی زرہیں وغیرہ اب بھی میرے حوالے کر دو ورنہ تمہارے بیٹے کو ابھی قتل کر دوں گا۔ اس نے اس پر بھی صاف کہہ دیا اور آنکھوں کے سامنے بیٹے کو ذبح ہوتے دیکھنا گوارا کر لیا لیکن جسے عہد دے رکھا تھا، اس کی خلاف ورزی نہیں کی۔

ایک دفعہ بنی کلاب کے ایک شخص نے یمامہ کے سردار عمیر کے ہاں مع اپنے بھائی کے پناہ لی۔ اتفاق سے اس شخص کے بھائی اور عمیر کے بھائی میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا اور عمیر کے بھائی نے اس کے بھائی کو قتل کر دیا۔ عمیر اس وقت کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ گھر آیا تو اس نے کوشش کی کہ کلابی اپنے بھائی کا خون بہا لے کر راضی ہو جائے۔ دوسرے لوگوں نے بھی اسے سمجھایا لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوا۔ وہ قتل کا بدلہ قتل چاہتا تھا۔ عمیر کی ماں نے بھی اس سے درخواست کی کہ وہ قاتل کی تمام جائیداد لے لے اور اس کی جان بخش دے لیکن وہ اس پر بھی راضی نہ ہوا۔ غور کیجئے کہ کس کی منت و سماجت ہو رہی ہے؟ ایک ایسے شخص کی جو ان کے ہاں پناہ گزین ہے، ان کے رحم و کرم پر ہے۔ مجبوراً عمیر نے اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑا اور کلابی کو ساتھ لے کر باہر جنگل میں چلا گیا۔ بھائی کو اپنے ہاتھوں کھجور کے درخت سے باندھ دیا اور کلابی سے کہا کہ تم جب قصاص کے سوا کسی چیز پر راضی نہیں ہوتے، تو اس کو قتل کر دو۔ لیکن اتنی مہلت دو کہ میں اس وادی سے باہر نکل جاؤں۔ چنانچہ کلابی نے اسے قتل کر دیا اور اپنے

قبیلہ میں آگیا۔

کیا اس قسم کی مثال تاریخ کہیں اور بھی پیش کرسکتی ہے ؟

دوست کی رفاقت میں وہ اس قدر پختہ تھے کہ جنگِ بدر میں رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ کفار کے ساتھ کچھ لوگ ایسے بھی آگئے ہیں جو خوشی سے ہمارے خلاف لڑنے کے لیے نہیں آئے بلکہ جبراً لائے گئے ہیں۔ انہیں قتل نہ کیا جائے۔ ان میں ایک شخص ابوالبختری بھی تھا۔ مجذر انصاری کی نظر ابوالبختری پر پڑی تو اس سے کہا کہ چونکہ تیرے قتل سے رسول اللہؐ نے منع فرمایا ہے اس لیے تجھے چھوڑتا ہوں۔ ابوالبختری کے ساتھ اس کا ایک رفیق بھی تھا جو اس زمرے میں نہیں آتا تھا۔ ابوالبختری نے کہا کہ کیا میرے اس رفیق کو بھی چھوڑتے ہو ؟ مجذر نے کہا کہ نہیں، اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ اس پر ابوالبختری نے کہا کہ میں عرب عورتوں کا یہ طعنہ نہیں سن سکتا کہ ابوالبختری نے اپنی جان بچانے کے لیے دوست کا ساتھ چھوڑ دیا۔ یہ کہہ کر وہ رجز پڑھتا ہوا مجذر پر حملہ آور ہوا اور مارا گیا۔

رفاقت

احسان کا اس قدر پاس رکھتے تھے کہ جب تک اس کا بدلہ نہیں اُتار لیتے تھے، اسے بھولتے نہیں تھے۔

احسان شناسی

حدیبیہ کے موقع پر قریش (کفار) کی طرف سے عروہ بن مسعود نبیؐ اکرمؐ کی طرف آیا اور کچھ ایسی باتیں کیں جو مسلمانوں کو بڑی گراں گزریں۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان باتوں کا سختی سے جواب دیا۔ اس پر عروہ نے کہا کہ ابوبکرؓ! میں بھی ایسی ہی سختی سے تمہاری باتوں کا جواب دیتا، لیکن کیا کروں ؟ تمہارا ایک احسان میری گردن پر ہے جسے میں ابھی تک اُتار نہیں سکا۔ اس لیے خاموشی کے سوا چارہ نہیں۔

شجاعت اور بہادری کا یہ عالم تھا کہ میدانِ جنگ ان کے لیے کھیل کا میدان بن چکا تھا۔ اس لیے ان کے ہاں بیماری سے بستر پر مرنا بڑی ذلت کی موت تھی۔ ان کا خیال تھا کہ جو شخص زخم کھا کر مرتا ہے، اس کی روح زخم کے راستے نکلتی ہے ورنہ ناک کی راہ سے نکلتی ہے اور یہ نہایت معیوب موت ہے۔ اس لیے وہ بیماری کی موت کو "حتف انف" کہتے تھے (یعنی ناک کی موت) اور ایسی موت کو بڑی ذلت کی موت تصور کرتے تھے۔ عامر بن طفیل، اپنے قبیلہ کا رئیس (اور بہت بڑا متقیؔ تھا)، اُسے طاعون ہوگیا جس کی وجہ سے اُسے بستر پر لیٹنا پڑا، لیکن جب موت قریب آئی تو اُس نے کہا کہ مجھے گھوڑے پر بٹھا دو۔ گھوڑے پر بٹھا دیا گیا اور اس نے وہیں دم توڑا۔

میدانِ جنگ میں بھی تیروں کے زخم سے مرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ غزوۂ احزاب میں نوفل بھاگتے ہوئے خندق میں گر گیا تو مسلمان مجاہدین نے تیر مارنا شروع کیے۔ اُس نے کہا "مسلمانو! میں شریفانہ موت مرنا چاہتا ہوں"۔ حضرت علیؓ نے اس کی درخواست منظور کی اور خندق میں اُتر کر تلوار سے اس کا سر کاٹ لیا کہ یہ شریفوں کے شایانِ شان تھا۔

ان ہی تصورات کا نتیجہ تھا کہ موت ان کے نزدیک کھیل ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ اس بات کو غیرت و حمیّت کے خلاف سمجھتے تھے کہ مقتول پر نوحہ کیا جائے۔ نوحے کی اجازت بھی دیتے تو اس وقت جب خون کا انتقام لے لیتے۔ جنگِ بدر میں قریش کی شکست کی خبر مکہ میں پہنچی تو گھر گھر صفِ ماتم بچھ گئی۔ لیکن قریش نے منادی کرا دی کہ کوئی شخص رونے نہ پائے۔ اس لڑائی میں اسوَد کے تین لڑکے مارے گئے تھے۔ اس کا دل اُمنڈا آتا تھا لیکن غیرتِ قومی سے رو نہیں سکتا تھا۔ ایک دن کسی طرف سے رونے کی آواز آئی۔ سمجھا کہ قریش نے رونے کی اجازت دے دی ہے۔ نوکر سے کہا کہ دیکھنا کون روتا ہے؟ کیا رونے کی اجازت ہو گئی؟ نوکر نے کہا کہ ایک عورت کا اُونٹ گم ہو گیا ہے، اس کے لیے رو رہی ہے، رونے کی اجازت نہیں ملی۔ اس پر وہ کلیجہ مسوس کر رہ گیا اور کہا کہ وا اسفا! ایک عورت کو اونٹ کے غم میں رونے کی تو اجازت ہے لیکن ایک باپ کو تین بیٹوں کے غم میں رونے کی اجازت نہیں!

احساسِ برتری

لیکن ان تمام چیزوں سے بڑھ کر ایک اور جذبہ تھا جو عربوں کی تمام زندگی پر پوری طرح چھایا ہوا تھا اور وہ جذبہ تھا احساسِ برتری کا۔ کوئی گوارا نہیں کرتا تھا کہ کوئی دُوسرا اس کی ہمسری کا دعویٰ کرے۔ ایک فرد کو دوسرے فرد سے آگے نکلنے کی خواہش ہمیشہ بے تاب رکھتی تھی۔ ایک قبیلہ کو دوسرے قبیلہ سے منافست کا جذبہ انہیں سب کچھ بھُلا دیتا تھا۔ یہی جذبہ تھا جس کی بنا پر نسلی تفاخر انتہائی شدت اور قبائلی تفوق غُلو تک پہنچ چکا تھا۔ من حیث القوم اپنی فصاحت اور طلاقت پر اس قدر ناز تھا کہ وہ ہر غیر عرب کو عجم (یعنی گونگا) کہتے تھے۔ پھر خود اپنے اندر مختلف قبائل کی یہ حالت تھی کہ اونچے درجہ کا قبیلہ نچلے درجے والے سے بات تک کرنا گوارا نہیں کرتا تھا۔ یہ نسلی امتیازات اور نسبی مفاخرات اس قدر محکم گیر اور بنیاد رس ہو چکے تھے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس جذبہ کو ان کے دل سے نہیں نکال سکتی تھی۔ ان ہی امتیازات نے ان کی وحدتِ قومی کے ٹکڑے ٹکڑے کر رکھے تھے اور پوری کی پوری قوم شعوب اور قبائل کے چھوٹے چھوٹے

حلقوں میں بٹ چکی تھی۔ جن قبائل میں کہیں حلفِ وفاداری قائم ہوگیا، ان میں تو خیر، ورنہ قبیلہ سے قبیلہ اور گروہ سے گروہ خونخوار بھیڑیوں کی طرح لڑتا رہتا تھا اور یہ سب کچھ احساسِ تفوّق اور جذبۂ برتری کے خیال سے ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے قبیلہ سے وابستگی اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ اس سے غرض ہی نہ تھی کہ حق پر کون ہے اور باطل پر کون۔ اپنے قبیلہ کا ساتھ دینا، بس یہی حق تھا۔ یہی تھی وہ عصبیتِ جاہلیہ جس کی بنا پر اگر قبیلہ سے باہر کسی کا قتل کیا جائے تو قبیلہ کا ہر فرد اس قتل کا ذمّہ دار بن جاتا تھا لیکن اگر قبیلہ کے اندر قتل ہو جائے تو قاتل کو کوئی شخص پناہ نہیں دے سکتا تھا۔ عہدِ جاہلیہ کے شعراء کا کلام اٹھا کر دیکھئے، آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ قبائلی عصبیت کیا بلا تھی! قبائل کا امتیازِ مراتب ان کے ہاں اس قدر مسلّم ہو چکا تھا کہ جو قبیلے زیادہ شریف سمجھے جاتے تھے ان کے ایک آدمی کے قتل کے بدلہ میں دوسرے قبیلہ کے دو آدمیوں کو قتل کیا جاتا۔ زندگی کے اور شعبے تو ایک طرف، میدانِ جنگ میں ان کی یہ کیفیت تھی کہ غزوۂ بدر میں قریش کی طرف سے عقبہ اور شیبہ میدان میں آئے اور مقابلہ کے لیے پکارا تو مسلمانوں کی طرف سے انصار کے دو افراد ان کے سامنے آئے۔ اس پر عقبہ نے یہ کہہ کر لڑنے سے انکار کر دیا کہ انصار قریش کی جوڑ کے نہیں ہیں۔ ہم ان سے لڑنا باعثِ ننگ سمجھتے ہیں۔ اس جنگ میں جب ابوجہل انصار کے ہاتھوں مارا گیا تو اُسے اس بات کا سخت رنج تھا کہ وہ کاشتکاروں کی قوم کے ہاتھوں کیوں قتل ہوا ہے۔

بنو امیہ اور بنو ہاشم ایک ہی درخت (قریش) کی دو شاخیں تھیں۔ لیکن بایں ہمہ، باہمی منافست و رقابت انتہا تک پہنچی ہوئی تھی۔ ابوجہل سے جب ایک شخص نے پوچھا کہ "محمدؐ کی دعوتِ اسلام کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے"، تو اُس نے کہا کہ "میں کیا کہوں؟ محمدؐ کے خاندان نے عزت و شرف میں دعویٰ برتری کیا اور ثبوت میں دعوتیں کھلائیں۔ اس کے جواب میں اسی شان کی دعوتیں ہم نے بھی دیں۔ انہوں نے خوں بہا دیئے، ہم نے بھی دیئے۔ انہوں نے بڑی بڑی فیّاضیاں کیں ہم نے بھی کیں۔ ہم دونوں خاندان ہم پلّہ ہو چکے تھے کہ دفعۃً ان کی طرف سے اب یہ دعویٰ پیش ہوا کہ ہمارے خاندان میں نبوّت اور آسمان سے وحی آگئی ہے۔ اب ہم کہاں تک برداشت کریں"۔ اسی ابوجہل کا واقعہ ہے (اور سنئے کہ کس قدر دلچسپ واقعہ ہے!) جب بدر کی لڑائی میں ایک مسلمان مجاہد اس کا سر کاٹنے لگا تو اس نے کہا کہ دیکھنا! میری گردن کو ذرا نیچے، کندھوں کے برابر سے کاٹنا۔ اس نے پوچھا کہ یہ کیوں؟ کہنے لگا کہ جب لڑائی کے بعد مقتولین کے سروں کا نیزوں پر جلوس نکلے گا تو میرا سر باقیوں سے اونچا ہوگا اور دُور سے نمایاں طور پر نظر آئے گا کہ فلاں سردار کا سر ہے۔ غور فرمائیے کہ ان لوگوں کا

جذبۂ تفوق و برتری کس حد تک دل کی گہرائیوں میں اُتر چکا تھا۔ عربوں کے اس جذبۂ منافست و مسابقت کے واقعات اس قدر دلچسپ تھے کہ دوسری قومیں انہیں افسانوں کے رنگ میں پیش کیا کرتی تھیں۔ ایک بدّو کے ہاں ایک گھوڑی تھی، برق رفتار۔ ملکی اس کا نام تھا۔ وہ گھوڑ دوڑ کے میدان میں کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہی۔ بدّو اسے جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ ایک رات چور آئے اور ملکی کھول کر لے گئے۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد بدّو کو اس کا علم ہو گیا اور وہ دوسرے گھوڑے پر سوار ہو کر چوروں کے تعاقب میں نکلا۔ تھوڑی دور جا کر اس نے چور کو دیکھ لیا۔ اب کیفیت یہ تھی کہ چور ملکی پر سوار آگے آگے ہے اور یہ بدّو گھوڑے پر سوار اس کے پیچھے۔ حتیٰ کہ کچھ دور اور آگے جا کر بدّو چور کے برابر آ گیا۔ ضرورت اس کی تھی کہ وہ آگے بڑھ کر چور کا راستہ روک لے اور اسے گرفتار کر لے۔ دو ہی قدم کے بعد بدّو نے دیکھا کہ اس کا گھوڑا ملکی سے آگے بڑھنے والا ہے۔ اس نے چلّا کر چور سے کہا کہ کمبخت! گھوڑی کا دایاں کان مروڑ۔ اس نے ملکی کا کان مروڑا تو وہ ہوا سے باتیں کرنے لگی اور وہ دو سیکنڈ کے اندر یہ جا اور وہ جا۔ اب اس کا گھوڑا اسے کب پا سکتا تھا۔ خاسر و ناکام خیمہ میں واپس آ گیا اور سر پکڑ کر رونے لگا۔ دوسروں نے پوچھا کہ کیوں؟ کوئی سراغ نہیں ملا؟ کہنے لگا، سراغ تو ایک طرف، میں نے تو چور کو پا لیا تھا۔ اس کے بعد اس نے ان سے سارا واقعہ بیان کیا۔ انہوں نے کہا کہ پاگل! جب تو دیکھتا تھا کہ ایک ہی قدم کے بعد تو چور سے آگے بڑھ کر اسے پکڑ لے گا، تو اس وقت ملکی کا یہ راز اسے کیوں بتا دیا جس سے وہ برق رفتار ہو گئی۔

کہنے لگا کہ اسے راز نہ بتاتا تو کیا یہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا کہ وہ ملکی جو عمر بھر کسی بڑے سے بڑے گھوڑے سے پیچھے نہیں رہی، وہ اس ٹٹّو سے مات کھا گئی ہے؟ میری غیرت اسے گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ میں ملکی کو کسی سے پیچھے رہتے دیکھ نہیں سکتا تھا۔

غور کیجئے کہ ان کی غیرت کس حد تک بڑھی ہوئی تھی اور ان کا جذبۂ برتری کن کن شکلوں میں کام کرتا تھا۔

یہی جذبہ تھا جس نے ان کے دلوں کو انتقام کی آگ سے بھر رکھا تھا۔ عرب کا جذبۂ انتقام! الامان والحفیظ! اس انتقام کو ان کے ہاں ثار کہا جاتا تھا اور اس کا سلسلہ صدیوں تک قائم رہتا تھا۔ اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں انتقام نہیں لے سکا، تو مرتے وقت وصیت کر جاتا تھا کہ قاتل کی اولاد سے انتقام لیا جائے اور یہ سلسلہ جاری رہتا حتیٰ کہ قاتل اور اس کے خاندان تک کا نام و نشان مٹ چکتا۔ لیکن جب تک اس قبیلہ کے کسی آدمی کو قتل نہ کر دیا جاتا، آتشِ انتقام فرو نہ ہوتی۔ ایک ایک قتل پر سینکڑوں سال کی لڑائیاں اسی بناء پر قائم رہتی تھیں۔ ثار

کے متعلق ان کے ہاں یہ عقیدہ پیدا ہو چکا تھا کہ مقتول کی رُوح پرندہ بن جاتی ہے اور جب تک اس کا انتقام نہیں لے لیا جاتا وہ مقامِ قتل پر شور کرتی رہتی ہے کہ "مجھے پلاؤ میں پیاسی ہوں"۔ اس پرند کو صدیٰ یا ہاما کہتے تھے۔ ثار کا جذبہ ان کے دلوں میں اس قدر راسخ تھا کہ بعض مواقع پر یہی جذبہ ان کے اسلام قبول کرنے میں مانع ہو جاتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اسلام اس طرح کے انتقام کا سخت دشمن ہے، اس لیے جب تک وہ اپنے اس جذبۂ آتشیں کی تسکین نہیں کر لیتے تھے، اسلام نہیں لاتے تھے۔ عمرو بن اقیش اسلام سے متاثر ہوئے اور اسے قبول کرنے پر بالکل آمادہ۔ لیکن ان کا ایک انتقام زمانۂ جاہلیت میں باقی رہ گیا تھا۔ جب تک وہ انتقام لے نہیں لیا مسلمان نہیں ہوئے۔ اسی طرح حضرت عمرو بن مالکؓ اسلام لا کر اپنے قبیلہ میں واپس آگئے اور انہیں دعوتِ اسلام دی تو قبیلہ والوں نے کہا کہ بات تو ہمارے بھی جی لگتی ہے لیکن بنو عقیل پر ہمارا ثار باقی ہے۔ وہ لے لیں تو پھر مسلمان ہوں گے۔ چنانچہ انہوں نے بنو عقیل پر جو مسلمان ہو چکے تھے، حملہ کیا اور انتقام کا "فریضہ" ادا کر لینے کے بعد مسلمان ہوئے۔ اس انتقام گیری میں انہیں دیر اس لیے بھی لگتی تھی کہ ان کے ہاں خدع و فریب سے کام لینا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ وہ انتقام لیتے تو کھلے بندوں للکار کر لیتے۔ بلکہ اُن کے اصولِ مبارزت تو اس سے بھی کہیں بلند تھے۔ وہ جب تک دشمن کو برابر کی پوزیشن نہ دیتے، اس پر حملہ نہیں کرتے تھے۔ غزوۂ احزاب میں دشمن کی فوج سے عمرو بن عبدود جو شجاعت اور بسالت میں ایک ہزار سپاہی کے برابر سمجھا جاتا تھا، میدان میں بڑھا اور مبارزت طلبی کی۔ مسلمانوں کی طرف سے حضرت علیؓ مقابلہ کے لیے میدان میں آئے اور اس سے کہا کہ آؤ میرے ساتھ نبرد آزمائی کرو۔ اس پر، یہ نوّے برس کا بوڑھا سردار استخفاف کی ہنسی ہنسا اور کہا کہ مجھے اُمید نہ تھی کہ اس آسمان کے نیچے کسی کو یہ جرأت بھی ہو گی کہ مجھے دعوتِ مقابلہ دے۔ بہرحال، اسے یہ چیلنج قبول کرنا پڑا۔ حضرت علیؓ پیادہ تھے اور وہ گھوڑے پر سوار۔ اس نے کہا کہ پیدل کا سوار سے کیا مقابلہ؟ یہ کہہ کر اپنے گھوڑے سے نیچے اُتر آیا اور سب سے پہلے اپنے گھوڑے کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔ جب دونوں حریف یوں برابر ہو گئے، تو پھر مقابلہ کے لیے آگے بڑھا۔ یہ تھے ان کے اصولِ مبارزت اور یہ تھی ان کی غیرت!

اختصار کی غرض سے ہم انہی نظائر پر اکتفا کرتے ہیں ورنہ ان کی غیرت و حمیّت، جرأت و بسالت،

لہ اصابہ فی احوال الصحابہ۔ اس کے بعد اسلامی تربیت نے ان کی کس طرح قلبِ ماہیت کر دی، اس کا ذکر اپنے مقام پر آئے گا۔

ایفائے عہد اور پختگیٔ پیمان اور دوسری طرف عصبیتِ جاہلیہ اور ثار و انتقام کی داستانیں بے شمار ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ جس قوم میں پہلے ہی سے یہ جوہر موجود تھے انہیں ایسی قوم بنا دینا جس کے سامنے دنیا کی کوئی اور قوم ٹھہر نہ سکے، کون سا مشکل کام تھا۔ یہ اعتراض بڑی سطح بینی پر مبنی ہے اور یہی وہ سطحیت ہے جس کی بناء پر یورپ کے اکثر مستشرقین نے بھی سخت دھوکا کھایا ہے۔ وہ جب اسلام کے پیدا کردہ انقلاب پر تبصرہ کرتے ہیں تو نہایت بے تکلفی سے کہہ دیتے ہیں کہ یہ سب عربوں کی جغرافیائی پوزیشن اور ان کی طبعی افتاد کی بناء پر تھا۔ رسول عربی (صلعم) نے فقط اتنا کیا کہ اُن کی اِن بے پناہ قوتوں کو جو اُن کے اندر از خود موجود تھیں، لیکن جو اس سے پہلے خود اُن کے اپنے خلاف استعمال ہوتی تھیں، ایک محاذ پر مرکوز کر دیا اور اس محاذ کا رُخ اپنوں کی بجائے غیروں کی طرف پھیر دیا۔ بس یہ ہے راز (ان کے نزدیک) عربوں کے اس انقلاب کا جو اسلام کی رُو سے اس کے اندر پیدا ہوا۔ حتّٰی کہ بیکر جیسے مؤرخ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ان میں توحید کا تصور بھی صحرا کی یکسانیت نے پیدا کر دیا تھا! (گویا عربوں نے ظہورِ اسلام کے وقت سے صحرا میں رہنا شروع کیا تھا۔ اس سے پہلے روم و یونان کے شہروں میں رہا کرتے تھے! یا للعجب!)۔

لیکن جن کی نگاہیں سطح سے نیچے اُتر کر حقائق پر پہنچتی ہیں، وہ جانتے ہیں کہ وہ انقلاب کیا تھا جو عربوں میں پیدا ہوا تھا اور اس قوم میں اس قسم کی انقلاب آفرینی کس قدر مشکل تھی! عربوں کا انقلاب اتنا ہی نہیں تھا کہ انہوں نے اپنی منتشر قوتوں کو مجتمع کر کے ایران اور روم کی سلطنتوں کو فتح کر لیا۔ اتنا کچھ تو شاید کوئی چنگیز خان بھی کر دیتا۔ عربوں کا انقلاب یہ تھا کہ انہوں نے دنیا کی عمرانی، تمدنی اور اخلاقی زندگی کی تاریخ بدل ڈالی۔ اور

چند ہی سال کے عرصہ میں اس دُنیا کا بیشتر حصہ، قدیم دنیا کے بجائے بالکل نئی دُنیا بن گیا۔

(PRINGLE KENNEDY, P.18)

اُنہوں نے کائنات کی اقدار (VALUES) بدل دیں۔ دنیا کو خیر و شر کے نئے پیمانے دیئے۔ قصرِ انسانیت کو بالکل جدید بُنیادوں پر تعمیر کیا۔ غرضیکہ ایک ایسا انقلاب پیدا کیا جس سے دنیا ایک نئی شاہراہ پر چل پڑی اور آج جب زمانہ مُڑ کر اس انقلاب کی طرف دیکھتا ہے، تو اُسے صاف نظر آجاتا ہے کہ یہ انقلاب دنیائے قدیم و جدید میں ایک متمیز حدِ فاصل کی حیثیت رکھتا ہے۔

لیکن دُنیا میں یہ انقلاب پیدا نہیں ہو سکتا تھا جب تک خود اس قوم کے قلب و دماغ میں بُنیادی انقلاب پیدا نہ کیا جاتا۔ اب آپ غور کیجئے کہ ایک ایسی قوم میں، جس کی نفسیاتی کیفیات کا ہم ابھی ابھی مطالعہ کر

چکے ہیں، اس قسم کا بنیادی انقلاب پیدا کرنا کس قدر کٹھن مرحلہ تھا۔ وہ جن کی خود سری اور انانیت کا یہ عالم تھا کہ اگر ان کا معبود بھی ان کی مرضی کے خلاف فیصلہ دے، تو وہ اس معبود کو اٹھا کر پھینک دیں، ان کے قلوب کو احکام و قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے لیے ایسے پیکر بنا دینا کہ ان کی خلاف ورزی کا تصوّر تک بھی ان کے ذہن میں نہ آئے، کسی چنگیز و اسکندر کا کام نہ تھا۔ وہ جن کے قبائلی تفاخر کی یہ کیفیت تھی کہ وہ اپنے سے کمتر قبیلہ والے کے ساتھ لڑنا تک بھی باعثِ عار سمجھتے تھے، انہیں اس عظیم الشّان اصول کا مبلّغ بنا دینا کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (۴۹/۱۳) (تم میں سب سے زیادہ واجب التکریم اور صاحبِ عزّت وہ ہے جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کا پابند ہے، خواہ پیدائش کے اعتبار سے وہ کوئی بھی کیوں نہ ہو) کوئی معمولی بات نہ تھی۔ جن لوگوں کی آتشِ انتقام سو سو برس تک بھی فرو نہیں ہوتی تھی، انہیں اس تعلیم کا پرستار بنا دینا کہ دشمن پر قابو پا لینے کے بعد اُسے معاف کر دینا من عزم الامور ہے، کوئی آسان کام نہ تھا۔ جن لوگوں نے حوالیٔ کعبہ میں سینکڑوں بُت نصب کر رکھے تھے، انہیں توحیدِ خالص کا علمبردار بنا دینا صحرا کی یکسانیت کے اثر سے ممکن نہ تھا۔ صحرا تو وہاں روزِ ازل سے موجود تھا۔ جو لوگ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے، ان میں ایسا ذہنی انقلاب پیدا کر دینا کہ وہ مصافِ زندگی میں مرد اور عورت میں کوئی فرق نہ سمجھیں، کسی دستِ کارکشا ہی کا کام ہو سکتا تھا۔

اور پھر یہ سب نئے اصول اس قوم کے افراد سے منوانا جن کی کیفیت یہ تھی کہ سب کچھ جاننے بوجھنے کے بعد بھی وہ محض قومی غیرت کی بناء پر، اسلاف کی روش سے ہٹنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ خود نبیٔ اکرمؐ کے چچا (ابوطالب) جو آپ کو اپنے جان و دل سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، ان کی یہ حالت تھی کہ حضورؐ جب بھی دعوتِ توحید دیتے، تو وہ کہہ دیتے کہ "کیا کروں، بزرگوں کے مذہب کو کیسے چھوڑ دوں"۔ حتّٰی کہ جب آپؐ نے چچا کی زندگی کے آخری ایام میں بھی دعوتِ توحید پیش کی، تو معلوم ہے کہ چچا کی طرف سے اس کا کیا جواب مِلا؟ یہ نہیں کہ میں تمہاری اس دعوت کو صحیح نہیں سمجھتا، بلکہ یہ کہ "بھتیجے! جو کچھ تم کہتے ہو، میں وہ کہہ کر تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا، لیکن قریش کہیں گے کہ ابوطالب موت سے ڈر کر مسلمان ہو گیا[۱]۔ اس لیے مجھے اپنے باپ دادا کے دین پر ہی مرنے دو"۔

یہ تھی وہ قوم جسے آنے والے انقلابِ عظیم کا اوّلین خمیر بننا تھا۔

آئیے اب دیکھیں کہ یہ انقلاب کس طرح رونما ہوا۔ پہلے یہ ریت کے ذرّے کس طرح بجلیوں کے شرارے بنے اور اس کے بعد انہوں نے کس طرح باطل کے ہر پردے کو جلا کر حقیقتوں کو بے نقاب کر دیا اور یہ کس کی تعلیم و تربیت کے تصدّق ہوا!

---

[۱] بخاری کتاب الجنائز و مسلم کتاب الایمان۔

ماحصل

گزشتہ اوراق میں دُنیائے تہذیب و تمدّن کی جو حالت ہماری نگاہوں سے گزر چکی ہے' اس کا نقشہ دورِ حاضر کے ایک ممتاز مورّخِ تہذیب نے ان الفاظ میں کھینچا ہے :-

اُس وقت (ظہورِ اسلام کے وقت) ایسا دکھائی دیتا تھا کہ تہذیب کا وہ قصرِ مشید جو چار ہزار سال میں جا کر تعمیر ہوا تھا، منہدم ہونے کے قریب پہنچ چکا ہے اور نوعِ انسانی پھر اسی بربریت کی حالت کی طرف لوٹ جانے والی ہے جہاں ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے خون کا پیاسا تھا اور آئین و ضوابط کوئی جانتا تک نہ تھا۔ قدیم قبائلی آئین اپنی قوّت و احترام کھو چکے تھے۔ اس لیے اب ملوکیت کے اندازِ کہن کا سکّہ دُنیا میں نہیں چل سکتا تھا۔ عیسائیت نے جن آئین و دساتیر کو رائج کیا تھا وہ نظم و ضبط اور وحدت و یکجہتی کے بجائے تشتّت و افتراق اور ہلاکت و بربادی کا موجب بن رہے تھے۔ غرضیکہ وقت وہ آچکا تھا جب ہر طرف فساد ہی فساد نظر آتا تھا۔ تہذیب کا وہ بلند و بالا درخت جس کی سرسبز اور شاداب شاخیں کبھی ساری دُنیا پر سایہ فگن تھیں اور آرٹ، سائنس اور لٹریچر کے زرّیں ثمرات سے بہرہ یاب ہو چکی تھیں، اب لڑکھڑا رہا تھا۔ عقیدت و احترام کی زندگی بخش نمی اس کے تنے سے خشک ہو چکی تھی اور وہ اندر تک سے بوسیدہ اور کھوکھلا ہو چکا تھا۔ سلسلۂ حرب و ضرب کے طوفان نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے اور یہ ٹکڑے صرف رسوماتِ پارینہ کے بندھن سے ایک جگہ قائم تھے لیکن ان کے متعلّق ہر وقت خطرہ تھا کہ معلوم کب گر پڑیں[1]

فضائے عالم کی بھیانک تاریکیوں کو آپ دیکھ چکے۔ اب تابانیٔ سحر کا درخشندہ منظر دیکھئے۔

سحر قریب ہے اللہ کا نام لے ساقی

[1] بحوالہ خطباتِ اقبالؒ۔ یہ اقتباس (DENNISON) کی کتاب (EMOTION AS THE BASIS OF-CIVILISATION) سے لیا گیا ہے۔

مژدهٔ صبح دریں تیره شبانم دادند

شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

کیا ان حالات میں کوئی ایسا جذباتی کلچر کہیں سے پیدا کیا
جا سکتا تھا جو نوعِ انسان کو ایک مرتبہ پھر ایک نقطہ پر
جمع کر دیتا اور اس طرح تہذیب کو مٹنے سے بچا لیتا؟
اس کلچر کو بالکل نئے انداز کا ہونا چاہیے تھا، اس لیے کہ
پُرانی رسُومات اور آئین وضوابط سب مُردہ ہو چکے تھے
اور انہی جیسے اور آئین کا مرتّب کرنا صدیوں کا کام تھا۔
یہ امر موجبِ حیرت و استعجاب ہے کہ اس قسم کا نیا کلچر
سرزمینِ عرب سے پیدا ہُوا اور اُس وقت پیدا ہُوا جب کہ
اس کی اشد ضرورت[1] تھی!

---

[1] یہ اسی مؤرخِ تہذیب کا بیان ہے جس کی کتاب کا اقتباس (صفحہ ۵۲) پر دیا جا چکا ہے۔

اوّلین دورِ جہالت سے گزر کر، اب ہم ایک مختلف قسم کے انسانوں اور مذہب کی ایک نرالی دُنیا کی طرف آتے ہیں یعنی عربوں میں دینِ محمّدی کی اشاعت کی طرف ایک بہت بڑا انقلاب! ایسا انقلاب جس نے نوعِ انسان کی عام حالت اوران کے تصوّراتِ زندگی میں عجیب تبدیلی اور محیّر العقوُل رفعت پیدا کر دی۔

اس دَور کا ہیرو اپنے ابنائے جنس میں خدا نہیں سمجھا جائے گا بلکہ خدا کا پیغامبر تصوّر کیا جائے گا۔ یہ بطل پرستی (ہیرو ورشپ) کا دُوسرا دَور ہے۔ پہلا دَور اب کلیتہً ختم ہو چکا ہے اور دوبارہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔ تاریخِ عالم میں اب کوئی ایسا انسان نہیں آئے گا جسے اُس کے ہم جنس خُدا بنالیں۔ اب ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ یہ جہالت تھی اور انسانی فہم کی بہُت بڑی غلطی۔

(کارلائل: ہیروز اینڈ ہیرو وَرشپ)

عربوں کا ظہور ایک داستان ہے اور یقیناً دنیا کی تاریخ میں ایک غیر معمولی واقعہ
آئیے اب ہم ذرا ان کی طرف بھی دیکھیں اور ضمناً ان کا وہ حق بھی ادا کریں جو ال
ہی میں ہمارے سامنے آیا ہے۔ یہ حقیقت کہ دنیائے تہذیب کس حد تک عربوں
کی شرمندۂ احسان ہے، اتنے عرصہ تک اس لیے نگاہوں سے اوجھل نہیں رہی کہ
مسلمانوں نے ہمیں اپنے قریب نہیں آنے دیا، بلکہ اس لیے کہ عیسائی جس کے دشمن
ہو جائیں اس کی کوئی خوبی تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ہم یہ تو نہایت آسانی
سے کہہ دیتے ہیں کہ کوپرنیکس نہ ہوتا تو نیوٹن بھی نہ ہوتا لیکن یہ کبھی تسلیم نہیں کرتے
کہ عرب ہمیں علم الافلاک نہ دیتے تو کوپرنیکس پیدا ہی نہ ہو سکتا۔ یا ہم بہ آسانی کہہ
دیتے ہیں کہ یہودیت نہ ہوتی تو عیسائیت بھی نہ ہوتی لیکن اس حقیقت کو بہ آسانی
تسلیم نہیں کرتے کہ عرب نہ ہوتے تو دورِ حاضرہ کی تہذیب بھی کہیں نہ ہوتی۔

(DORSEY-CIVILISATION -- PP.234 & 639)

اَب ہماری نگاہ اُس ناقابلِ فراموش انقلاب پر مرکوز ہے جس نے اقوامِ عالم (کے قلب) پر ایک نرالا لیکن دائمی نقش ثبت کر دیا۔

(GIBBON-DECLINE AND FALL -- VOL.II, P.255)

وہ روشنی جس سے تہذیب کی شمع دوبارہ جلائی گئی، یُونانی اور رومی ثقافت کی ان چنگاریوں سے نہیں لی گئی جو یورپ کے کھنڈرات میں سُلگ رہی تھیں، نہ ہی باسفورس کے کنارے زندہ موت سے۔ یہ روشنی شمال کی طرف سے نہیں بلکہ جنوب کی طرف کے حملہ آوروں سے لی گئی۔ یہ روشنی عرب سے اُٹھی۔

(BRIFFAULT-THE MAKING OF HUMANITY -- P.183)

مغرب میں پوپ، کلیسا پر اپنے اقتدار کا مدّعی تھا مشرق میں قیصر کا یہی دعوٰی تھا جس کا بطلان مِصر اور شام کر رہے تھے۔ اِس طرح عیسائیت کی صفوں میں مُہلک انتشار پیدا ہو چکا تھا لیکن وقت آچکا تھا کہ ان صفوں کو بالکل معدُوم کر دیا جائے کیونکہ اب ایک عظیم الشّان رُوحانی قوّت عرب سے نمُودار ہونے والی تھی۔

(HISTORY OF THE WORLD -- W.N. WEECH -- P.250)

چند ہی سال کے عرصہ میں (فتنہ و فساد کا) یہ نقشہ کِس طرح بدل گیا؟ کِس طرح ۶۵۰ء تک یہ دُنیا، اُس دُنیا سے یکسر مختلف ہو گئی جو اس سے پہلے تھی؟ نوعِ اِنسان کی تاریخ میں یہ بابؑ ایک نمایاں خصُوصیت کا حامل ہے۔

(ARABIAN SOCIETY AT THE TIME OF MOHAMMAD-
PRINGLE KENNEY -- P.18)

میثاقِ خُداوندی

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ (۳/۸۱)

اور ہم اقوامِ سابقہ سے انبیاء کے ذریعے عہد لیا کرتے تھے کہ ہم نے تمہیں کتاب اور حکمت عطا فرمائی ہے۔ لیکن اس کے بعد جب ہم (عند الضّرورت) کوئی دوسرا رسول بھیجیں جو اس تعلیم کو سچ کر دکھائے جو تمہیں دی گئی تھی، تو تم گروہ بندانہ تعصب کی بنا پر اس کی مخالفت نہ شروع کر دینا، بلکہ اس کی صداقت پر ایمان لانا اور اس کی تائید کرنا۔

اللہ ان اقوام سے پوچھ لیا کرتا تھا کہ کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو کہ تم ان رسولوں کو اسی طرح مانتے جاؤ گے اور اس کا ذمہ لیتے ہو کہ ان کی تائید کرو گے؟ وہ کہتے کہ بے شک ہم اس کا اقرار کرتے ہیں۔ اس پر اللہ ان سے کہتا کہ اب تم اس عہد اور اقرار کی نگرانی کرنا اور میں بھی اس کی نگرانی کروں گا (کہ تم اسے نباہتے ہو یا نہیں)۔

دُعائے خلیلؑ

وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ اِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (۲/۱۲۷—۱۲۹)

اور (دیکھو وہ کیسا عظیم الشان اور انقلاب انگیز وقت تھا) جب ابراہیمؑ خانۂ کعبہ کی بنیادیں چن رہا تھا اور اسمٰعیلؑ بھی اس کے ساتھ شریک تھا۔ (ان کے ہاتھ تو پتھر چننے میں مصروف تھے اور زبان پر یہ دعا جاری تھی کہ) اے پروردگار! (ہم تیرے دو بندے تیرے مقدس نام پر اس گھر کی بنیاد رکھ رہے ہیں تاکہ یہ دنیا میں تیری توحید کا مظہر اور وحدتِ انسانیت کا مرکز بن سکے۔ سو) ہمارے اس عمل کو شرفِ قبولیت عطا فرما۔ بلاشبہ تو ہی ہے جو دعاؤں کا سننے والا اور (دلوں کے ارادوں کا) جاننے والا ہے۔ اے پروردگار! ہمیں ایسی توفیق عطا فرما کہ ہم سچے مسلم (یعنی تیرے قوانین کے اطاعت گزار) ہو جائیں اور ہماری نسل میں سے بھی ایک ایسی جماعت پیدا کر دے جو تیرے ضابطۂ قوانین کی محکوم و مطیع ہو (اور اس کے سوا کسی اور کے حکموں کے سامنے سر نہ جھکائے)۔ خدایا! تو ہمیں وہ طور طریقے بتا دے جن سے ہم اس مقصدِ عظیم کے حصول میں کامیاب ہو جائیں اور تیری عنایات و انعامات کا رُخ ہماری طرف رہے۔ اس لیے کہ تیرا ہی قانون وہ قانون ہے کہ جونہی کسی نے اس کی طرف رُخ کیا، وہ اپنے سامانِ رحمت و ربوبیت کو لے کر اس کی طرف بڑھ آیا۔

اے پروردگار! ہماری اولاد میں یہ سلسلہ اسی طرح قائم رہے تا آنکہ ان میں، اس دعوتِ انقلاب کو لے کر، وہ رسول اُٹھ کھڑا ہو جو تیرے ضابطۂ قوانین کو اُن کے سامنے پیش کر دے۔ انہیں اس کی تعلیم بھی دے اور یہ بھی بتائے کہ ان قوانین کی غرض و غایت کیا ہے اور (ایسا نظام متشکل کر دے جس میں) لوگوں کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ یقیناً تو غالب حکمت والا ہے۔

تمنّائے کلیمؑ

وَاکۡتُبۡ لَنَا فِیۡ هٰذِهِ الدُّنۡیَا حَسَنَةً وَّفِی الۡاٰخِرَةِ اِنَّا هُدۡنَاۤ اِلَیۡكَ ؕ قَالَ عَذَابِیۡۤ اُصِیۡبُ بِهٖ مَنۡ اَشَآءُ ۚ وَرَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ كُلَّ شَیۡءٍ ؕ فَسَاَكۡتُبُهَا لِلَّذِیۡنَ یَتَّقُوۡنَ وَیُؤۡتُوۡنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِیۡنَ هُمۡ بِاٰیٰتِنَا یُؤۡمِنُوۡنَ ۚ اَلَّذِیۡنَ یَتَّبِعُوۡنَ الرَّسُوۡلَ النَّبِیَّ الۡاُمِّیَّ الَّذِیۡ یَجِدُوۡنَهٗ مَكۡتُوۡبًا عِنۡدَهُمۡ فِی التَّوۡرٰىةِ وَالۡاِنۡجِیۡلِ ۫ یَاۡمُرُهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَیَنۡهٰىهُمۡ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیۡهِمُ الۡخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ كَانَتۡ عَلَیۡهِمۡ ؕ فَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِهٖ وَعَزَّرُوۡهُ وَنَصَرُوۡهُ وَاتَّبَعُوا النُّوۡرَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ۠ (۷؛ ۱۵۶-۱۵۷)

اور جب موسیٰؑ نے اپنے رب سے دعا مانگی کہ بارِ الٰہا! اس دنیا کی زندگی میں بھی ہمارے لیے خوشگواریاں پیدا کر دے اور مستقبل کی زندگی میں بھی۔ اس لیے کہ ہم تیری طرف رجوع کر رہے ہیں اور آخرت کی زندگی میں ہمارے لیے اچھائی کر۔ ہم تیری طرف لوٹ آئے۔

(ہمارا یہ قانون، سابقہ انبیاءؑ کی وساطت سے بھی ملتا رہا اور اب یہی قانون اس رسول کی معرفت آیا ہے۔ اس لیے اب ہماری ربوبیت اور مرحمت ان لوگوں کے حصے میں آئے گی جو نظامِ ربوبیت قائم کرنے کے لیے) اس رسول کے پیچھے پیچھے چلیں گے جو، (قرآن ملنے سے پہلے) اُمّی تھا (۲۹/۴۸) جس کی علامات (یہود و نصاریٰ) اپنے ہاں، تورات اور انجیل میں لکھی پاتے ہیں۔ وہ اُن باتوں کا حکم دیتا ہے جسے وحیِ خداوندی صحیح تسلیم کرتی ہے اور اُن امور سے روکتا ہے جو اس وحی کی رُو سے ناپسندیدہ ہیں۔ اس وحی کی رُو سے وہ زندگی کی تمام پاکیزہ، خوشگوار چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے اور اُن خبائث کو حرام ٹھہراتا ہے (جن کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ ۶/۱۴۶) اور (مذہبی پیشواؤں کے جن خودساختہ آئین و شرائع اور مستبد حکام کے جور و ستم کے) جس بوجھ کے نیچے انسانیت دبی چلی آ رہی تھی، اُس بوجھ کو اس کے سر سے اُتارتا ہے اور (تقلید و اوہام کی جن زنجیروں میں، انسانی قلب و دماغ جکڑا ہوا تھا) ان زنجیروں کو توڑتا ہے (۷/۱۵۷)۔ اور اس طرح انسان کو صحیح آزادی عطا کرتا ہے کہ وہ (حدود اللہ کا پاس رکھتے ہوئے) اپنی سعی و کاوش سے

جن بلندیوں تک جانا چاہے چلا جائے۔ اس کے راستے میں کوئی روک نہ ہو۔

لہٰذا، جو لوگ اس کی نبوّت پر ایمان لے آئیں اور اس کے پیش کردہ پیغام کے مخالفین کے لیے روک بن کر اُس کی مدافعت کریں، اس نظام کے قیام میں اُس کی مدد کریں اور اس مقصد کے لیے اس روشنی کو اپنے لیے چراغِ راہ بنائیں جسے اس رسول کی طرف نازل کیا گیا ہے تو یہی لوگ ہوں گے جن کی کھیتیاں پروان چڑھیں گی اور جو کامیاب و کامران زندگی بسر کریں گے۔

توراتمیں

" خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی پیدا کرے گا۔ تم اس کی طرف کان دھر لیو۔" (استثنا، ۱۸/۱۵)

اور خداوند نے مجھ سے کہا..... میں ان کے لیے ان کے بھائیوں (بنی اسمٰعیل) میں سے تجھ سا ایک نبی پیدا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اس سے فرماؤں گا وہ سب اُن سے کہے گا۔ اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتیں جنہیں وہ میرا نام لے کر کہے گا، نہ سُنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔ (استثنا، ۱۸/۱۸-۱۹)

خداوند خدا سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا اور فاران (مکّہ) کے پہاڑوں سے وہ جلوہ گر ہوا۔ اور لاکھوں قدسیوں میں سے آیا۔ (استثنا، ۳۳/۲)

نویدِ مسیحا

وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ ط (۶۱/۶)

اور جب عیسیٰ ابنِ مریم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ میں تمہاری طرف اللہ کا پیغامبر ہوں اور اس تعلیم کو سچ کر کے دکھانے والا جو تمہارے پاس اس سے پہلے تورات میں آچکی ہے اور میں تمہیں بشارت دیتا ہوں کہ میرے بعد ایک رسول آئے گا جس کا نام احمدؐ ہوگا۔

انجیل میں

میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہیں آئے گا۔ لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا ..... مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں لیکن تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ، یعنی سچّائی کی روح آئے گا تو تم کو تمام سچّائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہیں کہے گا، بلکہ جو کچھ سُنے گا وُہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔ (انجیل یوحنّا، ۱۶/۷-۱۴)

لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمہاری طرف باپ کی طرف سے بھیجوں گا، یعنی سچائی کا روح جو باپ کی طرف سے نکلتا ہے وہ میری گواہی دے گا اور تم بھی گواہ ہو۔

(انجیل یوحنّا، ۱۵/۲۶)

اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے، دے دی جائے گی۔ اور جو اس پتھر پر گرے گا اُس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے مگر جس پر وہ گرے گا وُہ اسے پیس ڈالے گا۔ (انجیل متی، ۲۱/۴۳-۴۴)

کتابِ سیرت کے کھلے ہوئے اوراق

حضرت موسیٰ کی سیرت کو لیجئے۔ صدیوں تک یہ زبانی روایات اور قصص و اساطیر پر مشتمل رہی اور اس کی آخری صورت آپ کی وفات کے کہیں آٹھ سو یا ایک ہزار سال بعد جا کر متشکل ہوئی۔

گوتم بدھ کو لیجئے۔ آپ کی وفات کے عرصۂ بعید کے بعد کہیں جا کر اس کی کوشش کی گئی کہ آپ کی زندگی کے نمایاں واقعات کو منضبط کیا جائے لیکن چونکہ ہندی ذہن تاریخ کے لیے مناسب ہی واقع نہیں ہوا، اس لیے یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہو سکی بس اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ انہوں نے اپنے باپ کا گھر کیسے چھوڑا اور پھر عرصۂ دراز کی جدّوجہد کے بعد اس چیز کو پالیا جسے وہ رازِ زندگی کہتے تھے۔

جنابِ مسیح کو لیجئے تو ہم بجائے اس کے کہ تاریخی واقعات تک پہنچ سکیں، افسانوں کی دُنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ اگرچہ ہم عیسائیت کے بانی کے قریب رسائی حاصل کر لیتے ہیں لیکن اس کے عہد کے مصنّفین کی خاموشی، اس تحریک کے ابتدائی ادوار کی تاریخ کے متعلق رازداری، اس کے قدیمی نوشتوں کے زمانۂ تحریر کے متعلق شبہات، بالخصوص اناجیل کی تصنیف کے متعلق شکوک وغیرہ، جنابِ مسیح کی اس زندگی کے متعلق جو ہمارے سامنے پیش کی جاتی ہے، بہت سی چیزوں کو تاریکیوں میں چھوڑ دیتی ہیں۔

لیکن حضرت محمدؐ کی سیرت کے متعلق اس قسم کی کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ آپؐ کی سیدھی سادی پیدائش، بچپن کے ایّام کا صحرانشین بدّوؤں کے خیموں میں بسر ہونا، آپ کی ایک ایسی بیوہ سے شادی جو عمر میں آپ سے کہیں بڑی تھیں، آپ کا مبلّغِ توحید کی حیثیت سے دعوئ نبوّت، مکّہ کا طویل قیام، وہاں کے مصائب و نوائب، مدینہ کی طرف ہجرت اور اس شہر کے باشندوں کا قبولِ اسلام، عرب کے نامور قبائل کا آہستہ آہستہ آغوشِ حق و صداقت میں داخلہ، مکّہ کی طرف مراجعت اور وفات یہ تمام حالات و واقعات اس طرح متحقق و متعین ہیں جس طرح آج ہمارے لیے فریڈرک اعظم یا آلیور کرامول کے حالاتِ زندگی۔

(ARABIAN SOCIETY AT THE TIME OF MOHAMMAD-

PRINGLE KENNEDY -- P.19-21)

وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا ۳۹/۶۹

صبحِ بہار

برخیز کہ آدم را ہنگامِ نمود آمد
این مُشتِ غباری را انجم بسجود آمد

آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ است

از دمِ سیرابِ آں اُمّی لقب
لاله رُست از ریگِ صحرائے عرب

اُو دلے در پیکرِ آدم نهاد
اُو نقاب از طلعتِ آدم کُشاد

در جهاں آئینِ نَو آغاز کرد
مسندِ اقوامِ پیشیں در نورد

هر خداوندِ کهن را اُو شکست
هر کهن شاخ از نمِ اُو غنچه بست

عقل را اُو صاحبِ اسرار کرد
عشق را اُو تیغِ جوهردار کرد

از کلیدِ دیں درِ دُنیا کُشاد
همچو اُو بطنِ اُمِ گیتی نزاد

دینِ اُو آئینِ اُو تفسیرِ کُل
در جبینِ اُو خطِ تقدیرِ کُل

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا

خیز و قانونِ اخوت ساز دہ جامِ صہبائے محبت باز دہ
باز در عالم بیار ایامِ صلح جنگجویاں را بدہ پیغامِ صلح
شورشِ اقوام را خاموش کن نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن
باز این اوراق را شیرازہ کن باز آئینِ محبت تازہ کن
رہرواں را منزلِ تسلیم بخش قوتِ ایمانِ ابراہیم بخش
نوعِ انساں مزرع و تو حاصلی کاروانِ زندگی را منزلی

سجدہ ہائے طفلک و برنا و پیر
از جبینِ شرمسارِ ما بگیر

صبحِ بہار

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی
جلوہ اَت تعبیرِ خوابِ زندگی

جب زمین گرمی کی شدت سے تمتما اُٹھتی ہے، تمازتِ آفتاب اس کی رگ رگ سے نم زندگی چوس لیتی ہے۔ آسمان کی شعلہ ریزیاں ساری فضا کو دہکتا ہوا انگارا بنا دیتی ہیں۔ بادِ سموم کی ہلاکت سامانیاں تازگی و شگفتگی کی ہر نمود کو جھلس ڈالتی ہیں۔ پھول مرجھا جاتے ہیں۔ شگوفوں کی گردن کے منکے ٹوٹ جاتے ہیں۔ لالہ کا رنگ اُڑ جاتا ہے۔ پتیاں سوکھ جاتی ہیں۔ شاخیں پژمردہ ہو جاتی ہیں۔ لہلہاتی کھیتیاں خشک ہو جاتی ہیں۔ سرو و صنوبر آتش دانِ ارضی کے دُودکش دکھائی دیتے ہیں۔ تابندہ چشمے دیدۂ کور کی طرح بے نور ہو جاتے ہیں۔ مرمریں ندیاں خطِ تقدیرِ محکوماں کی طرح بے آب رہ جاتی ہیں۔ لُو کی دہشت سے سارے کانپتے ہیں۔ راستے ہانپتے ہیں۔ خنکی غاروں میں منہ چھپا لیتی ہے۔ ٹھنڈک سہم کر کنوؤں میں جا دبکتی ہے۔ دفورِ تپش سے سینۂ کائنات میں سانس رُکنے لگتی ہے۔ جنگل کے جانور آسمانی شعلوں کی لپیٹ سے کہیں پناہ نہیں پاتے۔ پرندے اپنے گھونسلوں میں نرم و نازک زبانیں نکالے نڈھال ہو کر پڑ جاتے ہیں۔ طائرِ نگاہ تک بھی کاشانۂ چشم میں سمٹ کر رہ جاتا ہے۔ انسان، زندگی اور اس کی تمام لطافتوں سے مایوس ہو جاتا ہے۔ سوختہ بخت کسان کھیت کے کنارے کھڑا التجائی ہوئی نظروں سے آسمان کی طرف تکتا ہے کہ کہیں سے اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان دکھائی دے لیکن اس کی خاسر و نامراد نگاہیں، حسرت بن کر اس کے ویرانۂ قلب میں لوٹ آتی ہیں۔ اس طرح جب حیاتِ ارضی کے کسی گوشے میں بھی اُمید کی نمی باقی نہیں رہتی اور بساطِ کائنات

کے کسی کونے میں بھی زندگی کی کوئی تازگی دکھائی نہیں دیتی تو یاس و نا اُمیدی کے اس انتہائی عالم میں مبداءِ فیض کی کرم گستری سے سحابِ رحمت کسان کی آنکھوں کا نور بن کر فضائے آسمانی پر چھا جاتا ہے اور اپنی جواہر پاشیوں اور گہر ریزیوں سے دامنِ ارض کو بھرپور کر دیتا ہے۔ زمینِ مردہ میں پھر سے زندگی آجاتی ہے۔ رگِ کائنات میں نبضِ حیات پھر سے متموّج ہو جاتی ہے۔ فضا کے سینے میں رُکی ہوئی سانس پھر سے زندگی کی جوئے رواں بن جاتی ہے۔ چشموں کی خشک آنکھیں شرابِ زندگی کے چھلکتے ہوئے جامِ نور بن جاتی ہیں۔ ندیوں کی بے آب لکیریں بادۂ جاں فزا کی مسیحا نفسی سے رگِ جان میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ سہمی ہوئی خنکیاں غاروں سے نکل کر فضاؤں پر چھا جاتی ہیں۔ دبکی ہوئی بُرودتیں، کنوؤں کی تہوں سے اچھل کر بساطِ ارض پر پھیل جاتی ہیں۔ خشک پتّوں میں جان پڑ جاتی ہے۔ مرجھائے ہوئے پھولوں میں از سرِ نو تازگی و شگفتگی آجاتی ہے۔ شگوفے چٹکتے ہیں، کلیاں مہکتی ہیں، ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے نفیس و لطیف جھونکے سرسبز و شاداب درختوں کی شاخوں میں لچک اور پھولوں میں یوں جُنبش پیدا کر دیتے ہیں گویا ـــ بہار جھُول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں ـــ ہر طرف ایک نئی زندگی اور ہر سمت ایک حیاتِ تازہ، جھُومتی، مسکراتی، مچلتی، لوٹتی، ایک ایسی جنّتِ نگاہ بن جاتی ہے جس کی ہر روش میں مسرّتوں کے چشمے اُبلتے اور ہر تختے میں قہقہوں کے پھول کھلتے دکھائی دیتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَیَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ؕ (۴۲/۲۸)

اور یہ اللہ ہی کی ذات ہے جو ایسی نا اُمیدیوں کے بعد اپنے سحابِ کرم کو بھیجتی اور اس طرح اپنی بساطِ رحمت کو صفحۂ ارض پر بچھا دیتی ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ (۷/۵۷)

اسی کی ذات ہے جو (زمین کے جھُلس جانے کے بعد) ان ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کو بھیجتی ہے جو اس کے ابرِ کرم کی پیشوائی میں ایک حیاتِ نو کی بشارت دیتی ہیں۔ پھر جب وہ ہوائیں، پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کو لے کر اُڑتی ہیں، تو خدا کا قانون انہیں زمینِ مردہ کی طرف کھینچ کر لے جاتا ہے۔ وہاں ان بادلوں سے پانی برستا ہے جس سے، اُسی زمینِ مُردہ سے، ہر قسم کے پھول اور پھل پیدا ہو جاتے

ہیں اور ہر طرف زندگی کی نمود ہو جاتی ہے۔

فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (۳۰: ۵۰)

پس اگر تم آنکھوں میں بصارت کے ساتھ بصیرت بھی رکھتے ہو تو اللہ کے ان آثارِ رحمت کو دیکھو اور غور کرو کہ وہ زمین کو اس کی موت کے بعد کس طرح حیاتِ تازہ عطا کرتا ہے۔

یہ فطرت کا نظام ہے۔ یہ اس کا قانون ہے جس کے قوانین اٹل اور جس کے آئین غیر متبدل ہیں۔ یہ اس کا قاعدہ ہے جس کے قواعد و ضوابط میں تبدیلی نہیں ہوا کرتی، کہ تبدیلیاں زمان و مکاں کے تغیرات کا نتیجہ ہوتی ہیں اور اس کی ذات زمان و مکاں کی قیود سے ماوراء اور ان کے اثرات سے بے نیاز ہے۔

لیکن ان مادی تشبیہات و استعارات سے ہٹ کر ذرا دنیائے انسانیت کی طرف آئیے اور دیکھئے کہ وہاں بھی یہی اصولِ فطرت کس طرح عمل پیرا ہے۔ یہ مادی تشبیہات و استعارات بھی درحقیقت اسی مقصد کے لیے بیان کیے جاتے ہیں کہ انسان ان محسوسات کی راہوں سے مجرد حقیقتوں کی طرف آئے اور جو کچھ عالمِ آفاق میں ہو رہا ہے اس سے عالمِ انفس پر دلیل لائے۔ گزشتہ اوراق میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ آج سے چودہ سو سال پیشتر دنیائے انسانیت کی کیا کیفیت ہو چکی تھی۔ تاریخ کی یادداشتیں اس پر شاہد ہیں کہ اس وقت عالمِ انسانیت کی خشک سالی اس سے کہیں زیادہ شدید و مہیب تھی جس کا تشبیہی منظر اوپر پیش کیا جا چکا ہے۔ اُس وقت شجرِ زندگی کی ہر شاخ سے نمی خشک ہو چکی تھی۔ تہذیب و تمدن کے پھول، وحشت و بربریت کی بادِ سموم سے مرجھا چکے تھے۔ حسنِ عمل کے زندگی بخش چشمے یکسر خشک ہو چکے تھے۔ زمین پر جوہرِ انسانیت کی سرسبزی و شادابی کا کہیں نشان تک باقی نہ تھا۔ کشتِ مذاہب و اخلاق کے حدود تو باقی تھے لیکن فصلیں بالکل اُجڑ چکی تھیں۔ اس وحشت و سراسیمگی کے عالم میں، خاسر و نامراد انسان اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا تھا۔ لیکن خدا کی اس وسیع زمین پر اسے کہیں زندگی کا نشان اور تازگی کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ چاروں طرف سے مایوس اور نااُمید ہو کر اس کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اُٹھتی تھیں اور ایک پکار سننے والے کو پکار پکار کر کہہ رہی تھیں کہ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ! یہ وقت تھا کہ فطرت کے اس اٹل قانون کے مطابق جس کی طرف اُوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، اس افسردگی و پژمردگی کو پھر سے تازگی و شگفتگی میں بدل دیا جاتا۔ چنانچہ اس کے لیے اس ربِّ ذو المنن کا سحابِ کرم، زندہ اُمیدوں اور تابندہ آرزوؤں کی ہزار جنتیں اپنے آغوش میں لیے، ربیع الاوّل کے مقدس مہینے میں فاران کی چوٹیوں پر جھوم کر آیا اور بلد امین کی مبارک وادیوں

میں کھل کھلا کر برسا جس سے انسانیت کی مرجھائی ہوئی کھیتیاں لہلہا اُٹھیں۔ اخلاق و تمدن کے پژمردہ پھولوں پر پھر سے بہار آگئی۔ عمرانیت و مدنیت کے سبزۂ پامال میں نزہت و لطافت پیدا ہوگئی۔ اعمالِ صالحہ کے خشک چشمے حیاتِ تازہ کے جوئے رواں میں تبدیل ہوگئے۔ طغیانی و سرکشی کی بادِ سموم، عدل و احسان کی جاں بخش نسیمِ سحری میں بدل گئی۔ فضائے عالم مسرتوں کے نغموں سے گونج اُٹھی۔ انسان کو نئی زندگی اور زندگی کو نئے ولولے عطا ہوئے۔ آسمان نے جُھک کر زمین کو مبارک باد دی کہ تیرے بختِ بلند نے یاوری کی اور تیرے خوش نصیب ذرّوں کو اس ذاتِ اطہر و اعظم کی پابوسی کی سعادت نصیب ہوگئی جو عالمِ موجودات کے سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی ہے، جس سے شرف و مجدِ انسانیت کی تکمیل ہوگئی، جو علم و بصیرت کے اس افقِ اعلیٰ پر جلوہ بار ہے جہاں عقل و عشق، فکر و نظر، دین اور دنیا قوسین کی طرح آپس میں ملتے ہیں، جو دانشِ نورانی اور حکمتِ برہانی کے اس مقامِ بلند پر فائز ہے جہاں غیب و شہود کی وادیاں دامنِ نگاہ میں سمٹ کر آجاتی ہیں۔ ہاں تو، آسمان نے خوش بخت زمین کی بارگاہِ عالیہ میں جُھک جُھک کر ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کیا۔ نوامیسِ فطرت نے "جنّت سے نکالے ہوئے آدم" کے اس طالعِ بیدار کا تقدیس و تحمید کے زمزموں سے استقبال کیا۔ دنیا سے طاغوتی قوتوں کے تخت اُلٹ گئے کہ وہ آنے والا آگیا جس کی آمد ملوکیت و قیصریت کے لیے پیغامِ فنا تھی۔ ایران کے آتش کدوں کی آگ ٹھنڈی پڑگئی کہ اب سے انسانی تصورات کی دُنیا نار کی جگہ نُور سے معمور ہوگئی۔ دنیا کے صنم کدوں کے بُت پاش پاش ہوگئے کہ آج مسلکِ ابراہیمیؑ کی تکمیل کا دن آگیا۔ شیاطین نے پہاڑوں میں جا کر منہ چھپالیا کہ اب جور و استبداد کی ہر طاغوتی قوت کے رُوپوش ہونے کا وقت آگیا۔ دنیا سے باطل کی تاریکیاں دور ہوگئیں کہ آج اس آفتابِ عالمتاب کا طلوع ہُوا جس کے بھیجنے والے نے اُسے "جگمگاتا چراغ" کہہ کر پکارا إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا ۝ (۳۳ / ۴۵-۴۶)۔ آنے والا جس کی آمد کا مقصد یہ بنایا گیا کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۝ (۷ / ۱۵۷) جب وہ آیا تو اس نے تمام اغلال و سلاسل کو ایک ایک کر کے توڑ دیا جن میں انسانیت جکڑی چلی آرہی تھی۔ احبار و رہبان کی تقلید کے اطواق و سلاسل، قیصر و کسریٰ کے استبداد کی زنجیریں، توہم پرستی کی بصیرت سوز بندشیں، تقسیمِ انسانیت کے انسانیت کُش نسلی، جغرافیائی، وطنی، غیر فطری معیار، سب ایک ایک کر کے ٹوٹتے چلے گئے اور پابندِ قفس طائرِ لاہوتی کو پھر سے آزادی کی فضائے بسیط میں اذنِ بال کشائی عطا ہوا اور انسان ایک مرتبہ پھر زمین پر سر اونچا

کرکے چلنے کے قابل ہوگیا۔ انسانیت کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی سیدھی راہ مل گئی۔ عقل کو عشق کا جنون اور عشق کو عقل کی فرزانگی عطا ہوئی۔ فقر کو شکوہِ خسروی اور پادشاہی کو استغنائے فاروقی عنایت ہوا۔ یہ تھی وہ ذاتِ گرامی کہ

محبت از نگاہش پائدار است
سلوکش عشق و مستی را عیار است
مقامش عبدہٗ آمد و لیکن
جہانِ شوق را پروردگار است

اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى (۳۰:۵۰)

اس طرح وہ دلوں کی مُردہ بستیوں میں پھر سے زندگی کا سامان پیدا کردیتا ہے۔

اسی حقیقتِ باہرہ کو باندازِ دگر دیکھئے۔ آویزشِ ابلیس و آدم سے سلسلۂ رُشد و ہدایت کی ابتدا ہوئی۔ ابلیسانہ قوتوں کی تائید میں کشش و جاذبیت کا وہ تمام نگاہ فریب سامانِ رنگ و تعطر تھا جو نگارخانۂ طلسم دِ حیات کے دامن میں بھر کر رکھ دیا گیا تھا۔ دوسری طرف انسانی راہ نمائی کے لیے پیغامِ ازلی تھا جو مبداءِ فیض کی شانِ ربوبیت سے انسانوں تک پہنچتا رہا۔ عقل خود بیں طبیعیاتی زندگی ہی کو سفرِ حیات کی آخری منزل قرار دے کر، اعلیٰ مقاصد اور بلند اقدار کو اس کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتی تھی لیکن یہ پیغامِ ازلی اس کے سامنے طبیعیاتی زندگی کی آرائشوں کے ساتھ ساتھ شرفِ انسانیت کی بلند حقیقتوں کو بے نقاب کرتا تھا۔ اس پیغام کی لِم ایک تھی، حقیقت ایک تھی، لیکن جوں جوں اس طلسم کدہ رنگ و بُو کی پیچیدگیاں بے نقاب ہوتی جاتی تھیں، اس تعلیم کی جزئیات میں مناسب ردّ و بدل اور ضروری تغیّر و تبدّل ہوتا جاتا تھا، تاکہ طبعی ارتقاء کے ساتھ ساتھ جوہرِ انسانیت میں بھی بتدریج ارتقاء ہوتا جائے۔ یہ ارتقائی مدارج تکمیل

کی طرف بڑھ رہے تھے۔ رہروانِ شوق کا یہ کارواں سوئے منزل جادہ پیما تھا۔ ان پیغمبرانِ حیاتِ جاوید کا ہر ایک قدم ایک خاص سمت اُٹھتا اور ہر نشانِ راہ ایک آخری مستقر کی طرف اشارہ کرتا جاتا۔ چنانچہ آنے والوں میں سے جو کوئی اپنے منصب کی تکمیل کے بعد واپس جاتا تو جاتے وقت ایک آخری آنے والے کا پتا نشان بنا کر جاتا، تاکہ جب وہ آنے والا آئے، تو یہ قافلہ بلا تأمل و توقف اس کے پیچھے ہولے اور راہ گم کردہ، مختلف وادیوں میں سرگرداں و حیراں نہ پھرتا رہے۔ اس لیے کہ یہ سب ایک ہی سلسلۂ زریں کی مختلف کڑیاں تھیں جن میں کی ہر کڑی، سلسلہ کی آخری کڑی کی روشن دلیل تھی۔ یہ سب ایک ہی کتابِ فطرت کے اوراق و ابواب تھے جن میں کا ہر ورق اور ہر باب، کتاب کے آخری باب کی تمہید تھا۔ یہ سب ایک ہی شجرِ طیب کی شگفتہ شاخیں تھیں جو ایک گلِ سرسبد کے لیے نویدِ بہار تھیں۔ چنانچہ جب مشیّتِ ایزدی کی یہ تدبیرِ محکم جس کے لیے زمین و آسمان قرنہا قرن سے یوں سرگرداں پھر رہے تھے، اپنی پختگی تک پہنچی، جب انسانیت جس کے لیے کائنات نے ایک ایک ذرّے کو لاکھوں چکر دیئے تھے، گہوارۂ طفولیت سے حریمِ شباب میں آگئی، جب اس صحیفۂ فطرت کی تکمیل کا وقت آگیا جس کے مختلف اوراق ستاروں کی ٹھنڈی ٹھنڈی مرمریں روشنی میں کوثر و تسنیم سے دُھلے ہوئے قلم سے لکھے گئے تھے، جب سینۂ کائنات میں اتنی کشادگی پیدا ہوگئی کہ وہ اپنے اندر رازہائے درونِ پردہ کے معدنِ لعل و گہر کو سمولے تو آسمان کی حوریں زمین پر اُتریں کہ جنّت کے تر و تازہ پھولوں سے وادیٔ بطحا کی تزئین و آرائش کریں۔ صحنِ گلستانِ کائنات پر بہار آگئی۔ ہر طرف سے مسرّتوں کے چشمے اُبلنے لگے۔ چاند مسکرایا، ستارے ہنسے، آسمان سے نور کی بارش ہوئی، فرشتوں کی معصوم نگاہوں میں — اِنِّیْ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ کی تفسیر، ایک پیکرِ محبوبیّت کا حسین تصوّر بن کر چمکنے لگی۔ فلک تعظیم کے لیے جھکا، زمین نے اپنی خاک آلود پیشانی سجدہ سے اٹھائی کہ آج اس کی قرنہا قرن کی دعاؤں کی قبولیت کا وقت آپہنچا تھا۔ صحرائے حجاز کے ذرّے جگمگا اُٹھے۔ بلدِ امین کی گلیوں کا نصیبہ جاگا کہ آج اس آنے والے کی آمد آمد تھی جس کی طرف جبلِ تین پر حضرت نوحؑ نے اشارہ کیا تھا اور جسے کوہِ زیتون پر حضرت مسیحؑ نے اپنے حواریوں کو وجہِ تسکینِ خاطر بتایا تھا، جس کی آمد کی بشارتیں وادیٔ طورِ سینین میں بنی اسرائیل کو دی گئی تھیں اور جس کے لیے دشتِ عرب میں حضرت خلیلِ اکبرؑ اور ذبیحِ اعظمؑ نے اپنے خدا کے حضور دامن پھیلایا تھا۔ وہ آنے والا کہ جس کے انتظار میں زمانہ نے لاکھوں کروٹیں بدلی تھیں، — آیا اور اس شانِ زیبائی و رعنائی سے آیا کہ زمین و آسمان میں تہنیت کے غلغلے بلند ہوئے۔ فرشتوں نے زمزمۂ تبریک گایا۔ سدرۃ المنتہیٰ کی حدود فراموش شاخوں

نے جھولا جھلایا، ملاء اعلیٰ کی مقدس قندیلوں نے چراغاں کیا، کائنات کے ذرے چمک اُٹھے۔ فضائے عالم صلوٰۃ وسلام کی فردوسِ گوش صداؤں سے گونج اُٹھی اور انس وجان وجد وکیف کے عالم میں پکار اُٹھے کہ

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا　　اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
در جہانِ ذکر وفکرِ انس وجاں　　تو صلوٰۃِ صبح، تو بانگِ اذاں

یہ آنے والا رسولؐ کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل وحریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی، اُسی کتابِ مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمدؐ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی، وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبویؐ میں اتاری گئی۔ مشامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی، وہ لالہ و یاسمن کی انہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبیؐ آخر الزماںؐ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدیؐ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدیؐ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ وتابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن وزیبائی جن کی حقیقی آب وتاب کو ان کے ستائش گروں کی غلوآمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے، یہاں یہ پیکرِ جلال وجمال، ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے، یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہو گئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے، یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں، یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے، یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے، یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے، یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے، یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے، یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتدا تھی، یہ انتہا تھا۔

خلق وتقدیر وہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینیؐ انتہاست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل

کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے، وہ اپنی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنھیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دَیر
بحق دِل بند و راہِ مُصطفےٰ رَو

یہ تھا حاصلِ بہارِ چمنِ کائنات، کہ جس کا ظہور صبحِ بہارِ کائنات تھا۔

وہ رازِ خلقتِ ہستی، وہ معنیٔ کونین
وہ جانِ حُسنِ ازل، وہ بہارِ صُبحِ وجود
وہ آفتابِ حرم نازنینِ کُنجِ حرا
وہ دل کا نور، وہ اربابِ درد کا مقصود
وہ سرورِ دوجہاں وہ محمدِ عربی ﷺ
برُوحِ اعظمِ و پاکش دُرُودِ لامحدُود!

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ
یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا
(۳۳/۵۶)

کشجرۃٍ طیبۃٍ اصلھا ثابتٌ وفرعھا فی السماءِ (۲۴)

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام

قیدار

فہر
الملقب بہ قریش (قریب ۲۲۵ء)

قصی ابنِ کلاب (قریب ۴۷۵ء)

عبدمناف

نوفل　　ہاشم　　عبد شمس

امیہ (خلفائے بنوامیہ)

عبدالمطلب (قریب ۵۵۰ء)

حمزہؓ　　ابوطالب　　عبداللہ　　عباسؓ　　ابولہب

حضرت علیؓ

گلِ سرسبدِ شاخِ ابراہیمی

محمد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم

طلوعِ آفتاب

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں!

حضرت اسمٰعیلؑ کے بارہ[12] بیٹے تھے۔ ان میں سے دوسرا بیٹا (قیدار) نہایت نامور ہوا ہے۔ یہ حجاز میں آباد ہوا اور خدا کے اس پہلے گھر کی تولیت کا مقدس فریضہ اس کے حصّہ میں آیا جو حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے ہاتھوں وجود پذیر ہوا تھا۔ بنو قیدار کی شاخ پھیلتے پھیلتے وسیع خاندانوں میں منقسم ہوگئی۔ ان میں قریش کا خاندان نہایت معزز اور ممتاز شمار کیا جاتا تھا۔

قریش کا مفہوم

قریش، فہر کا لقب تھا۔ عربی لغت میں لفظ قریش کے متعدد معانی ہیں۔ ویل مچھلی کو بھی قریش کہتے ہیں، اس لیے اکثر قیاس کا رُخ اس طرف گیا ہے کہ فہر نے اپنی قوت اور عظمت کے اظہار کے لیے یہ لقب اختیار کیا تھا۔ قریش میں قصیٰ ابنِ کلاب ایک خصوصی شہرت کا مالک ہے۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے اس قبیلہ میں ایک سیاسی نظام قائم کیا۔ اس نے ایک طرف کعبہ کے انتظام کو مختلف شعبوں میں تقسیم کیا۔ مثلاً سقایہ (حُجّاج کے کھانے پینے کا انتظام)، عمارہ (خانۂ کعبہ کی دیکھ بھال)، رِفادہ (حاجیوں کی مالی اعانت کا انتظام) وغیرہ۔ اور دوسری طرف سیاسی امور کی انجام دہی کے لیے، ندوہ (عدالت گاہ) اور مشورہ (مشاورت گاہ) جیسے شعبے قائم کیے۔ دارالندوہ قریش

کا ایوانِ حکومت سمجھیئے جہاں ان کے اربابِ بست وکشاد ہر قسم کے اجتماعی امور کے فیصلے کیا کرتے تھے۔ قصیّ ابنِ کلاب کے بعد، قریش میں ہاشم کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ یہ بھی بڑا نامور سردار تھا جس نے تولیّتِ کعبہ کے سلسلہ میں اپنے فرائض کو نہایت حسن وخوبی سے سرانجام دیا۔ اس نے قیصرِ روم اور حبش کے بادشاہ نجاشی سے فرامین حاصل کیے کہ تجّارِ قریش کے قافلے جب ان کے حدودِ سلطنت میں داخل ہوں تو ان سے کوئی ٹیکس وصول نہ کیا جائے۔ اس کا بیٹا، عبدالمطلب بھی اپنے قبیلہ کا نامور سردار تھا۔ ان کی زندگی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے چاہِ زمزم کا (جو ایک مدّت سے اَٹ کر گم ہو چکا تھا) سُراغ لگایا اور کھدوا کر اسے نئے سرے سے آباد کیا۔ انہوں نے اپنے بیٹے عبداللہ کی شادی قبیلہ زہرہ میں وہب بن عبد مناف کی صاحبزادی آمنہ سے کی جو قریش کے گھرانے میں ممتاز تھیں۔

آفتابِ عالمتاب

اسی مکرّم وممتاز گھرانے میں، موسمِ بہار میں، دوشنبہ کے روز، بتاریخ ۹ ربیع الاوّل مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء، بوقت صبح، اس نیّرِ عالمتاب کا طلوع ہوا جس سے دنیا بھر کی تاریکیوں کو کافور ہو جانا تھا۔ دادا نے اپنے مرحوم[1] لختِ جگر کی یادگار کو اپنی گود میں لیا اور خانۂ کعبہ میں جا کر دعا مانگی۔ ساتویں دن تمام قبیلہ کی دعوت کی اور بچّہ کا نام مُحمّدؐ رکھا۔ لوگوں نے از راہِ استعجاب پوچھا کہ آپ نے اپنے خاندان کے مروّجہ ناموں کو چھوڑ کر یہ نام کیوں رکھا۔ کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میرا بچّہ دنیا بھر کی ستائش اور تعریف کا شایان قرار پائے۔ یہ اسمِ گرامی دادا کی طرف سے تجویز ہوا۔ لیکن والدہ نے احمد[2]ؐ نام رکھا۔ اس زمانہ میں دستور تھا کہ شرفائے عرب اپنے بچّوں کو صحرانشین بدوؤں کے ہاں بھیج دیتے تھے تاکہ ان کی ابتدائی پرورش اور تربیت کھلی فضا میں ہو اور ان میں فصاحت کا جوہر

---

[1] حضورؐ کے والدِ ماجد کا انتقال حضورؐ کی پیدائش سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ حضورؐ کی یتیمی کا ذکر قرآنِ کریم میں بھی ہے۔
اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى (۹۳/۶) کیا خدا نے تمہیں یتیم پا کر پناہ نہیں دی؟

[2] قرآنِ کریم نے حضورؐ کے اسمِ گرامی محمّدؐ کا بھی ذکر کیا ہے اور بشارتِ حضرت عیسیٰؑ کے سلسلہ میں احمدؐ کا بھی (دیکھئے ۳/۱۴۴؛ ۳۳/۴۰؛ ۴۷/۲؛ ۴۸/۲۹ اور احمدؐ کے لیے ۶۱/۶)۔ مسلم کی روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا اِنَّ لِیْ اَسْمَآءً۔ اَنَا مُحَمَّدٌ وَّ اَنَا اَحْمَدُ...الخ۔ طبقاتِ ابنِ سعد میں بھی حضورؐ کے اسمِ گرامی احمدؐ کے متعلق بہت سی روایات مندرج ہیں نیز حضرت حسان بن ثابتؓ اور حضرت کعب بن مالکؓ نے جو حضورؐ کی مدح وستائش میں قصائد لکھا کرتے تھے اپنے اشعار میں متعدد جگہ حضورؐ کو اسمِ احمدؐ سے مخاطب کیا ہے۔

پیدا ہو جائے جو عربوں کی بہت بڑی خصوصیت تھی۔ اس دستور کے مطابق حضورؐ کی ابتدائی پرورش بنی سعد کے قبیلہ میں، جو فصاحت و بلاغت میں مشہور تھا، دایۂ فطرت کی گود میں ہوئی۔ قریب چھ برس کی عمر تھی کہ حضورؐ کی والدہ کا بھی انتقال ہو گیا اور آپ کی کفالت آپ کے دادا نے اپنے ذمہ لے لی۔ کتبِ آثار و روایات میں حضورؐ کے زمانہ پیش از نبوت کی سیرتِ طیبہ کے احوال و کوائف بھی تفصیل سے مذکور ہیں (اور حقیقت

زمانہ قبل از نبوّت

یہ ہے کہ، جیسا کہ غیر مسلموں تک کو اعتراف ہے، یہ خصوصیت بھی نبیٔ اکرمؐ ہی کو حاصل ہے کہ آپؐ کے سوانحِ حیات کی جزئیات تک تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں) لیکن قرآنِ کریم کا مقصد چونکہ اس تعلیم کو پیش کرنا ہے جو حضورؐ کی وساطت سے دُنیا کو ملی اور جس سے عالمِ انسانیت میں ایک انقلابِ عظیم پیدا ہوا، اس لیے وہ حضورؐ کے عہدِ رسالتؐ کی زندگی ہی کو بہ تفصیل پیش کرتا ہے۔ زمانۂ قبل از رسالت کی زندگی کے متعلق وہ صرف ایک شہادت پر اکتفا کرتا ہے اور وہ شہادت ایسی عظیم القدر اور جامع ہے کہ اس میں حضورؐ کی پوری حیاتِ مقدسہ اس طرح سمٹ کر آگئی ہے جیسے آنکھ کے تِل میں آسمان (اس کا ذکر ذرا آگے چل کر آئے گا) حضور نبیٔ اکرمؐ کی پیدائش اور پرورش اس ماحول میں ہوئی جہاں شرک اور بُت پرستی کا مسلک عام تھا جس کعبہ میں عبد المطلب اپنے چہیتے پوتے کو دعا کے لیے لے گئے، اس کے گرد و پیش سیکڑوں بُت نصب تھے اور آپؐ کا خاندان اس بت کدہ کا کلید بردار تھا۔ اسی ماحول میں آپؐ کی ساری عمر بسر ہوئی لیکن آپؐ نے مراسمِ شرک سے ہمیشہ اجتناب کیا۔ ایک دعوت میں آپؐ کے سامنے کھانے میں اس جانور کا گوشت آیا جو کسی بُت کے نام پر ذبح کیا گیا تھا تو آپؐ نے اسے کھانے سے انکار کر دیا[1]۔ مراسمِ شرک و کفر تو کجا، معاشرہ کی عام معیوب باتیں، جن کا عربوں میں بے محابا رواج تھا، حضورؐ کے حسنِ سیرت کو آلودہ نہ کر سکیں۔ مثلاً عربوں کی نگہ جہالت آمیز ننگے ہو جانے میں کوئی عیب نہیں دیکھتی تھی۔ حتیٰ کہ مرد اور عورتیں طوافِ کعبہ کے وقت اپنے کپڑے اُتار دیتے تھے۔ حضورؐ کا بچپن بھی اسی مسموم سوسائٹی میں سانس لے رہا تھا، لیکن کیفیت یہ تھی کہ ایک دفعہ خانۂ کعبہ کی تعمیر کا کام ہو رہا تھا۔ آپؐ اینٹیں اُٹھا اُٹھا کر لا رہے تھے جس سے کندھے پر رگڑ لگ رہی تھی۔ آپؐ کے چچا (حضرت عباسؓ) نے آپؐ کا تہبند کھول کر کندھے پر رکھ دیا کہ اُس کے اُوپر اینٹیں رکھی جائیں۔ لیکن ننگے ہونے کے احساس سے آپؐ پر بیہوشی کی سی حالت طاری ہو گئی اور ہوش آنے پر آپؐ کی زبان پر تھا،

---

[1] بخاری باب المناقب

میرا تہبند حضرت عباسؓ نے فوراً تہبند باندھ دیا۔[1] یہی بچپن جب جوانی میں پہنچا ہے تو شرم و حیا کی کیفیت یہ تھی کہ دبقولِ صحابۂ کرامؓ، كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَشَدَّ حَيَاءً مِّنَ الْعَذْرَاءِ فِي خِدْرِهَا[2] (حضورؐ پردہ نشین کنواری لڑکی سے بھی زیادہ شرمیلے تھے)۔

عربوں کی سفاکی اور خون آشامی کی داستانیں گزشتہ اوراق میں ہماری نظروں سے گزر چکی ہیں۔

ناحق خونریزی سے اجتناب

لیکن ان سب میں ایک دامن ایسا بھی تھا جسے خونِ ناحق کے ایک قطرہ نے بھی داغدار نہیں کیا۔ یہ دامن، امن و سلامتی کے شاہزادے کے سوا اور کس کا ہو سکتا تھا؟ قبیلوں کی ان لڑائیوں میں حضورؐ کی عدم شرکت بُزدلی کی بنا پر نہیں تھی، بلکہ اس لیے کہ یہ لڑائیاں عصبیتِ جاہلیہ کی باطل بنیادوں پر اٹھتی تھیں۔ اس تمام عمر میں حضورؐ نے صرف ایک لڑائی میں شرکت کی جو قریش اور قبیلۂ قیس میں ہوئی تھی اور جس میں قریش برسرِ حق تھے۔ لیکن چونکہ یہ لڑائی بھی ایام الحرام میں پیش آئی تھی اس لیے حضورؐ نے کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔[3] اس لڑائی میں حضورؐ کی شرکت بھی، ایک طرح صلح و آشتی کا موجب بن گئی۔ اس لیے کہ لڑائی سے واپسی پر بعض طبائع میں اصلاح کی تحریک پیدا ہوئی، جن میں پیش پیش حضورؐ کے اہلِ خاندان تھے۔ چنانچہ انہوں نے باہمی معاہدہ کیا کہ ان میں سے ہر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا اور کوئی ظالم مکہ میں نہیں رہنے پائے گا۔[4] حضورؐ اس معاہدہ میں شریک تھے اور عہدِ نبوت میں بھی اس کا تذکرہ فخر و مسرت سے فرمایا کرتے تھے۔ بات تھی بھی فخر و مباہات کی، کہ عربوں کی متشدد قبائلی عصبیت کے پیشِ نظر "مظلوم کی حمایت" کا عہد (خواہ مظلوم کوئی ہو) ایک بہت بڑی اصلاح تھی۔ اس معاہدہ کو "حلف الفضول" کہتے ہیں۔ اگرچہ عربوں کے خوئے انتقام اور عصبیتِ جاہلیہ نے بعد میں اس معاہدہ کو کالعدم قرار دے دیا جب خود حضورؐ کی مخالفت میں ظالم و مظلوم کا امتیاز بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ بایں ہمہ یہ اصلاح کی ایک مستحسن کوشش ضرور تھی۔ یہ معاہدہ ناکام اس لیے رہا کہ اس کا وجود ایک ہنگامی جذبہ کا رہینِ منت تھا۔ ان لوگوں کی اصلاح نہیں ہوئی تھی جن سے یہ بروئے کار آیا تھا۔ یہ اصلاحِ نفوس، تعلیم و تربیتِ رسالت سے ہی ممکن تھی جس کے لیے ابھی زمانہ کو کچھ وقت، اور انتظار کرنا تھا۔

امن و سلامتی کا پیامبر

حضورؐ کے حسنِ تدبر سے کس طرح قریش کی خون آشام تلواریں جو ذرا ذرا سی بات پر برقِ خاطف بن کر فضا میں چمک اٹھتی

---

[1] بخاری کتاب الحج۔ [2] بخاری کتاب الادب۔ [3] ابنِ ہشام۔ [4] طبقاتِ ابنِ سعد جلد اوّل۔

تھیں، پھر سے زیرِ نیام ہو جاتی تھیں۔ اس کی مثال وہ یادگار واقعہ ہے جو تعمیرِ کعبہ کے سلسلہ میں پیش آیا۔ کعبہ کی عمارت قدِ آدم اُونچی تھی اور نشیب میں واقع ہوئی تھی اس لیے بارش کا پانی اسے نقصان پہنچایا کرتا تھا۔ قریش نے فیصلہ کیا کہ اسے از سرِ نو مستحکم طور پر تعمیر کر دیا جائے۔ چونکہ تعمیرِ حرم کا کام وجۂ عزّ و شرف سمجھا جاتا تھا اس لیے اس میں مختلف قبائل شریک ہوئے اور ہر قبیلہ نے ایک حصّہ اپنے لیے مختص کر لیا لیکن جب حجرِ اَسوَد نصب کرنے کا وقت آیا تو سب میں جھگڑا پیدا ہوا۔ چنانچہ آن کی آن میں تلواریں بے نیام ہو گئیں۔ سردارانِ قبائل نے خون سے لبریز پیالوں میں اپنی انگلیاں ڈبو لیں، کہ یہ جان دینے کی قسم کے مرادف تھا۔ یہ جھگڑا چار دن تک برابر جاری رہا۔ پانچویں دن یہ طے پایا کہ دوسری صبح جو شخص سب سے پہلے آئے وہی ثالث تسلیم کر لیا جائے۔ دوسری صبح، سب سے پہلے، وہاں وہی ذاتِ گرامیؐ موجود تھی جس کے ذمّہ دنیا بھر کے تنازعات اور اختلافات مٹانے کا اہم فریضہ عاید ہونے والا تھا۔ آپؐ نے حجرِ اَسوَد اپنی چادر میں رکھا اور تمام دعویدار قبائل کے نمائندگان سے کہا کہ وہ اس چادر کو اُوپر اُٹھائیں۔ جب چادر موقع کے برابر آ گئی تو آپؐ نے حجرِ اَسوَد اٹھا کر نصب کر دیا اور یوں ایک خونریز جنگ کو ہوتے ہوتے روک دیا۔

حُسنِ مُعاملہ

یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قریش کا ذریعۂ معاش عام طور پر تجارت تھا۔ چنانچہ جب حضورؐ سنِ رُشد کو پہنچے تو تجارت ہی کو ذریعۂ معاش قرار دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں آپؐ کے حُسنِ معاملہ اور دیانت داری کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی جس کی وجہ سے ہر شخص چاہتا تھا کہ اپنے کاروبار میں حضورؐ کو بھی شریک کر لے۔ کتُبِ تاریخ و روایات میں ایسی شہادات بکثرت ملتی ہیں جن سے یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے کہ ان تمام معاملات میں آپؐ کس راستبازی اور دیانتداری سے تمام اُمور سرانجام دیتے تھے۔ یہی وہ پاکیزگیٔ اخلاق، حسنِ معاملہ، راستبازی اور دیانت داری تھی جس کی بنا پر قوم نے متفقہ طور پر آپؐ کو **امین** کا لقب دے دیا۔ اس زمانہ میں بینک تو ہوتے نہیں تھے۔ جب کوئی کہیں باہر جانے لگتا تو اُسے کسی ایسے گوشے کی تلاش ہوتی جہاں اس کا مال محفوظ رہ سکے۔ گرد و نواح کے علاقہ والوں کے لیے یہ کاشانۂ عافیت اسیؐ "امین صادق" کا دارالسلام تھا۔

حضرت خدیجہؓ

یہی وہ راست بازی اور صداقت شعاری تھی جس سے متأثر ہو کر دُودمانِ قریش کی ایک نہایت ممتاز خاتونِ محترمہ (جنابہ خدیجۃ الکبریٰؓ) نے جو اپنی شرافت

اور پاکیزگیٔ اخلاق کی بنا پر ایامِ جاہلیت میں **طاہرہ** کے نام سے پکاری جاتی تھیں، حضورؐ کو پیغامِ نکاح بھیجا۔ ان کی دو شادیاں پہلے ہو چکی تھیں اور اب بیوہ تھیں۔ اُس زمانہ میں عرب میں عورتوں کی کمی نہ تھی۔ اور اگر کمی ہوتی بھی تو بھی خاندانِ ہاشم کے ایک ایسے بلند اخلاق نوجوان کے لیے جو حسنِ سیرت وصورت کے اعتبار سے منفرد تھا، برابر کے رشتوں کی کیا کمی ہو سکتی تھی؟ لیکن حضورؐ نے شرافت ونجابت کے پیشِ نظر اس پیغامِ رفاقت کو قبول فرمایا اور یوں آپؐ کی عائلی زندگی کی ابتدا ہوئی جو اخیر تک ایسی خوشگوار اور رافت ومؤدت اور سکینت ومحبت کی آئینہ دار رہی جس کی مثال نہیں ملتی۔ حضرت خدیجہؓ دولت مند تھیں، اس لیے اس سے آپؐ کے تجارتی کاروبار میں فروغ ہوا اور معاش کی طرف سے آپؐ کی زندگی مطمئن ہو گئی۔ قرآنِ کریم نے جہاں فرمایا ہے کہ

وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ ﴿۹۳/۸﴾

اور خدا نے تمہیں ضرورت مند پایا تو بے نیاز کر دیا۔

تو اس سے غالباً اسی تبدیلیٔ حالات کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن بایں ہمہ آپؐ نے ایک متوسط درجہ کے مرفہ الحال کی زندگی بسر کی۔ رؤسائے قوم میں آپؐ کا شمار کبھی نہیں ہوا۔ چنانچہ آپؐ کی بعثت کے خلاف مخالفین کی طرف سے یہ اعتراض بھی کیا گیا تھا کہ اس منصبِ بلند کے لیے مکہ یا طائف کے رؤسا میں سے کسی کو کیوں منتخب نہیں کیا گیا۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَٰذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ ﴿۴۳/۳۱﴾

اور لوگ کہتے ہیں کہ دونوں آبادیوں (مکہ وطائف) میں سے یہ قرآن کسی بڑے (رئیس) آدمی پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟

مجملاً یہ ہیں حضورؐ کے زمانۂ قبل از نبوت کی حیاتِ طیبہ کے جستہ جستہ کوائف وسوانح۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ان کوائفِ حیات کی تفاصیل وجزئیات کتبِ تاریخ وسیر میں بکثرت موجود ہیں لیکن قرآنِ کریم نے ان تفاصیل کو بیان کرنے کے بجائے، اس پوری زندگی پر ایک ایسا تبصرہ کر دیا ہے جس کے بعد تفاصیل کی رُو سے استنباطِ نتائج کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ حضورؐ کے دعوائے رسالت کے بعد عرب کے ہر گوشے سے مخالفت کا ہجوم اُمنڈ آیا تھا۔ لوگ آتے اور آپؐ سے

زندگی! دلیلِ صداقت

دعویٰ کا ثبوت طلب کرتے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کے جواب میں حضورؐ کی طرف سے کیا ثبوت پیش کیا جاتا۔

سنیئے اور غور سے سنیئے کہ اس جامع ثبوت کے بعد کسی اور دلیل اور ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہتی! وہ پوچھتے کہ ہم کیسے تسلیم کرلیں کہ تم اپنے دعوٰی میں سچے ہو۔ حضورؐ فرماتے کہ میں کہیں باہر سے نہیں آیا۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ٥ (۱۰/۱۶)

میں اس سے پہلے تم لوگوں کے اندر ایک پوری عمر بسر کرچکا ہوں۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں جھوٹا انسان ہوں یا سچا۔ کیا تم ذرا بھی سوچ سمجھ سے کام نہیں لیتے۔

میں نے تمہارے اندر اپنی عمر بسر کی ہے۔ کیا تم میری سابقہ زندگی سے اس امر کا اندازہ نہیں کرسکتے کہ میں سچّا ہوں یا جھوٹا؟ کیا میری زندگی میری صداقت کی زندہ شہادت نہیں؟ کیا تم میری اس چالیس سالہ زندگی میں جس کا ایک ایک لمحہ تمہارے اندر بسر ہوا ہے، کوئی ایک واقعہ بھی ایسا پیش کرسکتے ہو جس سے میری صداقت کے متعلّق ذرا سا شُبہ گزرے؟ کیا میری اس تمام زندگی میں کہیں حرف گیری کی کوئی گنجائش ہے؟ یہ چیلنج پوری کی پوری قوم کو دیا گیا اور اس کے خلاف کسی نے ایک لفظ تک نہ کہا کسی کی زندگی کے آئینہ صفت ہونے کی اس سے بڑھ کر شہادت اور کیا ہوسکتی ہے کہ دشمنوں کے ہجوم میں اس زندگی کو اپنی صداقت کے ثبوت میں پیش کر دیا جائے اور اس کے سامنے سب کی نگاہیں جھک جائیں! یہ شہادت صرف اُس زمانہ کے قریش کے سامنے ہی پیش نہیں کی گئی بلکہ چودہ سو سال سے ساری دنیا کے سامنے ہے۔ اور اس کی صداقت کی دلیل یہ ہے کہ آج تک کسی طرف سے بھی اس کو جُھٹلایا نہیں گیا بلکہ دشمنوں تک کو اس زندگی کی پاکیزگی کا اعتراف کرنا پڑا۔ چنانچہ سر ولیم میور جیسا متعصّب مصنّف بھی یہ کہنے پر مجبور ہوگیا کہ

> ہماری تمام تصنیفات، محمّد (صلعم) کے بارے میں، ان کی عصمتِ اخلاق اور پاکیزگیٔ اطوار پر، جو اہلِ مکّہ میں کمیاب تھی متفق ہیں۔

(LIFE OF MOHAMMAD)

یہ تھا دیباچہ اس کتابِ زندگی کا جسے خود زندگی کو ایک نئی تفسیر عطا کرکے دنیا بھر کے انسانوں کے لیے نمونہ بننا تھا۔

واضح رہے کہ نبوّت ملنے سے پہلے، نبی کو اس کا علم واحساس نہیں ہوتا کہ وہ اس منصبِ جلیلہ کے لیے منتخب کیا جارہا ہے۔ اس لیے اس دور میں اس کی سیرت وکردار اس کے جوہرِ ذاتی کی نمود ہوتی ہے۔ اس

میں کسی خارجی قوت کا دخل نہیں ہوتا۔

نبوت کے بعد بھی اسے صرف وہ حقائق خدا کی طرف سے ملتے ہیں جن کے مطابق شرفِ انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس علم کو خدا کی طرف سے پاکر نبی خود بھی اس کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اور دوسروں کو اُس کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس زندگی میں بھی اس کے تمام فیصلے (جنھیں وہ اِن حقائقِ ابدی کی روشنی میں کرتا ہے) اس کے ذاتی اجتہاد کا نتیجہ ہوتے ہیں اور اس کے تمام اعمالِ حیات اس کے اپنے ارادوں کے مظاہر۔ ان میں بھی کسی خارجی قوت کا دخل نہیں ہوتا۔ یوں نبی کی ساری زندگی (بجز اُس وحی کے جو اُسے خارج سے ملتی ہے) ایک انسان کی زندگی ہوتی ہے جو اپنے فیصلوں اور ارادوں سے حسنِ سیرت اور پاکیزگیٔ کردار کا مظہر بنتا ہے۔ نبی کے یہی جوہرِ ذاتی ہیں جن کی بنا پر اس کا انتخاب اس مقصدِ بلند کے حصول و تکمیل کے لیے ہوتا ہے جسے نبوت اور رسالت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حضورؐ کی سیرت کے مطالعے کے وقت اس بنیادی حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ یہی چیز اس کی زندگی کو دوسرے انسانوں کے لیے نمونہ (اُسوۂ حسنہ) بناتی ہے۔ اس کے اُسوہ بننے کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ اُس نے کر کے دکھایا ہے، وہ کچھ ہر وہ انسان کر سکتا ہے جو اُن اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرے۔

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (۹۳:۷)

طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے ندارد
بہ نگاہِ ناشکیبے بہ دلِ اُمیدوارے

قلبِ وادیٔ فاران یعنی اُمّ القریٰ مکّہ، اپنی تمام نگاہ فریب جاذبیتوں کے ساتھ ہر عاکف و باد کے لیے مرکزِ توجہ بنا ہُوا ہے۔ چونکہ ریگِ حجاز کے ہر ذرہ کی عقیدت حریمِ کعبہ کے ساتھ وابستہ ہے، اس لیے طفل و

عہدِ جاہلیت کی ہنگامہ خیزیاں

بُرنا و پیر، نزد و دُور سے کارواں در کارواں اپنی پیشانیوں میں تڑپنے والے سجدوں کے نذرانے لیے، رواں دواں اور کشاں کشاں اس مرجعِ انام کی طرف چلے آ رہے ہیں۔ جبینِ شوق سجدوں سے معمور ہے لیکن کچھ معلوم نہیں کہ مسجود کیا ہے؟ قلبِ نیاز، جذبہ ہائے عقیدت سے لبریز ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ معبود کون ہے؟ زندگی کی تگ و تاز، بہر نوع ہنگامہ خیز ہے لیکن کسی کو علم نہیں کہ اس تگ و تاز سے مقصود کیا ہے؟ کاروانِ حیات تیز گام ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ اس کی منزل کون سی ہے؟ لیکن اس نہ جاننے کے باوجود، ایک ہنگامہ ہے کہ ہر وقت برپا ہے جس میں ہر شخص اپنے آپ کو جذب کیے ہُوئے ہے۔ اس کیف و مستی کے عالم میں کوئی تالیاں پیٹتا ہے، کوئی سیٹیاں بجاتا ہے، کوئی کعبہ کے گرد گھوم گھوم کر، سفر ختم ہونے کے باوجود ذوقِ سفر کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ کوئی بتوں کے آستانوں پر جانور ذبح کر کے اس کا گرم گرم لہو پی رہا ہے۔ کوئی زمزم

کے کنارے بیٹھا جام اور سبُو کے امتیازات مٹا رہا ہے۔ کاہنوں کے گرد عورتوں کا ہجوم ہے جو اپنے صبر گریز پا اور رنجِ گراں نشیں کے جگر سوز افسانوں کا مستقبل معلوم کرنا چاہتی ہیں۔ اُدھر عکاظ کے بازار میں شعرائے جادو بیاں اپنی سحر آفرینیوں سے ہر سننے والے کے دل کو مٹھی میں لیے ہوئے ہیں۔ کبھی کسی کے خاندانی مفاخر کے تذکرہ سے اس کے طرۂ امتیاز میں بالیدگی پیدا کرتے ہیں اور گاہ کسی کے عزیز کے قتل کی یاد تازہ کرکے اس کی رگوں میں آتشِ انتقام کے شعلے اس طرح بھڑکاتے ہیں کہ بزمِ شعر خوانی آن کی آن میں رزمگاہ بن جاتی ہے۔ لیکن محفلِ عیش و طرب ہے یا میدانِ جنگ و جدل، ہر شخص پورے جذب و انہماک سے اس میں حصّہ لیتا ہے اور اِس ہمہمہ اور طنطنہ میں، دنیا و مافیہا سے بے خبر، یوں مستغرق ہو جاتا ہے کہ کوئی کشش اسے اس ہنگامے سے باہر نہیں لے جا سکتی۔ چھوٹا بڑا، امیر غریب، مرد عورت، سب ان ہنگاموں میں اس طرح شریک ہوتے ہیں گویا یہ چیزیں ان کی زندگی کا جُزو بن چکی ہیں۔

ایک استثنا

لیکن مکّہ کی ان پُرہجوم گلیوں میں ایک ایسا شخص بھی دکھائی دیتا ہے جو ان میں سے ہوتے ہوئے بھی ان میں کا معلوم نہیں ہوتا۔ اس کی طرزِ معاشرت، وضع قطع، تراش خراش سب ان ہی جیسی ہے۔ وہ انہی بازاروں میں پھرتا ہے، انہی لوگوں سے کاروبار کرتا ہے، ان کی شادی اور غم میں شریک ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو انہی جیسا انسان سمجھتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنی زندگی میں کوئی خلاء محسوس کرتا ہے اور نہیں جانتا کہ وہ خلاء کیا ہے اور کس طرح پُر ہو سکتا ہے۔ وہ مشاغل و مشارب جو اس کی قوم کا جزوِ زندگی بن چکے ہیں، اس کے لیے اپنے اندر کوئی جاذبیت نہیں رکھتے۔ وہ بھی اپنی جبینِ نیاز میں ذوقِ عبودیت کے سجودِ رقصاں لے کر حریمِ کعبہ تک جاتا ہے لیکن وہ ان تابندہ گوہروں کو اسی طرح واپس لے آتا ہے کہ اسے وہاں انسانوں کی بنائی چوکھٹیں اس متاعِ گراں بہا کے شایانِ شان دکھائی نہیں دیتیں۔ وہ جب لوگوں کی گردنوں کو ان کے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی مٹی اور پتھر کی مورتیوں کے سامنے جُھکا ہوا دیکھتا ہے تو محوِ حیرت رہ جاتا ہے کہ — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ وہ عکاظ کے بازار میں جب سردارانِ قریش کو اپنی عالی نسبی پر فخر کرتے دیکھتا ہے تو، ہر چند وہ خود قریش کے ممتاز ترین گھرانے کا فرد ہے لیکن اس کا دل گواہی نہیں دیتا کہ جس چیز میں انسان کے جوہرِ ذاتی کا کوئی دخل نہ ہو وہ باعثِ فخر و تکبر ہو سکتی ہے۔ وہ بزمِ مے پرستی کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا کہ اس سے اس کا قلبِ سلیم اِبا کرتا ہے۔ وہ قمار خانوں کی طرف قدم تک نہیں اُٹھاتا کہ وہاں اسے مہذب انسانوں کے بھیس میں رہزن نظر آتے ہیں۔ وہ جب ان محافل و مجالس میں اپنے لیے کوئی سامانِ تسکین نہیں پاتا۔

تو عیسائی رہبان اور یہودی احبار کی طرف رجوع کرتا ہے کہ اُس نے سُن رکھا ہے کہ وہ زندگی کے حقائق کا علم

تلاشِ حقیقت

رکھنے کے مدعی ہیں۔ وہ خود لکھنا پڑھنا نہیں جانتا اس لیے ان علماء و مشائخ سے پوچھتا ہے کہ ان کے پاس کون سی روشنی ہے جسے وہ آسمانی کہہ کر پکارتے ہیں لیکن اسے ان مزعومہ آسمانی شمعوں پر انسانی تصورات کے ایسے ایسے رنگین فانوس نظر آتے ہیں جنہوں نے شمع کی اصلی روشنی کو بالکل ڈھانپ رکھا ہے۔ وہ یہاں سے بھی ٹھنڈی سانس بھر کر اُٹھ آتا ہے۔ اُسے معلوم ہوتا ہے کہ انہی بستیوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس کی طرح ان معبودانِ باطل سے متنفر ہیں۔ وہ ان کی طرف رُخ کرتا ہے کہ شاید وہیں وہ سکون مل جائے جس کی اُسے تلاش ہے لیکن اسے ان کا ذوق بھی تشنہ اور تڑپ خام نظر آتی ہے۔ وہ وہاں سے بھی مایوس واپس آجاتا ہے۔ غرضیکہ وہ انسانوں کے اس ہجوم میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے۔ اُسے ایسا کوئی رفیق نہیں ملتا جس سے اپنے دل کی تپش و خلش اور سوز و گداز کا حال کہہ سکے۔ وہ اس تنہائی سے اُکتا جاتا ہے تو آسمان کی طرف آنکھ اُٹھا کر پکار اُٹھتا ہے کہ ؎

درین میخانہ اے ساقی ندارم محرمے دیگر
کہ من شاید نخُستیں آدمم از عالمے دیگر

تفکّر و تدبّر

وہ انسانوں کی بستیوں میں اپنے دل کی پکار کا کوئی جواب نہیں پاتا تو باہر فطرت کی کُھلی فضاؤں میں چلا جاتا ہے۔ وہاں کبھی صحراؤں کی ناپیدا کنار وسعتوں پر غور کرتا ہے اور کبھی آسمانوں کی حدود فراموش پہنائیوں پر۔ گاہ اُسے ستاروں کی تابندگی دعوتِ غور و فکر دیتی ہے اور گاہ ماہِ عالمتاب کی درخشندگی اس کے لیے سامانِ تدبّر پیدا کرتی ہے۔ وہ مظاہرِ فطرت کی گوناگوں نیرنگیوں پر غور کرتا اور بار بار اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ یہ عظیم الشان سلسلۂ کائنات کس طرح وجود میں آگیا؟ کون اسے بایں حُسن و خوبی چلا رہا ہے؟ اس کا بالآخر مقصد کیا ہے؟ یہ سوالات رہ رہ کر اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں لیکن اسے ان کا جواب کہیں سے نہیں ملتا جب جواب نہیں ملتا تو اس سے اس کے دل کا اضطراب اور بڑھ جاتا ہے اور جب اضطراب بڑھتا ہے تو اس کے ساتھ ہی تشنگیٔ ذوق کی شدت تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے لیکن اسے اپنے آپ پر ضبط اتنا ہے کہ وہ اس کاوش و اضطراب کو اپنے معمولاتِ زندگی پر قطعاً اثر انداز نہیں ہونے دیتا۔ وہ اپنے کاروباری معاملات، بال بچوں کی نگہداشت، رفقاء و احباب سے میل ملاقات، معاشرتی زندگی کے مقتضیات میں کوئی فرق نہیں آنے دیتا اور ایسی زندگی بسر کیے جاتا ہے کہ اس کے ابنائے جنس

اپنے میں اور اس میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے، بجز اس کے کہ وہ اس کے کیریکٹر کی بلندی کے مداح ہیں اور اس کی صداقت و دیانت کے معترف۔ چھوٹا بڑا سب اس کی عزت کرتے ہیں اور قبیلہ اور خاندان کو اس کی شرافت اور نجابت پر ناز ہے لیکن وہ اپنے آپ کو ان سے کچھ مختلف محسوس کرتا ہے، اس لیے کہ جن گوشوں کو انہوں نے اپنے لیے وجۂ اطمینان اور موجبِ تسکین قرار دے رکھا ہے، وہ ان میں سے کسی میں بھی اپنے دل کے اضطراب کا مداوا نہیں پاتا اور وہ اپنے آپ کو ہر وقت کسی ایسی چیز کی تلاش میں مضطرب بے قرار پاتا ہے جس کا اسے خود بھی علم نہیں کہ وہ کیا ہے؟

قرآنِ کریم نے حضورؐ کی تلاشِ حقیقت میں سرگردانی کی اس کیفیت کو دو لفظوں میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے جب فرمایا کہ

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ (۹۳/۷)

ہم نے تجھے تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو راستہ دکھا دیا۔

کارلائل نے اس کیفیت کو ان الفاظ بیان کیا ہے۔

شروع ہی سے، چلتے پھرتے آپ کے دل میں ہزاروں سوالات پیدا ہوتے تھے۔

میں کیا ہوں؟

کائنات کا لامتناہی سلسلہ کیا ہے؟

زندگی کیا ہے؟

موت کیا ہے؟

مجھے کس چیز پر ایمان رکھنا چاہیئے؟

مجھے کیا کرنا چاہیئے؟

حرا اور سینا کی پہاڑیاں، ریت کے ٹیلوں کا سکوت، ان سوالات کا کوئی جواب نہیں دیتے تھے۔ چرخ اور اس کے درخشندہ ستارے بھی کچھ جواب نہیں دیتے تھے۔ ان سوالات کا کہیں سے جواب نہیں ملتا تھا۔ ان سوالات کا جواب انسان کی اپنی روح اور خدا کی اس وحی سے ملنا تھا جو اس روح کو اپنا مسکن بنالے۔

(HEROES AND HERO WORSHIP-CARLYSLE -- P.49)

ہاں! ان سوالات کا جواب کہیں سے نہیں مل سکتا تھا۔ ان کا جواب صرف وحی کی زبان سے مل سکتا تھا حقیقت کا انکشاف ناممکن ہے جب تک حقیقت خود اپنے آپ کو کسی پر منکشف نہ کر دے۔ مسائلِ حیات نہیں سمجھے جا سکتے جب تک "حیات" خود ہی "شارحِ اسرارِ حیات" نہ ہو جائے۔ حقیقت کے مشاہدہ کے لیے انسان کی آنکھ وحی کی روشنی کی محتاج ہے اور نبی قبل از نبوت وحی سے واقف نہیں ہوتا یہی کیفیت قبل از رسالت حضورؐ کی تھی۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۙ (۴۲/۵۲)

اور اے محمدؐ! اسی طرح ہم نے (اپنے قانونِ مشیت کے مطابق) تیری طرف اپنے حکم سے ایک کتاب بطور وحی نازل کی۔ (جس نے تجھ پر حقیقت کو منکشف کر دیا۔ ورنہ) اس سے پہلے تجھے قطعاً معلوم نہ تھا کہ کتاب (الٰہی) کیا ہوتی ہے اور ایمان کس چیز کا نام ہے۔ لیکن (وحی کے ذریعے) ہم نے اس کتاب کو تیرے لیے ایک (عظیم القدر) روشنی بنا دیا جس کے ذریعے ہم اپنے قانونِ مشیت کے مطابق اپنے بندوں میں سے کسی ایک (یعنی نبی) کو حقیقت کا راستہ دکھا دیتے ہیں اور (اے پیغمبرؐ! یہ ہماری اس عطا فرمودہ روشنی ہی کا صدقہ ہے کہ) تو (گم کردہ راہ لوگوں کو) سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔

نہ حضورؐ جانتے تھے کہ کتاب کسے کہتے ہیں اور وحی کیا ہوتی تھی اور نہ ہی اس کی توقع رکھتے تھے کہ آپؐ اس نعمتِ عظمٰے سے سرفراز کیے جائیں گے۔

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ ۡ (۲۸/۸۶)

اور اے پیغمبرؐ! تجھے کسی طرح یہ توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ (ہماری طرف سے) تجھ پر کوئی کتاب نازل کی جائے گی۔ یہ تو محض تیرے پروردگار کی رحمت ہے (کہ اس نے تجھے اس عظیم مقصد کے لیے منتخب فرما لیا) سو جو لوگ اس صداقت سے انکار کریں اور اس سے سرکشی برتیں، تمہارے لیے یہ جائز نہیں ہو گا کہ کسی طرح ان کا پشت پناہ بن جائے۔

اس کتاب کے ذریعہ حضورؐ کو ان حقائق کا علم دیا جن کے متعلق اس سے پہلے آپؐ کچھ نہیں جانتے تھے۔

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ... (۴/۱۱۳)

اور (اے پیغمبرؐ!) خدا نے تمہیں وہ باتیں سکھلا دیں جو تجھے پہلے معلوم نہ تھیں۔

پہلی وحی

حضورؐ کی عمر کا چالیسواں سال تھا، رمضان کا مہینہ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (۲/۱۸۵) اور رات کا وقت[1]۔ رات اس لیے کہ ساری دنیا جہالت کی تاریکیوں میں لپٹی ہوئی تھی اور طلوعِ سحر کی منتظر۔ یہ رات تاریخ عالم میں عدیم النظیر اور فقید المثال رات تھی۔ یہ حدِ فاصل تھی دنیائے قدیم اور جہانِ نو میں۔ اس رات ضمیرِ کائنات نے ایک نئی کروٹ لی جس سے زندگی، جو اپنے مقام سے بےخبر چلی آ رہی تھی، خودنگر و خودشناس ہو گئی۔ تمام نظامہائے کہن جو غیر فطری بنیادوں پر استوار تھے، باطل قرار پا گئے اور دنیا کو ایک نیا آئین عطا ہوا جس میں تکمیلِ شرفِ انسانیت کی تمام راہیں واضح طور پر سامنے آ گئیں۔ انسان کو حق و باطل کی تمیز کے صحیح پیمانے عطا ہوئے۔ اس لیے اس رات کو لَيْلَةِ الْقَدْرِ (۹۷/۱) کہہ کر پکارا گیا۔ یعنی جدید پیمانوں کی رات۔ اسی کو دوسری جگہ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ کہا گیا ہے جس میں حق و باطل نکھر کر الگ الگ ہو گئے (۴۴/۳)۔ دنیا نے اس رات کی عظمت کو نہیں پہچانا۔ اسی لیے وہ ابھی تک تاریکیوں کے جہنم میں ڈوبی ہوئی ہے اور ہزار ہاتھ پاؤں مارنے کے باوجود زندگی کے صحیح راستہ پر گامزن نہیں ہو سکی۔ جس دن یہ حقیقت اس کی سمجھ میں آ گئی کہ کائنات کی شبِ دیجور کی تاریکیاں اس مہرِ عالمتاب کی ضوفشانیوں سے دور ہو سکتی ہیں جو اس لیلۃ القدر کی صبح کو نمودار ہوا تھا، منزلِ انسانیت کی سیدھی راہ (صراطِ مستقیم) اس کے سامنے آ جائے گی۔ راستہ اب بھی موجود ہے اور وہ مہرِ عالمتاب اپنی پوری تابندگی سے نور افشاں بھی۔ صرف اتنی کمی ہے کہ انسان نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں جس سے وہ اس روشنی سے محروم ہے۔ جس دن اس نے اپنی آنکھیں کھول لیں، سیدھا راستہ اس کے سامنے آ جائے گا۔

نوعِ انسانی کے لیے جشنِ مسرت

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نزولِ قرآن کے واقعۂ عظیمہ کو نوعِ انسانی کے لیے جشنِ مسرت قرار دیا ہے کہ اس سے دنیا کو اس کی چھنی ہوئی بینائی واپس ملی تھی اور کسی اندھے کی زندگی میں اس واقعہ سے زیادہ قابلِ یادگار اور کون سا واقعہ ہو گا جس میں اس کی بصیرتِ رفتہ کی بازیابی ہوئی ہو۔

---

[1] قرآنِ کریم نے اس کے لیے لیل کہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پہلی وحی کا وقت بھی رات کا ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا 'جہالت کی جن تاریکیوں میں لپٹی ہوئی تھی، اس کی وجہ سے اس زمانے کو تشبیہاً لیل (رات) کہا ہو۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝ (۱۰ / ۵۷-۵۸)

اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے ایک ایسی چیز آگئی ہے، جو موعظت ہے، دل کی تمام بیماریوں کے لیے شفا ہے اور ہدایت و رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو (اس پر) یقین رکھتے ہیں (اے پیغمبرؐ!) تم کہو، یہ اللہ کا فضل ہے اور اس کی رحمت پس چاہیے کہ اس پر خوشیاں منائیں۔ اور یہ ان ساری چیزوں سے بہتر ہے جسے وہ دنیا کی زندگی میں جمع کرتے رہتے ہیں!

یہ تھی وہ لَيْلَةُ الْقَدْرِ جس میں حضورؐ کو منصبِ نبوّت سے سرفراز کیا گیا۔

وحی ملنے کے بعد، آپؐ نے سب سے پہلے، اس کا ذکر اپنی بیوی (حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ) سے کیا۔ یہاں ہمارے سامنے ایک اور عظیم حقیقت آتی ہے۔

شاہدِ عادل۔ (۱) بیوی

بیوی، مرد کی زندگی کی شکن در شکن تہوں سے واقف ہوتی ہے۔ اس کا کوئی راز اس سے پوشیدہ نہیں ہوتا۔ وہ ساری دنیا کے سامنے نقاب پوش رہ سکتا ہے لیکن بیوی کے سامنے اس کی زندگی بے نقاب ہوتی ہے۔ انسان ساری دنیا کی نگاہوں میں ہیرو بن سکتا ہے، زندگی کے بہت سے گوشے دنیا سے چھپائے جا سکتے ہیں لیکن اصلی ہیرو وہ ہے جو اپنی بیوی کی نگاہ میں ہیرو ہو بشرطیکہ اس کی نگاہیں غلط چشموں سے رنگین نہ ہو چکی ہوں۔ آپؐ کی رفیقۂ حیات، حضرت خدیجہؓ کا قلبِ سلیم تھا چنانچہ جب انہوں نے اس پیغام کو سُنا، تو حضورؐ کی صداقت پر فوراً ایمان لے آئیں۔

(۲) نوکر اور بچے

بیوی کے بعد انسان کی بے نقاب زندگی کا مشاہدہ کرنے والے گھر کے نوکر اور بچے ہوتے ہیں۔ حضرت زیدؓ آپؐ کے آزاد کردہ غلام تھے اور حضرت علیؓ ابنِ ابی طالب حضورؐ کے آغوشِ تربیت کے پرورش یافتہ۔ حضرت خدیجہؓ کے بعد انہوں نے سُنا تو فوراً نگۂ عقیدت جُھکا کر ایمان لے آئے۔

(۳) دوست

گھر کے باہر انسان کے کیریکٹر کا صحیح پرکھنے والا اس کا قلبی دوست ہوتا ہے جس کے سامنے اس کی زندگی کا ہر بے تکلف پہلو ہوتا ہے۔ حضورؐ کے یہ دوست حضرت ابوبکرؓ تھے ـــ

۔ دولتمند، فیاض، نہایت صائب الرائے اور قریش میں معزز اور تمام شہر میں بااثر، صدق و دیانت میں مشہور، اپنی پارسائی کی وجہ سے ممتاز۔ جب دوست کے اس نئے دعویٰ کو سُنا تو بلا ادنیٰ تامل اس کی صداقت کا اعلان کر دیا۔

کس قدر ثریا بخت اور فرخندہ اختر تھے یہ حضرات جنھیں قدوسیوں کی اس جماعت میں شرکت کی اولیت بلکہ یوں کہیے کہ اس جماعت کے مبنی و اساس ہونے کا شرف حاصل ہوا جسے دُنیائے انسانیت میں انقلابِ عظیم پیدا کرنا تھا۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۹﴾ اس کے بعد کچھ اور خوش نصیب حضرات اپنے جذبۂ شوق سے بابِ رسالت تک کشاں کشاں آئے اور متاعِ ایمان و آگہی سے بہرہ یاب ہوئے۔ ۔ ان میں سے اکثر وہ تھے جو تلاشِ حقیقت میں سرگرداں رہتے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے یہ نئی آواز سُنی، تو اسے پہچان لیا اور حق و صداقت کی اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھ آئے۔ حضرت عثمان رضؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ، سعد بن وقاص رضؓ، طلحہ رضؓ، ارقم رضؓ، سعید بن زید رضؓ، عبداللہ بن مسعود رضؓ، حضرت ابوبکر رضؓ کی ترغیب سے اس جماعتِ حقہ میں شامل ہوئے۔ یہ سب تبدیلی خاموشی سے ہو رہی تھی کیونکہ اس دعوت کی آواز ابھی بلند نہیں کی گئی تھی۔ یہ ایمان و اقرار، دلوں کا جھکاؤ اور نگاہوں کی تسلیم تھی اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر اور پختہ عہد و فا ہوتا بھی کون سا ہے!

یک نگہ، یک خندۂ دُزدیدہ، یک تابندہ اشک
بہرِ پیمانِ محبت نیست سوگندے دگر

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی

خیز و سجاک تشنۂ بادۂ زندگی فشاں!

سچا رسول وہ ہے جس کے پاس (نوعِ انسانی کے لیے) کوئی پیغام ہو، وہ جس کی روح میں اُس زمانہ کے اہم مسائلِ حیات، اضطرابی کیفیت پیدا کردیں اور ان مسائل و مباحث کی اہمیت اُسے دعوت اور پکار پر مجبور کر دے۔

(MOHAMMAD -- THE MAN AND HIS FAITH;

BY TOR ANDRE)

اسی حقیقت کو، علامہ اقبالؒ نے اپنے خُطبات میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"محمدؐ عربی فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچ کر واپس تشریف لے آئے۔ خدا شاہد ہے کہ اگر میں اس مقام پر پہنچ جاتا، تو کبھی واپس نہ آتا"۔ یہ الفاظ ایک بہت بڑے مسلمان صوفی بزرگ (حضرت عبد القدوس گنگوہیؒ) کے ہیں۔ تصوّف کے لٹریچر میں ان جیسے اور الفاظ کا ملنا غالباً مشکل ہے جو ایک فقرہ کے اندر شعورِ نبوّت اور تصوّف[1] کے اس قدر لطیف نفسیاتی فرق کو اس طرح واضح کردیں۔ ایک صوفی

---

[1] ہم اس وقت اس بحث میں نہیں جانا چاہتے کہ تصوّف کی ماہیّت کیا ہے۔ اس وقت صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ ایک صوفی کا تجربہ (جو کچھ بھی وہ ہے) اس کی اپنی ذات تک محدود ہوتا ہے اور جب کوئی دوسرا اس سے، اس کے متعلق پوچھتا ہے، تو وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا کہ — ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی — لیکن وحی کا مقصد ایک جہانِ نو کی تخلیق ہوتا ہے۔ (تصوّف کی ماہیّت کے متعلق میری کتاب — تصوّف کی حقیقت — دیکھئے)۔

اپنے انفرادی تجربہ کی تجرّدگاہ سے واپس آنا نہیں چاہتا۔اور جب واپس آتا بھی ہے' (اس لیے کہ اُسے واپس آنا پڑتا ہے) تو اس کی یہ مراجعت نوعِ انسانی کے لیے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس' ایک نبی کی مراجعت تخلیقی ہوتی ہے۔ وہ آتا ہے کہ زمانہ کے طوفان پر تسلط پاکر تاریخ کی قوّتوں کو اپنے قابو میں لے آئے اور اس طرح مقاصد و مطامح کی ایک نئی دنیا تعمیر کردے۔ ایک صوفی کے لیے اس کے انفرادی تجربہ کی تجرّدگاہ' آخری مقام ہوتی ہے لیکن ایک رسُول کے دل میں اس سے زلزلہ انگیز نفسی قوّتیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تمام دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کردیں۔ یہ آرزو، کہ جو کچھ اس کی آنکھ نے دیکھا ہے' ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکّل ہو جائے، نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اسی لیے ایک صاحبِ وحی کے "تجربہ" کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے' وہ کیسا ہے اور اس کے پیغام کی روح سے جس قسم کی دنیائے ثقافت ابھر کر سامنے آگئی ہے' وہ کس انداز کی ہے۔ (خطبات صفحہ ۱۱۸)

عظیم الشّان فریضہ

وحی ملنے کے بعد، آپؐ پر، انسانی دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کا عظیم فریضہ عاید ہو گیا۔ چنانچہ ندائے خداوندی نے آپؐ کو پکارا اور کہا کہ:

یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ قُمْ فَاَنْذِرْ ۙ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۙ (۷۴/۱-۳)

اے وہ کہ جس کے ذمّے دنیا کو سنوارنے اور جہانِ نو پیدا کرنے کا فریضہ عاید کیا گیا ہے، اُٹھ اور نوعِ انسان کو، غلط راستے پر چلنے کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر دے اور اس حقیقت کا اعلان کردے کہ کبریائی صرف خدا کے لیے ہے۔

قُمْ (اُٹھ) کہ تیرے قیام میں نوعِ انسانی کا قیام مضمر ہے اور قیامِ انسانیّت ہی تخلیقِ کائنات کا مقصود ہے۔ انسانوں کی پوری بستی پر موت کی سی افسردگی طاری ہو چکی ہے۔ دنیا میں زندگی کی کوئی رمق کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ اُٹھ! اور خونِ رگِ کائنات میں تموّج پیدا کر دے۔

خیز و بخاکِ تشنہ' بادۂ زندگی فشاں!

انقلاب

نظامِ عالم درہم برہم ہو چکا ہے۔ نوعِ انسان، وحدتِ خلق کا بنیادی اصول بھلا کر رنگ، نسل، وطن، زبان کی غیر فطری حدود و ثغور سے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی ہے جس سے یہ دُنیا،

انسانوں کی بستی کے بجائے خونخوار درندوں کا بھٹ بن چکی ہے۔ اُٹھ! اور انسانیت کا فراموش کردہ آئین پھر اُن کی نگاہوں کے سامنے لا۔

خیز و قانونِ اخوت ساز دہ
جامِ صہبائے محبت باز دہ

قبائل و شعوب اور اقوام و ملل ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہو رہی ہیں۔ یہ خاکدانِ ارضی جسے امن و سلامتی کی جنت بننا تھا، انسانی سبعیت و بربریت کے ہاتھوں ہلاکت و بربادی کا شعلہ بار جہنم بن رہا ہے۔ اُٹھ! اور اس جہنم کی انسانیت سوز آتش فشانیوں کو، اپنے عالمگیر سحابِ اخوت و مودت کے ترشح سے برد و سلامتی کی جنت بنا دے۔

باز در عالم بیار ایامِ صلح
جنگجویاں را بدہ پیغامِ صلح

ملوکیت اور سرمایہ پرستی کی ملعونہ مفاد پرستیوں نے انسانوں کی گردنوں میں اپنی چیرہ دستیوں کے اطواق و سلاسل پہنا رکھے ہیں۔ احبار و رہبان کی انسان فروش برہمنیت نے خدا اور بندے کے درمیان آسمان بوس دیواریں حائل کر رکھی ہیں۔ ذرّے کو خورشید سے کوئی نسبت نہیں رہی۔ عابد اور معبود میں کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ سنگِ آستانِ حرم، سجودِ اہلِ دنیا سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ قلوب کے رشتے منقطع ہو گئے ہیں۔ تسبیح کا دھاگا ٹوٹ چکا ہے۔ اُٹھ! اور دنیا میں ان تمام طاغوتی قوتوں کو پامال کر کے انسان اور انسان، اور خدا اور بندے میں حقیقی تعلق پیدا کر دے۔

باز ایں اوراق کا شیرازہ کن
باز آئینِ محبت تازہ کن

اُٹھ! اور اس انقلاب آفریں دعوتِ حق و صداقت سے کوہ و جبل اور دشت و صحرا کی فضا میں حیات انگیز تحریک پیدا کر دے جس سے تمام نظامہائے کہن کی بنیادیں ہل جائیں اور ان کی جگہ دنیا میں وہ نظامِ عدل و حریت قائم ہو جائے جس سے انسانیت کو اس فضائے بسیط میں اِذنِ بال کشائی ملے اور وہ ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی اپنے معراجِ کبریٰ تک جا پہنچے جہاں نمائندگانِ عالمِ ملکوت، جنت سے نکلے ہوئے آدم کا استقبال اس پیغامِ تبریک و تہنیت سے کریں کہ

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيٓ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ○ (۴۳/۷۲)

یہ وہ جنت ہے جس کا تمہیں، تمہارے اعمال کے بدلے میں وارث قرار دیا گیا ہے۔

یہ تھا وہ انقلاب آفریں پیغام جسے دُنیا میں عام کرنے کا فریضہ آپؐ پر عاید کیا گیا۔ وہ پیغام حریّت آموز جس کی خصوصیت یہ ہے کہ

زندگی را می کند تفسیرِ نَو	می دہد ایں خواب را تعبیرِ نَو
بندہا از پا کشاید بندہ را	از خداوندی رہاید بندہ را
پختہ سازد فطرتِ ہر خام را	از حرم بیروں کند اصنام را

كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ○ (۲/۷۳)

اللہ اِس طرح مُردوں کو زندگی بخشتا اور تمہیں اپنی (قدرت وحکمت کی) نشانیاں دکھلاتا ہے تاکہ تم فہم ودانش سے کام لو۔

پہلی دعوتِ حیات بخش

ذمہ داریوں کی اس دنیا کو اپنے کندھوں پہ اُٹھائے حضورؐ نے اپنی قوم کو مخاطب کیا اور صفا کی پہاڑی پر چڑھ کر پکارا یَا صَبَاحَاہ۔ عرب میں یہ لفظ اُس وقت بولا جاتا ہے جب صبح کے وقت کوئی قبیلہ دوسرے قبیلہ پر دفعۃً قتل وغارت گری کے لیے ٹوٹ پڑے۔ یہ لفظ سن کر تمام لوگ چونک اُٹھے اور آپؐ کے گرد جمع ہو گئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ یَامَعْشَرِ قُرَیش!

اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے دامن سے ایک فوج نکلا چاہتی ہے تو تم کیا میری اس بات کو سچ مانو گے؟[1]

انہوں نے بیک زبان کہا کہ ہم نے آج تک کبھی کوئی غلط بات تمہاری زبان سے نہیں سُنی۔ ہم یقین کرتے ہیں کہ تو صادق اور امین ہے، اس لیے تمہاری بات کو ضرور سچ مانیں گے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا، میں تمہیں آگاہ کرتا ہوں کہ تمہاری موجودہ روشِ زندگی سے تم پر ایک سخت تباہی آنے والی ہے جسے یوں سمجھو کہ تمہارے سر پر کھڑی ہے۔ اس پر ابولہب نے نہایت استخفاف سے کہا کہ کیا ہم سب کو اسی لیے جمع کیا تھا! یہ کہہ کر وہ چلا آیا اور اس کے ساتھ دوسرے لوگ بھی چلے گئے۔ یہ قریش کی طرف ایک عمومی دعوت تھی۔

---

[1] بخاری جلد دوم

ذرا اس دعوت کے انداز پر غور فرمائیے اور دیکھئے کہ نبیٔ اکرمؐ نے مقامِ نبوّت کی وضاحت کیسے دلنشین

مقامِ نبوّت کی وضاحت

انداز سے فرمائی ہے۔ نبیؐ کے معنی ہیں مقامِ بلند پر کھڑا ہونے والا۔ آپؐ صفا کی چوٹی پر کھڑے ہیں جہاں سے آپؐ پہاڑ کے دونوں جانب دیکھ سکتے ہیں۔ مخاطبین پہاڑ کے دامن میں ہیں جہاں وہ صرف پہاڑ کے ایک جانب دیکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا جو شخص ایسے مقام پر کھڑا ہو جہاں سے پہاڑ کی دوسری سمت بھی نظر آ رہی ہو، وہ دوسری طرف کے ماجریات و واقعات کو آنکھوں دیکھ کر بتا سکتا ہے اور اگر مخاطبین کو اس کی صداقت پر ایمان ہے تو اس کی کسی بات میں شبہ نہیں ہو سکتا۔ نبی بھی خدا کی طرف سے ایک ایسے مقامِ بلند پر فائز ہوتا ہے جہاں وہ وحیٔ خداوندی کی روشنی میں انسانی اعمال کے حال (PRESENT) کے ساتھ ساتھ ان کا مستقبل (FUTURE) بھی دیکھ سکتا ہے[1]۔ یہ تھی اس دعوتِ انقلاب کی ابتداء۔ یہ تھی وہ آسمانی آواز جسے سننے کے لیے فضائے عالم ایک مدت سے گوش بر آواز تھی۔

دعوت کا جواب

لوگوں نے اس دعوت کو سنا اور استخفاف کی ہنسی سے اس کا استقبال کر کے واپس چلے گئے۔ لیکن کیا اس سے یہ داعیٔ انقلابؐ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو گیا؟ کیا اس نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیا کہ میرے ذمہ جو فریضہ تھا وہ ادا ہو گیا۔ اب اس سے زیادہ میں کیا کر سکتا ہوں؟ ایسا کس طرح سے ہو سکتا تھا؟ آپؐ کے ذمہ تو اس پیغام کو عملی طور پر متشکل کرنا تھا اور اس کی تشکیل و تعمیر ناممکن تھی جب تک تمام سرکش قوتوں کو مغلوب نہ کر لیا جائے۔ اس لیے اس داعیٔ انقلاب (علیہ التحیۃ والسلام) کے فریضۂ زندگی کو یہیں ختم نہیں ہو جانا تھا۔ یہ تو اس کی ابتدا تھی۔

پہلی دعوت عمومی تھی۔ اس کے بعد، یہ سلسلۂ دعوت و تبلیغ ایک نظام کی شکل میں آگے بڑھنا شروع ہوا۔

اس کی ابتداء آپؐ نے خود اپنے اہلِ خاندان سے کی۔ چنانچہ جب آپؐ کو حکم ملا کہ

وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ ۙ (۲۶/۲۱۴)

اور (اے پیغمبرؐ!) اپنے قریبی رشتہ داروں کو (غلط روش زندگی کے تباہ کن نتائج سے) آگاہ کر دے!

اہلِ خاندان کو دعوت

تو آپؐ نے تمام بنو ہاشم کو کھانے پر بلایا اور ان سے کہا کہ "میں وہ چیز لے کر آیا ہوں جو دین اور دنیا دونوں کی کفیل ہے۔ اس بارِ گراں کو

---

[1] مقامِ نبوّت کی وضاحت کے لیے دیکھئے "مقامِ محمدیؐ" جو سلیم کے نام خطوط میں شامل ہے۔

اُٹھانے میں کون میرا ساتھ دے گا؟ خاندان کے بڑے سُن رہے تھے اور محوِ حیرت تھے کہ ہماری گود کا کھلایا ہُوا بچہ ہمیں کیا باتیں سنا رہا ہے؟ جب آپؐ نے اپنے چچا ابوطالب سے کہا کہ "اپنے تیرہ سالہ بیٹے (حضرت) علی رضؓ کی بات مانا کرو اور جو کچھ وہ کہا کرے اُسے بغور سُنا کرو" تو تمام مجمع کھلکھلا کر ہنسا اور ابوطالب سے تمسخر کرنے لگا کہ لو آج سے بیٹے کا حکم مانا کرو۔

انہیں کیا علم کہ جس بات کو ماننے کے لیے کہا گیا تھا اس میں بیٹے اور باپ کے رشتہ کا کوئی تعلق نہیں تھا! وہ تو کلمۂ حق و صداقت کے سامنے جُھک جانے کا مطالبہ تھا۔ یہ کلمۂ صداقت بیٹے کی زبان سے نکلے تو باپ اس کے سامنے جُھک جائے اور باپ کی زبان سے نکلے تو بیٹا جھک جائے۔

لیکن ابھی یہ بات ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی جنہوں نے سُن رکھا تھا کہ باپ کی اطاعت بیٹے پر بہرحال لازم ہے۔

سورۂ قصص میں ہے کہ رسول کو ملک کے دارالخلافہ میں مبعوث کیا جاتا ہے (۲۸/۵۹)، اس لیے کہ وہ تمام آبادی کا مرکز اور ان کے افکار و اعمال کا منبع ہوتا ہے۔

اہلِ مکہ کو دعوت

حضورؐ کی بعثتِ مقدسہ مکہ میں ہوئی جو نہ صرف حجاز کی اجتماعی زندگی کا مرکز تھا بلکہ تمام عرب کی عقیدت مندیوں کا قبلہ تھا اور اپنی اولیّت اور اہمیت کی بنا پر اُمُّ القُرٰی (بستیوں کی ماں) کہلاتا تھا۔ اب اس صدائے حق و صداقت کو اپنے خاندان سے آگے بڑھ کر، اُمُّ القُرٰی اور اس کے گرد و پیش تک پہنچانے کا حکم ہُوا۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا ط (۶/۹۲ نیز ۴۲/۷)

اور (دیکھو) یہ کتاب (قرآن) ہے جسے ہم نے (تورات کی طرح) نازل کیا۔ یہ بڑی بابرکت ہے اور جو تعلیم اس سے پہلے انبیاء کرامؑ کو دی گئی تھی اسے سچا کر دکھانے والی ہے۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ تم اس کے ذریعے (شہر مکہ) کے باشندوں کو اور ان لوگوں کو جو اس کے گرد و نواح میں بستے ہیں ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرو۔

اُس وقت، اس انقلابی جماعت، اس حزبُ اللہ کی تعداد قریب چالیس تک پہنچ چکی تھی۔ آج اِس دَور میں

جبکہ جماعتوں کی کثرت و قلت کا معیار صرف سروں کی گنتی رہ گیا ہے، چالیس نفوس پر مشتمل جماعت کو شاید جماعت کے نام سے موسوم بھی نہ کیا جائے لیکن ہمیں کیا معلوم ان چالیس مقدس پیکروں کے سینے میں جو قلوب متحرک تھے ان کی دھڑکنوں میں کتنی قیامتیں چھپی ہوئی تھیں۔ آج جماعت کی قوت کے پیمانے ہاتھوں کا شمار ہیں۔ اُس وقت قوتوں کا مقیاس ایمان کی حرارت تھی اور ایمان کی قوت ایسی کوہ شکن اور خارا شگاف ہوتی ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی۔

جب اِس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ رُوح الامیں پیدا

سب سے پہلی شہادت

آپؐ نے اب خاص حرمِ کعبہ میں پہنچ کر توحید کا اعلان کر دیا۔ مخالفین کے نزدیک یہ حرم کی سب سے بڑی بے حرمتی تھی۔ یہ ان کی حمیت و غیرت کے خلاف سب سے بڑا اعلانِ جنگ تھا۔ چاروں طرف سے لوگ اس جماعت پر ٹوٹ پڑے۔ حضورؐ کے ربیبؓ حارث ابنِ ابی ہالہ یہ خبر سُن کر اپنے گھر سے دوڑے آئے کہ آپؐ کو بچالیں لیکن وہ مخالفین کے ہجوم میں گھر گئے اور شہید ہو گئے۔ اعلائے کلمۃ الحق کے سلسلہ میں یہ خون کے پہلے قطرے تھے جن سے یہ زمین رشکِ صد آسمان بن گئی۔ ایسے مقدس خون کے لیے حرم کی سرزمین سے زیادہ اور کون سا مقام موزوں ہو سکتا تھا۔ شجرِ اسلام کو اسی خون کے قطرات کی آبیاری کی ضرورت تھی۔ ملت کی سرخروئی اسی خون کی رنگینی کی دست نگر تھی۔ دنیا میں کون سا انقلاب ہے جس کی کامیابی کی داستانیں خونیں حروف سے نہیں لکھی گئیں؟ کون سی تحریک ہے جو شمشیر و سناں کے سایوں میں پروان نہیں چڑھی؟ حق و باطل کی کون سی آویزش ہے جس کے فیصلے قتل گاہوں میں نہیں ہوئے؟ صدق و عدل کی کون سی آواز ہے جسے دبانے کے لیے ابلیسی نظامِ استبداد نے دار و رسن سے گریز کیا ہے؟ ازل سے یہی ہوتا آیا ہے اور ابد تک یہی ہوتا رہے گا۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

اہلِ عرب کی طرف

اہلِ مکہ کے بعد اس دعوت کو تمام قوم تک پہنچایا گیا۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا۟ عَلَيْهِمُ

الَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ... (۱۳/۳۰)

اور (اے پیغمبرؐ!) اسی طرح ہم نے تجھے ایک ایسی قوم کی طرف بھیجا جس سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکی ہیں۔ اور اس لیے بھیجا ہے کہ جو تعلیم تمہیں بذریعہ وحی دی گئی ہے، اسے ان کے سامنے پیش کر دے۔

تمام نوعِ انسانی کی طرف

اس سے پہلے، وحی کی تعلیم خاص قبیلوں اور خاص قوموں تک محدود رہتی تھی لیکن جو تعلیم خدا کے اس آخری رسولؐ کے ذریعے دی گئی تھی، اس کی مخاطب تمام نوعِ انسانی تھی، یعنی یہ تعلیم زمان کی حدود سے ناآشنا اور مکان کی قیود سے بے نیاز تھی۔ اسے عالمگیر انسانیت کا ضابطۂ زندگی بننا تھا اور قیامت تک آنے والے انسانوں کی راہ نمائی کا فریضہ ادا کرنا تھا۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے سلسلہ میں فرمایا کہ

قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعَا ۨالَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ج (۷/۱۵۸)

اے پیغمبرؐ! تم عالمگیر انسانیت کو مخاطب کر کے کہہ دو کہ میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں، اس خدا کا بھیجا ہوا رسول جس کا اقتدار تمام کائنات میں کارفرما ہے۔

اور چونکہ انسان بھی کائنات ہی کے ایک گوشے کا مکین ہے، اس لیے اس کی دنیا میں بھی اقتدار و اختیار خدا ہی کا ہونا چاہیئے۔

یہ تھی وہ انقلاب انگیز دعوت جس کا مرکز مکہ بنا اور جس کا محیط تمام کرۂ ارض کو بننا تھا۔

آویزشِ حق و باطل

ستیزہ کار رہا ہے اَزل سے تا اِمروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بُولہبی

اَزل سے تا اِمروز

قرآنِ کریم میں ہے کہ ابلیس کی نمود، تخلیقِ آدم کے ساتھ ہی ہوئی ہے اور اسے قیامت تک کے لیے مہلت بھی دے دی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خیر و شر کا تصادم اور حق و باطل کا تزاحم ناگزیر ہوگا۔ جہاں حق کی آواز اُٹھے گی، باطل کی فریب کاریاں اور رستخیزیاں اسے دبانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوں گی۔ جہاں کہیں "چراغِ مصطفویؐ" نور افشاں ہوگا، "شرارِ بُولہبی" اس سے ستیزہ کار نظر آئے گا۔ تغیراتِ زمانہ سے اس تزاحم و تصادم کے انداز بدل جائیں گے لیکن اصلِ مخالفت اپنی جگہ پر بدستور قائم رہے گی۔ جنگ کے محاذ بدل جائیں گے۔ آلاتِ حرب و ضرب کی شکلوں اور نوعیتوں میں تبدیلی ہو جائے گی لیکن حریفانِ پنجہ شکن وہی رہیں گے۔ نہ "فطرت اسد اللّٰہی" بدلے گی نہ قلبِ "مرحبی و عنتری" میں کوئی تغیر واقع ہوگا۔ وہی ابنِ آدم اور وہی جنودِ ابلیس۔ حضرت نوحؑ سے جنابِ عیسیٰؑ تک کے سلسلۂ رشد و ہدایت پر ایک نگاہ ڈالیے۔ یہ سلسلۂ دراز کیا ہے؟ ایک داستانِ مسلسل ہے اسی تزاحم و تخالف کی۔ جہاں حق و صداقت کی آواز بلند ہوئی، ابلیسی جیوش و عساکر اپنی پوری قوتوں کو ساتھ لے کر مقابلہ کے لیے سامنے آ گئے۔ ان ابلیسی جیوش و عساکر کی تفاصیل کتنی ہی طول طویل کیوں نہ ہوں، اصولی طور پر یہ، دو بنیادی شقوں میں تقسیم ہوں گے اور مزید تجزیہ کے بعد نظر آئے گا کہ یہ بنیادی شقیں بھی درحقیقت

ایک ہی اصل کی دو شاخیں ہیں۔ اس اصل کا نام قرآنِ کریم کی اصطلاح میں "مترفین کا گروہ" ہے یعنی وہ لوگ جو دوسروں کی کمائی پر عیش پرستی کی زندگی بسر کریں۔ غریب، مزدور، محنت کش خون پسینہ ایک کر کے کمائیں اور یہ مختلف طریقوں اور متنوع حربوں سے ان کی محنت کے ماحصل کو لوٹ کھسوٹ کر مزے اڑائیں۔ مفاد پرستوں کے اس گروہ کی ایک شاخ کا نام ملوکیت، سرمایہ داری، جاگیرداری، زمینداری (اور دورِ حاضر کے جدید نظام کی رو سے) صنعت کاری اور کارخانہ داری ہے۔ اور دوسری شاخ 'مذہبی پیشوائیت' پر مشتمل ہے مقصد دونوں گروہوں کا ایک ہے ـــ یعنی غریب کمائیں اور یہ کھائیں۔ ان دونوں گروہوں کی آپس میں مِلی بھگت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ ایک کے بغیر دوسرا گروہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ برہمن، راجہ کو ایشور کا اوتار قرار دے کر، عوام کو اس کی پرستش پر آمادہ کرتا ہے اور راجہ، برہمن کی رکھشا (حفاظت) کا ذمہ لے کر اُسے عوام کے قلب و دماغ پر سوار رہنے کے قابل بناتا ہے۔ خدا کے رسول آتے ہی اس لیے تھے کہ مظلوم اور مقہور انسانیت کو ان مفاد پرستوں کے پنجۂ استبداد سے چھڑا کر انہیں صحیح آزادی عطا کریں۔ ان کے خلاف، ان دونوں گروہوں کا اُٹھ کھڑے ہونا لازمی تھا۔ یہی ہے وہ کشمکش جو پہلے دن سے آج تک چلی آ رہی ہے۔ چنانچہ تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ جہاں خدا کا کوئی رسول آیا، اربابِ مذہب عوام کے جذبات کو مشتعل کر کے ایک طرف صف آرا ہو گئے اور ارکانِ دولت و اقتدار، استبداد و قہرمانی کے تمام حربات و آلات کو ساتھ لے کر دوسری طرف نبرد آزما۔ مدعیانِ حق کی تکذیب و تذلیل کی گئی۔ ان کی حق پرستی کا مضحکہ اڑایا گیا۔ ان کی دعوتِ انقلاب کا استقبال استخفاف و استہزاء سے کیا گیا۔ ان کی انسانیت پرور تحریک کو کچلنے کے لیے ہر قسم کی تخویف و ترہیب سے کام لیا گیا۔ کہیں ان سے کہا گیا کہ اگر اپنی اس دعوتِ انقلاب سے باز نہیں آؤ گے تو سنگسار کر دیے جاؤ گے۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ۝ (۲۶/۱۱۶)

لوگوں نے کہا "اے نوحؑ! اگر تو باز نہیں آئے گا (اور اس دعوتِ انقلاب کو برابر جاری رکھے گا، تو یاد رکھ) تمہیں سنگسار کر دیا جائے گا۔

کسی کو یہ دھمکی دی گئی کہ اگر اپنی روش نہ بدلو گے، تو جلاوطن کر دیئے جاؤ گے۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ ۝ (۲۶/۱۶۷)

لوگوں نے کہا۔ "اے لُوطؑ! اگر تو باز نہیں آئے گا (اور اپنی اس دعوت کو بند نہیں کرے گا) تو (یاد رکھ) تمہیں شہر بدر کر دیا جائے گا۔

کہیں قسمیں اٹھا اٹھا کر فیصلے کیے گئے کہ اس جماعت کے تمام افراد کو بیک وقت موت کے گھاٹ اتار دیا جائے تاکہ یہ ہر روز کی خلفشار ختم ہو۔

قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ○ (۲۷/۴۹)

اُن (نو آدمیوں) نے کہا "ایک دوسرے کے سامنے خدا کے نام پر حلف اٹھاؤ کہ ہم اچانک صالح اور اس کے ساتھیوں کو رات کے وقت فنا کے گھاٹ اتار دیں گے اور پھر اس کے ورثا سے کہہ دیں گے کہ ہم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے ان کے خاندان کو تباہ و ہلاک کر دیا ہے اور یقیناً ہم (اپنے اس بیان میں) سچے ہیں۔

کہیں یہ دھمکی دی گئی کہ اگر اس انداز کو نہیں بدلو گے تو زندہ آگ میں جھونک دیئے جاؤ گے۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ ... (۲۹/۲۴)

تو ابراہیمؑ کی قوم کا (اس کے سوا) کوئی جواب نہیں تھا کہ وہ کہنے لگے (یہ یوں باز نہیں آئے گا) اسے قتل کر ڈالو یا آگ میں جلا دو۔

کہیں سرکشی اور تمرد کی تمام قوتیں مجتمع ہو گئیں کہ اس انقلابی تحریک کے بانی کا خاتمہ کر دیا جائے جو پکار پکار کر کہتا ہے کہ سامانِ ربوبیت صرف خدا کے ہاتھ میں رہنا چاہیئے، انسانوں کے اقتدار میں نہیں۔

وَ قَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗۤ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ ... (۴۰/۲۸)

خاندانِ فرعون میں سے ایک مردِ مومن نے کہا جو اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا "کیا تم ایسے آدمی کو قتل کرتے ہو جو صرف یہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار خدا ہے (اور اس کے علاوہ اس کا اور کوئی جرم نہیں)"۔

قصۂ بنی اسرائیل میں ہے کہ جب ساحرینِ دربارِ فرعون نے، حضرت موسےٰؑ کی طرف سے پیش کردہ صداقت کو بے نقاب دیکھ لیا، تو انہوں نے اس کا اعتراف کر لیا اور ربِّ موسیٰؑ پر ایمان لے آئے۔ اس پر، فرعون کی قہرمانیت پورے جوش میں آگئی اور اس نے گرج کر کہا کہ

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ

النَّخْلِ ز وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰى ٥ (۲۰:۷۱)

فرعون نے کہا، "تم میری اجازت کے بغیر موسیٰ پر ایمان لے آئے؟ ضرور یہ تمہارا سردار ہے جس نے تمہیں باطل سکھایا ہے۔ اچھا دیکھو میں کیا کرتا ہوں۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں اُلٹے سیدھے کٹواؤں گا دیا ہتھکڑیاں، بیڑیاں پہناؤں گا) اور کھجور کے تنوں پر سُولی دوں گا۔ پھر تمہیں پتا چلے گا ہم دونوں میں کون سخت عذاب دینے والا ہے اور کس کا عذاب دیرپا ہے۔"

اور پھر اسی داستانِ بنی اسرائیل کے مقطع کے بند کو دیکھیے، جب خدا کی آخری حجت نفسِ مسیحائی کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی تاکہ اگر ان کے عروقِ مردہ میں کچھ بھی صلاحیت باقی ہو تو ان میں پھر سے خونِ زندگی دوڑا دیا جائے، تو اس مقدس کوشش کے جواب میں یہودیوں کے احبار و رہبان اور بازنطینی شاہنشاہیت کے عمائد و ارکان، خرقہ و سجّادہ کی دسیسہ کاریوں اور شمشیر و سناں کی آتش باریوں کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے کہ اس داعیٔ انقلاب کو حوالۂ دار و رسن کر دیا جائے۔

غرضیکہ اگر آپ تاریخ کی رصدگاہوں سے نوعِ انسان کی داستانِ حیات کا مطالعہ کریں، تو یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجائے گی کہ یہ پوری داستان ایک حکایتِ مسلسل ہے کشمکشِ خیر و شر اور ستیزہ کاریٔ حق و باطل کی۔ جب اور جہاں حق کی آواز بلند ہوئی، طاغوتی قوتیں، ہجومِ مخالفت کے ساتھ چاروں طرف سے اُمنڈ کر حلقہ گیر ہو گئیں۔ چنانچہ جب صدق و عدل کی یہی انقلاب آفریں آواز فاران کی وادیوں سے بلند ہوئی، تو ابلیسی جنود عساکر اپنی پوری قوتوں کے ساتھ یورش کر کے مقابلہ کے لیے صف آرا ہو گئے۔ اس

وادیٔ فاران میں

مقابلہ کی سختی اور مخالفت کی شدت کا اندازہ کرنے کے لیے عربوں کی ان نفسیاتی خصوصیات کو ایک مرتبہ پھر سامنے لائیے جن کا ذکر گزشتہ اوراق میں ہو چکا ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، سب سے پہلی چیز جو ان کے لیے قبولیتِ حق کی راہ میں حائل تھی، ان کا قومی تفاخر اور قبائلی عصبیت تھی۔ ابوجہل نے برملا کہہ دیا کہ ہم نے ہر میدان میں بنو ہاشم کی برابری کی ہے اور انہیں کبھی آگے نہیں بڑھنے دیا لیکن اب یہ نبوت کو اپنے گھرانے میں لے آئے ہیں تو ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ان کے اس دعویٰ کو سچا مان کر ان کی عظمت کو تسلیم کر لیں اور یوں ان کے خاندان کو اپنے خاندان سے زیادہ معزز و مکرم بنا دیں۔ لہٰذا، ان کی مخالفت دلائل و براہین کی بنا پر نہیں تھی۔ یہ نہیں کہ انہوں نے اس دعوتِ انقلاب کا ٹھنڈے دل سے مطالعہ کیا اور اسے حق کے خلاف پایا اس لیے اس سے انکار کر دیا۔ ان کا انکار صرف تکبّر کی بنا پر تھا۔

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّ شِقَاقٍ ○ (۳۸/۲)

(کسی معقول بنا پر نہیں، بلکہ جو لوگ انکار کی راہ اختیار کیے ہوئے ہیں وہ جھوٹی عزت اور عداوت پر ایسا کیے ہوئے ہیں۔

وجوہاتِ مخالفت

وہ کہتے تھے کہ اس شرف و مجد کے لیے یہی انسان کیوں منتخب ہوا ہے؟

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ (۲/۱۰۵)

اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کر رکھی ہے، وہ، اور مشرکینِ مکہ، دونوں نہیں چاہتے کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر خیر و برکت (یعنی وحیٔ الٰہی) نازل ہو۔

ان کا اعتراض یہ تھا کہ خدا اس سے باتیں کرتا ہے، ہم سے کیوں نہیں کرتا؟

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ (۲/۱۱۸)

اور جو لوگ (حقیقت کا) علم نہیں رکھتے (یعنی مشرکینِ عرب) کہتے ہیں (اگر یہ تعلیم خدا کی طرف سے ہے تو) کیوں ایسا نہیں ہوتا کہ خدا ہم سے براہِ راست بات چیت کرے یا اپنی کوئی (عجیب و غریب) نشانی بھیج دے۔

وہ نہایت تکبر اور غرور اور نفرت و حقارت سے کہتے کہ اس پر فرشتے نازل ہوتے ہیں، ہم پر کیوں نہیں ہوتے؟

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ○ (۲۵/۲۱)

اور جو لوگ ہمارے قانونِ مکافات کا سامنا کرنے کی توقع نہیں کرتے (یعنی آخرت کی زندگی کے منکر ہیں) کہتے ہیں (اگر یہ تعلیم خدا کی طرف سے ہے تو) کیوں ایسا نہیں ہوتا کہ براہِ راست خود ہم پر فرشتے اتار دیئے جائیں (جو خدا کی تعلیم ہم تک پہنچا دیں) یا خود ہم اپنی آنکھوں سے اپنے پروردگار کو دیکھ لیں (اور جو کچھ اسے ہم سے کہنا ہے وہ بلاواسطہ ہم سے کہہ دے) حقیقت یہ ہے کہ یہ محض تکبر کی وجہ سے ہے جو یہ لوگ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں اور سخت قسم کی سرکشی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

اس آیت جلیلہ کے آخری ٹکڑے پر غور کیجئے۔ یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ وہ یہ تمام اعتراضات محض تکبر کی بنا پر کرتے تھے۔ نبی اکرمؐ خود قریش کے ممتاز ترین گھرانے کے فرد تھے اس لیے ان کے اس تکبر کا مطلب

یہ نہیں تھا کہ شرفِ نبوت ذلیل خاندان کے حصہ میں کیوں آیا ہے، بلکہ یہ کہ قریش کے مختلف گھرانے اپنے میں سے کسی کو بڑا نہیں سمجھتے تھے اس لیے اس امر کا تصور بھی انہیں سخت گراں گزرتا تھا کہ انہی میں سے ایک خاندان اس طرح باقیوں پر سبقت لے جائے۔ یہ تھا وہ جذبۂ نخوت جو قبولِ حق کی راہ میں اس درجہ عناں گیر ہو رہا تھا۔

ءَ اُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا ۚ (۳۸/۸)

(وہ لوگ ازراہِ عناد کہتے ہیں) کیا ہمارے درمیان میں سے (سب کو چھوڑ کر) صرف اسی پر ذکر و موعظت (قرآن) نازل کیا گیا ہے؟

قبائلی تفاخر کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں مال و دولت بھی وجہِ عزت و باعثِ افتخار سمجھا جاتا تھا۔ اور جیسا کہ پہلے سامنے آچکا ہے، حضورؐ کا شمار اُن کے رؤسا میں نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے وہ اس چیز پر بھی اعتراض کرتے تھے اور کہتے تھے۔

وَ قَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝ (۴۳/۳۱)

اور وہ لوگ (ازراہِ اعتراض یہ بھی) کہتے ہیں کہ ایسا کیوں نہیں ہوا کہ یہ قرآن دونوں شہروں (مکہ اور طائف کے سرداروں) میں سے کسی بڑے آدمی پر نازل کر دیا جاتا (جو دولت و ثروت کے لحاظ سے معزز ہوتا)۔

جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے، جس انقلاب کی دعوت رسولوں کی طرف سے دی جاتی ہے اس کے پیشِ نظر مقصد یہ ہوتا ہے کہ غریبوں، ناداروں، کمزوروں اور مظلوموں کو، طاقتوروں اور دولت مندوں کے پنجۂ خونیں سے چھڑایا جائے۔ لہٰذا، ظاہر ہے کہ اس دعوت پر سب سے پہلے غریبوں کا طبقہ لبیک کہے گا۔ آپ قرآن میں بیان کردہ، اوّلیں دعوت کو دیکھئے۔ حضرت نوحؑ کی جماعت کے متعلق سردارانِ قوم کا یہ حقارت آمیز طعن ہمارے سامنے آتا ہے کہ

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۢ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ۝ (۱۱/۲۷)

اس پر قوم کے اُن دولت مند سرداروں نے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی کہا ہم تو تم میں اس کے سوا

کوئی بات نہیں دیکھتے کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو اور جو لوگ تمہارے پیچھے چلے ہیں' ان میں بھی ان لوگوں کے سوا کوئی دکھائی نہیں دیتا جو ہم میں کمینے ہیں اور بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے ہو لیے ہیں۔ ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے، بلکہ سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو۔

نفرت و حقارت

یہی کیفیت قرآنی تحریکِ انقلاب کی تھی۔ جو سعید روحیں سب سے پہلے جماعتِ مؤمنین میں شامل ہوئیں' ان میں اکثریت غربا ہی کی تھی، اس لیے اکابرِ قریش انہیں بنگاہِ حقارت دیکھتے اور طنزاً کہتے کہ

اَهٰۤؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ (۶/۵۴)

کیا یہی ہیں وہ لوگ جنھیں اللہ نے ہم میں سے اپنے بذل و احسان کے لیے چُن لیا ہے؟

نہ صرف ذلیل ہی بلکہ انہیں سفیہ (بیوقوف) بھی کہتے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ كَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ (۲/۱۳)

اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ (اپنی مفسدانہ روش سے باز آجاؤ اور راست بازی کے ساتھ ایمان کی راہ اختیار کرو، جس طرح اور لوگوں نے اختیار کی ہے' تو کہتے ہیں، کیا ہم بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح (یہ) بے وقوف آدمی ایمان لے آئے ہیں۔

بشریّت پر اعتراض

نبی کی سب سے بڑی خصوصیّت یہ ہوتی تھی کہ وہ، خدا سے ہمکلام ہونے کے باوجود، عام انسانوں جیسی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کی امتیازی خصوصیّت (وحی کے بعد) اس کی سیرت کی بلندی ہوتی تھی لیکن مذہبی پیشوائیت، عوام کے ذہن میں یہ بات بٹھا دیتی تھی کہ نبی' عام انسانوں سے الگ تھلگ، ایک عجیب قسم کی محیّر العقول ہستی ہوتی ہے۔ اس سے قدم قدم پر معجزے سرزد ہوتے ہیں۔ اس کی ہر بات خارقِ عادت اور خلافِ فطرت ہوتی ہے۔ فرشتے اس کے جلو میں چلتے ہیں۔ اس سے پتھر باتیں کرتے ہیں۔ پہاڑ اس کے اشارے پر کانپنے لگ جاتے ہیں۔ وہ خشک زمین سے تر و تازہ پھل اُگا دیتا ہے۔ اس کی ایک نگاہ سے سیکڑوں بیماریاں دور ہو جاتی ہیں۔ اس کی ایک آواز پر مُردے جی اُٹھتے ہیں۔ اربابِ مذہب' خدا کے رسولوں کے متعلق اس قسم کا تصوّر، عوام کے ذہن

میں پیوست کر دیتے تھے اور جب رسول، ان کے اس تصور پر پورا نہیں اترتا تھا، وہ اسے جھٹلاتے تھے، تنگ کرتے تھے، اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔

أَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا أَنْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ رَجُلٍ مِّنْهُمْ أَنْ أَنذِرِ النَّاسَ
وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا أَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِندَ رَبِّهِمْ ۗ قَالَ الْكَافِرُونَ
إِنَّ هَٰذَا لَسَاحِرٌ مُّبِينٌ ○ (۱۰/۲)

کیا لوگوں کو اس بات پر تعجب ہو رہا ہے کہ انہی میں سے ایک آدمی پر ہم نے وحی بھیجی ہے؟ اس بات کی وحی کہ لوگوں کو (انکار و بدعملی کے نتائج سے) خبردار کر دے اور ایمان والوں کو خوش خبری دیدے کہ پروردگار کے حضور ان کے لیے اچھا مقام ہے۔ اسی لیے کفّار کہتے ہیں کہ یہ شخص بالکل جھوٹا ہے۔

دوسری جگہ ہے۔

وَعَجِبُوا أَن جَاءَهُم مُّنذِرٌ مِّنْهُمْ ۖ وَقَالَ الْكَافِرُونَ هَٰذَا سَاحِرٌ
كَذَّابٌ ○ (۳۸/۴)

اور لوگوں کو اس بات پر اچنبھا ہو رہا ہے کہ ان کے پاس (انکار و بدعملی کے نتائج سے) آگاہ کرنے والا (رسول) انہی میں سے (کیسے) آگیا اور (اس بنا پر) منکرینِ دعوت کہتے ہیں کہ یہ شخص اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے۔

سورۂ قٓ میں ہے۔

بَلْ عَجِبُوا أَن جَاءَهُم مُّنذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكَافِرُونَ هَٰذَا شَيْءٌ
عَجِيبٌ ○ (۵۰/۲)

(یہ لوگ کسی دلیل و برہان سے انکار نہیں کر رہے) بلکہ انہیں اس بات پر اچنبھا ہو رہا ہے کہ (انکار و بدعملی کے نتائج سے) آگاہ کرنے والا (یعنی رسول) انہی میں سے (کیسے) آگیا۔ چنانچہ منکرینِ دعوت کہتے ہیں کہ یہ تو عجیب سی بات ہے (جو ہماری سمجھ میں نہیں آتی)۔

اسی کہنہ اعتراض کی صدائے بازگشت کہ رسول مافوق البشر ہونا چاہیئے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَن يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ إِلَّا أَن قَالُوا
أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَّسُولًا ○ (۱۷/۹۴)

اور حقیقت یہ ہے کہ جب کبھی اللہ کی ہدایت (دنیا میں) ظاہر ہوئی تو اس بات نے لوگوں کو ایمان لانے سے روکا کہ (متعجب ہوکر) کہنے لگے "کیا اللہ نے (ہماری طرح کا) ایک آدمی پیغمبر بنا کر بھیج دیا ہے؟"

مخالفین کے سرغنے، خفیہ سازشوں میں اسی اعتراض کو پیش کر کے عوام کو فریب میں مبتلا رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

وَ اَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَ اَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝ (۲۱/۳)

یہ مخالفین جو اس طرح سرکشی پر اترے ہوئے ہیں، سرگوشیاں کرتے ہیں اور عوام سے کہتے ہیں کہ یہ آدمی اس کے سوا کیا ہے کہ ہماری ہی طرح کا ایک انسان ہے؟ پھر کیا تم جان بوجھ کر ایسی جگہ جاتے ہو جہاں جھوٹ کے سوا اور کچھ نہیں؟"

یہ کیسا رسول ہے جو ہماری طرح کھانا پیتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ رسول کو تو "خدا کا اوتار" اور "الوہیت کا مظہر" ہونا چاہیئے۔

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۙ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۝ (۲۵/۷)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ "اس رسول کو کیا ہو گیا کہ وہ (عام انسانوں کی طرح) کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ (اس میں اور عام انسانوں میں فرق ہی کیا ہے؟) ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس کے پاس کوئی فرشتہ اترتا جو اس کے ساتھ ساتھ (لوگوں کو انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈراتا۔

وہی اسلاف پرستی

یہ تو تھا رسول کے متعلق۔ باقی رہا اس کا پیغام، سو اس کی مخالفت میں کسی دلیل و برہان کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اس لیے کہ ہزار دلیلوں کی ایک دلیل اور لاکھ براہین کی ایک برہان یہی تھی کہ یہ تعلیم ہمارے آباء و اجداد کے مسلک کے خلاف ہے۔ وہی "دلیل" جس نے نوعِ انسانی کو علم و بصیرت کی راہوں پر گامزن ہونے سے ہمیشہ روکا۔ وہی "برہان" جس کی وجہ سے انسان کے تفکر و تدبر کی قوتوں پر ہمیشہ جمود و تعطل کا فالج گرتا رہا۔ وہی تقلیدِ اعمیٰ (بریفو کے

الفاظ میں (CUSTOM THOUGHT) جس نے انسانیت کو ارتقائی مدارج طے کرنے سے ہمیشہ باز رکھا۔ وہ جذام جس کے مہلک جراثیم، دین و دانش کے جسدِ صالح کی ہلاکت میں ہمیشہ سرگرمِ عمل رہے، وہ نگہ فریب شخصیت پرستی جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان حجابِ اکبر بن کر حائل رہی، یعنی ابلیس کا وہ حربہ جس سے اس نے ابنِ آدم کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچانے والے صراطِ مستقیم سے ہمیشہ گمراہ کیا۔ قرآن علم و بصیرت اور عقل و دانش کی دعوت تھی، لیکن مذہبی پیشوائیت کے نزدیک آنکھیں بند کر کے اسلاف کے نقوشِ قدم پر چلتے جانا ہی مسلکِ حق و صداقت تھا۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝ (۲/۱۷۰)

اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے، اللہ نے جو ہدایت نازل کی ہے اس کی پیروی کرو (اور خدا کی دی ہوئی عقل و بصیرت سے کام لو) تو کہتے ہیں نہیں، ہم تو اسی طریقہ پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو چلتے دیکھا ہے۔ (افسوس ان کی بے دانشی و جہالت پر!) کوئی ان سے پوچھے، اگر تمہارے اسلاف عقل سے کورے اور ہدایت سے محروم رہے ہوں تو تم بھی عقل و ہدایت سے انکار کر دو گے؟

سورۂ مائدہ میں ہے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝ (۵/۱۰۴)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے، (عقل و بصیرت کی) اس بات کی طرف آؤ جو اللہ نے نازل کی ہے۔ نیز اللہ کے رسول کی طرف رجوع ہو تو کہتے ہیں، ہمارے لیے تو وہی طریقہ بس کرتا ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو چلتے دیکھا ہے۔ (ان سے پوچھو کہ) اگر ان کے باپ دادا کچھ جانتے بوجھتے نہ ہوں اور راہِ راست پر بھی نہ ہوں (تو کیا وہ پھر بھی انہی کی اندھی تقلید کرتے رہیں گے؟)۔

وہ اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے تھے (اور مسلکِ تقلید میں اس کی ضرورت سمجھی ہی نہیں جاتی) کہ جس ڈگر پر چلے جا رہے ہیں اس کے متعلق کبھی اتنا تو سوچ لیا جائے کہ یہ فلاح و سعادت کی جنت کی طرف لیے جا رہی ہے یا ہلاکت و بربادی کے جہنم کی طرف۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ

اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ (۳۱/۲۱)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس (ہدایت) کی پیروی کرو جو اللہ نے (اپنے رسول پر) نازل کی ہے تو کہتے ہیں (نہیں) ہم تو اس راہ کی پیروی کرتے رہیں گے جس پر ہم نے اپنے بڑے بوڑھوں کو چلتے ہوئے پایا ہے، (ان سے پوچھو کہ) اگر (اس طرح) شیطان انہیں جہنّم کے عذاب کی طرف بلاتا ہے۔ (حتّٰی کہ وہ جہنّم کے یقینی مستحق ہو جائیں تو کیا پھر بھی وہ اسی راہ پر چلتے رہیں گے؟)۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت کا سارا مدار، اسلاف کی پرستش پر ہے۔ وہ پہلے اسلاف کی عظمت لوگوں کے دل میں راسخ کر دیتے ہیں اور اس کے بعد، اپنے آپ کو، ان اسلاف کی عظمت کے محافظ اور ان کے مسلک کے نگہبان کی حیثیت سے پیش کر کے، لوگوں سے اپنی پرستش کراتے ہیں۔ جس مسلک کی دعوت رسولوں کی طرف سے دی جاتی تھی، اس میں، ان مذہبی پیشواؤں کی مفاد پرستیوں پر براہِ راست زد پڑتی تھی۔ وہ یہ تو کہہ نہیں سکتے تھے کہ ہم اس دعوت کی مخالفت اس لیے کرتے ہیں کہ اس سے ہماری روٹی چھنتی ہے، نہ ہی وہ علم و بصیرت کی بنا پر اس کی تردید کر سکتے تھے۔ وہ عوام کو یہ کہہ کر بھڑکاتے تھے کہ یہ شخص تمہیں، تمہارے بزرگوں کے مذہب سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے۔ ان کے ہاتھ میں یہ بڑا موثر حربہ تھا حتّٰی کہ اگر ان کی کسی بدیہی غلط روی کی طرف ان کی توجہ دلائی جاتی اور ان سے کہا جاتا کہ اس قسم کی بات، تعلیمِ خداوندی کی نہیں ہو سکتی، تو وہ یہ جواب دیتے کہ یہ بات ہمارے اسلاف سے اسی طرح چلی آ رہی ہے اور چونکہ ہمارے اسلاف تعلیمِ خداوندی کو ہم سے بہتر سمجھتے تھے، اس لیے خدا کا حکم اسی قسم کا ہوگا۔ سورۂ اعراف میں ہے۔

وَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَ اللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ (۷/۲۸)

اور یہ لوگ جب بے حیائی کی باتیں کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے اپنے بزرگوں کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے اور (چونکہ وہ ایسا کرتے رہے ہیں اس لیے) خدا نے ایسا ہی کرنے کا ہمیں حکم دیا ہے۔ (اے پیغمبرؐ!) تم کہہ دو کہ خدا کبھی بھی بے حیائی کی باتوں کا حکم نہیں دے گا۔ کیا تم خدا کے نام پر ایسی بات کہنے کی جرأت کرتے ہو جس کے لیے تمہارے پاس کوئی علم نہیں؟

اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ جن لوگوں کی حالت یہاں تک پہنچ چکی تھی، انہیں عقل و فکر کی بنا پر تعلیمِ خداوندی کی دعوت دینا کس قدر مشکل کام تھا!

آپ تاریخ کے صفحات پر نگاہ ڈالیے یا اپنے گرد و پیش نظر دوڑائیے۔ آپ دیکھیں گے کہ سوسائٹی میں ایک طبقہ تو عوام (MASSES) کا ہوتا ہے اور دوسرا خواص یعنی لیڈروں کا۔ قوت، عوام میں ہوتی ہے لیکن ان کی مہار، خواص کے ہاتھوں میں۔

لیڈروں کے حربے

خواص کی ذہانت کی کامیابی کا معیار یہ ہے کہ عوام کو کس حد تک اپنے ہاتھوں میں رکھ سکتے ہیں۔ بس یہی خواص کی کاری گری اور ہوشیاری ہے۔ سورج کی آنکھ نے جو کچھ اس کرۂ ارض پر دیکھا ہے، اگر اس کی فلم تیار ہو سکے تو آپ دیکھیں گے کہ عقلِ انسانی کی تمام تگ و تاز اسی میں صرف ہوتی رہی ہے کہ عوام کو کس طرح قابو میں رکھ کر انہیں اپنی اغراض و مقاصد کے حصول کا آلۂ کار بنایا جائے۔ جو اس فن میں زیادہ ماہر ہے، وہی صاحبِ اقتدار و ذی وجاہت ہے۔ عوام کو ہاتھ میں رکھنے کے لیے ذہنِ انسانی کی ابلیس کاری نے عجیب و غریب حربے ایجاد کیے ہیں۔ کہیں استبداد شاہنشاہیت کا وہ آہنی پنجہ جو جسم اور دماغ دونوں کی آزادی کا گلا گھونٹ دے اور کہیں تقدسِ برہمنیت کا وہ کچا دھاگا (زُنّار) کہ جس کی گرفت فولادی زنجیروں سے بھی زیادہ پائیدار ہو کہیں سلطانی کی "ظلِ الٰہیت" اور کہیں درویشی کی "عرش آشیانیت" اور ان تمام دل کش و حسین پردوں کے پیچھے کارفرما جذبہ، وہی حصولِ جاہ و حکومت اور فروغِ اقتدار و سطوت۔ ہم اس سے پہلے بتا چکے ہیں کہ اسلام نظامِ سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ ان کے ساتھ ہی وہ اس قسم کے طبقۂ خواص کے بھی سخت خلاف ہے جو عوام کو اپنا آلۂ کار بنا کر، حکومت کے اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک، حکومت کا حق، خدا کے علاوہ اور کسی کو نہیں۔ لہٰذا جس تحریک کے داعی حضرات انبیاء کرامؑ تھے، اس کی مخالفت اس طبقہ کی طرف سے بھی بڑی شدّت سے ہوتی تھی اور اس کے لیے وہ وہی حربے استعمال کرتے تھے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یعنی وہ عوام کو طرح طرح سے بھڑکاتے اور ان کے جذبات کو مشتعل کرتے تھے تاکہ وہ سیلابِ بلا کی طرح اٹھیں اور اس تحریک کو اپنی طغیانیوں میں بہا کر لے جائیں۔ اور چونکہ عقاید، انسان کی عزیز ترین متاع ہوتے ہیں، اس لیے وہ عوام کو مشتعل کرنے کے لیے سب سے پہلے ان کی اسی دُکھتی رگ کو پکڑتے۔ وہ نہایت مصلحانہ انداز اور دردمندانہ پیرایہ میں ان سے کہتے کہ دیکھو! یہ شخص تمہیں اس دین سے برگشتہ کر رہا ہے جو تمہارے بزرگانِ کرام اور اسلافِ عظام کی طرف سے منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اگر اس کی قوت بڑھ گئی تو تمہارا مذہب خطرہ میں پڑ جائے گا۔ تم مرتد ہو جاؤ گے، الحاد و بے دینی کی موت مرو گے۔

یہی فرعون نے کیا فرعون اور حضرت موسیٰؑ کی آویزش میں دیکھیے۔ فرعون اتنی بڑی قوت کا مالک تھا لیکن اس کے باوجود اُسے عوام کے اسی کمزور پہلو سے فائدہ اٹھانا پڑا۔ اس نے ان سے کہا کہ:

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ ۝ (۴۰/۲۶)

اور فرعون نے (اہلِ دربار سے) کہا "تم مجھے موسیٰ کو قتل کرنے دو۔ وہ (اپنی امداد کے لیے) اپنے پرورد گار کو پکارے! مجھے ڈر ہے کہ (اگر اُسے یونہی زندہ چھوڑ دیا گیا، تو) وہ تمہارے دین کو بدل دیگا یا پھر (سر) زمین (مصر) میں فساد برپا کر دے گا (جسے بعد میں سنبھالنا مشکل ہو جائے گا)۔

اور یہی اکابرِ مکہ نے یہی حربہ سرزمینِ عرب کے فراعنہ نے استعمال کیا۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ۚ وَقَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًى ۝ (۳۴/۴۳)

اور (دیکھو) جب ان کے سامنے ہمارے واضح احکام پیش کیے جاتے ہیں تو یہ لوگ کہنے لگتے ہیں کہ یہ شخص (محمدؐ) اس کے سوا کیا ہے کہ (ہماری ہی طرح کا) ایک آدمی ہے جو یہ چاہتا ہے کہ تمہیں ان معبودوں کی پرستش سے روک دے جنہیں تمہارے آبا و اجداد پوجتے آئے ہیں؟" اور کہتے ہیں کہ یہ دعویٰ (کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے خدا کا حکم ہے) اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ (خدا کے نام پر) تہمت باندھا ہوا ایک جھوٹ ہے۔

یہ ہیں "اکابر مجرمین" کی وہ چالیں جو اس انسانیت بخش تحریک کے خلاف چلی جاتی ہیں۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ۭ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ (۶/۱۲۳ نیز ۲۵/۳۱)

اسی طرح، ہر بستی میں بڑے بڑے مجرم پیدا ہو جاتے ہیں جو اس تحریک کے خلاف عجیب و غریب چالیں چلتے ہیں۔ حالانکہ یہ چالیں خود ان کے اپنے خلاف ہوتی ہیں لیکن وہ اس کا شعور نہیں رکھتے۔

ان کی طرف سے یہ مخالفت کیوں ہوتی تھی؟ اس لیے کہ ان کے پاس مال و دولت کی کثرت تھی اور ان کا خاندانی جتھہ بھی بہت بڑا تھا۔

اَنۡ کَانَ ذَا مَالٍ وَّ بَنِیۡنَ ؕ (۶۸/۱۴)

یہ (تمام سرکشی و عدوان)، اس وجہ سے ہے کہ وہ مال اور اولاد والا تھا۔

قوّت و دولت کے نشہ میں جب ان سے کہا جاتا کہ جو روش تم نے اختیار کر رکھی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم تباہ اور برباد ہو جاؤ گے، تو وہ کہتے کہ ہمارے پاس اس قدر دولت ہے اور ہمارا جتھہ بھی اس قدر مضبوط ہے۔ اس لیے ہماری طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ ہم کیسے تباہ ہو جائیں گے؟

وَ قَالُوۡا نَحۡنُ اَکۡثَرُ اَمۡوَالًا وَّ اَوۡلَادًا ۙ وَّ مَا نَحۡنُ بِمُعَذَّبِیۡنَ ○ (۳۴/۳۵)

اور ان لوگوں نے (یہ بھی) کہا کہ ہمارے پاس بہت زیادہ مال و دولت اور کثیر تعداد اولاد ہیں (جن سے ہم اپنی مدافعت کر سکتے ہیں)، اور ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

مترفین کا گروہ یہی ہے "مُتۡرَفِیۡن" کا وہ گروہ جس کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے۔ "مُتۡرَفِیۡن" سہل انگار، تن آسان، عشرت پسند، دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرنے والے، خواہ وہ امراء و رؤساء کا طبقہ ہو کہ جن کے قصرِ تعیّش کی رنگینی کا سامان، مزدور کے پسینہ اور خون سے بہم پہنچتا ہے اور خواہ اربابِ مذہب و "روحانیت" کا حلقہ ہو جن کی مسندِ الوہیت کے پائے سادہ لوح عوام کے جذباتِ اطاعت کے کندھوں پر استوار ہوتے ہیں۔ یہی ہے وہ طبقہ جو اس انقلابی تحریک کی مخالفت اس شدّ و مد سے کرتا ہے۔

وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا فِیۡ قَرۡیَۃٍ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ اِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوۡہَاۤ ۙ اِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِہٖ کٰفِرُوۡنَ ○ (۳۴/۳۴)

اور (دیکھو)، ہم نے کبھی کسی انسانی آبادی میں کوئی (انکار و بدعملی کے نتائج سے خبردار کرنے والا رسول) نہیں بھیجا مگر (ہمیشہ) اس (بستی) کے مفاد پرست طبقہ کی طرف سے یہی کہا گیا کہ جس دین کو تمہیں دے کر بھیجا گیا ہے ہم اُسے ماننے والے نہیں ہیں۔

اور اس مخالفت میں دلیل وہی عوام فریبی کی پیش کرتا ہے۔

وَ کَذٰلِکَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ فِیۡ قَرۡیَۃٍ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ اِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوۡہَاۤ ۙ اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤی اُمَّۃٍ وَّ اِنَّا عَلٰۤی اٰثٰرِہِمۡ مُّقۡتَدُوۡنَ ○ (۴۳/۲۳)

اور (اے پیغمبرؐ! جس طرح آج اہلِ مکّہ کے سردار تیری مخالفت میں سرگرم ہو رہے ہیں)، اسی طرح تجھ سے

پہلے بھی ہم نے کسی (انسانی) آبادی میں کوئی (انکار و بدعملی کے نتائج سے) خبردار کرنے والا (رسول) نہیں بھیجا مگر (ہمیشہ) اس کے مفاد پرست طبقہ نے یہی کہا کہ ہم (اس نئے دین کو نہیں مانتے۔ ہم) نے تو اپنے بڑے بوڑھوں کو ایک طریقہ پر (عمل کرتے) پایا ہے اور یقیناً ہم (انہی کے نقوشِ قدم کی پیروی کرنے والے ہیں۔

تقدیر کا بہانہ

اور اگر یہ گروہ کسی وقت اس طرح گھر جاتا ہے کہ اُسے کوئی اور راہِ فرار نہیں سوجھتی، تو پھر تقدیر کا بہانہ سامنے لے آتا ہے۔

وَقَالُوا لَوْ شَاءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ○ (۲۰/۴۳)

اور وہ کہتے ہیں کہ اگر خدائے رحمٰن چاہتا تو ہم ان معبودوں کی عبودیت (محکومیت واطاعت) اختیار ہی نہ کرتے (اُس نے چاہا جب ہی تو ہم نے ایسا کیا)۔ اُنہیں اس بات کا کچھ بھی علم نہیں (کہ خدا اس کا ذمّہ دار نہیں بلکہ ان کا اپنا ارادہ اور عمل اس کا ذمّہ دار ہے) اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے کہ وہ لوگ قیاسی گھوڑے دوڑا رہے ہیں!

تکذیب

معرکۂ حق و باطل میں، طاغوتی قوتوں کی مخالفت کی تفاصیل کس قدر طول طویل کیوں نہ ہوں، اس کی اساس وبنیاد اسی نقطہ پر ہوتی ہے کہ وہ اس صدائے حق کی تکذیب کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اگر وہ تسلیم کرلیں کہ ہم اس دعوتِ انقلاب کو سچائی پر مبنی سمجھتے ہیں، تو پھر اس سے انکار کی کوئی وجہ ان کے پاس باقی نہیں رہتی۔ لہٰذا اگر وہ دل سے اس تحریک کی صداقت کے قائل بھی ہوں تو بھی علانیہ اس کی تکذیب کرتے جائیں گے، اس لیے کہ عملی طور پر سچائی کتنی ہی کمیاب (بلکہ بعض اوقات نایاب) کیوں نہ ہوجائے اس کی گرفت ایسی محکم اور عالمگیر ہے کہ ایسی مثال آپ کو شاید کہیں نظر آئے کہ کوئی شخص دھڑتے سے یہ کہے کہ ہاں! میں اس بات کو بالکل سچا سمجھتا ہوں لیکن اس کے باوجود اس کی مخالفت کرتا ہوں۔ لہٰذا، سرکش قوتوں کی طرف سے جب حق کی آواز کی مخالفت ہوگی تو اس کا مستقل مظاہرہ تکذیب کی صورت میں ہوگا۔ لیکن نبی کریمؐ کے باب میں اس تکذیب کی بھی ایک عجیب صورت تھی۔ عرب کا بچہ بچہ حضورؐ کی صداقت اور امانت کا قائل تھا۔ آپؐ کی موجودگی ہی میں نہیں بلکہ غیبت میں بھی وہ اس کے معترف تھے حتّٰی کہ ہرقل

کے دربار میں ابوسفیان جیسے متشدّد دشمن کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ مدعیٔ نبوتؐ نے اپنی ساری زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا لیکن اس کے باوجود وہ آپؐ کے دعویٔ نبوّت کی تکذیب کرتے تھے خود قرآنِ کریم میں ہے کہ۔

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝ (۶/۳۳)

(اے پیغمبرؐ) ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ (انکار و تعصب کی) جیسی کچھ باتیں کہتے ہیں، وہ بلاشبہ تمہارے لیے آزردگی کا موجب ہوتی ہیں لیکن وہ تمہیں نہیں جھٹلاتے (یعنی تمہیں جھوٹا کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے، کیونکہ تمہاری راست گوئی سب کو معلوم ہے) لیکن یہ ظالم دیدہ و دانستہ احکامِ خداوندی سے انکار کرتے ہیں۔!

ذرا غور کیجئے کہ یہ صورتِ حال کس قدر تعجب انگیز اور تحیر خیز ہے کہ وہ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ آپؐ نے ساری زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا لیکن بایں ہمہ اس ایک بات میں آپؐ کی سچائی کو تسلیم نہیں کرتے! صاف نظر آجاتا ہے کہ یہ تکذیب محض بربنائے مخالفت تھی، حقیقت پر مبنی نہ تھی، نہ ہی اس بات پر کہ وہ اس دعویٰ کے مختلف پہلوؤں پر غور کر کے اس نتیجہ پر پہنچے ہوں کہ یہ دعویٰ سچا نہیں۔ وہ بس اس کی تکذیب کیے جارہے تھے۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (۱۰/۳۹)

نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ جس بات پر وہ اپنے علم سے احاطہ نہ کر سکے، اور جس بات کا نتیجہ ابھی پیش نہیں آیا، اس کے جھٹلانے پر آمادہ ہو گئے۔ ٹھیک اسی طرح ان لوگوں نے بھی جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ سو تم دیکھنا کہ ان کی اس روش کا انجام کیا ہوتا ہے!

حالانکہ اگر وہ ذرا غور و فکر سے کام لیتے تو یہ حقیقت ان پر واشگاف ہو جاتی کہ جس شخص نے زندگی کے کسی دوسرے معاملہ میں کبھی جھوٹ نہیں بولا، اس کا یہ دعویٰ بھی سچائی پر مبنی ہوگا کہ وہ جو کچھ کہتا ہے خدا کا پیغام ہے۔

وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ؕ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۝ (۶/۶۶)

اور (اے پیغمبرؐ!) تیری قوم نے اسے جھٹلایا ہے حالانکہ وہ حق ہے۔ تم ان سے کہہ دو (اگر تم جھٹلاتے ہو تو جھٹلاؤ) میں تم پر کچھ نگہبان نہیں ہوں کہ تمہیں قبولِ حق پر مجبور کر دوں۔ اس کا نتیجہ خود تمہارے سامنے

آجائے گا۔

افتراء کا الزام لیکن وہ برابر پراپگینڈہ کیے جاتے تھے کہ یہ افسانہ طرازی ہے۔ یہ (معاذ اللہ) خود ہی کچھ فقرے وضع کرلیتا ہے یا کسی اور سے لکھوا لیتا ہے اور انہیں پھر اللہ کی طرف منسوب کردیتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِنْ ھٰذَآ اِلَّآ اِفْکُ ۨ افْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَیْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۛ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّ زُوْرًا ۚ (۲۵/۴؛ ۳۲/۳؛ ۳۴/۸؛ ۳۴/۴۳؛ ۴۶/۱۱)

اور (دیکھو) جو لوگ (دعوتِ حق سے) انکار کی راہ اختیار کیے ہوئے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) اس کے سوا کیا ہے کہ ایک جھوٹ ہے جسے محمدؐ نے گھڑ لیا ہے اور اس سلسلہ میں کچھ دوسرے لوگ بھی اس کی مدد کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ (اس قسم کی باتیں بنا کر) وہ ایک (بہت بڑے) ظلم اور جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں۔

وہ کہتے کہ یہ باتیں اسے کوئی اور سکھا جاتا ہے۔

ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ۘ (۴۴/۱۴)

وہ (ہمارے) رسول سے منہ موڑ کر (اعراض کرکے) چلتے بنے یہ کہتے ہوئے کہ یہ تو سکھایا پڑھایا ہوا پاگل ہے۔!

کبھی کہتے کہ اس قرآن میں ہے ہی کیا؟ بس اگلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں۔

اِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ۘ (۶۸/۱۵؛ ۶/۲۵؛ ۸/۳۱؛ ۱۶/۲۴؛ ۸۳/۱۳)

جب اس کے سامنے ہمارے احکام پیش کیے جاتے ہیں، تو یہ کہتا ہے کہ اس میں رکھا ہی کیا ہے۔ یہ تو بس پچھلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں۔

اسے (معاذ اللہ) یہ کہانیاں کہیں سے مل گئی ہیں۔ انہیں ہمارے سامنے دہراتا رہتا ہے۔

وَقَالُوْٓا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ اکْتَتَبَهَا فَهِیَ تُمْلٰى عَلَیْهِ بُکْرَةً وَّاَصِیْلًا ۘ (۲۵/۵)

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ تو پچھلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں جنھیں لوگ آکر اس سے بیان کرتے ہیں اور یہ انہیں لکھ لیتا ہے۔ پھر وہی باتیں اس کے ہاں صبح و شام کاتبوں کو لکھوائی جاتی ہیں۔

باقی رہے اس کے دوسرے مضامین، سو وہ بجز ایں نیست کہ خوابوں کی باتیں اور واہمہ کے افسانے ہیں۔

بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚۖ (۲۱/۵)

(اتنا ہی نہیں) بلکہ انہوں نے کہا کہ یہ محض خواب و خیال کی باتیں ہیں بلکہ من گھڑت دعویٰ ہے نہیں؛ بلکہ یہ شاعر ہے۔

ساحر و کذّاب

اس کی ہر بات جھوٹ ہے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝

(۴۳/۳۰؛ ۲۱/۳؛ ۳۴/۴۳؛ ۳۷/۱۵؛ ۴۶/۷؛ ۶۱/۶؛ ۷۴/۲۴)

اور (دیکھو) جب حق (قرآنی ہدایت) اُن کے پاس آگیا تو وہ کہنے لگے کہ یہ تو جھوٹ ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم اس سے انکار کرنے والے ہیں۔

اس لیے یہ (پناہ بخدا) ساحر و کذّاب ہے۔

وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ؗ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝ۖۚ (۳۸/۴؛ ۱۰/۲)

اور (دیکھو) انہیں اس بات پر اچنبا ہو رہا ہے کہ ان کے پاس (انکار و بدعملی کے نتائج سے) آگاہ کرنے والا (یعنی رسول) انہی میں سے (کیسے) آگیا اور ان منکرین نے (یہاں تک) کہہ دیا کہ یہ (پیغمبر) تو جھوٹا، بہت بڑا جھوٹا ہے۔

قرآن کو مت سنو

وہ زبان سے یہ کچھ کہتے تھے لیکن دل میں خوب سمجھتے تھے کہ اس پیغامِ حق و صداقت کا اثر کس قدر گہرا اور دل نشین ہے۔ یہ کتنی جلدی دل کی گہرائیوں تک اُتر جاتا ہے۔ جس کے کان میں اس کی آواز پڑ جاتی ہے، وہ کس قدر والہانہ انداز سے اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ وہ اُسے سحر (جھوٹ) کہتے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی خوب جانتے تھے کہ اس کا اثر بڑا سحر آفرین ہے۔ اس لیے وہ اس خطرہ کی روک تھام کے لیے ایسا اہتمام کرتے کہ کوئی اُسے سننے ہی نہ پائے۔ اس کے لیے وہ کہتے کہ جہاں قرآن کی تلقین ہو رہی ہو، اتنا شور مچاؤ، ایسا ہنگامہ برپا کرو کہ کوئی اُسے سُن ہی نہ سکے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝ (۴۱/۲۶)

اور (دیکھو) جو لوگ (قبولِ حق سے) انکار کر چکے ہیں، انہوں نے کہا، "اس قرآن کو نہ خود سنو (نہ دوسروں کو سننے دو) جہاں اس کی تعلیم ہو رہی ہو، وہاں شور مچاؤ۔ شاید تم اس طرح غالب آسکو۔"

اور اگر کہیں ایسا اتّفاق ہو جائے کہ سُنے بغیر چارہ نہ ہو تو بالکل بے توجّہی سے سنو۔

وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّسۡتَمِعُ اِلَیۡكَ ۚ حَتّٰۤی اِذَا خَرَجُوۡا مِنۡ عِنۡدِكَ قَالُوۡا لِلَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ۟ (۴۷/۱۶)

اور (اے پیغمبرؐ!) ان منکرینِ حق میں ایسے لوگ بھی ہیں جو (بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) تیری طرف کان لگائے ہوئے ہیں (مگر ان کے دل کہیں اور ہوتے ہیں۔ وہ تیری باتوں کو توجہ سے نہیں سنتے) حتیٰ کہ جب وہ تیرے پاس سے نکلتے ہیں تو ان لوگوں سے جنھیں اس تعلیم کا علم دیا گیا ہے (یعنی مؤمنین سے) پوچھتے ہیں کہ اس (پیغمبر) نے ابھی ابھی کیا کہا تھا؟"

ولید کا واقعہ اس کے علاوہ وہ اپنے معتمد علیہ سرغنوں کو سازشاً بھی محفلِ نبویؐ میں بھیج دیا کرتے تھے کہ وہ آکر لوگوں میں پروپیگنڈہ کریں کہ ہم نے قرآن کو خود سُنا ہے۔ اس میں جھوٹ کے سوا رکھا ہی کیا ہے"۔ اسی قسم کا واقعہ سورۂ مُدّثّر میں مذکور ہے۔ سردارانِ قریش میں سے ایک شخص (تاریخ جس کا نام ولید بن مغیرہ بتاتی ہے) کثرتِ مال اور اولاد کی بنا پر بے حد مغرور اور متکبّر تھا۔ یہ ترفین کا نمائندہ تھا۔

وَّ جَعَلۡتُ لَهٗ مَالًا مَّمۡدُوۡدًا ۙ وَّ بَنِیۡنَ شُهُوۡدًا ۙ (۷۴/۱۲-۱۳)

اور ہم نے اسے فراواں دولت اور (کثیر تعداد) بیٹے دیے تھے جو گھر پر بیٹھے (ہمیشہ سازشیں کرتے رہتے تھے)۔

اور آیاتِ خداوندی کا بدترین دشمن۔

وَّ مَهَّدۡتُّ لَهٗ تَمۡهِیۡدًا ۙ ثُمَّ یَطۡمَعُ اَنۡ اَزِیۡدَ ۙ كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰیٰتِنَا عَنِیۡدًا ؕ سَاُرۡهِقُهٗ صَعُوۡدًا ؕ (۷۴/۱۴-۱۷)

اور ہم نے (معاملاتِ دنیوی کو) اس کے لیے خوب اچھی طرح سے درست کر دیا۔ پھر اس کے بعد بھی اس کو یہ حرص ہوتی ہے کہ ہم کچھ اور زیادہ دے دیں۔ ہرگز نہیں (اب مہلت کا وقفہ ختم ہو گیا)۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ہمارے احکام سے (بلاوجہ) عناد رکھتا ہے۔ اب ہم اُسے رسوا کن عذاب دینگے جو اس پر مسلط ہو جائے گا۔

وہ ایک روز اسی طرح بزمِ رسالت میں پہنچا۔ دل میں بُغض و عناد کی سینکڑوں کدورتیں لیے اور دماغ میں مخالفت و مخاصمت کے ہزاروں منصوبے باندھے، کمر پر ہاتھ رکھ کر کچھ آگے کو جُھکا، قرآن کی آیات کو سُنا۔

ان میں تو (بقول کفار) جادو تھا۔ کچھ سوچا۔

اِنَّهٗ فَكَّرَ (۱۸)

حقیقت یہ ہے کہ اس نے کچھ سوچا۔

اور دل میں کہا کہ یہ تو شاعروں اور کاہنوں کی باتیں معلوم نہیں ہوتیں۔ پھر جس مہم کے لیے آیا تھا اس کا' اور اس بات کا کہ اگر میں نے اس دعوت کی صداقت کو تسلیم کر لیا تو میرا مستقبل کیا ہوگا، اندازہ کیا۔

وَ قَدَّرَهٗ (۱۸)

اور کچھ اندازہ کیا۔

اور اس کی بدبختی کہ اندازہ بہت غلط کیا۔

فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَهٗ (۱۹)

اس کی بدبختی کہ اس نے کیسا (غلط) اندازہ کیا!

ایسا غلط کہ اس میں اس کی تباہی اور بربادی کا جہنم چھپا ہوا تھا یعنی اس نے اندازہ لگایا کہ اگر میں نے اس دعوت کی صداقت کو تسلیم کر لیا تو ذاتی ریاست اور وجاہت اور قبائلی سیادت و امارت' سب کچھ چلا جائے گا۔ لیکن اس نے یہ نہ سوچا کہ اس کے بدلے میں جو کچھ ملے گا وہ کس قدر گراں بہا اور حیات آور ہے۔

ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَهٗ (۲۰)

پھر اس کی بدبختی کہ اس نے کیسا (غلط) اندازہ کیا۔

اس طرح اس کا سینہ کشمکشِ حق و باطل کی آماجگاہ بن رہا تھا — ایمان مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر — اس نے ایک بار پھر دیکھا اور غور کیا۔

ثُمَّ نَظَرَهٗ (۲۱)

اس کے بعد اس نے پھر دیکھا (اور غور کیا)

لیکن بالآخر ہوسِ جاہ پرستی، قبولیتِ حق پر غالب آگئی۔ اس کے سینہ کا تلاطم اس کے ماتھے کی شکنوں کی صورت میں اُبھر کر باہر آگیا۔ اس نے تیوری چڑھائی، منہ بنایا۔

ثُمَّ عَبَسَ وَ بَسَرَهٗ (۲۲)

اس کے بعد اس نے تیوری چڑھائی اور منہ بسورا۔

پیٹھ پھیری۔

ثُمَّ اَدۡبَرَ ﴿۷۴ ؍ ۲۳﴾

پھر پشت پھیری (یعنی لوٹ گیا)۔

اور متکبرانہ انداز میں واپس آ گیا۔

وَاسۡتَکۡبَرَ ۙ﴿۷۴ ؍ ۲۳﴾

اور غرور کیا۔

خلوت کی محفلوں میں تو اقرار کیا کہ — ایں کتاب نیست چیزے دیگر است — لیکن باہر مجمعوں میں یہی اعلان کرتا رہا کہ[1]

فَقَالَ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ یُّؤۡثَرُ ۙ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا قَوۡلُ الۡبَشَرِ ؕ﴿۷۴ ؍ ۲۴-۲۵﴾

پھر اس نے کہا کہ یہ اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ ایک جھوٹ ہے جو دوسروں سے سُن کر نقل کر دیا جاتا ہے۔ یہ کچھ بھی نہیں، صرف انسانی کلام ہے (اور بس!)۔

استہزاء لیکن تکذیب و تنقیص کے ان حربوں سے کہیں زیادہ دُور رس اور تکلیف دِہ وہ حربہ ہے جو مخالفین کی طرف سے استہزاء کی شکل میں استعمال ہوتا ہے۔ آپ سے ایک شخص کسی معاملہ میں اختلاف رکھتا ہے۔ آپ اسے دلائل و براہین سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ، بجائے اس کے کہ آپ کے دلائل کے مقابلہ میں دلائل پیش کرے، آپ کا مضحکہ اُڑاتا ہے۔ آپ کی ہر بات کو ہنسی میں اڑا دیتا ہے، مزاح کرتا ہے۔ گلی محلے کے لڑکے پیچھے لگا دیتا ہے کہ وہ آپ کا تمسخر اُڑائیں۔ کہیے کہ اس حربہ کا آپ کیا جواب دیں گے! اور اس اسلوبِ مخالفت سے آپ کس قدر کبیدہ خاطر اور اندوہ گیں نہ ہوں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ کا یہ مخالف، شمشیر بکف آپ کے سامنے آ جائے تو بھی آپ کو کبھی اتنی تکلیف ہو جتنی اس کے اس اندازِ مخالفت سے ہوتی ہے۔ سنانِ زبان کی جراحت یقیناً نوکِ شمشیر کے زخم سے کہیں زیادہ کرب انگیز اور صبر آزما ہوتی ہے۔ تکذیب و تنقیص کے ساتھ مخالفینِ عرب تضحیک و استہزاء کے ان روح فرسا حربوں پر بھی اُتر آئے۔

وَاِذَا رَاٰکَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِنۡ یَّتَّخِذُوۡنَکَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِیۡ یَذۡکُرُ اٰلِهَتَکُمۡ ۚ﴿۲۱ ؍ ۳۶﴾

[1] اس واقعہ کی اصل تو قرآن میں ہے لیکن جزئیات مختلف روایات میں مختلف انداز سے مذکور ہیں۔

اور (اے پیغمبرؐ!) جب تجھے وہ لوگ دیکھتے ہیں جنہوں نے انکارِ حق کی راہ اختیار کی ہے، تو انہیں اور تو کچھ سوجھتا نہیں، بس تجھے اپنی ہنسی ٹھٹھے کی بات بنا لیتے ہیں اور کہتے ہیں "کیا یہی وہ آدمی ہے جو ہمارے معبودوں کے متعلق طرح طرح کی باتیں کرتا رہتا ہے؟"

سورۂ فرقان میں ہے۔

وَ اِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ‎(۲۵/۴۱)

اور (اے پیغمبرؐ!) جب تجھے یہ لوگ دیکھتے ہیں تو انہیں اور تو کچھ سوجھتا نہیں، بس تجھے اپنی ہنسی ٹھٹھے کی بات بنا لیتے ہیں اور کہتے ہیں کیا یہ وہی آدمی ہے جسے اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟

اس قسم کی متعدد آیات قرآنِ کریم میں موجود ہیں (مثلاً ۳۴/۸-۷؛ ۲۱/۲۰۳-۲۰۲؛ ۴۵/۹؛ ۲/۲۱۲؛ ۲۳/۱۱۰؛ ۱۱/۸)۔ یہ اس قسم کی باتیں کرنے والے کون تھے؟ وہی گروہ "مترفین" جس کا ذکر پہلے آچکا ہے (۲۳/۶۶-۶۴)۔ اس کے علاوہ منافقین بھی تمسخر کرتے تھے۔

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ‎(۹/۶۴)

منافق اس بات سے (بھی) ڈرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو، ان کے بارے میں کوئی سورۃ نازل ہوجائے اور جو کچھ ان کے دلوں میں (چھپا) ہے وہ بے نقاب سامنے آجائے۔ (اے پیغمبرؐ!) تم ان سے کہہ دو کہ تم (اپنی عادت کے مطابق) تمسخر کرتے رہو۔ یقیناً اب وہ بات ظاہر ہونے والی ہے جس کے بے نقاب ہونے کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے۔

مجنون

طنز و استہزاء کے ضمن میں یہ بھی تھا کہ وہ آپؐ کو مجنون (پاگل) کہتے تھے۔

اِنَّهُمْ كَانُوْۤا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۙ يَسْتَكْبِرُوْنَ ۙ وَ يَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْۤا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ ؕ ‎(۳۷/۳۶-۳۵ نیز ۳۴/۸-۷؛ ۴۴/۱۴؛ ۶۸/۵۱)

جب ان سے کہا جاتا (خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو) اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، تو وہ غرور سے تن جاتے اور کہتے "کیا ہم ایک پاگل شاعر کے کہہ دینے سے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں گے؟"

(ہرگز نہیں)"۔

یوں دیکھا جائے تو ایک داعیٔ انقلاب، مفاد پرست گروہ کی نگاہوں میں ہوتا ہی "پاگل" ہے۔ یہ فقرہ آپ کو اکثر سنائی دیتا ہوگا کہ "یہ شخص بالکل پاگل ہے۔ اسے اپنے نفع نقصان کا بھی خیال نہیں"۔ چونکہ داعیٔ انقلاب کی زندگی اور اس کے مقاصد، مفاد پرست گروہ کے پیمانوں اور معیاروں کے مطابق سراسر نقصان کا سودا ہوتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ اگر یہ داعی، اپنی اس دعوت کو چھوڑ دے تو یہ کس قدر دنیاوی مفاد حاصل کر سکتا ہے۔ اس لیے وہ اسے "پاگل" کہتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ حضورؐ کو محض اسی نقطۂ نگاہ ہی سے "پاگل" نہیں کہتے تھے، اس میں "ہمدردی" کے بجائے طنز کا نشتر زیادہ گہرا تھا۔

مسحور ہے عربوں میں (اور ازمنۂ قدیمہ میں ہر جگہ) جادو پر بڑا گہرا اعتقاد تھا۔ چنانچہ وہ یہ بھی کہتے کہ حضورؐ پر کسی نے جادو کر رکھا ہے اسی لیے یہ (معاذ اللہ) اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔

نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَا یَسۡتَمِعُوۡنَ بِہٖۤ اِذۡ یَسۡتَمِعُوۡنَ اِلَیۡکَ وَ اِذۡ ہُمۡ نَجۡوٰۤی اِذۡ یَقُوۡلُ الظّٰلِمُوۡنَ اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسۡحُوۡرًا ﴿ ۱۷ ؍ ۴۷ ﴾

(اے پیغمبرؐ!) جب یہ لوگ تمہاری طرف کان لگاتے ہیں تو جو کچھ ان کو سننا ہوتا ہے، اسے ہم اچھی طرح جانتے ہیں اور جب یہ ظالم باہم سرگوشیاں کرتے ہوتے کہتے ہیں "تم جس آدمی کے پیچھے چل رہے ہو، وہ اس کے سوا کیا ہے کہ جادو سے مارا ہوا ہے" تو اس سے بھی ہم بے خبر نہیں ہیں!

شاعر ہے! عربوں میں شعراء کے متعلق عقیدہ تھا کہ ان کے پاس جن آتے ہیں جو انہیں اس قسم کی باتیں سکھاجاتے ہیں۔ حضورؐ کے متعلق بھی وہ کہتے کہ یہ شاعر ہے جو تخیلات کی دنیا میں بیٹھا افسانہ طرازی کرتا رہتا ہے۔

بَلۡ قَالُوۡۤا اَضۡغَاثُ اَحۡلَامٍۭ بَلِ افۡتَرٰىہُ بَلۡ ہُوَ شَاعِرٌ ﴿ ۲۱ ؍ ۵ ﴾

(اتنا ہی نہیں)، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ "یہ محض خواب و خیال کی باتیں ہیں، اس کا من گھڑت دعویٰ ہے۔ نہیں، بلکہ یہ شاعر ہے"۔

اس لیے وہ کہتے کہ کیا ہم ایک ایسے شخص کے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں؟

وَ یَقُوۡلُوۡنَ اَئِنَّا لَتَارِکُوۡۤا اٰلِہَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجۡنُوۡنٍ ؕ ﴿ ۳۷ ؍ ۳۶ ﴾

اور وہ کہتے کہ کیا ہم ایک پاگل شاعر کے لیے اپنے معبودوں (اور دیوتاؤں) کو چھوڑ دیں؟ (ہرگز نہیں)۔

وہ کہتے کہ اس کے تخیل کی یہ بلند پروازیاں محض ہنگامی جذبات کی پیدا کردہ ہیں۔ چند دنوں کے بعد جب یہ جذبات فرو ہو جائیں گے تو یہ تخیلات بھی ختم ہو جائیں گے۔ شاعر جو کچھ کہتے ہیں وہ محض لطائف ہوتے ہیں حقائق نہیں ہوتے۔ اس لیے مرورِ زمانہ سے وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا، اس کی ان باتوں کو سنجیدگی سے لینا ہی نہیں چاہیئے۔

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَیۡبَ الۡمَنُوۡنِ ۝ (۵۲/۳۰)

بلکہ وہ یہاں تک کہہ گزرتے ہیں کہ وہ (محمدؐ) تو شاعر ہے (جس کے تخیل کی بلند پروازیاں خاص وقت تک کے لیے ہیں)، ہم اسی وقت کا انتظار کر رہے ہیں جب مرورِ زمانہ سے اس کے تخیل کی بلند پروازی ختم ہو جائے گی۔

اہلِ کتاب کی مخالفت

انہیں مخالفین میں ایک گروہ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کا بھی تھا۔ ان کی آسمانی کتابوں میں (جیسی کچھ بھی وہ ان کے پاس رہ گئی تھیں) ایک آنے والے نبی کی بشارات موجود تھیں اور وہ اس موعودہ رسول کے انتظار میں تھے۔ نبئِ اکرمؐ میں اس آنے والے کی تمام علامات موجود تھیں اس لیے وہ حضورؐ کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔

اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ یَعۡرِفُوۡنَهٗ كَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ ؕ وَ اِنَّ فَرِیۡقًا مِّنۡهُمۡ لَیَكۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ وَ هُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ۝ (۲/۱۴۶)

اور حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کو ہم نے اس سے پہلے کتاب دی تھی (یعنی اہلِ کتاب کے علماء) ان پر حقیقتِ حال پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ پیغمبرِ اسلام کو ویسے ہی پہچانتے ہیں جس طرح اپنی اولاد کو جانتے پہچانتے ہیں۔ لیکن اس پر بھی ان میں ایک گروہ ایسا ہے جو دیدہ و دانستہ سچائی کو چھپاتا ہے۔

مذہب کے علمبردار

دین اور مذہب کی کشمکش بھی تاریخِ انسانیت کی عجیب داستان ہے۔ دین اس نظامِ زندگی کا نام ہے جو قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل ہوتا ہے۔ خدا کا ہر رسول دین لاتا تھا اور اسے عملاً متشکل کرتا تھا۔ اس کے بعد، اس کے متبعین اس دینِ خالص میں اپنے خیالات کی آمیزش کرنی شروع کر دیتے تھے اور اس طرح رفتہ رفتہ وہ دین، مذہب بن جاتا تھا۔ یعنی چند بے معنی معتقدات اور بے روح رسومات کا مجموعہ جنہیں زندگی کے عملی معاملات سے کوئی سروکار نہ ہو۔ مذہبی پیشوائیت، اس مذہب کی محافظ اور اجارہ دار ہوتی تاکہ اس کے ذریعے اپنے مفاد حاصل کرے۔ اس کے بعد خدا کا دوسرا

رسول آتا اور وہ اس مذہب کی جگہ پھر دینِ خالص پیش کرتا۔ اس کی دعوت کی مخالفت سب سے پہلے اسی مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ہوتی۔ یہی کچھ سابقہ انبیاء کرامؑ کے ساتھ ہوا اور یہی صورت نبیٔ اکرمؐ کے ساتھ پیش آئی۔ آپؐ کے زمانے میں اس مذہبی پیشوائیت کے علمبردار، یہودی اور نصاریٰ تھے جنہیں قرآن اہلِ کتاب کہہ کر پکارتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ان کی مخالفت کا ذکر بڑی شرح و بسط سے آیا ہے۔ اس مخالفت کے محرکات کئی ایک تھے۔ ان کا بنیادی اعتراض یہ تھا کہ نبوت بنی اسرائیل کے لیے مخصوص ہے اور یہ بنی اسمٰعیل میں سے ہے۔ اس لیے ہم اس کے دعوے کو کس طرح تسلیم کرلیں۔ (۲/۸۹-۹۰)

مذہبی سیادت کی وجہ سے

اس نسلی عصبیت کے بعد ان کے سامنے مذہبی سیادت کا سوال تھا۔ قرآن اس برہمنیت (PRIESTHOOD) کو مٹانے کے لیے آیا تھا جسے انہوں نے بطور "خدائی استحقاق" اپنے لیے مختص کر رکھا تھا اور جس کی رُو سے وہ تمام قوم کے قلوب و اذہان پر حکومت کرتے تھے۔ قرآن پر ایمان لانے سے یہ سیادت و ریاست ختم ہو جاتی تھی۔ اس لیے وہ کہتے کہ اگر اس تعلیم کو ہماری مرضی کے مطابق بدل دو، تو ہم ایمان لے آئیں گے۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ۭ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ (۱۰/۱۵)

(اور اے پیغمبرؐ!) جب تم ہمارے واضح احکام ان کے سامنے پیش کرتے ہو، تو جو لوگ (حیاتِ دنیوی میں مست ہو کر مکافاتِ عمل کو بھلا بیٹھے ہیں کہ گویا مرنے کے بعد) ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے، وہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کے بجائے کوئی دوسرا قرآن لاؤ یا اس (کے مطالب) میں کچھ ردّ و بدل کر دو (تو پھر ہم تمہارے ہم نوا بن جائیں گے)۔ (اے پیغمبرؐ!) تم کہہ دو کہ میرا یہ مقدور نہیں کہ اپنے جی سے اس میں ردّ و بدل کر دوں۔ میں تو بس اسی حکم کا تابع ہوں جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر اپنے پروردگار کے حکم سے سرتابی کروں، تو میں بھی خدا کے عذابِ عظیم میں گرفتار ہو جاؤں گا۔

اس مطالبہ کا محرک جذبہ تو وہی اپنے "خدائی حقوق" کا تحفظ تھا لیکن اسے وہ اس مقدس نقاب میں چھپاتے

تھے کہ قرآن کی تعلیم ہماری کتابوں کی تعلیم کے خلاف جاتی ہے اور اس دعویٰ کے ثبوت میں وہ یونہی آکر کہہ دیتے کہ ہمارے ہاں یہ لکھا ہے اور وہ لکھا ہے۔

وَ اِنَّ مِنۡهُمۡ لَفَرِيۡقًا يَّلۡوٗنَ اَلۡسِنَتَهُمۡ بِالۡكِتٰبِ لِتَحۡسَبُوۡهُ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الۡكِتٰبِ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ‏۝ (۳/۷۸)

ان اہلِ کتاب میں (ان کے عالموں اور پیشواؤں کا) ایک گروہ ہے جو کتاب اللہ پڑھتے ہوئے اس میں الٹ پھیر کرتے ہیں تاکہ تم خیال کرو کہ جو کچھ یہ سنا رہے ہیں، کتاب اللہ میں سے ہے، حالانکہ وہ قطعاً کتاب اللہ (کے احکام میں سے) نہیں ہوتا اور وہ لوگوں سے کہتے ہیں کہ جو کچھ وہ ان سے کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ (اللہ کی طرف سے نہیں ہوتا۔ وہ اللہ کے نام سے جھوٹ بولتے ہیں اور دیدہ و دانستہ ایسا کرتے ہیں۔

درحقیقت اس قسم کے مطالبات سے ان کا مقصد یہ تھا کہ ایسے حالات پیدا کر دیں جن میں آپؐ ان کے ساتھ مفاہمت کر کے ان کے مسلک کے تابع ہو جائیں۔

وَلَنۡ تَرۡضٰى عَنۡكَ الۡيَهُوۡدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمۡ ؕ قُلۡ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الۡهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَهۡوَآءَهُمۡ بَعۡدَ الَّذِىۡ جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيۡرٍ ‏۝ (۲/۱۲۰)

(اور حقیقت یہ ہے کہ تم اپنی سچائی کے کتنے ہی ثبوت پیش کرو، لیکن) یہود و نصاریٰ تم سے کبھی خوش نہیں رہ سکتے، بجز اس کے کہ تم ان کی (بنائی ہوئی) ملتوں کے تابع ہو جاؤ۔ پس تم ان سے صاف صاف کہہ دو کہ ہدایت کی صحیح راہ صرف وہ ہے جو خدا نے مجھے عطا کی ہے۔ یاد رکھو! اگر تم نے ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی کی، باوجودیکہ تمہارے پاس علم و یقین کی روشنی آچکی ہے، تو یہ ہدایتِ الٰہی کی صریح خلاف ورزی ہوگی، اور پھر تم اللہ کی رفاقت اور نصرت سے محروم ہو جاؤ گے۔

وہ باہمی سازشیں کرتے کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کی جماعت کے اندر گھس کر ان کے اجتماعی نظم میں انتشار پیدا کر دیں۔

وَقَالَتۡ طَّآئِفَةٌ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اٰمِنُوۡا بِالَّذِىۡۤ اُنۡزِلَ عَلَى الَّذِيۡنَ

اٰمِنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ‎ﺆ‎ (۳/۷۲)

اور (دیکھو) اہلِ کتاب میں ایک گروہ ہے جو کہتا ہے کہ (مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے) ایسا کرو کہ صبح ان کی کتاب پر ایمان لے آؤ، شام کو اس سے انکار کر دو۔ اس طرح عجب نہیں وہ (تمہیں اسلام سے پھرتے ہوئے دیکھ کر خود بھی) اس سے پھر جائیں۔

ہجومِ مخالفت

یہ تھیں مخالفین و معاندین کی سرکشی و طغیان کی وہ آندھیاں جو حق و صداقت کی اس شمعِ فروزاں کو بجھانے کے لیے ہجوم کر کے اٹھیں اور اللہ کے اس بندےؐ کو (جو دنیا کے عام معیاروں کے مطابق بے یار و مددگار اور بے کس و لاچار تھا) بگولے کے سے عفریتی جوش و خروش کے ساتھ چاروں طرف سے گھیر لیا۔ انہوں نے جوشِ مخالفت میں ایذا رسانی اور تکلیف دہی کے لیے کیا کیا صبر آزما اور ہوش رُبا حربے استعمال کیے، کُتُبِ روایات و سِیَر نے ان کی تفاصیل کو اپنے دامن میں محفوظ کر رکھا ہے تاکہ وہ ہر اُس داعیٔ انقلاب کے لیے جو اس نوعِ انسان کے مبلّغِ اعظمؐ کے نقوشِ قدم کے اِتّباع میں حق و صداقت کی آواز بلند کرنا چاہے، وجہِ تثبیتِ قلب اور باعثِ تسکینِ روح ہوں اور راستہ کی سختیاں اس کے پائے استقلال میں لغزش اور عزم و استقامت میں تزلزل نہ پیدا ہونے دیں اور یہ سب ہجومِ بلا اور انبوہِ تکالیف اس جُرم کی پاداش میں کہ وہ اللہ کے بندوں کو اللہ کے نظامِ حکومت کی طرف کیوں بلاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے ان تفصیلی واقعات کا ذکر کیے بغیر اس حقیقت کو اپنی معجزانہ بلاغت سے ایک آیت میں مصوّر کر دیا ہے۔ سابقہ عنوان میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ آپؐ کو ارشاد ہوا تھا کہ

قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ (۷۴/۲)

اٹھ اور ان لوگوں کو ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر۔

سورۂ جنّ میں ہے۔

وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ ۔ (۷۲/۱۹)

اور جب اللہ کا یہ بندہ اس دعوتِ خداوندی کو لے کر اُٹھا۔

كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ۝ؕ (۷۲/۱۹)

مخالفین چاروں طرف سے یورش کر کے اسے لپٹ گئے۔

مخالفت و مخاصمت کی تمام جزئیات اور عناد و انتقام کی جملہ تفاصیل اس ایک اجمال کے اندر آگئیں۔

قریش جیسی شعلہ صفت قوم کے لیے یہ مشکل نہ تھا کہ جوشِ مخالفت میں اٹھتے اور اس داعیٔ انقلابؐ کو قتل کر دیتے، لیکن انہیں یہ معلوم تھا کہ بنو ہاشم اپنے قبیلہ کے خون کا انتقام لینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے اور پھر، چونکہ قریب قریب ہر قبیلہ کے دو ایک آدمی اسلام لا چکے تھے، اس لیے اغلب تھا کہ قتل و انتقامِ قتل کا یہ سلسلہ حدود فراموش ہو جاتا۔ قریش اس عالمگیر خون ریزی کو بھی مول لے لیتے لیکن وہ مسلسل خانہ جنگیوں سے اس قدر تھک چکے تھے کہ وہ اپنے اندر اس قسم کی عمومی جنگ میں الجھنے کی ہمت نہیں پاتے تھے۔ اس لیے انہوں نے قتل و خوں ریزی کے بجائے ایذا رسانی اور تکلیف دہی کا شیوہ اختیار کیا اور اس

ایذا رسانی کے انوکھے انداز

درندگی میں بھی پہل ان مسلمانوں سے کی جو غریب و نادار اور بے یار و مددگار تھے یا جن کے قبیلے کمزور سمجھے جاتے تھے۔ ذرا مئی اور جون کے مہینوں میں صحرائے عرب کی چلچلاتی دھوپ اور تپتی ریت کا اندازہ لگائیے۔ طائرِ نگاہ تک اس کے تصور سے کاشانۂ چشم میں سمٹ جاتا ہے۔ اس عالمِ سوز و تپش میں وہ ان کمزور مسلمانوں کو پکڑتے، بھٹی کی طرح جلتی ہوئی ریت پر لٹا دیتے اور چھاتی پر بھاری پتھر رکھ دیتے کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں۔ بدن پر گرم گرم بالو بچھاتے۔ اس سے بھی تسکین نہ ہوتی تو لوہا گرم کر کے اس سے داغتے۔ حضرت خبابؓ قبیلۂ تمیم کے ایک فرد تھے اور جاہلیت میں غلام

بلاکشانِ محبت

بنا کر فروخت کر دیئے گئے تھے۔ وہ آغازِ اسلام ہی میں ایمان کی سعادت سے بہرہ یاب ہو گئے۔ قریش انہیں طرح طرح کی جانگسل اور روح فرسا تکالیف دیا کرتے تھے۔ ایک دن دہکتے ہوئے انگارے زمین پر بچھائے اور اس پر انہیں چت لٹا دیا اور ایک شخص چھاتی پر پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں۔ مدتوں بعد آپ نے یہ واقعہ حضرت عمرؓ کے سامنے بیان کیا تو پیٹھ کھول کر دکھائی جو کھال اُدھڑ جانے سے برص کے داغوں کی طرح سفید ہو رہی تھی[1]۔

حضرت بلالؓ ــــ ہاں وہی بلالؓ کہ جس کے نام سے رگِ محبت میں تحرک اور نبضِ عشق میں تموّج پیدا ہو جاتا ہے ــــ حبشی النسل اور امیہ ابنِ خلف کے غلام تھے۔ ٹھیک دوپہر کے وقت امیہ انہیں جلتی ریت پر لٹاتا اور پتھر کی چٹان سینہ پر رکھ دیتا۔ اس سے بھی جی نہ بھرتا تو گلے میں رسّی باندھ کر لڑکوں کے حوالے کر دیتا جو انہیں شہر کے گلی کوچوں میں گھسیٹتے پھرتے۔

---

[1] یہ تمام واقعات طبقاتِ ابنِ سعد میں مذکور ہیں۔

حضرت یاسرؓ۔ یمن کے رہنے والے، مکہ کے غرباء سے منعلق لیکن سارا گھرانہ (خود، بیوی حضرت سمیہؓ اور بیٹا حضرت عمارؓ) دولتِ اسلام سے مالا مال، خود اذیتیں اٹھاتے اٹھاتے ہلاک ہو گئے۔ بیوی کو ابوجہل کی برچھی نے جنت میں پہنچا دیا اور حضرت عمارؓ پیہم تکالیف کا نشانہ بنتے رہے۔

انہی بلاکشانِ محبت میں حضرت صہیب رومیؓ اور ابوفکیہہؓ، قریش کے غلام اور لبینہؓ، زنیرہؓ، ہندیہؓ اور اُمِ عبیسؓ ان کی کنیزیں تھیں۔ ان پر اس قدر مظالم توڑے جاتے کہ انہیں دیکھ کر فضا تھرتھرا اٹھتی۔ لیکن جہاں یہ مظالم اپنی قساوت اور سفاکی میں اپنی نظیر نہیں رکھتے وہاں یہ حقیقت بھی اپنی مثال پیش نہیں کر سکتی کہ ابتلاء و آزمائش کے اس طویل اور صبر آزما عرصہ میں کوئی ایک متنفس (مرد یا عورت) ایسا نہ تھا جس نے عملاً کر دکھانا تو ایک طرف، دل کی گہرائیوں میں بھی اس امر کا ہلکا سا خیال کیا ہو کہ چلو! ان کی سی کہہ کر جان تو بچا لو۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ ان پر جس قدر سختیاں زیادہ ہوتیں اسی قدر ان کے ایمان میں پختگی، ہمت میں استواری، حوصلوں میں بلندی، عزم میں ثبات اور ارادوں میں استحکام پیدا ہو جاتا۔ ہر آنے والی مصیبت ان کی نگاہوں میں چمک اور روح میں بالیدگی پیدا کر دیتی۔ وہ ان کی قصابانہ بے رحمیوں اور سفاکانہ سختیوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے اور ان کے خون کا ایک ایک قطرہ دربارِ فرعون کے ساحرین کی ہمنوائی میں پکار پکار کر کہتا کہ فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ (۲۰/۷۲) آسمان کے فرشتے اس عبرت انگیز منظر پر محوِ حیرت تھے اور بارگاہِ صمدیت میں سجدہ کناں اعتراف کرتے تھے کہ بارِالہا! تو نے سچ کہا تھا کہ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ آب و گل کے اس ہیولیٰ، آدم میں اس قسم کے فولادی جوہر بھی مضمر ہیں کہ زمین و آسمان کی گردشیں مل کر بھی انہیں پیس نہ سکیں۔ کسی انقلابی تحریک کے لیے یہ واقعہ کچھ کم باعثِ فخر و مباہات نہیں کہ اس جماعت کے کسی ایک فرد نے نہ کبھی غداری کی نہ خود اس سے پھرا۔ بلکہ بلاؤں کا ہجوم اور سختیوں کا انبوہ ان کے نصب العین کی صداقت کے یقین کو پختہ سے پختہ تر کرتا چلا گیا اور ان کے سینے تسکین و طمانیت کی جنت گاہ بنتے چلے گئے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ ۚ وَ لَكُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْٓ اَنْفُسُكُمْ وَ لَكُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ ۝ (۴۱/۳۰-۳۲)

یہ حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا نشو و نما دینے والا اللہ ہے اور پھر اس پر جم کر کھڑے ہو گئے،

تو ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے جو ان کے پاس یہ بشاراتِ الٰہی لے کر آتے ہیں کہ نہ تم ڈرو اور نہ غمگین ہو اور اس جنّت کی خوشخبری حاصل کرو جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ دنیوی زندگی اور آخرت میں (دونوں جگہ) ہم تمہارے مددگار ہیں۔ تمہارے لیے وہ تمام چیزیں مہیا ہوں گی جن کی تمہیں خواہش ہوگی اور جن کی تم فرمائش کرو گے۔ تمہاری میزبانی وہ خدا کرے گا جو بڑا ہی حفاظت کرنے والا اور سامانِ نشوونما پہنچانے والا ہے۔

ایمان کی بے پناہ قوّت

ان کی اس استقامت وعزیمت سے ان جیسی اور سعید روحیں بھی متاثر ہوتیں اور آگے بڑھ کر ان کی جماعت میں شامل ہو جاتیں۔ یوں اس انقلاب کی لہروں کی وسعت اور بھی ساحل فراموش ہوتی چلی جاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوتِ حق وصداقت کا فروغ اس کے پیروؤں کے یقین وثبات کی نسبت سے ہوتا ہے۔ ان کا ایمانِ محکم اس جہانِ آب وگِل میں زلزلہ پیدا کر دیتا ہے۔

طرحِ نو می افگند اندر ضمیرِ کائنات
نالہ ہا کز سینۂ اہلِ نیاز آید بروں

قوموں کی موت وحیات کا مدار ان کی قوّتِ ایمانی پر ہے۔ اگر انہیں اپنے مسلکِ زندگی کی صداقت پر یقین ہے اور وہ یقین دل کی گہرائیوں میں پیوست، تو پھر دنیا کی کوئی طاقت انہیں ان کے مقام سے نیچے نہیں گرا سکتی۔

ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں

لیکن جہاں ان کے یقین کی قوّت کمزور ہوئی، تباہی کے پنجے نے انہیں فوراً دبوچ لیا ـ آدم ہمہ راز بے یقینی ــــ مردانِ مومن کی وہ جماعتِ قدسیہ جن کا ذکر اس وقت ہمارے لیے وجۂ شادابیٔ قلب ونظر ہے اسی قوّتِ ایمانیہ کی پیکر تھی جس کی وجہ سے دنیا کی بڑی سے بڑی مصیبت اور سخت سے سخت تکلیف ان کے نزدیک ہیچ تھی۔ ہم صرف نام کے مسلمان، کیا سمجھ سکتے ہیں کہ ایمان کی قوّت انسان کے اندر کیا تبدیلی پیدا کر دیتی ہے؟ آج کا مسلمان نہ ایمان کے ذوق سے بہرہ یاب نہ عمل کی چاشنی سے لذت گیر۔ اسے کون بتائے کہ

یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی ۔۔۔ یقیں اللہ مستی خود گزینی
سن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار ۔۔۔ غلامی سے بدتر ہے بے یقینی

خود اپنوں کے ہاتھوں

یہ تھے وہ لوگ جو قریش کی نگاہ میں بے یار و مددگار تھے اور ان کے قبیلے کمزور شمار کیے جاتے تھے، لیکن طاقت ور قبیلوں کے افراد بھی اس اذیت سے محفوظ نہ تھے۔ وہ غیروں کے ہاتھوں نہیں ستائے جاتے تھے بلکہ خود ان کے اعزّا و اقربا انہیں تنگ کرتے تھے حضرت عثمانؓ قریش میں عزّت و ثروت کے مالک تھے اور ممتاز قبیلہ کے فرد۔ جب وہ اسلام لائے ہیں تو خود ان کا چچا انہیں رسّی سے باندھ کر مارا کرتا تھا (حالانکہ وہ بچے نہیں تھے بڑی عمر کے تھے) اسی طرح حضرت زبیرؓ ابن العوام کو بھی ان کا چچا چٹائی میں لپیٹ کر دھواں دیا کرتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے چچازاد بھائی اور بہنوئی سعید بن زیدؓ ایمان لائے تو حضرت عمرؓ نے (جو اس وقت تک حلقہ بگوشِ اسلام نہیں ہوئے تھے) انہیں رسّیوں سے باندھ دیا حتّٰی کہ خود اپنی بہن (فاطمہؓ) کو زد و کوب کیا کیونکہ وہ بھی ایمان لے آئی تھیں۔

حبش کی طرف ہجرت

جب نوبت یہاں تک آپہنچی کہ جو مسلمان کمزور تھے انہیں ہر مستبد و سرکش ہدفِ مظالم بنا رہا تھا اور جو صاحبِ عزّت و ثروت تھے انہیں اُن کے اہلِ خاندان ایذا پہنچاتے تھے تو آپؐ نے تجویز کیا کہ یہ لوگ حبش کی طرف ہجرت کر جائیں۔ حبش سے قریش کے تاجرانہ تعلقات تھے، اس لیے وہ ملک ان کے لیے نامانوس نہ تھا۔ سب سے پہلے (ماہ رجب ۵؁ نبوی میں) حضورؐ کے ایماء سے گیارہ[1] مرد اور چار عورتوں نے ہجرت کی جن میں حضرت عثمانؓ اور ان کی حرم محترمہ حضرت رقیہؓ (حضورؐ کی صاحبزادی) بھی شامل تھیں۔ اس ہجرت کا اوّلین سبب تو وہی نظر آتا ہے جو اوپر مذکور ہے لیکن جب ہم مہاجرین کی فہرست پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اس میں اکثریت ان حضرات کی نظر آتی ہے جو صاحبانِ ثروت و عزّت تھے۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ اس پہلی ہجرت سے مقصود صرف مظلومین کے لیے حفاظت گاہ کی تلاش نہ تھی، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ پیغامِ اسلام کو عرب کی چار دیواری سے باہر پہنچانا بھی تھا۔ حبش کے بادشاہ نجاشی نے ان مہاجرین کو پناہ دی اور یہ وہاں امن و عافیت سے زندگی بسر کرنے لگے۔ لیکن قریش کا جذبۂ انتقام انہیں کب چین سے بیٹھنے دیتا تھا؛ انہوں نے باہمی مشورے کیے اور بالآخر یہ قرار پایا کہ نجاشی کے پاس سفیر بھیجے جائیں۔ اس سفارت کا امیر، عمرو بن العاص تھا (یہ وہی حضرت عمرو بن العاصؓ ہیں جو لوائے اسلام کے

---

[1] بے یار و مددگار لوگوں میں اکثریت ان کی تھی جو ابھی تک مشرکین کی غلامی سے رستگاری حاصل نہ کر سکے تھے اس لیے وہ اس ہجرت میں شریک نہ ہو سکے۔

سائے ہیں فاتح مصر کی حیثیت سے دنیا میں متعارف ہوئے) یہ سفارت بڑے طمطراق سے جانب حبش روانہ ہوئی۔ وہاں پہنچ کر یہ پہلے نجاشی کے اہلِ دربار سے ملے۔ ان کی خدمت میں نذرانے پیش کیے پھر انہیں ورغلایا کہ یہ لوگ جو یہاں آکر آباد ہوئے ہیں انہوں نے ایک نیا فتنہ اٹھایا ہے۔ ہم ان کی بازیابی کے لیے نجاشی سے درخواست کرنے آئے ہیں۔ آپ بھی ہماری تائید کیجئے گا۔ دوسرے دن یہ سفارت نجاشی سے ملی اور اپنی درخواست پیش کی۔ اہلِ دربار نے ان کے مطالبہ کی تائید کی۔ نجاشی نے مسلمانوں کو بلا کر پوچھا کہ تم نے کون سا نیا مذہب ایجاد کیا ہے جو عیسائیوں اور عربوں (دونوں) کے مذہب کے خلاف ہے۔

نجاشی کے دربار میں

ذرا اس واقعہ کے احوال و ظروف پر غور کیجئے۔ چند گنتی کے مسلمان، اپنوں کے ستائے ہوئے غیر ملک میں پناہ گزیں ہیں۔ دشمن وہاں بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ بادشاہ غیر قوم ہی کا نہیں، بلکہ مذہب بھی دوسرا (عیسائیت) رکھتا ہے۔ سفارت، عرب کے ان اربابِ ثروت و اقتدار کی نمائندگی کر رہی ہے جن سے اہلِ حبش کے تاجرانہ تعلقات ہیں اور وہ ان تعلقات کو بہرحال استوار رکھنا چاہتے ہیں۔ بادشاہ کو ان پناہ گزین مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا جاتا ہے۔ وہ ان سے متاثر ہو کر مسلمانوں کو دربار میں بلاتا ہے اور پوچھتا ہے کہ تم نے یہ کون سا مذہب ایجاد کیا ہے جو نصرانیت کے بھی خلاف ہے۔ ذرا غور کیجئے موقع کی نزاکت پر اور پھر دیکھئے ان مسلمانوں کا طرزِ عمل! ان کی طرف سے حضرت جعفرؓ آگے بڑھے اور کہا۔

> اَیُّهَا الْمَلِكُ! ہم ایک جاہل قوم تھے، بتوں کو پوجتے تھے، نجاست سے آلودہ تھے، مردار کھاتے تھے، بیہودہ بکا کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے۔ بھائی پر بھائی ظلم کیا کرتا تھا۔ ہم میں انسانیت کا نشان نہ تھا۔ کوئی قاعدہ اور قانون نہ تھا۔ طاقت ور لوگ کمزوروں کو کھا جاتے تھے۔ ایسی حالت میں ہم میں اللہ نے ایک شخص کو پیدا کیا جس کی صداقت اور دیانت، شرافت اور راستبازی سے ہم خوب واقف تھے۔ اس نے ہمیں تمام باتوں کو چھوڑ کر ایک خدا کے احکام کے سامنے جھکنے کی دعوت دی اور یہ سکھایا کہ ہم سچ بولا کریں، خوں ریزی سے باز آئیں، غریبوں اور یتیموں کا مال نہ کھایا کریں، ہمسایوں کو آرام دیں، کسی کی عفت پر داغِ تہمت نہ لگائیں، برائیوں سے بچیں، غریبوں کی امداد میں مال خرچ کریں۔ ہم اس پر ایمان لائے، شرک چھوڑا، تمام اعمالِ خبیثہ سے باز آئے۔ اس جرم پر ہماری قوم ہماری جان کی دشمن ہو گئی۔ ہمیں طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائیں۔ جب ہم مجبور ہو گئے تو آپ کے ملک میں

آکر پناہ لی۔ اب یہ یہاں بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتے اور مجبور کرتے ہیں کہ ہم پھر اسی گمراہی میں واپس چلے جائیں۔

حضرت جعفرؓ یہ تقریر کر رہے تھے اور دربار پر سناٹا چھا رہا تھا۔ نجاشی نے کہا کہ جو کلام تمہارے پیغمبرؐ پر اترا ہے، مجھے اس میں سے کچھ سناؤ۔ حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کی تلاوت شروع کی۔ ایک تو قرآن اور پھر پڑھنے والے اس صدق و اخلاق کے پیکر!

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا

نجاشی پر ایسا اثر ہوا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سر اٹھایا اور کہا کہ "خدا کی قسم! یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی شمع کی کرنیں ہیں" یہ کہہ کر سفرائے قریش سے کہا کہ جاؤ، میں ان مظلوموں کو واپس نہیں دوں گا۔

سفارتِ قریش اس جواب سے بہت مایوس ہوئی لیکن انہوں نے اس پر بھی حوصلہ نہیں ہارا۔ اب انہوں نے نجاشی کی دُکھتی ہوئی رگ کو پکڑنا چاہا۔ دوسرے دن عمرو بن العاص نے پھر دربار میں رسائی حاصل کی اور نجاشی سے کہا کہ آپ کو معلوم بھی ہے کہ یہ مسلمان، حضرت عیسیٰؑ کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے ہیں؟ نجاشی نے مسلمانوں کو پھر بلا بھیجا۔

اب ایک مرتبہ پھر اس موقع کی نزاکت کو سامنے لائیے۔ عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو خدا یا کم از کم خدا کا بیٹا مانتے ہیں اور اسلام کھلے لفظوں میں الوہیت اور ابنیت کے اس عقیدہ کا ابطال کرتا ہے۔ سفرائے قریش اس حقیقتِ حال سے واقف تھے، اسی لیے انہوں نے یہ چال چلی تھی۔ ان حالات میں دورِ حاضر کی مصلحت آمیز "پالیسی" کا جو کچھ تقاضا ہو سکتا تھا اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں، لیکن ایمان کا تقاضا کچھ اور تھا۔ حضرت جعفرؓ نے نہایت بے باکانہ کہا کہ ہمارے پیغمبرؐ نے بتایا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہے اور بس! یہ سُن کر دربار کے اُسقف اور بطریق غصے سے لال پیلے ہو گئے۔ سفرائے مکہ جی میں خوش ہوئے کہ تیر نشانہ پر لگا۔ لیکن نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ "واللہ جو کچھ تم نے کہا (حضرت) عیسیٰؑ اس تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں۔" اس طرح قریش کی سفارت خاسر و نامراد واپس آ گئی۔[1]

یہ تو وہ ہجومِ مصائب تھا جن سے جماعتِ مسلمین کو گھیرا جاتا تھا لیکن جن تکالیف و آلام کا نشانہ خود حضورؐ

---

[1] یہ واقعات سیرتِ ابنِ ہشام میں بہ تفصیل مذکور ہیں۔ یہ مہاجرین بعد میں واپس آ گئے تھے۔

خود حضورؐ کے مخالف کی ذاتِ اقدسؐ کو بنایا جاتا تھا وہ اپنی شدّت اور سختی میں ان سے کچھ کم نہ تھے۔ مخالفین آپؐ کے قبیلہ کی پوزیشن کے پیشِ نظر آپؐ پر دست درازی نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے وہ کمینہ حرکات پر اُتر آئے۔ وہ آپؐ کے راستوں میں کانٹے بچھاتے۔ نماز پڑھتے وقت ہنسی اُڑاتے۔ حضورؐ سجدہ میں جاتے تو نجاست کا ڈھیر اوپر ڈال دیتے۔ باہر تشریف لے جاتے تو شریر لڑکوں کا غول پیچھے لگا دیتے۔ آپؐ کسی مجمع میں دعوتِ اسلام دیتے تو ابولہب برابر چلاّتا جاتا کہ یہ (معاذ اللہ) جھوٹ کہتا ہے۔ جیساکہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یہ لوگ حضورؐ کی جان پر ہاتھ ڈالنے میں بھی کبھی توقّف نہ کرتے لیکن آپؐ کے قبیلہ کی حمایت کا خیال ان کی راہ میں مانع تھا۔

یہ ابوطالب کے پاس پہنچے بنو ہاشم میں اس وقت ابوطالب سب سے بڑے تھے۔ جب رؤسائے قریش نے دیکھا کہ ان کی عام ایذارسانیوں کا آپؐ پر کچھ اثر نہیں ہوتا، تو ان کا ایک وفد ابوطالب کے پاس آیا اور اس سے کہا کہ تمہارا بھتیجا ہمارے معبودوں کی توہین کرتا ہے، ہمارے آباد و اجداد کو اتنا سخت سست کہتا ہے کہ ہم میں سننے کی تاب نہیں رہتی۔ ہم اب تنگ آچکے ہیں؛ اس لیے یا تو تم اس کی پشت پناہی سے الگ ہو جاؤ یا میدان میں اُتر آؤ کہ اس تمام کشمکش و آویزش کا ایک دن میں فیصلہ ہو جائے۔ ابوطالب نے حالات کا جائزہ لیا، معاملہ کی نزاکت پر غور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ سارے قریش سے عداوت مول لینا کسی صورت میں بھی قرینِ مصلحت نہیں۔ وہ اکیلا ان سب کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ اس نے بھتیجے کی طرف محبّت بھری نگاہوں سے دیکھا اور کہا، جانِ پدر! میرے اوپر اتنا بوجھ نہ ڈال کہ میں اُسے اُٹھا نہ سکوں۔

غور کیجئے کہ اس مختصر سے فقرے میں (دنیا کے عام معیار کے مطابق) حضورؐ کے لیے بے کسی و بے بسی اور عاجزی و بے چارگی کی کتنی غمناک قیامتیں پوشیدہ تھیں۔ عرب کا ساوحشی ملک۔ سردارانِ قریش کا پُورے کا پُورا گروہ جن کے دلوں میں آتشِ انتقام و عناد کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ مخالفت و نامساعدت کے اس تلاطم خیز طوفان میں، دنیا کے ہر معیار اور عالمِ اسباب کے ہر اندازے کے مطابق صرف اپنے خاندان کا آسرا وجہِ تقویت ہو سکتا تھا۔ اور اب وہ آسرا اس طرح ٹوٹ رہا ہے۔

لیکن آپؐ نے کیا کہا؟

کہا یہ کہ چچا جان! میں تو آپ ہی کے بھروسے پر ان کی مخالفتیں مول لے رہا تھا۔ جب آپ ہی میری حفاظت

پاسبانی سے الگ ہوتے ہیں تو میری کیا مجال کہ ان کے خلاف ایک لفظ بھی زبان تک لاؤں؟
معاذ اللہ! یہ جواب اُس کی طرف سے کیسے ہوسکتا تھا جس نے حقیقت کو اپنی آنکھوں کے سامنے بے نقاب دیکھ لیا ہو اور جو ساری دنیا کو یہ سکھانے آیا ہو کہ حق و صداقت کا بول بالا کرنے کے لیے دنیا میں کیا کیا مصیبتیں جھیلنی اور کون کون سی قیامتیں اٹھانی پڑا کرتی ہیں۔
آپؐ نے رؤسائے قریش کی اس دھمکی کا استخفاف کی ہنسی سے استقبال کیا اور کامل سکون و طمانیت کے ساتھ، جس میں عزم و استقلال کا کوہ آسا استحکام جھلک رہا تھا، فرمایا۔

> خدا کی قسم! اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند لاکر رکھ دیں، تب بھی میں اپنے فریضہ کی سرانجام دہی سے باز نہ آؤں گا۔ یا تو اللہ میرے اس مشن کو کامیاب کرے گا اور یا میں اس پر قربان ہو جاؤں گا۔

آفتاب و ماہ و انجم می تواں دادن زِ دست
در بہائے آں کفِ خاکے کہ دلہائے دل است

عزیمت و استقامت کی یہ صدائے ہوش رُبا سیدھی چچا کے دل میں اتر گئی۔ بھتیجے سے کہا کہ جانِ عم! جاؤ۔ کوئی تمہاری طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتا! (بحوالہ سیرت ابنِ ہشام)

بنو ہاشم کا مقاطعہ و محاصرہ

قریش کے غم و غصہ کی اب انتہا نہ تھی۔ حبش سے ان کی سفارت بے نیلِ مرام واپس آگئی۔ ابوطالب نے یہ جواب دیا۔ ان کی مسلسل مخالفت کے باوجود یہ تحریکِ انقلاب برابر بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ انہوں نے مجلس مشاورت میں بیٹھ کر ابوطالب کے اس جواب پر غور کیا اور بالآخر فیصلہ کیا کہ آپؐ کو اور آپؐ کے خاندان کو محصور کرکے فاقوں مار دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے بالاتفاق ایک معاہدہ مرتب کیا کہ کوئی شخص خاندانِ بنو ہاشم سے نہ رشتہ ناطہ کرے نہ خرید و فروخت، نہ ان سے ملے جلے اور نہ انہیں کھانے پینے کا کوئی سامان دے اور اس طرح ان کا مکمل مقاطعہ (بائیکاٹ) کیا جائے۔ یہ معاہدہ لکھ کر درِ کعبہ پر لٹکا دیا گیا۔ یہ ۷ سنہ نبوی کا واقعہ ہے۔ تین برس تک نبی اکرمؐ اور ان کے ساتھ خاندانِ بنو ہاشم نظر بندی کی سی حالت میں رہے تا آنکہ خود قریش میں سے بعض نیک دل لوگوں کو بنی ہاشم کی اس کرب و صعوبت کی زندگی پر ترس آیا اور انہوں نے رفتہ رفتہ اپنے ہم خیال پیدا کر کے درِ کعبہ پر لٹکی ہوئی اس دستاویز کو چاک کر دیا اور یوں یہ سخت آزمائش کا زمانہ ختم ہوا۔

غمگسار بیوی کی وفات

اس مصیبت سے رہائی ملی تو امید تھی کہ کچھ دن آرام سے گزر جائیں گے۔ لیکن ۱۰ نبوی میں آپؐ کے چچا ابوطالب کا انتقال ہو گیا اور اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے وفات پائی۔ ان غمگساروں کے اُٹھ جانے سے آپؐ تو تنہا نہیں رہ گئے کیونکہ آپؐ کو اُس خدا کی رفاقت میسر تھی جو ہمیشہ زندہ ہے اور کبھی نہیں مرے گا لیکن اس سے قریش کے حوصلے بہت بڑھ گئے اور اب انہوں نے ایذا رسانی اور تکلیف دہی میں اور بھی شدّت اختیار کر لی۔

اہلِ طائف کی طرف

اب آپؐ اہلِ مکہ سے نا اُمید ہو چکے تھے اس لیے آپؐ نے ارادہ کیا کہ اہلِ طائف کو بھی مخاطب کر کے دیکھ لیا جائے تاکہ حق و باطل کے فیصلہ کے آخری وقت سے پہلے ہر طرف سے اتمامِ حجت ہو جائے۔ چنانچہ آپؐ طائف تشریف لے گئے اور وہاں کے رؤسا کو اسلام کی دعوت دی۔

آپؐ کو معلوم تھا کہ وہ بھی فرعونوں اور نمرودوں کی بستی ہے لیکن اس کے باوجود صرف ایک ساتھی زیدؓ بن حارث کی معیت میں مخالفین کے اس نرغے میں از خود چلے جانا اعتماد علی النفس کی ایسی مثال ہے جس کا اعتراف غیر مسلموں تک کو کرنا پڑا ہے[1]۔ آپؐ نے انہیں دعوتِ توحید دی لیکن انہوں نے اس دعوتِ راستبازی کا جواب جس کجروی سے دیا تاریخ کا دیدۂ عبرت اس پر آج تک خوں فشاں ہے۔ انہوں نے نہایت استہزاء آمیز اور حقارت انگیز انداز سے گفتگو کی اور جب آپؐ نے واپسی کا ارادہ کیا تو طائف کے بازاری لوگوں اور اوباشوں کو ابھارا کہ اس ذاتِ اقدس کو جس پر دنیا بھر کا شرف و مجد نثار تھا، اپنی دنایت و سفاہت کا نشانہ بنائیں۔ چنانچہ شقاوت و قساوت کے یہ مجسّمے بازار میں دو رویہ کھڑے ہو گئے اور جب حضورؐ ادھر سے گزرے تو آپؐ پر پتھر برسانے شروع کر دیئے یہاں تک کہ آپؐ کے جوتے لہو سے بھر گئے۔ جب آپؐ زخموں سے نڈھال ہو کر بیٹھتے تو وہ بازو پکڑ کر اٹھا دیتے اور پھر سنگباری شروع کر دیتے اور اس کے ساتھ (معاذ اللہ) گالیاں دیتے، تالیاں بجاتے اور شور مچاتے۔

وہ اس تماشے میں محو تھے اور ان کی قضا ایک گوشے میں کھڑی ان پر ہنس رہی تھی۔ آپؐ نے شہر سے باہر نکل کر عقبہ بن ربیعہ کے تاکستان میں پناہ لی جو نسبتاً شریف النفس انسان تھا۔ آپؐ ایک درخت کے

---

[1] سر ولیم میور نے "لائف آف محمدؐ" میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔

اور اِدھر سے جواب

سایہ میں بیٹھ گئے، زخموں سے خون صاف کیا، گردوپیش کے حالات پر نگاہ ڈالی۔ پیچھے طائف تھا جہاں سے اس حالت میں نکالے گئے تھے۔ سامنے مکہ تھا جہاں (دنیاوی اندازوں کے مطابق) کوئی پناہ دینے والا نہ تھا اور راستہ کی تنہائیوں میں' اللہ کا یہ بندہ، زخموں سے چُور، ستانے کے لیے بیٹھا تھا۔ دنیا بھر سے جنگ اور یہ عالمِ بے چارگی، جنّ و انس سے مبارزت اور یہ بے سروسامانی! بے کسی و درماندگی کے اس حُزن انگیز عالم میں گوشۂ چشمِ آرزو کسی دنیاوی قوت سے استمداد و اعانت کے لیے نہیں وا ہوا، بلکہ نگہِ التجا، اس بابِ صمدیت کی طرف اٹھی جس کا قانون ہر بے کس و ناتواں کا سہارا اور ہر عاجز و درماندہ کا تکیہ ہے۔ عرض کیا کہ

بارالٰہا! میں اپنی کمزوری اور بے سروسامانی اور اُس کے خلاف لوگوں کے اس حقارت آمیز سلوک کی تجھ سے فریاد کرتا ہوں کہ تو اَرحم الرّاحمین ہے۔ تو ہی درماندوں اور عاجزوں کا سہارا ہے اور تو ہی میرا مالک ہے۔

مجھے کس کے سپرد کیا جا رہا ہے؟ کیا ترش رُو بے گانوں (اہلِ طائف) کے یا اُن اپنوں (اہلِ مکہ) کے جو اپنی اسکیموں کو کامیاب کرنے پر قدرت رکھتے ہیں؟ لیکن جب تو مجھ سے ناراض نہیں تو مجھے اس کی کیا پروا ہے۔ اس لیے کہ تیری حفاظت کا گوشہ میرے لیے بہت وسیع ہے۔ میں تیرے دامنِ انوار میں پناہ لیتا ہوں جن سے سب تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور حال اور مستقبل کے تمام امورِ مبہمہ درست ہو جاتے ہیں۔ مجھے تیری مشیت سے ہم آہنگی درکار ہے کہ تمام قوتوں کا سرچشمہ تیری ہی ذات ہے[1]

اس دعا پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ ایمان کسے کہتے ہیں!

شاید کہ خود را باز آفرینی!

یہ مخالفت کیوں تھی؟

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ ان لوگوں سے کیا کہتے تھے جس کی وجہ سے یہ پوری کی پوری قوم نعل بر آتش ہو رہی تھی؟ وہ کیا پیغام تھا جس کی وجہ سے جوشِ انتقام اور شدتِ عداوت سے ان پر راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام ہو گیا تھا؟ وہ کیا دعوت تھی جس کی مخالفت میں ان کے جنود و عساکر کی تمام قوتیں ایک محاذ پر مجتمع ہو گئی تھیں؟ وہ کیا تحریک تھی

---

[1] بحوالہ طبری۔

جس کو دبانے کے لیے وہ اپنی جان تک دینے کے لیے تیار ہو گئے تھے؟ اس سوال کا تفصیلی جواب تو اُس وقت سامنے آئے گا جب ہم یہ بتائیں گے کہ "اسلام" کیا ہے۔ اس لیے کہ جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ قرآن دُنیا کے سامنے کیا پیغام پیش کرتا ہے، وہ عالمِ انسانیت میں کیا تغیر چاہتا ہے، وہ دنیا کے تمدنی، عائلی، معاشی معاشرتی، سیاسی، اقتصادی نظام کو کِن جدید بنیادوں پر استوار کرنے کی دعوت دیتا ہے، مختصراً یہ کہ وہ انسانی زندگی کا مقصد کیا قرار دیتا ہے، جب تک یہ تفصیل سامنے نہ آجائے، اس وقت تک یہ حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی کہ دنیا بھر کی قوتیں اس کی مخالفت پر کیوں کمربستہ ہو جاتی ہیں؟ انھیں یہ پیغام کیوں خوش نہیں آتا؟ اس تحریک کی کامیابی میں ان کا نقصان کیا ہوتا ہے؟ انہیں کیوں اس کی زندگی کے آئینے میں اپنی موت دکھائی دیتی ہے؟ اِس وقت صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہو گا کہ رسول اللہ نے جو پیغام ان لوگوں تک پہنچایا وہ کوئی نیا پیغام نہیں تھا بلکہ وہی پیغام تھا جو اُس وقت سے دُنیا کے سامنے آ رہا جب سے دنیائے فکر و عمل کو رشد و ہدایت کی ضرورت ہوئی، وہی پیغام جو حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت عیسٰیؑ تک مختلف زمانوں میں اور مختلف مقامات پر دہرایا جاتا رہا اور جس کے متعلق فرمایا۔

اِنَّآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ كَمَآ اَوْحَیْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِیّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ ....
..... وَكَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا ○ (۴ / ۱۶۳-۱۶۵)

(اے پیغمبرؐ!) ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی جس طرح نوح پر اور ان نبیوں پر جو نوح کے بعد ہوئے بھیجی تھی اور جس طرح ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ، اولادِ یعقوبؑ، عیسٰیؑ، ایوبؑ، یونسؑ، ہارونؑ، اور سلیمانؑ پر بھیجی اور داؤدؑ کو زبور عطا فرمائی۔ نیز خدا کے وہ رسول جن کا حال ہم قرآن میں پہلے سُنا چکے ہیں اور وہ جن کا حال ہم نے تمہیں نہیں سنایا (اسی طرح) اللہ نے موسٰیؑ سے کلام کیا۔ یہ تمام رسول (اعمالِ صالحہ کے نتائج کی) خوشخبری دینے والے اور (انکارِ حق کے نتائج سے) آگاہ کرنے والے تھے (اور اس لیے بھیجے گئے تھے) کہ اس طرح لوگوں کو متنبہ کر دینے کے بعد ان کے پاس کوئی حجت باقی نہ رہے جو وہ خدا کے حضور میں پیش کر سکیں (یعنی یہ عذر کر سکیں کہ ہمیں راہِ حق کی طرف کسی نے دعوت نہیں دی تھی) اور خدا کا قانونِ مکافات بڑا ہی صاحبِ قوت و حکمت ہے۔

قیامِ دین کا مفہوم

اس وحی کی غایت کیا تھی؟ قرآنِ کریم نے اسے دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ یعنی "قیامِ دین"؟ اس نظامِ زندگی کا قیام جس میں

انسانیت اپنی منزلِ مقصود تک جا پہنچے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝ (۴۲/۱۳)

(اے افرادِ نسلِ انسانی!) خدا نے تمہارے لیے وہ نظامِ زندگی تجویز کیا ہے (جو کوئی نیا نظام نہیں ہے بلکہ اب سے بہت پہلے) جس کی نوحؑ کو بھی ہدایت کی جا چکی ہے اور جس کی (اے پیغمبرِ اسلام! اب) ہم تمہاری طرف وحی کر رہے ہیں اور (تم سے پہلے اسی نظام کو قائم کرنے کی) ہم نے ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ کو بھی ہدایت فرمائی تھی۔ (وہ ہدایت کیا ہے؟) یہی کہ (وحی کے متعین فرمودہ) نظامِ زندگی کو قائم کرو اور (پھر یکدلی کے ساتھ اس پر جم جاؤ یعنی) اس میں کسی قسم کا اختلاف نہ کرو (اے پیغمبرِ اسلام!) مشرکین پر اس نظامِ زندگی کا قیام جس کی طرف تم انہیں بلا رہے ہو، بڑا ہی گراں گزر رہا ہے۔ (مگر تم اس کی فکر نہ کرو، کیونکہ) خدا صرف انہی لوگوں کو اس سے نوازا کرتا ہے جو اسے حاصل کرنا چاہتے ہیں اور انہی لوگوں کو صحیح راستہ دکھاتا ہے جو (اپنے ارادہ اور عزم سے) اس کی طرف رجوع ہوتے ہیں!

اوپر کی آیت کے اس ٹکڑے پر پھر غور کیجئے کہ اس نظام کا قیام "مشرکین" پر گراں گزرتا ہے اس لیے کہ وہ خدا کے سوا اوروں کا بھی یہ حق تسلیم کرتے ہیں کہ وہ انسانی زندگی کے لیے نظام وضع کریں۔

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ؕ (۴۲/۲۱)

کیا ان کے کچھ ایسے ساتھی بھی ہیں جنہوں نے (اپنی مرضی سے) اُن کے لیے کوئی نظامِ زندگی تجویز کر دیا ہے جس کی خدا نے اجازت نہیں دی؟ (یقیناً ایسا ہی ہے)۔

اس نظامِ خداوندی کی تفاصیل طویل ہیں لیکن اس کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ خدا کے سوا، دنیا میں کسی کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں سے اپنا حکم منوائے۔ نہ ہی کسی انسان کے لیے جائز ہے کہ وہ کسی انسان کو اپنا حکمران تسلیم کرے۔ حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے اور محکومیت صرف اس کی اختیار کی جا سکتی

ہے۔ لَآ اِلٰہَ ۔ اِلَّا اللّٰہُ سے یہی مراد ہے۔ خدا کی یہ حکومت، اس کے قوانین کی کارفرمائی کا نام ہے جو اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ اسلامی نظامِ مملکت ان احکام و قوانین کو نافذ کرنے کی ایجنسی ہوتی ہے۔ یہ نظامِ مملکت سب سے پہلے رسُول کے ہاتھوں متشکّل ہوتا ہے۔ رسول خود بھی قوانینِ خداوندی کا اِتّباع کرتا ہے اور دوسروں سے بھی انہی کا اتباع کراتا ہے۔

اِس نظام کا دوسرا گوشہ یہ ہے کہ رزق کے سرچشموں پر کسی کی ملکیّت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ انہیں خدا نے تمام انسانوں کی پرورش کے لیے بلامزد و معاوضہ دیا ہے۔ نظامِ اسلامی کا فریضہ یہ ہے کہ ان کا اس طرح انتظام کرے کہ تمام افراد کی بُنیادی ضروریات زندگی پوری ہوتی رہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ اس نظام کی مخالفت کیوں ہوتی ہے۔

اربابِ اقتدار کی مخالفت

اربابِ حکومت اس کی مخالفت کرتے ہیں کہ اس نظام کی رُو سے کسی انسان کو حق حاصل نہیں رہتا کہ وہ کسی دُوسرے انسان پر حکومت کرے۔ وہ حکومت و اقتدار کے تمام خزانوں کی کنجیاں ان سے چھین کر حکومت و اقتدار کے حقیقی مالک کی طرف لوٹا دیتا ہے۔

اربابِ دولت و ثروت اس لیے مخالفت کرتے ہیں کہ اس نظام کی رُو سے سرمایہ داری کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔

اربابِ مذہب اس لیے مخالفت کرتے ہیں کہ یہ اُنہیں ان کی "خدائی مسندوں" سے نیچے اُتار دیتا ہے۔ اس لیے کہ اس کے نزدیک، بندے اور خدا کے درمیان کسی انسانی وسیلہ کی ضرورت ہی نہیں۔

اربابِ طریقت مخالفت کرتے ہیں کہ یہ انہیں ان کی خانقاہوں کی خلوتوں سے نکال کر میدانِ عمل میں لاتا ہے، اس لیے کہ اس کے نزدیک یہ انسان کی سب سے بڑی شکست ہے کہ وہ باطل کی قوتوں کو کھُلا چھوڑ کر خود گوشوں اور زاویوں میں جا چھپے۔

اربابِ حسب و نسب مخالفت کرتے ہیں کہ وہ پیدائش کی رُو سے کسی انسان کو دوسرے انسان پر کوئی فضیلت نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک تمام انسانوں کی تخلیق "نفسِ واحدہ" سے ہوئی ہے۔

یہی ہیں وہ "ارباب" جنھیں قرآن اَنْدَادًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ ۔ قرار دیتا ہے۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰہِ اَنْدَادًا لِّیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِہٖ ط (۱۴/۳۰)

اور دیکھو، لوگوں نے اللہ کے لیے بہت سے اس کے ہم درجہ گھڑ رکھے ہیں تاکہ وہ لوگوں کو اس کی راہ سے بھٹکائیں۔

ان میں سے ہر ایک کی طرف سے مخالفت ہوتی ہے اور ان میں کتنے ہی باہمی اختلافات کیوں نہ ہوں، اس مخالفت میں سب ایک مرکز پر جمع ہو جاتے ہیں۔

پیغامِ توحید

رسول اللہؐ بھی اسی نظام کا قیام چاہتے تھے۔ اس لیے تمام اَرْبَابٌ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ۔ کی طرف سے اس کی مخالفت ضروری تھی۔ آپؐ کا پیغام یہ تھا کہ۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔

قُلْ اِنَّمَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰـھُکُمْ اِلٰـہٌ وَّاحِدٌ ۚ فَھَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ (۲۱/۱۰۸)

(اے پیغمبرِ اسلام!) تم کہہ دو کہ مجھ پر جو کچھ وحی کیا گیا ہے، وہ تو صرف یہ ہے کہ تمہارا حاکم ایک ہی تنہا حاکم ہے (اس کے سوا کوئی نہیں)۔ پس بتلاؤ، تم اس کے قوانین کے سامنے سر جھکاتے ہو یا نہیں؟"

آپؐ نے صاف صاف کہہ دیا کہ محکومیت خالصتہً اللہ کے قوانین کی ہوگی۔ اس میں کسی اور کی محکومیت کا شائبہ تک نہیں ہوگا۔

قُلِ اللّٰہَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّہٗ دِیْنِیْ ۙ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِہٖ ؕ قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِیْنَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَھُمْ وَاَھْلِیْھِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ؕ اَلَا ذٰلِکَ ھُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ ○ (۳۹/۱۴-۱۵)

(اے پیغمبرِ اسلام! ان مخاطبینِ دعوتِ حق سے) کہہ دے کہ میں تو اپنے نظامِ زندگی کو خالص (قانونِ خداوندی کے تابع کرتے ہوئے) اللہ ہی کی اطاعت و محکومیت اختیار کرتا ہوں۔ (اگر تم کسی طرح بھی نہیں مانتے)، تو خدا کے سوا جس کی تمہارا جی چاہے محکومیت (اطاعت) اختیار کر لو (اور اس کا خمیازہ بھی بھگتو)۔

جنھیں تم نے اربابِ قوت و اقتدار سمجھ رکھا ہے، میں ان میں سے کسی کے حقِ حکومت کو تسلیم نہیں کرتا۔

قُلْ اِنِّیْ نُھِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَمَّا

جَآءَنِیَ الْبَیِّنٰتُ مِنْ رَّبِّیْ ۫ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ (۴۰/۶۶)

(اے پیغمبرِ اسلام!) کہہ دے کہ مجھے (میرے خدا کی طرف سے) منع کر دیا گیا ہے کہ میں ان کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) تسلیم کروں جنہیں تم لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہو (خصوصاً) جبکہ میرے پاس اس باب میں میرے پروردگار کی طرف سے کھلی کھلی دلیلیں بھی آچکی ہیں اور مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں (اپنی ہر حرکت اور ہر عمل میں) تمام جہانوں کے پروردگار کے قوانین کی اطاعت کروں۔

یہ تھی وہ دعوت جو قریش کو دی گئی۔ اب ذرا اس عنوان کو ایک مرتبہ پھر اپنے سامنے لائیے جس میں عربوں کی خصوصیات کا ذکر ہوا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ تکبّر و نخوت، خودستائی و خودپسندی، دعوائے افضلیت و فوقیت، جذبۂ مسابقت و منافست ان کی رگ رگ میں موجزن تھا۔ ہر عرب اپنے آپ کو عجمی سے فائق سمجھتا تھا۔ پھر عربوں میں سے قریش اپنے آپ کو سب قبائل سے افضل تصوّر کرتے تھے۔ قریش میں سے بنو ہاشم اور بنو امیہ کسی کو اپنے برابر نہیں سمجھتے تھے۔ دنیاوی وجاہت کے علاوہ، کعبہ کے کلید بردار اور مجاور ہونے کی حیثیت سے انہیں مذہبی تقدّس و عظمت بھی حاصل تھی جس میں ان کا کوئی شریک و سہیم نہ تھا۔ ان میں بڑے بڑے دولت مند بھی تھے جن کے دروازوں پر اہی جیسے سیکڑوں انسان، غلاموں اور کنیزوں کی صورت میں، بلازنجیر بندھے رہتے تھے اور ان پر انہیں ہر قسم کا تصرّف حاصل تھا۔ قریش کے تاجر دُور دراز ملکوں سے تجارت کرتے اور کعبہ کے متولّی ہونے کی وجہ سے ان کی تجارت کے قافلے ہر جگہ محفوظ رہتے تھے۔

یہ تھے عرب۔ اب سوچئے کہ ان عربوں سے یہ کہنا کہ

نسلی اور قبائلی غرور و افتخار سب باطل ہیں کیونکہ پیدائش کے اعتبار سے سب انسان برابر ہیں۔ عرب کو عجم پر اور قریشی کو حبشی پر کوئی فضیلت نہیں۔

جاہ و منصب کا تکبّر غلط ہے کیونکہ تمہیں حق حاصل نہیں کہ کسی انسان پر اپنا حکم چلاؤ۔

تولیّتِ کعبہ کی اجارہ داری کا تصوّر بے بنیاد ہے کیونکہ خدا اور انسان کے درمیان کسی واسطے کی ضرورت نہیں۔

غلام اور آقا کا امتیاز، باعثِ ننگِ انسانیّت ہے کیونکہ کوئی انسان دوسرے انسان کا غلام نہیں ہوسکتا۔

یہ مٹی اور پتھر کی مورتیں جنھیں تم نے اور تمہارے آباء و اجداد نے خُدا بنا کر جوارِ کعبہ میں نصب کر رکھا ہے، تمہاری جہالت کی دلیل اور حماقت کا ثبوت ہیں۔ ان میں تو اتنی بھی قوّت نہیں کہ خود اپنی مگس رانی کر سکیں چہ جائیکہ تمہیں فائدہ یا نقصان پہنچا سکیں۔

نوحۂ ابوجہل ان لوگوں سے یہ کچھ کہنا ان کے خلاف اعلانِ جنگ نہیں تھا تو اور کیا تھا؟ وہ اس تعلیم کے فروغ میں اپنی موت مضمر دیکھتے تھے۔ اس لیے وہ اِسے آسانی سے کِس طرح قبول کر لیتے؟ اس آنے والے انقلاب کے تصوّر سے ان کی روح کانپتی تھی۔ اسی لیے ابوجہل غلافِ کعبہ کو تھام تھام کر فریاد کرتا تھا کہ

سینۂ ما از محمّدﷺ داغ داغ — از دمِ اُو کعبہ را گُل شُد چراغ
ساحر و اندر کلامش ساحری است — ایں دو حرفِ لَا اِلٰہ خود کافری است
تا بساطِ دینِ آباء در نورد — با خداوندانِ ما کرد آنچہ کرد

وہ چلّاتا تھا کہ

مذہبِ اُو قاطعِ ملک و نسب — از قریش و منکر از فضلِ عرب
در نگاہِ اُو یکے بالا و پست — با غلامِ خویش بر یک خواں نشست

اس کے نزدیک یہ سانحہ، قیامتِ صغریٰ سے کم نہ تھا۔

قدرِ احرارِ عرب نشناختہ — با کلفتانِ حبش در ساختہ
احمراں با اَسْوَداں آمیختند — آبروئے دُودمانے ریختند

اس لیے وہ کبھی حجرِ اَسْوَدْ کو پکار کر کہتا تھا۔

باز گو اے سنگِ اَسْوَدْ باز گوے — آنچہ دیدیم از محمّدﷺ باز گوے

اور کبھی کعبہ کے سب سے بڑے "خدا" سے فریاد کرتا کہ

اے ہُبل! اے بندہ را پوزش پذیر — خانۂ خود را ز بے کیشاں بگیر

گلّۂ شاں را بگرگاں کن سبیل تلخ کن خرمائے شاں را بر نخیل

اور اس نالۂ و فریاد اور سبّ و شتم سے اپنے دل کی آگ ٹھنڈی کرتا تھا۔

یہ تھے اس مخالفت و مخاصمت کے وجوہ اور اس تزاحم و تصادم کے اسباب، یعنی وہی وجوہ جو روزِ ازل سے حق و باطل کی کشمکش کے لیے وجود کوش رہے ہیں اور وہی اسباب جو قیامت تک ابلیس و آدم کی آویزش کے لیے فتیلۂ آتش بنتے رہیں گے۔

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی، نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسداللّٰہی، وہی مرحبی، وہی عنتری

اِستقامت

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ (۱۱/۱۱۲)

بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی
چو خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است

قوم کی طرف سے اس دعوتِ حق و صداقت کا جواب جس طرح اینٹ اور پتھر سے دیا گیا اُس کا اجمالی سا خاکہ گزشتہ باب میں ہمارے سامنے آچکا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مخالفت و مخاصمت کے اس ہجوم اور مصائب و نوائب کے اس طوفان میں اس داعیٔ انقلاب کی کیا روش رہی؟ کیا آپؐ نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان دے لیا کہ میرے ذمہ جو فریضہ تھا وہ ادا ہو گیا۔ اب مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ خواہ مخواہ اپنی جان جوکھوں میں ڈالوں؟ میں ان کے بھلے کی کہہ رہا ہوں اور یہ سامنے سے اس طرح پیش آرہے ہیں۔ نہیں مانتے تو جائیں جہنم میں۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ ان کی خاطر اس قدر تکلیفیں اٹھاؤں — اور وہ بھی انہی کے ہاتھوں۔!

ایک عام انسان ایسے حالات میں یہی کچھ کہتا اور ایسا ہی کچھ کرتا۔ لیکن جس کے سامنے حقیقت بے نقاب ہو کر آگئی ہو، جو جانتا ہو کہ انسانی زندگی کیا ہے اور اس کا مقصد کیا، جو دیکھ رہا ہو کہ اندھا کنوئیں کے کنارے پہنچ چکا ہے اور اب اگر اس نے ایک قدم بھی اور اسی راستہ پر اٹھایا تو اس کا نتیجہ ہلاکت اور بربادی ہوگا، وہ خاموش نہیں بیٹھ سکتا۔ وہ اس تباہ ہونے والے کو للکارے گا اور اگر وہ اس للکار بھی اپنی اس روش سے

نہیں رُکتا تو یہ آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑلے گا اور اسے ہلاکت کے عمیق گڑھے میں گرنے نہیں دے گا۔ اسی طرح جب ایک دیدۂ بینا دیکھتا ہے کہ باطل کی سرکش قوتیں انسانیت کے ہر شعبہ پر مسلط ہو رہی ہیں اور آواز دینے پر وہ اپنی روش سے باز نہیں آتیں، تو وہ اس فریب سے اپنے آپ کو جھوٹا اطمینان دے کر خلوت گزین نہیں ہو سکتا کہ میرا فریضہ اتنا ہی تھا۔ وہ جانتا ہے کہ اگر میں نے میدان سے منہ موڑلیا تو باطل بساطِ زندگی کے ہر گوشہ پر چھا جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسانوں کی بستیوں میں فساد ہی فساد برپا ہو جائے گا اور اس طرح شجرِ انسانیت مرجھا کر گر پڑے گا۔ اس لیے وہ اس کی پرواہ ہی نہیں کرتا کہ سامنے سے جواب کیا ملتا ہے۔ وہ اپنی پکار کو برابر جاری رکھتا ہے۔ وہ اپنی دعوت کو دہرائے چلا جاتا ہے۔ جو کچھ اس کی آنکھیں دیکھتی ہیں، وہ دوسروں تک پہنچائے چلا جاتا ہے۔

قرآنِ کریم نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (۱۵/۹۴)

جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے، لوگوں پر آشکارا کیے جاؤ اور مشرکوں کی کچھ پرواہ نہ کرو۔

استقامت

قرآنِ کریم کے صفحات پر نگاہ ڈالیے۔ شروع سے اخیر تک اس حقیقت کو مختلف انداز اور متنوع پیرایوں سے دہرایا گیا ہے۔ دعوت، تبلیغ، تبشیر، تنذیر سب اسی حقیقت کی تبئین کے مختلف اسالیب ہیں۔

وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ؕ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (۲۲/۶۷ نیز ۲۸/۸۷)

اپنے رب کی طرف دعوت دیتے رہو۔ یقیناً تم سیدھے راستہ پر ہو۔

آگے بڑھنے سے پہلے اس آیت کے آخری الفاظ پر بنگاہِ تعمق غور کیجئے۔ کسی تحریک کی کامیابی کا راز اسی میں ہے کہ داعیٔ تحریک کو اپنی دعوت کی صداقت پر پورا پورا یقین ہو اور دوسرے یہ کہ جو شخص اپنے آپ کو حق پر سمجھے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس حق کو دوسروں تک بھی پہنچائے۔ یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں، یعنی وہ خود اس مسلکِ حق و صداقت پر جم کر کھڑا ہو اور دوسروں کو اس کی دعوت دیے جائے۔

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ (۴۲/۱۵)

چنانچہ (اے پیغمبر!) اسی تعلیم کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے رہو! اور جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے (کہ وہ آسا) جم کر کھڑے رہو اور لوگوں کے جذبات، خیالات

کی (ہرگز ہرگز) پیروی نہ کرو۔

دل کش انداز میں تبلیغ

اپنے دعویٰ کی صداقت کے ثبوت میں دلائل و براہین پیش کیجئے اور دعوت کو نہایت دل کش و دل آویز اسلوب سے بطریقِ احسن دوسروں تک پہنچائیے۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ ط اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ٥ (۱۶/۱۲۵، پ ۱۴ ع ۲۹)

(اے پیغمبر!) اپنے نشوونما دینے والے کی راہ کی طرف لوگوں کو بلاؤ۔ اس طرح کہ حکمت کی باتیں بیان کرو اور اچھے طریقہ پر پند و نصیحت کرو اور مخالفوں سے بحث و نزاع کرو تو (وہ بھی) ایسے طریقہ پر کہ حسن و خوبی کا طریقہ ہو۔ تمہارے پروردگار کو علم ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹک گیا ہے اور کون راہِ راست پر ہے۔

ایسے پیرایہ میں جو سیدھا ان کے دل تک اُتر جائے۔

قُلْ لَّهُمْ فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا ٥ (۴/۶۳)

تم اُنہیں (پند و نصیحت کی) ایسی باتیں کہو کہ ان کے دل میں اُتر جائیں۔

اس سے ہوگا یہ کہ جن قلوب میں قبولِ حق کی کچھ بھی صلاحیت باقی ہے، وہ اپنی غلط روش کے انجام و عواقب سے آگاہ ہو جائیں گے اور اس طرح آنے والی تباہی و بربادی کے جہنم سے بچ جائیں گے۔

وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ (۶/۷۰)

قرآن کے ذریعے حقیقت کو ان کے سامنے لاتے رہو تاکہ ایسا نہ ہو کہ کوئی انسان اپنی بدعملی کی وجہ سے ہلاکت میں چھوڑ دیا جائے۔

اس کے بعد باقی وہ رہ جائیں گے جن کے دل انکار و جحود کی سرکشی اور تقلید و جمود کے تعطّل سے مردہ ہو چکے ہیں اور زندگی کی کوئی رمق ان میں باقی نہیں رہی۔

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ٥ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِى الْعُمْىِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ط اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ

بِاٰیٰتِنَا فَھُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ○ (۲۷/۸۰-۸۱ نیز ۳۰/۵۲)

(اے پیغمبرِ اسلام!) تم (اپنی بات) مُردوں کو نہیں سُنا سکتے اور نہ ہی اپنی پکار نیٹ بہروں کو سُنا سکتے ہو (خصوصاً) جبکہ وہ پیٹھ موڑ کر، اعراض کر کے، چلتے بنیں (اور سُننے کا ارادہ ہی نہ کریں) اور (اسی طرح) تم اندھوں کو ان کی غلط روش سے ہٹا کر صحیح راستے کی طرف نہیں لا سکتے (ہاں) تم صرف ان لوگوں کو اپنی پکار سنا سکتے ہو جو ہماری آیتوں پر یقین رکھتے ہیں چنانچہ وہی لوگ ان کے سامنے جھکنے والے ہیں۔

سورۂ یٰسین میں حقیقت کے ان دونوں پہلوؤں کو ایک ہی ٹکڑے میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

لِّیُنۡذِرَ مَنۡ کَانَ حَیًّا وَّ یَحِقَّ الۡقَوۡلُ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ ○ (۳۶/۷۰)

(یہ قرآن اس لیے نازل کیا گیا ہے) تاکہ پیغمبرِ اسلام (اس کے ذریعے) ان لوگوں کو جن میں زندگی کی کچھ بھی رمق ہو، (انکار و بدعملی کے نتائج سے) آگاہ کرے اور منکرینِ حق پر (جو بالکل مردہ ہو چکے ہیں) حجت قائم ہو جائے۔

تنذیر کا مفہوم

یہ تنذیر بھی تبلیغ ہی کا دوسرا نام ہے یعنی غلط روش زندگی کے انجام و عواقب سے آگاہ کرنا، سنکھیا کھانے پر آمادہ ہونے والے کو بتا دینا کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ محکمۂ آب و ہوا (METEOROLOGICAL DEPARTMENT) کے منذرین (WARNERS) کی طرح، دریا کے کنارے بسنے والوں کو آگاہ کر دینا کہ بہت بڑا طوفان اُمنڈے چلا آرہا ہے، اپنی اپنی حفاظت کا انتظام کر لو اور کسی "اونچے ٹیلے" پر چلے جاؤ (صمد کے یہی معنی ہیں)۔

یہی نزولِ قرآن کا مقصد ہے۔

قَیِّمًا لِّیُنۡذِرَ بَاۡسًا شَدِیۡدًا مِّنۡ لَّدُنۡہُ وَ یُبَشِّرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ الَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَہُمۡ اَجۡرًا حَسَنًا ۙ○ مَّاکِثِیۡنَ فِیۡہِ اَبَدًا ۙ○ (۱۸/۲-۳)

بالکل سیدھی بات (ہر طرح کے پیچ و خم سے پاک) اور اس لیے اتاری کہ تو لوگوں کو خبردار کر دے کہ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی سے ایک سخت ہولناکی ان پر آسکتی ہے اور مومنوں کو جو صلاحیت بخش کام کرتے ہیں، خوشخبری دے دے کہ یقیناً ان کے لیے بڑی ہی خوبی کا اجر ہے۔ وہ ہمیشہ اس میں خوشحال رہیں گے۔

سورۂ شوریٰ میں ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ۝ (۴۲/۷ نیز ۲۶/۱۹۴ ، ۳۹/۷۱)

اور (اے پیغمبرؐ! جس طرح دوسرے پیغمبروں کی طرف ہم وحی کر چکے ہیں) اسی طرح ہم نے تیری طرف بھی اس قرآن کی وحی کی ہے جو عربی زبان میں ہے تاکہ تم (اس کے ذریعے) باشندگانِ اُمّ القُریٰ (یعنی مکہ) اور جو آبادیاں اس کے چاروں طرف ہیں اُن کو (انکار و بدعملی کے نتائج سے) آگاہ کرو اور ظہورِ نتائج کے اس وقت سے انہیں متنبہ کرو جس میں شک و شبہ کی قطعاً گنجائش نہیں ہے (جس دن اپنے اپنے اعمال کے نتیجہ میں) ایک فریق جنت میں پہنچ جائے گا اور دوسرا فریق جہنم میں!

اسی رسول کو نذیر کہا گیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۙ (۳۳/۴۵ ; ۲۸/۳۴ ; ۳۸/۶۵ ; ۴۶/۹ ; ۴۸/۸ ; ۵۱/۵۱ ; ۵۳/۵۶)

اے نبیؐ! ہم نے تجھے نگران بنا کر اور (ایمان و اعمالِ صالحہ کے نتائج کی) خوشخبری دینے والا اور (انکار و بدعملی کے نتائج سے) آگاہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے!

تبشیر تنذیر کا دوسرا پہلو تبشیر ہے، یعنی جب آپ کسی سے کہتے ہیں کہ اس کی غلط روشِ زندگی اسے بربادی کے جہنم کی طرف لیے جا رہی ہے تو اس کا مثبت پہلو یہ بھی ہے کہ صحیح اسلوبِ حیات اسے کامیابی اور کامرانی کی جنت کی طرف لے جائے گا۔ یہی بشارت ہے، یعنی اعمالِ صالحہ کے صحیح نتائج کی خوشخبری۔ لہٰذا، تنذیر اور تبشیر ایک ہی بیت کے دو مصرعے اور ایک ہی اصل کی دو شاخیں ہیں۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ ۝ (۴۶/۱۲)

اور (اسی طرح) یہ کتاب (قرآن) بھی ہے جو پچھلی تمام کتابوں کی تعلیم کو سچ کر دکھلانے والی ہے۔ واضح (عربی) زبان میں ہے تاکہ ہمارا پیغمبرؐ (اس کے ذریعے) ان لوگوں کو جو غلط روشِ زندگی اختیار کر کے اپنے آپ پر ظلم کرتے رہے ہیں (ان کے اعمال کے نتائج سے) آگاہ کر دے اور تاکہ یہ کتاب حسن کارانہ انداز

سے زندگی بسر کرنے والوں کے لیے خوشخبری کا باعث بن جائے (کہ اس سے وہ اپنے ایمان و اعمالِ صالحہ کے خوشگوار نتائج معلوم کر کے بشارت حاصل کر سکیں)۔

بشیر و نذیر لہٰذا، نبی اکرمؐ بشیر بھی تھے اور نذیر بھی۔

اِنَّآ اَرۡسَلۡنٰكَ بِالۡحَقِّ بَشِيۡرًا وَّ نَذِيۡرًا ۙ وَّلَا تُسۡـَٔلُ عَنۡ اَصۡحٰبِ الۡجَحِيۡمِ ۝ (۲/۱۱۹ ; ۳۴/۲۸ ; ۴۸/۸)

(اے پیغمبرؐ!) یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم نے تمہیں اس لیے بھیجا ہے کہ لوگوں کو بتا دو کہ ان میں سے جو قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں گے، ان کے اعمال کے نتائج کس قدر خوشگوار ہوں گے اور جو ان کی خلاف ورزی کریں گے، ان کا انجام کس قدر تباہ کن ہوگا۔ تمہارا کام لوگوں کو آگاہ کر دینا ہے۔ جو لوگ تمہاری بات پر کان نہیں دھریں گے اور یوں جہنم کی تباہیوں میں چلے جائیں گے، تم ان کے اعمال کے ذمہ دار نہیں ہو گے۔

سفینۂ برگِ گل وہ تھی روش مخالفین کی اور یہ تھا انداز اس داعیٔ حق و صداقت کا۔ جس قدر مخالفت کی سختی بڑھتی جاتی تھی، اسی قدر اس دعوت و تبلیغ اور تنذیر و تبشیر کی شدت زیادہ ہوتی جاتی تھی کہ

حُدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

صعوبات و مصائب کا بحرِ زخّار متلاطم تھا اور اس میں مورِ ناتواں کے قافلہ کا یہ "سفینۂ برگِ گل"۔ چاروں طرف سے کف بدہاں موجوں کے تھپیڑے اسے ہر آن اُلٹ دینے کے لیے مضطرب و بیقرار تھے۔ بادِ مخالف کا جھکڑ، سرکش عفاریت کی طرح ہر سمت سے اسے محیط تھا۔ مستبد قوتوں کے اژدر و نہنگ سطحِ آب سے اُبھر اُبھر کر اس جوش و خروش سے جھپٹتے کہ گویا ایک ہی وار میں اس پورے کے پورے قافلے کو لقمۂ اجل بنا دیں گے۔ جہالت اور تعصب کی گھٹائیں چاروں طرف سے منڈلا رہی تھیں جس سے اندھیرے پر اندھیرے کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔

اَوۡ كَظُلُمٰتٍ فِىۡ بَحۡرٍ لُّـجِّىٍّ يَّغۡشٰٮهُ مَوۡجٌ مِّنۡ فَوۡقِهٖ مَوۡجٌ مِّنۡ فَوۡقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعۡضُهَا فَوۡقَ بَعۡضٍ ؕ اِذَاۤ اَخۡرَجَ يَدَهٗ لَمۡ يَكَدۡ يَرٰٮهَا ؕ وَمَنۡ لَّمۡ يَجۡعَلِ اللّٰهُ

لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۝ (۲۴/۴۰)

ان تاریکیوں کی طرح جو کسی عمیق سمندر میں طاری ہوتی ہیں کہ سمندر کی سطح کو موج ڈھانپ لیتی ہے اور اس موج پر ایک دوسری موج ہوتی ہے اور پھر اس دوسری موج پر بادل کی تاریکی ہوتی ہے۔ (غرضیکہ) ایک پر دوسری اور دوسری پر تیسری تاریکیاں ہی تاریکیاں ہوتی ہیں۔ جب انسان اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو (نظر آنا تو درکنار) نظر آنے کے قریب بھی نہیں ہوتا۔ (اس جہانِ تاریک میں) بجز اس کے جسے خدا ہی اپنے نور کا کچھ حصہ عطا فرمادے، کسی کو روشنی میسّر نہیں آسکتی۔

لیکن اس طوفان و ظلمات میں یہ "سفینۂ برگِ گُل" آسمانی ستاروں کی دھوکا نہ دینے والی قندیلوں کو دلیلِ راہ بناتا نہایت سکون و اطمینان سے جانبِ منزل رواں دواں چلے جارہا تھا کہ خدائے سفینہ نے انہیں اطمینان دلا رکھا تھا کہ وہ انہیں ہر موجِ بلا سے محفوظ رکھے گا۔

يَاۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۶۷/۵)

اے پیغمبرؐ! تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر جو کچھ نازل ہوا ہے، اسے (خدا کے بندوں تک) پہنچا دو (اور دشمنوں کی مخالفت کی پرواہ نہ کرو) اگر تم نے ایسا نہ کیا تو (پھر) تم نے خدا کا پیغام نہیں پہنچایا (یعنی ادائے فریضۂ رسالت میں کوتاہی کی) اور اللہ تمہارے مشن کو انسانوں (کے شر) سے محفوظ رکھے گا۔ وہ اس گروہ پر (کامیابی کی) راہ نہیں کھولتا جس نے انکارِ حق کی راہ اختیار کی ہو!

اور انہیں یقین تھا کہ جس جماعت کے ساتھ قوانینِ خداوندی کی طرف سے حفاظت کا وعدہ شامل ہوا اُسے دنیا کی کوئی بلا گزند نہیں پہنچا سکتی۔

آپ قرآنِ کریم کا شروع سے اخیر تک مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ اس نے احوالِ امم سابقہ اور واقعاتِ مِلل گزشتہ کو کس شرح و بسط سے بیان کیا ہے اور ان تاریخی نظائر و شواہد پر غور و فکر کی دعوت کس شدّ و مدّ سے دی ہے۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ یہ حقیقت ہر داعیِ حق و صداقت کے سامنے واضح طور پر آجائے کہ جو کچھ اس کی دعوتِ انقلاب کے ساتھ ہو رہا ہے وہ کوئی نیا تجربہ نہیں۔ دنیا میں حق و باطل کی کشمکش کے سلسلہ میں

یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔ جہاں اور جب بھی حق کی آواز بلند ہوئی ہے، باطل کی قوتیں اسے دبانے کے لیے ہر طرف سے یورش کر کے آگئی ہیں۔ اس لیے اس قسم کے سیلابِ مخالفت سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں، داعیٔ انقلاب کو ایک محکم چٹان کی طرح جم کر کھڑے رہنا چاہیئے کہ حوادثِ زمانہ کے تھپیڑے اس سے آکر ٹکرائیں اور سر پھوڑ کر واپس چلے جائیں۔

تاریخی شواہد

ان تاریخی شواہد میں تحریکِ حق و صداقت کی علمبردار جماعتوں کے لیے سامانِ تثبیتِ قلب اور اسبابِ تقویتِ روح ہوتا ہے اور اسی غرض سے قرآن نے انہیں بیان بھی کیا ہے۔ چنانچہ اس معرکۂ خیر و شر میں بھی جو اس وقت ہمارے لیے وجۂ بالیدگیٔ ایمان و یقین ہے، انبیائے سابقہ و مِلَلِ گزشتہ کے احوال و کوائف کی طرف خاص طور پر توجہ منعطف کرائی گئی اور نبیٔ اکرمؐ اور آپ کی وساطت سے اس جماعتِ حقّہ سے کہا گیا جو اس تحریکِ انقلاب کی اوّلین علمبردار تھی، کہ ان تاریخی شواہد پر غور کرو اور سوچو کہ داعیانِ حق و صداقت کے ساتھ دُنیا میں کیا کچھ نہیں ہوتا رہا، لیکن بالآخر کامیابی و سرخروئی انہی کے حصّہ میں آتی رہی۔ سورۂ ھودؔ میں تمام انبیائے سابقہ اور ان کی مخالف جماعتوں کی آویزش و کشمکش کی داستانیں دہرانے کے بعد فرمایا۔

وَ كُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَ جَآءَكَ فِیْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَ مَوْعِظَةٌ وَّ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (۱۱/۱۲۰)

اور (اے پیغمبرؐ!) رسولوں کی سرگزشتوں میں سے جو جو داستانیں ہم تجھے سناتے ہیں تو ان سب میں یہی بات ہے کہ تیرے دل کو مضبوط کر دیں اور ان سے تم حقیقت تک پہنچ جاؤ اور تمہاری جماعت اس سے عبرت و بصیرت حاصل کرے۔

ایسا ہی ہوتا رہا ہے

کہا گیا کہ ان معارکِ حق و باطل پر غور کرو تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ موجودہ کشمکش صرف اصول میں ہی نہیں بلکہ جزئیات تک میں اُنہی کے دوش بدوش چل رہی ہے اور یہ لوگ قدم بہ قدم وہی کچھ کر رہے ہیں جو ان کے پیش رو کرتے رہے ہیں۔ یہ لوگ آپ کی تکذیب کرتے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ سب انبیاء کی تکذیب ہوتی چلی آئی ہے۔

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَیِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ وَ الْكِتٰبِ الْمُنِیْرِ ۝ (۳/۱۸۴)

(اے پیغمبرِ اسلام!) یہ لوگ اگر آج تمہیں جھٹلا رہے ہیں تو کوئی نئی بات نہیں، تم سے پہلے کتنے ہی رسول

ہیں جو (اسی طرح) جھٹلائے گئے، باوجودیکہ سچائی کی روشن دلیلیں، (حکمت و موعظت کے) صحیفے، (اور قوانینِ خداوندی کی) روشن کتاب ان کے ساتھ تھی۔

یہ درست ہے کہ تکذیب و تعریض آپ پر گراں گزرتی ہے (اور اسے ہر قلبِ حساس پر گراں گزرنا چاہیئے) لیکن ہر پیغامِ حق و صداقت کی تکذیب اسی طرح ہوتی رہی ہے۔ اس سے افسردہ خاطر ہونے کی کوئی بات نہیں۔ اس لیے کہ آخرالامر فتح و کامیابی اسی انقلاب کے حصہ میں آئے گی۔

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَ اُوْذُوْا حَتّٰۤى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ ۝ (۶/۳۲-۳۴)

(اے پیغمبرؐ!) ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ (انکار و تعصب کی) جیسی کچھ باتیں کہتے ہیں، وہ بلاشبہ تمہارے لیے آزردگی کا موجب ہوتی ہیں، لیکن وہ تمہیں تو نہیں جھٹلاتے (یعنی تمہیں جھوٹا کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے کیونکہ تمہاری راست گوئی سب کو معلوم ہے) بلکہ دیدہ و دانستہ اللہ کے قوانین سے انکار کرتے ہیں! اور (دیکھو!) یہ واقعہ ہے کہ تم سے پہلے بھی خدا کے رسول جھٹلائے گئے سو انہوں نے لوگوں کے جھٹلانے اور اذیت دینے پر استقامت سے کام لیا (اور اپنے کام میں لگے رہے) یہاں تک کہ (بالآخر) ہماری مدد آپہنچی اور (یاد رکھو!) یہ خدا کے وہ اٹل قوانین ہیں جنہیں کوئی بدل نہیں سکتا۔ ان رسولوں کے حالات میں سے بعض کے حالات تو تم تک پہنچ ہی چکے ہیں۔

جو کچھ یہ کر رہے ہیں، ہر ایک قوم نے یہی کچھ کیا تھا۔

وَ اِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ عَادٌ وَّ ثَمُوْدُ ۙ وَقَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ۙ وَّ اَصْحٰبُ مَدْيَنَ ۚ وَكُذِّبَ مُوْسٰى فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ۝ (۲۲/۴۲-۴۴ نیز ۳۵/۴ ؛ ۳۵/۲۵)

اور (اے پیغمبرؐ!) اگر یہ (سن کر) تجھے جھٹلاتے ہیں، تو (یہ کوئی نئی بات نہیں) ان سے پہلے کتنی ہی قومیں اپنے اپنے وقت کے رسولوں کو جھٹلا چکی ہیں؛ قومِ نوح، قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ ابراہیم، قومِ لوط، اصحابِ مدین اور موسیٰ کو بھی جھٹلایا گیا اور ہمارا قانون ہمیشہ ایسا ہی رہا ہے کہ منکرین

کو (کچھ عرصہ کے لیے) مہلت دی گئی۔ پھر (مؤاخذہ میں) پکڑ لیا۔ تو دیکھو! ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق ان کا کیا انجام ہوا؟

وہ سب تباہ ہو گئے۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّ اَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ ۙ وَ عَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ ۙ وَّ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَ قَوْمُ تُبَّعٍ ۭ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ ۝ (۵۰ / ۱۲-۱۴)

(دیکھو!) ان سے پہلے (بے شمار قومیں) دعوتِ حق کی تکذیب کر چکی ہیں، قومِ نوح، اصحاب الرّس، قومِ ثمود، قومِ عاد، قومِ فرعون، برادرانِ لوط، اصحاب الایکہ، قومِ تبّع۔ غرضیکہ سب نے ہی ہمارے رسولوں کو جھٹلایا۔ چنانچہ (وقفۂ مہلت گزر جانے کے بعد) وہ کچھ ہو کر رہا جو ان سے کہا جاتا تھا۔

اس لیے کہ اگر کسی سے کہا جائے کہ سنکھیا نہ کھانا، ہلاک ہو جاؤ گے، لیکن وہ کہے کہ تم جھوٹ کہتے ہو، اس سے کچھ بھی نہیں ہوگا اور سنکھیا کھالے تو اس کا انجام ہلاکت کے سوا اور کیا ہوگا۔ اس لیے مکذبین (حقیقت کو جھٹلانے والوں) کا انجام ہلاکت ہے۔ جب اُممِ سابقہ کے ساتھ یہی کچھ ہوا تو اِن مخالفین کے ساتھ وہی کچھ کیوں نہیں ہوگا؟ نہ سنکھیا کی خاصیت بدل گئی ہے نہ انسانی طبیعت۔ وہ ہلاک ہوئے تھے تو یہ بھی ہلاک ہوں گے۔ وہ لوگ تو ان سے بھی زیادہ صاحبِ قوت واقتدار تھے۔

فَاَهْلَكْنَآ اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا وَّمَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ (۴۳ / ۸)

چنانچہ (دیکھو) ہم نے ان قوموں کو بھی ہلاک کر دیا جو ان لوگوں سے گرفت میں کہیں زیادہ مضبوط تھیں (کیونکہ انہوں نے دعوتِ حق کی تکذیب کی تھی) اور ان لوگوں کا جو حشر ہوا تھا وہ پہلے گزر چکا ہے۔

اس لیے تم ان مکذبین کے انجام وعواقب کو ہمارے غیر متبدّل قانون کے حوالے کر دو اور خود اپنے کام میں جمعیتِ خاطر سے مصروف رہو۔

وَ ذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ۝ اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا ۙ وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِيْمًا ۤ يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ۝

(۷۳ / ۱۱-۱۴)

(اے پیغمبرِ اسلام!) ان (دعوتِ حق) کی تکذیب کرنے والے صاحبانِ دولت و ثروت کو میرے قانونِ مکافات کے حوالے کر دو۔ کچھ تھوڑی سی انہیں مہلت دے دو۔ (اس کے بعد دیکھنا) یہ واقعہ ہے کہ ہمارے پاس (ان لوگوں کے لیے) بھاری بھاری بیکڑے اور بیڑیاں، شعلہ فگن آگ، گلے میں پھنس جانے والا کھانا اور دردناک عذاب (تیار) ہے۔ جس دن عوام اور خواص سب اپنے اپنے مقام سے ہل جائیں گے اور بڑے بڑے سرداروں کی یہ حالت ہو جائے گی جیسے ریت کے ڈھیلے ڈھالے ٹیلے ہوں۔

تضحیک بھی ہوتی رہی ہے

یہ بھی درست ہے کہ یہ لوگ اس پیغامِ صداقت کا مذاق اڑاتے ہیں، اس کی تضحیک کرتے ہیں، اس کا استقبال استہزاء اور تمسخر سے کرتے ہیں لیکن یہ بھی کوئی انوکھی چیز نہیں۔ اس سے پہلے بھی یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ (۶/۱۰ ؛ نیز ۲۱/۴۱ ؛ ۱۳/۳۲)

اور (اے پیغمبرؐ!) یہ واقعہ ہے کہ تم سے پہلے بھی رسولوں کی ہنسی اڑائی گئی (جیسی آج تمہاری ہنسی اڑائی جا رہی ہے)، تو جن لوگوں نے ہنسی اڑائی تھی، وہ جس بات کی ہنسی اڑاتے تھے وہی بات اُن پر آپڑی۔

آپ ان سے کہہ رہے ہیں کہ

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا نا پائدار ہوگا

اور یہ اُس انذار کی ہنسی اڑا رہے ہیں۔ ان سے اس ہنسی کے متعلق کچھ نہ کہیے۔ ذرا آندھی کا طوفان آنے دیجیے اس کے بعد یہ خود دیکھ لیں گے کہ اس آشیانے کے تنکے کہاں کہاں بکھرے ملتے ہیں۔

فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۚ فَسَوْفَ يَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ (۶/۵)

چنانچہ جب سچائی ان کے پاس آئی (یعنی قرآن کی دعوت نمودار ہوئی)، تو انہوں نے اسے جھٹلایا۔ سو جس بات کی یہ ہنسی اڑاتے رہے ہیں عنقریب اس کی حقیقت انہیں معلوم ہو جائے گی۔

لہٰذا، آپ ان حقائق کو جو آپ پر منکشف کیے گئے ہیں، ان سے واضح طور پر کہے جائیے اور انجام کی فکر نہ کیجیے۔

اس کے لیے ہمارا قانونِ مکافاتِ عمل کافی ہے۔

إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ ۝ (۱۵/۹۵)

یہ واقعہ ہے کہ (اے پیغمبرؐ!) تیری طرف سے ہم ان مذاق اڑانے والوں کے لیے کافی ہیں۔

نیز شاعر!

جب تو ان سے یہ کچھ کہتا ہے تو، جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، یہ لوگ بطور طنز اور استہزاء کے کہتے ہیں کہ یہ محض شاعرانہ باتیں ہیں۔ یہ شخص تصورات کی دنیا میں بیٹھا ہوائی قلعے بناتا رہتا ہے کبھی کسریٰ کے ایوان گراتا ہے اور کبھی قیصر کا تخت الٹتا ہے۔ یہ محض شاعری ہے حقیقت سے اس کا کیا تعلق؟ ان سے کہو کہ جو کچھ میں کہتا ہوں۔

حقیقت ہے۔ نہیں میرے تخیل کی خلاقی!

یہ زندگی کے ٹھوس حقائق ہیں، عالمِ تصورات کے حسین خواب نہیں۔

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تُؤْمِنُونَ ۝ (۶۹/۴۱)

اور (یاد رکھو!) یہ قرآن کسی شاعر کا قول نہیں بلکہ (خدا کے اٹل قوانین کا بیان ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ) تم ان حقائق کا بہت کم یقین کرتے ہو!

تخیلات کی وادیوں میں لطائف آفرینی، ایک داعیٔ انقلاب کا کام نہیں ہوتا۔ یہ اس کے منصبِ زندگی کے خلاف اور مقصدِ حیات کے منافی ہے۔ اسے شاعری کرنا زیب ہی نہیں دیتا۔

وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنبَغِي لَهُ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُّبِينٌ ۝ (۳۶/۶۹)

اور (یاد رکھو) ہم نے محمدؐ کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ ہی یہ چیز ایک داعیٔ انقلاب کے شایانِ شان ہو سکتی ہے[1] (جو ہم نے اس پر نازل کیا ہے) اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان کے فراموش کردہ مقاصدِ زندگی کی یاد دہانی اور ایک واضح کتاب (یعنی) قرآن ہے۔

کیا شاعروں کو تم نے نہیں دیکھا؟ کبھی تصورات کی اس وادی میں بھٹک رہے ہیں، کبھی تخیلات کے اس صحرا میں سرگرداں ہیں۔ نہ زندگی کی کوئی متعین منزل، نہ اس منزل تک پہنچنے کی دل میں تڑپ۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ ۝ (۲۶/۲۲۵)

اے پیغمبرؐ! کیا تم نے شاعروں کو نہیں دیکھا کہ وہ ایک ایسے اونٹ کی طرح جسے جھوٹی پیاس کی بیماری

---

[1] شاعری کیا ہے اور رسول شاعر کیوں نہیں ہوتا، اس کے لیے اسی عنوان کے اخیر میں "استدراک" دیکھیے۔ (صفحہ ۱۸۱)

لیے لیے پھر رہی ہو، ہر وادی میں بھٹکتے رہتے ہیں۔

اسی لیے

وَ اَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ ۝ (۲۶/۲۲۶)

وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جو خود کرتے نہیں۔

ان کی ساری زندگی لفظی اتار چڑھاؤ میں گزر جاتی ہے۔ عمل کی ایک جھلک بھی ان کے نصیب میں نہیں ہوتی۔ ان کے برعکس، ایک میں ہوں کہ تمہارے سامنے زندگی کا ایک واضح اور غیر مبہم نصب العین متعین کر کے رکھ رہا ہوں اور اس نصب العین کے حصول کے لیے تمہاری تمام خفیہ صلاحیتوں اور خوابیدہ قوتوں کو یوں بیدار کر رہا ہوں جس طرح مضراب کی جنبش سے رگِ ساز میں پوشیدہ نغمے تڑپ کر باہر آجائیں اور زندگی کی خاموش فضاؤں میں ارتعاش پیدا کر کے روح میں بالیدگی اور خون میں حرارت پیدا کر دیں۔ میں تمہیں اس چیز کی طرف بلاتا ہوں جس سے تمہارے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑ جائے، جو مُردوں کی بستی میں صُورِ اسرافیل پھونک دے۔ میں تم سے فقط اتنا کہتا ہوں کہ اپنی زندگی کو میرے حیات آور پیغام کے قالب میں ڈھالو اور پھر دیکھو کہ ساری دنیا کی بادشاہتیں تمہارے قدم چومتی ہیں یا نہیں؟ اور اس کے بعد یہ بھی دیکھو کہ میں جو کچھ کہتا ہوں اس پر سب سے پہلے خود عمل کرتا ہوں (وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ)۔ (۶/۱۶۳)

کیا یہ شاعری ہے؟ کیا جذبات کی قوسِ قزاحوں میں تصورات کے جھولے جھولنے والے شاعر یہی کچھ کیا کرتے ہیں؟ اگر اب بھی تم اس پیغامِ انقلاب کو شاعری سمجھتے ہو تو اُفٍّ لَّكُمْ وَ لِمَا تَعْبُدُونَ (۲۱/۶۷) تف ہے تمہاری سمجھ پر اور ان پر جن کے ایما پر تم یہ کچھ کہتے ہو۔

ثابت قدمی کے لیے

ان تاریخی شواہد و امثال کے بیان اور حقائق و حکم کے اظہار سے نبی اکرمؐ اور آپؐ کی جماعتِ قدسیہ کی تثبیتِ قلب کا سامان بہم پہنچایا جاتا اور آپؐ سے کہا جاتا کہ لوگوں کی ان حرکات سے شکستہ خاطر نہ ہوں بلکہ نہایت عزم و استقلال سے اپنے مشن کو پورا کرتے چلے جائیں۔

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِىْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّ الَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُونَ ۝

(۱۶/۱۲۷-۱۲۸ نیز ۱۱/۱۱۵)

(اے پیغمبرؐ!) عزم و استقلال سے کام کیے جاؤ۔ تمہیں یہ ثبات و استقلال قوانینِ خداوندی کے اتباع سے حاصل ہوگا اور ان لوگوں کی حالت سے رنجیدہ خاطر مت ہو، نہ ہی ان کی مخالفانہ تدبیروں سے دل تنگ ہو۔ یقیناً اللہ کی مدد ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے بچ کر حُسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

آپؐ اِن مصائب و آلام سے ہمّت نہ ہاریں۔ خدا کا یہ وعدہ کہ آخرالامر فتح و کامرانی حق کے لیے مقدّر ہے، بالکل سچا ہے۔ ایسا ہوکر رہے گا۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ۝ (۳۰/۶۰)

(اے پیغمبرؐ! اپنے مشن کی انجام دہی میں استقلال سے جمے رہو۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ کا وعدہ کہ آخر تم ہی کامیاب ہوگے) سچا ہے (اور خیال رکھو! ایسی کوئی بات سرزد نہ ہونے پائے کہ) جو لوگ ایمان و یقین کی دولت سے محروم ہیں (یعنی منکرینِ دعوتِ حق) تمہیں ہلکا سمجھنے لگ جائیں!

تکالیف و صعوبات میں کس طرح مستقل مزاج اور ثابت قدم رہا کرتے ہیں؟ اس کے متعلق انبیائے سابقہ کے احوال و سوانح پر نگاہ ڈالو۔ ذرا دیکھو کہ حضرت داؤدؑ کے ساتھ کیا ہُوا تھا۔

اِصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ ۚ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ۝ (۳۸/۱۷)

(اے پیغمبرؐ!) جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں ان کی باتوں) پر استقلال و استقامت کو ہاتھ سے نہ دو۔ اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کرو جو (بڑی) طاقتوں والا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ وہ (تمام مشکلات و مصائب کے باوجود اپنے خدا کی طرف) بڑا ہی رجوع ہونے والا تھا۔

اس لیے ایسی عزیمت و استقامت دکھاؤ جیسی اُن داعیانِ حق و صداقت نے دکھائی تھی۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ۭ (۴۶/۳۵)

چنانچہ (اے پیغمبرؐ!) عزیمت و استقامت کا ثبوت دو! جیسا کہ دوسرے (بڑے بڑے) صاحبانِ عزیمت پیغمبروں نے استقامت کا ثبوت دیا ہے اور ان کے لیے (نتائجِ اعمال کے ظہور میں) جلدی نہ کرو (وہ اپنے مقرّرہ وقت پر ظاہر ہوکر رہیں گے)۔

یہ کفر و معصیت اور سرکشی و طغیان پر جمے ہوئے ہیں۔ تم احکامِ الٰہیہ پر پختگی سے جمے رہو۔ ان ہر دو اسالیبِ زندگی کے نتائج خود بخود سامنے آجائیں گے۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○ (۱۱/۱۱۲)

پس چاہیئے کہ جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے، تم، اور وہ جو اپنی غلط روش چھوڑ کر تمہارے ساتھ ہو لیے ہیں (اپنی راہ میں) استوار ہو جائیں اور دیکھو حد سے نہ بڑھو یقین کرو، تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔

زندگی کی جو واضح شاہراہ آپ کے سامنے کھول دی گئی ہے (یعنی وحی) اس پر سیدھے چلتے جاؤ اور پھر دیکھو کہ خدا کے فیصلے کیا ہوتے ہیں۔

وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ○ (۱۰/۱۰۹)

(اے پیغمبرؐ!) جو کچھ تم پر وحی کی جاتی ہے، اس پر چلتے رہو اور اپنی راہ میں جمے رہو، یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے اور وہ فیصلہ کرنے والوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے!

خدا کے وعدے سچے ہیں۔ اس کے قوانین اٹل ہیں۔ صرف اتنا ہے کہ عمل اور اس کے نتیجہ کے ظہور میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ اس مہلت کے زمانے کو اس طرح استقلال سے گزارنا چاہیئے جس طرح ایک کسان تخم ریزی کے بعد فصل کاٹنے تک کا عرصہ کامل سکون و اطمینان (لیکن اس کے ساتھ ہی انتہائی جدّ وجہد) کے ساتھ گزارتا ہے۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ج (۳۰/۶۰)

چنانچہ (اے پیغمبرؐ!) تم (اپنے مشن کی سرانجام دہی میں) جمے رہو اور یقین رکھو، اللہ کا وعدہ سچا ہے۔

اسی کا نام صبرِ جمیل ہے۔

فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ○ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۙ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ۗ (۷۰/۵-۷)

لہٰذا (اے پیغمبرؐ!) عمدہ استقلال کے ساتھ (اپنے مشن کی سرانجام دہی میں) جمے رہو۔ یہ واقعہ ہے کہ منکرینِ دعوت اس (مکافاتِ عمل) کو بہت دُور سمجھ رہے ہیں، حالانکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ بہت ہی قریب ہے۔

عبودیت میں پختگی

اس تمام زمانہ میں جبکہ معاندین اس انقلابی تحریک کو کچلنے کے لیے اتنا کچھ کر رہے تھے، نبی اکرمؐ نے اپنی جماعت کے لیے کیا پروگرام مرتب فرمایا تھا،

اس کی تفصیل آئندہ چل کر سامنے آئے گی۔ قرآن کریم نے اس تمام تفصیل کو ایک نکتہ میں سمیٹ کر بیان کر دیا ہے جو اس تمام تحریک کا مرکزِ ثقل اور اس تمام جدوجہد کا اصل الاصول ہے یعنی قوانین خداوندی کی اطاعت میں پختگی اختیار کرتے چلے جانا۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ۝ (۱۹/۶۵)

آسمان اور زمین کا پروردگار، اور ان سب کا پروردگار جو آسمان و زمین میں ہیں۔ سو (اے پیغمبرؐ!) اس کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) کی راہ میں جو کچھ پیش آئے مستقل مزاجی سے جھیلتا رہ۔

اس طرح سے یہ دونوں جماعتیں (حزب الشیطان اور حزب اللہ) اپنی اپنی جدوجہد میں متوازی جا رہی تھیں دونوں سرگرمِ عمل اور اپنی تگ و تاز اور سعی و کاوش کے نتیجہ کی منتظر۔

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ۭ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ۝ وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۝ (۱۱/۱۲۱-۱۲۲)

اور (اے پیغمبرؐ!) جو لوگ دعوتِ حق پر یقین نہیں رکھتے ان سے (صاف صاف) کہہ دے کہ تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے رہو، ہم اپنے پروگرام کے مطابق کام کر رہے ہیں اور (ظہورِ نتائج کا) انتظار کرو۔ یہ واقعہ ہے کہ ہم بھی انتظار کر رہے ہیں۔

دنیا میں طاغوتی قوتوں کی فریب کاریوں پر غور کیجئے۔ جب وہ دیکھتی ہیں کہ تخویف و ترہیب سے کام نہیں نکلتا، تو ترغیب و تحریص پر اُتر آتی ہیں۔ ابلیس نے آدم کو لالچ دے کر ہی جنت سے نکالا تھا۔ اس لیے کشمکش حق و باطل

طمع اور لالچ

میں بیم و خوف سے کہیں زیادہ لغزش کے امکانات طمع اور لالچ کی گھاٹیوں میں ہوتے ہیں۔ جہاں لوہے کی ہتھکڑیاں ٹوٹ جاتی ہیں وہاں سونے کی زنجیریں کام میں لائی جاتی ہیں۔ حق و صداقت کی آواز کا گلا گھونٹنے کے لیے طلائی دستانے فولادی پنجوں سے کہیں زیادہ محکم گیر ثابت ہوتے ہیں۔ آپ تاریخ کے صفحات پر نگاہ ڈالیے، کتنے اولوالعزم سینے تھے جو جاہ و دولت کے انسانیت کش زلزلہ سے، دھڑکنے والے دلوں کے مدفن بن کر رہ گئے اور کتنی درخشندہ آنکھیں تھیں جو ریاست و سیادت کی برقِ خاطف سے "روزنِ دیوارِ زنداں" ہو گئیں۔ قریش ستم رانیوں اور ایذا رسانیوں سے تھک گئے، تو انہوں نے بھی یہی حربہ استعمال کرنا چاہا۔ چنانچہ عتبہ بن ربیعہ، سردارانِ قریش کے نمائندہ کی حیثیت سے حضورؐ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ

"محمدؐ! کیا چاہتے ہو؟
مکہ کی ریاست!
بڑے سے بڑے گھرانے میں شادی!!
دولت کا انبار!!!
جو کچھ مانگو، تمہارے لیے حاضر ہے لیکن اپنے اس مسلک کو چھوڑ دو"

آپؐ نے عتبہ کی طرف دیکھا اور اس آواز سے جو جرأت و بیباکی کی ایک کوہ آسا دنیا اپنے اندر لیے ہوئے تھی، قرآنِ کریم کی چند آیتیں پڑھیں۔ عتبہ محوِ حیرت کھڑا سُن رہا تھا۔ جب واپس ہوا تو عتبہ کچھ اور تھا۔ اس نے قریش سے جاکر کہا کہ "محمدؐ جو کلام پیش کرتا ہے، خدا کی قسم وہ شاعری نہیں۔ وہ ماورائے شاعری کچھ اور ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ تم اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب آگیا تو یہ تمہاری ہی عزت ہے اور اگر ناکام رہا، تو عرب خود اسے فنا کر دے گا" لیکن قریش اس مشورہ کو کب ماننے والے تھے۔

قریش کی نگاہیں اس سے آگے جا نہیں سکتی تھیں۔ ان کے نزدیک زندگی کا انتہائی مقصد حصولِ مال و دولت اور جلبِ منصب و شہرت تھا۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکتے تھے کہ زندگی کا مقصد اس سے بلند بھی ہو سکتا ہے۔

کارلائل کی شہادت

کارلائل، انہیں اور ان جیسے اور معترضین کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

جذبۂ جاہ پرستی!

نہیں، ہرگز نہیں۔ اس سیاہ چمکیلی آنکھوں اور گہرے اور کشادہ قلب والے فرزندِ صحرا کے دل میں جو جذبات موجزن تھے، وہ جاہ پرستی سے بالکل الگ تھے۔

ایک خاموش روحِ عظیم!

وہ ان میں سے تھا جو صداقتِ مجسّم ہوتے ہیں۔ وہ جنہیں خود فطرت صداقت کے لیے منتخب کرتی ہے جبکہ ساری دنیا روایاتِ کہن اور نظری اعتقادات کی وادیوں میں گامزن نظر آتی ہے اور ان ہی فرسودہ روایات میں اپنا اطمینان پا لیتی ہے۔ اس قسم کا انسان اپنے آپ کو اس جھوٹے نقاب کے اطمینان میں چھپانا نہیں چاہتا۔ وہ اس تمام ہجوم میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے اور اس کی رفیق اس کی اپنی روح یا تلاشِ حقیقت کی تڑپ ہوتی ہے۔ ایسے شخص کا پیغام، قلبِ فطرت کی

گہرائیوں سے نکلی ہوئی آواز ہوتا ہے۔ لوگوں کو اس کے پیغام پر کان دھرنا چاہیئے، کسی اور آواز پر نہیں۔ اس کے مقابلہ میں اور سب کچھ یونہی ہوائی ہوتا ہے۔ (HEROES -- P.49)

مصالحت کی کوشش

تحریص و ترغیب کی ناکامی کے بعد آخری حربہ مصالحت و مفاہمت کی کوشش ہوتی ہے بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو مفاہمت کی کوشش بھی، تحریص و ترغیب ہی کی ایک شکل ہوتی ہے۔

مفاہمت (COMPROMISE) ایک ایسا ہم رنگِ زمیں دامِ فریب ہے، جسے بڑی سے بڑی عقابی نگاہ بھی بمشکل بھانپ سکے۔ بظاہر دریا کی پُرسکوت روانیوں کی طرح بالکل بے خطر اور جاذبِ قلب و نگاہ لیکن سطحِ آب سے نیچے ایسے ایسے مہیب اور پُرخطر نہنگ و اژدر، کہ بیکرانِ حق و صداقت کو پورے کا پورا نگل جائیں اور کانوں کان کسی کو خبر تک نہ ہو۔ ایک ایسا رنگین چشمہ کہ جس میں جھوٹ، سچ۔ اور سچ، جھوٹ بن کر دکھائی دے۔ ایک ایسا نگاہ فریب نقاب جس میں گرگِ درّندہ، برّۂ معصوم اور برّۂ معصوم، گرگِ درّندہ نظر آئے۔

بہت بڑا فریب

اس حقیقت کو ایک مثال سے سمجھئے۔ فرض کیجئے کہ آپ کہتے ہیں کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں اور آپ کا فریقِ مقابل کہتا ہے کہ نہیں، دو اور دو تین ہوتے ہیں۔ اس اختلاف پر آپ میں جھگڑا ہو جاتا ہے۔ اِدھر اُدھر کے لوگ بیچ بچاؤ کرنے کے لیے آجاتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ ہر شخص ان میں سے یہی کہے گا کہ صاحب! مصالحت کی تو یہی صورت ہوا کرتی ہے کہ کچھ تم گھٹو، کچھ یہ بڑھے اور اس طرح بین بین کوئی فیصلہ ہو جائے۔ اگر تم دونوں اپنی اپنی بات پر اڑے رہے، تو مصالحت کیسے ہو سکتی ہے؟ اب فرض کیجئے کہ آپ کا فریقِ مخالف نہایت "کشادہ ظرفی" کا ثبوت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ صاحب میں تو جھگڑا پسند نہیں کرتا۔ میں مانے لیتا ہوں کہ دو اور دو تین نہیں ساڑھے تین ہوتے ہیں۔ اگر آپ اس پر بھی نہیں مانتے اور یہی کہے جاتے ہیں کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں، تو ساری دنیا آپ کے خلاف ہو جاتی ہے کہ دیکھئے صاحب! اُس کی "شرافت" ملاحظہ ہو کہ اس نے ہمارا کہنا نہیں ٹالا اور جھگڑا نپٹانے کی خاطر اتنا آگے بڑھ گیا اور اِس کی "ضد" دیکھئے کہ یہ اپنے مقام سے ذرا بھی نیچے نہیں اُترتا۔ بھلا اس قسم کی ہٹ دھرمی سے دنیا میں کام چل سکتا ہے؟

اور اگر آپ اسے تسلیم کر لیتے ہیں کہ دو اور دو ساڑھے تین ہوتے ہیں تو کہئے! اس میں فتح کس کی ہوئی؟ حق کی یا باطل کی؟

یہ ہے وہ مہیب فریب جسے معرکۂ حق و باطل میں مصالحت (COMPROMISE) کہا جاتا ہے۔

حق کسے کہتے ہیں

حق کہتے ہی اسے ہیں کہ جو اپنی جگہ پر اٹل ہو، اَنمٹ ہو۔ دو اور دو چار کی طرح، کوہ آسا محکم کھڑا ہو۔ اگر یہ اپنے مقام سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر سرک جائے، تو باطل ہو جائے۔ برعکس اس کے، اگر باطل اپنے مقام سے سَو قدم بھی پیچھے ہٹ جائے تو بھی اپنے مقام پر قائم ہے۔ پیچھے تو وہ ہٹے جو حد سے بڑھا ہُوا ہو۔ جو پہلے ہی آخری حد پر کھڑا ہو وہ پیچھے کیسے ہٹ جائے۔ حق اپنے مقام سے آگے نہیں بڑھا ہوتا اس لیے وہ پیچھے ہٹ نہیں سکتا۔ قیمت وہ کم کرے جو زیادہ دام مانگ رہا ہو۔ جو پہلے ہی پوری قیمت مانگ رہا ہو وہ کم کس طرح کر دے؟ حق و باطل کی کشمکش میں، باطل یہی پُر فریب حربہ استعمال کرتا ہے اور ساری رائے عامہ کو یہ کہہ کر برسرِ حق فریق کے خلاف کر دیتا ہے کہ دیکھ لو! یہ شخص کس قدر ضدّی ہے کہ تم میں سے کسی کی بات مانتا ہی نہیں!

لیکن سوچئے کہ اگر حق (TRUTH) لوگوں کے جذبات و آرار کے تابع ہو کر اپنے مقام سے ذرا بھی اِدھر اُدھر ہو جائے تو اس کائنات کا کیا حشر ہو؟

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ
بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ؕ (۲۳/۷۱)

اور اگر ایسا ہوتا کہ حق ان کی خواہشوں کی پیروی کرتا، تو یقیناً آسمان و زمین اور وہ سب جو ان میں ہے ایک قلم درہم برہم ہو جاتا۔ (لیکن ان کی اس جہالت پر ذرا غور کرو) ہم انہیں شرف اور عزّت کا مقام عطا کرنا چاہتے ہیں اور یہ اپنے شرف اور عزّت سے اعراض برت رہے ہیں۔

اگر یہ سورج لوگوں کے کہنے سے اپنی رفتار میں ایک ثانیہ کی بھی کمی کرے، اگر زمین اپنی جذب و کشش میں ذرہ برابر بھی فرق پیدا کر لے، اگر ستارے اپنے راستوں میں ایک انچ کا بھی ردّ و بدل کر لیں تو اس کا انجام سمجھ لیجئے کہ کیا ہو؟ یہ عالمِ آفاق کے مظاہر ہیں جنہیں ہماری محسوسات کی خوگر نگاہیں بغیر دقت نِبھا لیتی ہیں۔ لیکن عالمِ انفس کی کائنات بھی تو اسی طرح حق پر مبنی ہے اور اس کا دار و مدار بھی اسی قسم کے اٹل حقائق پر ہے۔ تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اگر سورج، حق کی راہ سے اِدھر اُدھر ہٹ جائے تو فساد برپا ہو جائے، لیکن اگر انسانیت جادۂ حق و صداقت سے منحرف ہو جائے تو عالمِ انسانیت کا کچھ بھی نہ بگڑے۔ یہ نگاہ کی بھول اور دل کا فریب ہے۔ اس سے عالمِ انسانیت میں اس سے بھی کہیں زیادہ فساد برپا ہو جاتا ہے جتنا

عالمِ آفاق میں ہوتا ہے لیکن ہماری سر کی آنکھیں ان مستور حقیقتوں کو دیکھ نہیں سکتیں اور دل کی آنکھیں، نورِ بصیرت کے فقدان سے اندھی ہو چکی ہوتی ہیں۔

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ (۲۲/۴۶)

حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی اندھے پن میں پڑتا ہے تو آنکھیں اندھی نہیں ہو جایا کرتیں (جو سروں میں ہیں)، بلکہ دل اندھے ہو جایا کرتے ہیں جو سینوں کے اندر پوشیدہ ہیں۔

حق و صداقت کی تحریکِ انقلاب میں تلبیسِ حق و باطل، ایک کھُلا ہُوا شرک ہے اور اس توحید کے یکسر منافی جو اس تحریک کی بنیاد و اساس ہوتی ہے۔ اس لیے ایک داعیٔ حق و صداقت کے سامنے یہ حقیقت ہر وقت بے نقاب رہتی ہے کہ

باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے،
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!!

باطل سے مصالحت کیسی

قریش نے بھی بالآخر اسی قسم کی مصالحت کی کوششیں شروع کیں۔ حضورؐ کو اور آپؐ کی وساطت سے جماعتِ مسلمین کو ان کوششوں کی تباہ کاری اور ہلاکت انگیزی سے آگاہ کیا گیا۔ سورۂ قلم میں ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝ (۶۸/۷)

(اے پیغمبرؐ!) یہ واقعہ ہے کہ تیرا پروردگار اس کا زیادہ علم رکھتا ہے کہ کون (سچائی کے) راستہ سے بھٹک گیا ہے اور کون صحیح راستہ پر چل رہا ہے۔

اس لیے

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝ (۶۸/۸)

لہٰذا تم ان لوگوں کی ہرگز پیروی نہ کرنا جو (حقیقت کو) جھٹلانے والے ہیں۔

یہ لوگ چاہتے ہیں کہ کچھ یہ جُھک جائیں کچھ تم جُھک جاؤ۔

وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝ (۶۸/۹)

ان کی یہ خواہش ہے کہ اگر تم کچھ مداہنت سے کام لینے لگو تو وہ بھی مداہنت سے کام لینے لگیں۔

لیکن انہیں معلوم نہیں کہ اس ذرا سے جھکاؤ سے کائنات کی دیواریں ہل جاتی ہیں۔ اس لیے

وَ لَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝ (۶۸/۱۰)

اور (اے پیغمبرؐ!) یاد رکھ کسی پست فطرت اور بہت زیادہ قسمیں کھانے والے کی پیروی نہ کرنا۔

تم اپنے مقامِ صدق و عدل پر جمے رہو اور ان کے امیال و عواطف کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو۔

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ؕ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝ (۴۲/۱۵)

پس (اے پیغمبرؐ!) اسی (پیغامِ الٰہی) کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا رہ اور جیسا کہ تجھے حکم دیا گیا ہے اس پر پختگی کے ساتھ جم جا اور لوگوں کے خیالات کی پیروی نہ کر اور (صاف صاف) کہہ دے کہ میرے خدا نے جو کتاب نازل فرمائی ہے میں اس پر یقین رکھتا ہوں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ (اس کتابِ الٰہی کے مطابق) تمہارے درمیان عدل (و مساوات) کا نظام قائم کر دوں۔ اللہ ہی ہمارا اور تمہارا سب کا پروردگار ہے (کیونکہ عزت و دولت سب اس کے قانون کے ساتھ وابستہ ہے) ہمارے اعمال ہمارے کام آئینگے اور تمہارے اعمال تمہارے۔ اس بارہ میں ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی حجت بازی کی ضرورت ہی نہیں (جب مکافاتِ عمل کا وقت آئے گا تو) خدا ہم سب کو ایک دوسرے کے بالمقابل لا کھڑا کریگا۔ اور (بالآخر) سب کو نتائج اعمال کے لیے اس کے قانونِ مکافات کی طرف لوٹنا ہے۔ (اُس وقت حقیقتِ حال واضح طور پر نتائج کی شکل میں سامنے آجائے گی)۔

حق پر استقامت گزینی ہی برسرِ حق ہونے کی دلیل ہے۔ اس لیے باطل کی اطاعت کیسی؟

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ۝ (۷۶/۲۴)

لہٰذا (اے پیغمبرؐ!) اپنے پروردگار کے حکم پر استقلال و استقامت کے ساتھ جمے رہو اور ان میں کسی نافرمان یا سچائی کا انکار کرنے والے کی پیروی نہ کرو!

اطاعت تو ایک طرف، ان کی طرف ذرا سا جھکو بھی نہیں کہ اس میلان میں بھی ملابستِ حق و باطل کی جھلک پائی جاتی ہے جس کا نتیجہ ہلاکت ہے۔

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۝ (۱۱۳/۱۱)

اور ایسا بھی نہ کرنا کہ ظالموں کی طرف جھک پڑو اور (قریب ہونے کی وجہ سے) آگ تمہیں بھی چھو جائے۔ اللہ کے سوا تمہارا کوئی رفیق نہیں۔ پھر اگر اس سے بچھڑے تو کہیں مدد نہ پاؤگے!

ان سے برملا کہہ دو کہ اگر تمہیں اس نظامِ زندگی کے برسرِ حق ہونے میں شبہ ہے جسے میں پیش کر رہا ہوں، تو یہ مت سمجھو کہ تمہاری خاطر میں کوئی اور نظام اختیار کر لوں گا۔

ایں خیال است و محال است و جنوں

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۚ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۙ (۱۰۴/۱۰)

(اے پیغمبرؐ!) تم کہہ دو! "اے لوگو! اگر تم میرے (پیش کردہ) نظامِ زندگی کے بارے میں کسی طرح کے شبہ میں ہو، تو میں بتلائے دیتا ہوں کہ تمہارے اس شک و شبہ کی وجہ سے میں ان کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرنے سے رہا جن کی تم خدا کے سوا عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کیے ہوئے ہو۔ بلکہ میں تو اسی اللہ کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کروں گا جس کے قبضۂ قدرت میں یہ بھی ہے کہ وہ تم پر موت طاری کر دے (یعنی جو مالکِ موت و حیات ہے)، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مومنوں کے زمرہ میں سے ہوں۔

میں تو تمام دُنیا سے کٹ کر اسی ایک راہ پر چلتا جاؤں گا۔

وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (۱۰۵/۱۰)

اور نیز مجھے کہا گیا ہے کہ ہر طرف سے ہٹ کر اپنا رُخ اللہ کے دین کی طرف کر لے اور اس کی اطاعت میں کسی اور کا قانون قطعاً شامل نہ کرو۔

"مصالحت" کی طرف آمادگی کا جذبۂ محرکہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس سے تم ان کی ایذاء رسانی سے محفوظ ہو جاؤ گے۔ سو ان کی اس تکلیف دہی کی قطعاً پرواہ نہ کرو۔

وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ

عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝ (۳۳/۴۸)

اور (اے پیغمبر!) منکرینِ حق اور منافقین کی اطاعت نہ کرو۔ ان کی ایذا دہی (کے خیال کو) چھوڑ دو اور خدا کے قانون کی محکمیت پر بھروسا رکھو۔ اس کی نگرانی اور حفاظت (تمہارے لئے) کافی ہے۔

ان کی تمام شرارتوں اور سازشوں سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو قوانینِ خداوندی کے حصارِ عافیت میں لے آؤ۔

وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۴۱/۳۶)

اور اگر کبھی کوئی غلط خیال یا ان لوگوں کی شرارتوں کا احساس تمہارے لیے وجۂ پریشانی ہو، تو اس سے بچنے کا طریق یہ ہے کہ تم اور زیادہ قوانینِ خداوندی کے ساتھ چپک جاؤ اور یوں اُس خدا کی پناہ میں آجاؤ جو سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔

جو اللہ کی محکومیت اختیار کرلیتا ہے قوانینِ خداوندی کی حفاظت اس کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ؕ وَ يُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ (۳۹/۳۶)

(اے پیغمبرؐ!) کیا خدا اپنے بندہ کے لیے کافی نہیں؟ (ضرور کافی ہے) اور یہ لوگ تمہیں غیر خداوندی قوتوں سے ڈراتے ہیں (حالانکہ تمام طاقتوں کے سرچشموں کا مالک صرف خدا ہی ہے)۔

سب سے بڑا سہارا

باطل اپنی تقویت اور حفاظت کے لیے ہر قسم کے جائز و ناجائز حربے اختیار کرلیتا ہے لیکن جو جماعت حق و صداقت کے نظام کے قیام کے لیے اُٹھے، وہ ان حربوں کو اختیار نہیں کرسکتی۔ اس کے لیے جادۂ حق و صداقت ہی سب سے بڑا قابلِ اعتماد سہارا ہوتا ہے۔ وہ اپنی تقویت کے لیے کوئی غلط اقدام کر ہی نہیں سکتی۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝ (۹/۱۲۹)

(اے پیغمبرؐ!) اگر اس پر بھی یہ سرتابی کریں، تو ان سے کہہ دو "میرے لیے اللہ کا سہارا بس

کرتا ہے۔ کوئی معبود (مالک و آقا جس کی اطاعت کی جائے) نہیں ہے مگر صرف اسی کی ذات۔
میں نے اس پر بھروسا کیا ہے۔ جملہ کائنات کا مرکزی کنٹرول اس کے ہاتھ میں ہے۔
اس لیے ان کی مخالفت سے مت گھبراؤ۔ ہم تمہاری حفاظت سے بے خبر نہیں۔ تم تو ہر وقت ہماری آنکھوں کے سامنے ہو۔

وَاصۡبِرۡ لِحُكۡمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعۡيُنِنَا وَ سَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ حِيۡنَ تَقُوۡمُ ۙ﴿۵۲ / ۴۸﴾

اور (اے پیغمبرؐ!) اپنے پروردگار کے حکم پر (استقامت و استقلال کے ساتھ) جمے رہو اور (لوگوں کی مخالفت کی مطلق پرواہ نہ کرو) یہ واقعہ ہے کہ تم (ہر وقت) ہماری آنکھوں کے سامنے ہو اور جب بھی اٹھو ربوبیّتِ خداوندی کے پروگرام کو وجۂ حمد و ستائش بنانے کے لیے سرگرمِ عمل رہو۔

اور یہ تم خوب جانتے ہو کہ "یہ آنکھیں" وہ ہیں جن میں نہ کبھی نیند آتی ہے اور نہ اونگھ لَا تَاۡخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوۡمٌ (۲/۲۵۵) اس لیے ان لوگوں کی مخالفانہ روش اور معاندانہ حیل کی کچھ پرواہ نہ کرو اور حق کی آواز کو بلند سے بلند تر کرتے جاؤ کہ باطلانہ روباہ بازی محض بھبکی ہوتی ہے۔ اس کی اصلیت کچھ نہیں ہوتی۔ اِنَّ الۡبَاطِلَ كَانَ زَهُوۡقًا۔ وَ الۡعَاقِبَةُ لِلۡمُتَّقِيۡنَ۔

ضیقِ صدر

ذرا فاران کی ان وادیوں سے تجلّی گاہِ طوٗر کی طرف چلیے۔ جب حضرت موسیٰؑ کو حکم ملا کہ فرعون کی طرف جاؤ اور بنی اسرائیل کو اس کے ظلم و استبداد سے نجات دلاؤ، تو یہ مہم اس قدر صبر آزما تھی کہ آپؑ نے عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيۡۤ اَخَافُ اَنۡ يُّكَذِّبُوۡنِ ؕ وَ يَضِيۡقُ صَدۡرِيۡ وَلَا يَنۡطَلِقُ لِسَانِيۡ فَاَرۡسِلۡ اِلٰى هٰرُوۡنَ ﴿۲۶ / ۱۲-۱۳﴾

(موسیٰؑ نے کہا "اے میرے پروردگار! مجھے ڈر ہے کہ وہ لوگ میری تکذیب کریں گے اور (اس وجہ سے مجھے دل تنگی ہوگی اور میری زبان بھی نہ چل سکے گی۔ لہٰذا (میری مدد کے لیے) ہارون کی طرف اپنا پیغام بھیج دے۔

آنے والے خطرات اور فریقِ مخالف کی بے اصول سرشت کے تصوّر سے حضرت موسیٰؑ کے قلب پر جو کیفیت طاری ہوئی اسے "ضیقِ صدر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان خطرات کے پیشِ نظر انہوں نے بحضور ربّ العزت درخواست پیش کی کہ:

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ۙ وَ يَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ۙ (۲۰/۲۵-۲۶)

(موسیٰؑ نے) کہا، اے پروردگار! میرا سینہ کھول دے اور میری مہم کو میرے لیے آسان کر دے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ "ضیقِ صدر" اور "شرحِ صدر" کا مفہوم کیا ہے؟

غور کیجئے کہ ایک رسول کے سامنے کس قدر عظیم الشّان مہم ہوتی ہے جسے سر کرنے کے لیے اسے قسم قسم کی صبر آزما اور جگر گداز وادیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کی دعوتِ انقلاب ہر طاغوتی مستبد قوت کے خلاف اعلانِ جنگ ہوتی ہے اور وہ تنہا ان سب کی مخالفت کا مقابلہ کرتا ہے۔ پھر اس کشمکش میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ فریقِ مخالف ہر قسم کی بے اصولی پر اُتر آتا ہے۔ وہ بد دیانتی اور فریب کاری کی روباہ بازیوں اور دنایت و کمینگی کے سوقیانہ حملوں تک سے بھی احتراز نہیں کرتا۔ اس کے برعکس، یہ داعیٔ حق و صداقت ان حملوں کے مقابلہ میں اصول و آئین پرستی کو ہاتھ سے نہیں چھوڑ سکتا اور ان کی طرف سے مکر و فریب کے کسی میدان میں کبھی اپنے مقامِ راستبازی سے نیچے نہیں اُترتا۔ ان کی یہ حرکات یقیناً ایک شریف النفس انسان پر گراں گزرتی ہیں۔ یہی تھی وہ کیفیت جس کے پیشِ نظر نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ:

وَ اصْبِرْ وَ مَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَ لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّ الَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ۝ (۱۶/۱۲۷-۱۲۸)، نیز (۲۷/۷۰ ; ۱۵/۹۷ ; ۱۱/۱۲)

اے رسولؐ! تم ہمت اور استقامت سے کام لو۔ اور یہ چیز تمہیں قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے حاصل ہو گی۔ تم ان لوگوں کے غم میں، جو دیدہ و دانستہ غلط راستے پر چل رہے ہیں اور ہزار سمجھانے کے باوجود، اپنی روش بدلنے پر تیار نہیں، اپنی جان نہ گھلاؤ، نہ ہی ان کی مخالفانہ تدبیروں سے اپنے دل میں تنگی پیدا کرو۔ یاد رکھو! قوانینِ خداوندی کی تائید ان لوگوں کے شاملِ حال ہوتی ہے جو ان قوانین کی نگہداشت کرتے ہیں اور حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

حزن و ملال کی ان تنگناؤں سے مردانہ وار گزر جانے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کی نگاہوں میں وسعت؛

اور شرحِ صدر حوصلہ میں بلندی اور ہمت میں رفعت پیدا ہو۔ اسی کا نام شرحِ صدر یعنی سینہ کی کشادہ ہے۔ ایسی کشادہ کہ دنیا بھر کے مصائب و آلام اور خطرات و خدشات اس کے اندر سما جائیں اور اس پر ان کا کچھ بھی اثر نہ ہو۔ یہی تھی اس داعیٔ انقلاب کی عظیم خصوصیت جس کی یاد اُسے اِن الفاظ میں دلائی گئی۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۙ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۙ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۙ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ؕ (۹۴/۱-۴)

(اے پیغمبرؐ!) کیا ہم نے تمہیں کشادِ قلب عطا نہیں کر دیا اور تم سے تمہارا وہ (گرانبار) بوجھ دور نہیں کر دیا جو تمہاری کمر توڑے ڈالتا تھا اور کیا ہم نے تمہارا آوازہ بلند نہیں کر دیا۔

ذمہ داریوں کا وہ بوجھ جس سے آپؐ کی کمر ٹوٹ رہی تھی، اُسے عزم و استقلال کے بازوؤں سے اُٹھا کر دور پھینک دیا اور اس کا فطری نتیجہ یہ نکلا کہ تمام مخالفین و معاندین سرنگوں ہو گئے اور کلمۃ الحق جس کے اعلاء (بلند کرنے) کے لیے آپؐ اُٹھے تھے ایسا بلند ہو کر رہا كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۙ جو ضیق اور تنگی کے صبر آزما مراحل میں ہمت نہیں ہارتا، وسعت اور کشادہ اسی کے حصہ میں آتی ہے۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے۔

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۙ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ؕ (۹۴/۵-۶)

کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی ہے۔ بلاشبہ تنگی کے ساتھ فراخی ہے!

اور پھر فتح و کامرانی کے بعد سہل انگاری اور تن آسانی نہیں۔ اس لیے کہ

"شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر"

تو ان لوگوں کا مسلک ہے جو زندگی کے بلند مقاصد اپنے سامنے نہیں رکھتے۔ لہٰذا،

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۙ (۹۴/۷)

لہٰذا (اے پیغمبرؐ!) جب تم ایک مہم سے فارغ ہو جاؤ تو (دوسری مہم کے لیے) محنت و مشقت کرو۔

وہ محکم مقصدِ زندگی کیا ہے جس کے لیے یہ سب کچھ کرنا ہے

وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ؕ (۹۴/۸)

اور اپنے نشوونما دینے والے کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کی طرف اور زیادہ توجہ دو۔

ذمہ داری کا بھی پاس اور مہم پیشِ نظر کی گراں باری کا بھی احساس تھا جو آپؐ کو راتوں کو سونے نہیں دیتا تھا۔ آپؐ دن بھر اس تگ و تاز اور جدّ وجہد میں مصروفِ عمل رہتے اور رات کو جب سارا عالم سو

رات کی تنہائیوں میں

جاتا، تو آپؐ اپنے پروگرام کا نیا ورق اُلٹتے۔ رات کی تنہائیوں میں آپؐ کیا کرتے؟ غور و فکر، سوچ بچار، اپنی مہم کی کامیابی کی تدابیر و تجاویز اور ان سب سے بڑھ کر تَبَتَّلْ اِلَیْہِ ۔ ۷۳/۸۔ پہلی سب چیزیں تو ہماری سمجھ میں آسکتی ہیں لیکن آخری چیز بمشکل سمجھ میں آسکے گی اس لیے کہ آج مادیت کی فضا ساری دنیا کو اس طرح گھیرے ہوئے ہے کہ جو لوگ بظاہر خدا پر ایمان کے مدّعی ہیں اُن کی سمجھ میں بھی یہ بات بآسانی نہیں آتی کہ معاملات کی درستی اور کامیابی کے سلسلہ میں "خدا" کہاں آتا ہے؟ لیکن جو لوگ سطح سے ذرا نیچے اُتر کر دیکھتے ہیں، انہیں اس بات کے سمجھنے میں دقّت نہیں ہو سکتی کہ جو کوشش قوانینِ خداوندی کے مطابق کی جائے اس کا نتیجہ کس طرح انسان کی توقعات سے بھی بڑھ کر مرتّب ہوتا ہے۔ اسی کا نام تَبَتَّلْ، انابت اور رجعت الی اللہ ہے۔

رسولِ اکرمؐ کی حالت یہ تھی کہ آپؐ دن بھر، اپنے رفقاءؓ کے ساتھ، پیشِ نظر معاملات کے حل کرنے میں مصروفِ تگ و تاز رہتے اور رات کو آنے والے پروگرام کے سلسلہ میں غور و فکر کرتے اور یہ دیکھتے کہ قوانینِ خداوندی کے تقاضے کیا ہیں اور ان کی روشنی میں، مہمّاتِ اُمور کو کس طرح حل کیا جا سکتا ہے۔ یہ کچھ حضورؐ اس جذب و انہماک سے کرتے کہ آرام کرنے کا خیال بھی نہ رہتا۔ اس لیے آپؐ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی گئی اور کہا

کچھ سونا بھی چاہیئے

گیا کہ اس عظیم الشّان مہم کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ رات کا کچھ حصّہ سونے کے لیے بھی رکھا جائے۔

يَاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ .... (۷۳/۱)

اے وہ کہ جس کے ذمّے پورے قافلہ کی تیاری کا کام ہے۔

قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ نِّصْفَهٗ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝ (۷۳/۲-۳)

رات کو اٹھا کرو مگر تھوڑا سا حصّہ (سونے کے لیے بھی رکھو۔ یعنی) رات کے آدھے حصّہ میں اٹھا کرو بلکہ تھوڑا سا اس میں سے بھی کچھ کم کر دیا کرو۔۔۔!

اور اس قیام میں نہایت غور و تدبّر سے قرآن کا مطالعہ کرو۔

اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝ (۷۳/۴)

یا اس پر کچھ اضافہ کر لیا کرو) اور اس قیام میں، آہستہ آہستہ (تدبر و تفکر کے ساتھ) قرآن پر غور و تدبر کیا کرو۔

شب بیداری میں یہ کمی اس لیے کہ کام اتنا ہی نہیں جتنا تمہارے سامنے ہے۔ ابھی تو بڑا راستہ باقی ہے۔

إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ۝ (۷۳/۵)

یہ واقعہ ہے کہ ہم جلد ہی تم پر ایک بوجھل بات ڈالیں گے۔

ہم جانتے ہیں کہ رات کی سکوت افزا فضا میں یکسوئی اور دل جمعی کا پورا پورا سامان ہوتا ہے۔ لیکن تمہارے لیے دن میں بھی تو کچھ کم کام نہیں ہوتا۔

إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ۝ (۷۳/۷)

یہ بھی واقعہ ہے کہ تمہارے لیے دن کے اوقات میں بھی طویل مشاغل ہوتے ہیں۔

ہم تمہاری بے تابیِ تمنا سے واقف ہیں لیکن تمہاری مہم بڑی صبر طلب واقع ہوئی ہے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ اس مہم کو سامنے رکھو اور ہر طرف سے یکسوئی اختیار کر کے قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگی پیدا کرتے جاؤ۔ منزل کھنچ کر قریب آجائے گی۔ باقی رہے یہ مخالفین، سو ان کی باتوں کی پرواہ نہ کرو اور حسن کارانہ انداز سے ان کی لغویتوں سے کنارہ کش ہو جاؤ!

وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا ۝ (۷۳/۱۰)

اور جو کچھ وہ (ایذا رسانی کی باتیں) کہتے ہیں، ان پر استقامت سے کام لو اور ان سے حسن کارانہ انداز سے کنارہ کش ہو جاؤ۔

اور یہ جو مال و دولت کے گھمنڈ پر یوں حق کی مخالفت کر رہے ہیں، انہیں ہمارے قانونِ مجازات کے حوالے کر دو۔ اس قانون میں مہلت کا وقفہ ضرور ہوتا ہے۔

وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا ۝ (۷۳/۱۱)

اور مجھے اور ان حق کے جھٹلانے والے دولت مندوں کو چھوڑ دو (میں آپ ان سے نمٹ لوں گا)، البتہ تھوڑی سی انہیں مہلت دو (کہ ہمارے قانون کے مطابق عمل کو نتیجہ تک پہنچنے کا وقفہ مل جائے)۔

آپ ایسا کیوں کرتے تھے؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی اکرم یہ تمام صعوبات و تکالیف برداشت کیوں کر رہے تھے؟ وہ دن اور رات اسی ایک فکر

میں غلطاں و پیچاں کیوں رہتے تھے؟ یہ تمام تگ و تاز کس لیے تھی؟ اس جدّوجہد سے مقصد کیا تھا؟

اس سوال کا آسان جواب یہ ہے کہ یہ سب کچھ اپنے مشن کی کامیابی کے لیے تھا! لیکن یہ جواب بجائے خویش ایک سوال ہے کہ اس مشن کی کامیابی میں آپؐ کی غرض کیا تھی؟

آپؐ کی غرض کیا تھی؟ یہ ہے وہ سوال جو تیرہ سو برس میں ہر اس شخص کے سامنے آیا جسے تاریخ عالم کے اس حصّے سے کچھ بھی دل چسپی پیدا ہوئی اور اس کا جواب مختلف ذہنیتوں کی طرف سے مختلف ملا۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر عمل کا کوئی نہ کوئی جذبۂ محرّکہ ہوتا ہے۔ یہی جذبہ اس عمل کی غرض کہلاتا ہے۔ "من و تو" کے امتیازات میں گھرا ہُوا انسان، کسی عمل کے لیے ذاتی غرض سے آگے کسی جذبۂ محرّکہ کا تصور ہی نہیں کرسکتا۔ اس لیے ہر عمل کی بنیاد و اساس کے لیے اس کی نگاہ کسی ذاتی غرض کی تلاش میں نکلتی ہے۔ یورپ کے مؤرخین بھی جب تاریخِ عالم کے اس انقلابی دور پر پہنچتے ہیں تو ان کی نگاہیں کسی "ذاتی غرض" کے تجسّس میں چاروں طرف پھیل جاتی ہیں اور جب وہ اپنی اس سعی و کاوش میں کسی یقینی نتیجے پر نہیں پہنچتے (اس لیے کہ جس مفروضہ کی بنیاد پر وہ یہ عمارت قائم کرنا چاہتے ہیں، وہ بنیاد ہی غلط ہوتی ہے) تو پھر اپنے ذہن سے اس قسم کے اغراض و مقاصد تراشتے ہیں جن پر علم ہنسے اور عقل ماتم کرے۔

یورپ کے متعصّب مؤرخین

ان کا متشدّد طبقہ، جو ان وقائع و حوادث کا تجزیہ مؤرخانہ دیانت سے نہیں بلکہ متعصبانہ دنائت سے کرتا ہے، اس تمام سعی و کاوش اور جدّوجہد کو ہوس رانی و کامجوئی کے پست مقاصد پر محمول کرتا ہے۔ چونکہ زاویۂ نگاہ کے بدل جانے سے دنیا کی ہر شے اپنے اصلی مقام سے ہٹی ہوئی نظر آتی ہے اور رنگین چشمے کا تقاضا ہے کہ کوئی چیز اپنے حقیقی رنگ میں دکھائی نہ دے، اس لیے ان مؤرخین کی معاندانہ احوَل چشمی انہیں کبھی صحیح نتائج تک پہنچنے نہیں دیتی۔ علمی دیانت کے بازار میں یہ جنس کاسد اس قابل ہی نہیں کہ اسے درخورِ اعتنا سمجھا جائے۔

غیر متعصب مستشرقین

اس سے نیچے اُتر کر مستشرقین مغرب کا ایک دُوسرا طبقہ آتا ہے جو اس سوال کے حل کی تلاش دیانت دارانہ کرنا چاہتا ہے لیکن چونکہ وہ بھی مقامِ رسالت سے آشنا نہیں ہوتا اس لیے وہ نبئ اکرمؐ کو زیادہ سے زیادہ ایک قومی ریفارمر کی حیثیت دیتا ہے۔ اس سے آگے اس کی نگاہ بھی نہیں جاسکتی۔ ان کی تحقیق کا ماحصل یہ ہوتا ہے کہ عربوں کی زبوں حالی سے متاثر ہو کر آپؐ نے ان کی بکھری ہوئی قوتوں کو، جو باہمی خانہ جنگی میں ایک دوسرے کی گردن

زنی میں ضائع ہو جاتی تھیں، ایک نقطہ پر مرکوز کیا اور اس طرح بیرونی قوتوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کر کے ان صحرا نشینوں کو وارثِ تخت و تاج بنا دیا اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی معاشرتی برائیوں کی بھی اصلاح کر دی جن کی وجہ سے ان کی قوت رائیگاں جا رہی تھی۔

مذہب پرست طبقہ

دوسری طرف ہمارا مذہب پرست طبقہ ہے۔ وہ بھی حقیقت کو بالعموم جس انداز سے پیش کرتا ہے اس سے نہ صرف یہ کہ حقیقت کماحقہٗ سامنے نہیں آتی بلکہ ان کے بیان سے جو تصویر ذہن میں مرتسم ہوتی ہے اس سے رسول کا صحیح مقام نگاہوں کے سامنے نہیں آتا۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ آپؐ مامور من اللہ تھے۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ آپؐ کو حکم دیتا آپؐ اس کی تعمیل کرتے تھے۔ اس لیے آپؐ کے تمام اعمال بے غرض اور بے لوث تھے۔ بات تو یہ ٹھیک ہے لیکن اسے جس انداز سے بیان کیا جاتا ہے اس سے انسان کا ذہن اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی "اپنے" مقصد کے لیے آپؐ کو منتخب کیا اور اس مقصد کے حصول کے لیے مسلسل و متواتر احکامات و ہدایات دیتا رہا۔ آپؐ ان احکام کی بلا چون و چرا تعمیل کرتے رہے اور اس تعمیلِ احکام میں جس قدر تکالیف سامنے آتی رہیں انہیں برداشت کرتے رہے۔ اس لیے کہ ایک رسول کے لیے خدا کے احکام کی اطاعت ضروری ہوتی ہے اس سے اُسے مفر نہیں ہوتا نہ ہی یہ غرض کہ خدا اس سے یہ کچھ کیوں کرا رہا ہے۔

غور کیجیے کہ اس تصور سے کس قسم کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے؟ ایسا ہی گویا ایک بادشاہ اپنی کسی اسکیم کو بروئے کار لانے کے لیے، اپنے قصرِ معلّٰی میں بیٹھا، اپنے غلاموں اور ملازموں کو مختلف احکام دے رہا ہے اور وہ سب ان احکامات کی تعمیل میں کمربستہ سرگرمِ عمل ہیں۔ اس تعمیلِ احکام اور اطاعتِ ارشاد میں ان کے اختیار و ارادہ کو کوئی دخل نہیں۔ چونکہ یہ اس بادشاہ کے غلام اور فرمانبردار ملازم ہیں اس لیے انہیں ان حکمات کی تعمیل کرنی ہی ہے۔ احکام کی اطاعت ان کا فریضہ ہے یعنی یہ ایک مشین کے پرزے ہیں جو ایک انجنیئر کے اشاروں کے ماتحت صبح سے شام تک سرگرداں رہتے ہیں۔ اس سے انہیں غرض نہیں کہ ان کی اس حرکتِ پیہم اور سعیٔ مسلسل کا ماحصل کیا ہے۔ ان سے یہ کچھ کیوں کرایا جا رہا ہے؟ مذہب کی اصطلاح میں اس کا نام رکھا جاتا ہے للّٰہیت! للّٰہیت کے اسی مفہوم کا اثر ہے کہ آپ مذہب پرست طبقہ (کے عوام ہی نہیں بلکہ خواص تک) سے پوچھئے کہ وہ مذہبی احکام کی تعمیل کیوں کرتے ہیں؟ تو ان کے پاس اس کا جواب اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوگا کہ یہ اللہ کا حکم ہے جس کی اطاعت فرض ہے۔ نتیجہ اس کا

یہ کہ ان کے تمام اعمال میکانکی (MECHANICAL) حرکات بن کر رہ جاتے ہیں اور داخلی یا خارجی دنیا میں کوئی زندگی بخش نتیجہ مرتّب نہیں کرتے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ خدا اور رسول کا صحیح قرآنی تصوّر ہمارے سامنے ہو۔ پھر معلوم ہوگا کہ احکاماتِ خداوندی سے مفہوم کیا ہے۔ رسول ان کی کس طرح اطاعت کرتا ہے۔ مامور من اللہ کسے کہتے ہیں۔ اس کا نصبُ العینِ حیات کیا ہوتا ہے اور وہ اس نصبُ العین کے حصول میں کیوں اپنی جان تک جوکھوں میں ڈال دیتا ہے۔ یہیں سے اس سوال کا صحیح جواب مِل سکے گا کہ نبیِٔ اکرمؐ اس قدر تکالیف کیوں برداشت کرتے تھے۔

اصل حقیقت نبوّت نام ہے خدا کی طرف سے وحی مِل جانے کا۔ یہ منصب کسی انسان کو کسب و ہنر سے نہیں مل سکتا۔ یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص محنت کر کے اس مقام کو حاصل کر لے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ جس ہستی کو چاہتا منتخب کر لیتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ انتخاب یونہی (معاذاللہ) آنکھ بند کر کے نہیں ہو جاتا تھا۔ یہ خدا کے نظامِ مشیّت کے تابع ہوتا تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جس سینے کو وحی کا مہبط بنانے کے لیے منتخب کرتا، وہ خاص صلاحیتوں کا مالک اور اس بارِ امانت کے اٹھا لینے کا کماحقہٗ اہل ہوتا۔ لیکن، بہرحال ہوتا یہ خدا کے انتخاب سے۔ حتّٰی کہ (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) ایک ہونے والے نبی کو، منصبِ نبوّت پر فائز ہونے سے ایک دن پہلے تک بھی اس کا علم نہیں ہوتا کہ اس مرتبۂ بلند کے لیے اس کا انتخاب عمل میں آنے والا ہے۔ اس عمل میں اس کے اختیار و ارادہ کو کوئی دخل نہ ہوتا۔ (واضح رہے کہ چونکہ نبوّت کا سلسلہ حضور نبیِٔ اکرمؐ کی ذاتِ گرامی پر ختم ہو گیا ہے، اس لیے اب اس منصب کے لیے کسی کے انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا چہ جائیکہ کوئی اپنے کسب و ہنر سے تدریجاً نبوّت کے مقام تک پہنچ جائے۔)

۲۔ جس ذاتِ گرامی کو منصبِ نبوّت کے لیے منتخب کیا جاتا، اس میں شرفِ انسانیت کی دیگر صلاحیتوں کے علاوہ، ایک بڑا جوہر یہ بھی ہوتا کہ اس کا سینہ انسانیت کے درد سے لبریز اور اس کی آنکھیں بنی آدم کے غم میں اشکبار ہوتیں۔ وہ دیکھتا کہ انسان، غلط راستوں پر چل کر کس طرح تباہی اور بربادی کے جہنّم کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اس منظر پر اس کا دلِ دردمند تڑپ اُٹھتا اور وہ نوعِ انسان کو اس تباہی سے بچانے کے لیے دن کا چین اور رات کی نیند اپنے اوپر حرام کر لیتا۔

۳۔ اس مقصدِ عظیم کے حصول کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ایک ایسا نظامِ معاشرہ قائم کرتا جس کی بُنیادیں

احترامِ آدمیت، عدل اور مساوات کے آسمانی اصولوں پر قائم ہوتیں۔ یہ معاشرہ دکھا دیتا کہ کس طرح کمزور اور ناتواں انسان، زبردستوں اور قہرمانوں کے ظلم و استبداد سے محفوظ و مصئون رہ کر، امن و سکون کی زندگی بسر کرتے ہیں صرف امن و سکون کی زندگی ہی نہیں بلکہ ایسی زندگی جس میں ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما اس انداز سے ہوتی چلی جائے کہ وہ اس دنیا میں بھی انسانیت کی سطح پر زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں اور اس کے بعد کی دنیا میں، مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے اہل۔ بالفاظِ دیگر، وہ اس دنیا میں بھی جنتی زندگی بسر کریں اور اس کے بعد کی دنیا میں بھی۔

اس قسم کے معاشرہ کی تشکیل کے لیے ضروری تھا کہ نبی، ہدایتِ خداوندی کو دوسرے انسانوں تک پہنچائے۔ انہیں اس کی تعلیم دے اور اس کی حکمت و غایت سمجھائے، ان کی نشوونما کا سامان مہیا کرے۔ خود آگے آگے چلے اور اپنے پیچھے انہیں زندگی کی صراطِ مستقیم پر چلائے۔

نبی کے اس فریضہ کو آپ رسالت سے تعبیر کر لیجئے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ منصبِ نبوت کے حصول میں، نبی کے کسب و ہنر یا اختیار و ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ لیکن وہ فریضۂ رسالت کی ادائیگی اپنی منشا اور رضامندی سے کرتا ہے اور یہ اعمال اس سے (معاذ اللہ) ایک مشین کی طرح میکانکی طور پر (MECHANICALLY) سرزد نہیں ہوتے۔ غلط راستے پر چل کر تباہ ہونے والی انسانیت کی غمخواریاں اس کی اس جدّوجہد کی محرّک اور ابنِ آدم کو حیوانی سطح سے اٹھا کر، شرفِ انسانیّت کی بلند سطح پر لے جانے کی شدید آرزو، اس کی سعی و کاوش کی علت ہوتی۔ اس کے لیے وہ اپنی بصیرت کی روشنی میں، پروگرام مرتب کرتا، غور و تدبر سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتا اور اس کے بعد ایسا قدم اٹھاتا جو کاروانِ انسانیت کو اس کی منزلِ مقصود کی طرف لے جائے۔ اس تمام سعی و کاوش میں، قوانینِ خداوندی کی محکمیت پر اس کا یقینِ کامل، اس کے لیے بے پناہ تقویت کا موجب بنتا اور اپنے نصب العین کی صداقت پر ایمان اس کا ہر قدم آگے بڑھائے چلا جاتا۔

اس قسم کے معاشرہ کو، جو احکام و قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل ہو اور جس میں انسانیت اپنی ارتقائی منازل طے کرتے، آگے بڑھتی اور بلند ہوتی چلی جائے، نظامِ خداوندی یا حکومتِ الٰہیہ کہا جاتا ہے۔ (آج کی اصطلاح میں اسے قرآنی مملکت یا اسلامی ریاست کہا جائے گا)۔ رسول کے سامنے اسی نظام کا قیام ہونا تھا۔ باطل کی قوتیں اس نظام کے قیام و بقا میں حائل ہوتی تھیں۔ رسول ان تمام رکاوٹوں کو انسانیت کی راہ سے ہٹاتا تھا۔ اس جدّوجہد کا نام **جہاد** ہے اور اس کا نتیجہ غلبۂ حق یا اعلائے کلمۃ الحق، یعنی اس

نظام کا قیام جس میں شرفِ انسانیت کی برومندی ہو۔

اب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ جب نبیٔ اکرمؐ ان لوگوں سے کہتے تھے کہ

لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ (۶/۹۰؛ ۱۲/۱۰۴؛ ۳۸/۸۶)

میں جس نظام پر تمہیں چلانا چاہتا ہوں، اس کے معاوضہ میں تم سے کچھ نہیں مانگتا!

رسُول اجرِ رسالت نہیں مانگتا

تو اس سے مفہوم کیا تھا اور یہ تمام جدّ وجہد اور سعی و کاوش کس طرح یکسر بے غرض اور بے لوث تھی۔ اس تمام تگ و تاز سے مقصود یہ تھا کہ انسانیّت کسی طرح صحیح راستے پر لگ جائے تاکہ زندگی اپنے مقصود کو پالے۔ اسی لیے فرمایا کہ:

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝ (۲۵/۵۷)

(اے پیغمبرؐ!) تم کہہ دو کہ میں اس کے سوا کہ جو شخص چاہے اپنے پروردگار کی طرف کا راستہ اختیار کرلے تم سے کسی قسم کا معاوضہ نہیں مانگتا۔

سورۂ سبا میں اس حقیقت کی وضاحت ان الفاظ میں کردی کہ

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ (۳۴/۴۷)

(اے پیغمبرِ اسلام!) تم کہہ دو کہ جو کچھ میں نے تم سے معاوضہ مانگا ہے (یعنی اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کرلینا)، وہ (میرے لیے نہیں بلکہ) خود تمہارے واسطے فائدہ مند ہے۔ (ویسے) میرا معاوضہ تو سوائے خدا کے کسی کے ذمّہ بھی نہیں ہے اور وہی ہر چیز پر گواہ ہے!

یعنی جو کچھ میں تم سے چاہتا ہوں وہ یہی ہے کہ تم اس نظام کی اطاعت کرو۔ اور اس نظام کا ماحصل بھی تمہارے ہی لیے ہے، اس لیے کہ اس نظام کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حق غالب آجائے گا اور باطل کو شکست ہوگی۔ تو یہ فتح خود تمہاری ذات کی فتح ہوگی اور یہی میری محنتوں کا معاوضہ ہے۔

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ ۝ (۳۴/۴۹)

(اے پیغمبرؐ!) کہہ دو کہ حق آگیا اور باطل (اب) سر نہیں نکال سکے گا اور نہ ہی دوبارہ لوٹ سکے گا۔

اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ نبی اکرمؐ کا اپنے مخالفین کے ساتھ تعلق کس نوعیت کا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ

رسُول کا مخالفین سے تعلق

مخالفین آپؐ کے کھلے دشمن تھے۔ اس لیے دنیا کے عام معیاروں کے مطابق اُن کے ساتھ آپؐ کا تعلق، انتقام اور عداوت کا تعلق ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن آپؐ کا ان کے ساتھ تعلق اس قسم کا نہیں تھا۔ آپؐ کا ان کے ساتھ ایسا ہی تعلق تھا جیسا کسی طبیبِ مشفق کا مریض سے ہو۔ آپؐ دیکھتے تھے کہ ان کی انسانیت مجروح ہو چکی ہے اس لیے آپؐ چاہتے تھے کہ ان کا علاج ہو جائے۔ لیکن ان کی ضد' دوا کو زہر بنا کر دکھاتی تھی' اس لیے وہ اس کے قریب نہیں آتے تھے۔ یہ طبیبِ مشفق جانتا تھا کہ ان کا مرض انہیں کس طرح ہلاکت اور تباہی کی طرف کشاں کشاں لیے جا رہا ہے' اس لیے ان کی ضد پر آپؐ کا دل کڑھتا تھا اور ان کے مآل کا غم آپؐ کو بے چین کیے دیتا تھا اور یہ شدتِ احساس اس حد تک تھی کہ سورہ شعرا میں ہے۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ (۲۶/۳)

(اے پیغمبرؐ!) شاید تم اس رنج و غم میں اپنی جان ہی کھو دو گے کہ یہ لوگ ایمان لانے والوں میں سے کیوں نہیں ہو جاتے!

دوسری جگہ ہے۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝ (۱۸/۶)

(اے پیغمبرؐ!) تیری حالت تو ایسی ہو رہی ہے کہ جب لوگ یہ (واضح) بات بھی نہ مانیں، تو عجب نہیں ان (کی ہدایت) کے پیچھے' مارے افسوس کے' اپنی جان ہلاکت میں ڈال دے (حالانکہ یہ لوگ ماننے والے نہیں)۔

ان کا غم آپؐ کی جان کو گھلائے جا رہا تھا۔

فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝ (۳۵/۸)

(اے پیغمبرؐ!) دیکھو ان لوگوں پر غم کھانے سے تمہاری جان ہی نہ چلی جائے۔ یہ واقعہ ہے کہ جو کچھ یہ لوگ کر رہے ہیں اسے خدا (اچھی طرح) جاننے والا ہے!

کہا جا سکتا ہے کہ اگر مخالفین سے آپؐ کے تعلقات منتقمانہ نہیں بلکہ مشفقانہ تھے تو پھر ان سے وہ سلسلۂ

پھر وہ سِلسلۂ جنگ و قتال کیوں؟

جنگ و قتال کیوں جو بعد میں وقوع پذیر ہوا۔ یہ لڑائیاں کیوں واقع ہوئیں اور ان کی حقیقت کیا تھی۔ اس

کی تفصیل آئندہ عنوان میں ملے گی۔ اس وقت صرف اتنے اشارے پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ یہ جنگ بھی منتقمانہ قتل و غارت گری کی جنگ نہیں تھی بلکہ ایک طبیب کی مشفقانہ قطع و برید تھی جو اس علاج میں ناگزیر ہو گئی تھی۔ اگر آپ کی کسی انگلی پر ناسور ہے، تو ڈاکٹر کوشش کرے گا کہ وہ مرہم سے اچھا ہو جائے لیکن اگر وہ دیکھے کہ زخم لاعلاج ہو چکا ہے اور اس کا زہر بڑھتا چلا جا رہا ہے، تو باقی جسم کی حفاظت کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ اس لاعلاج حصّہ کو کاٹ کر پھینک دیا جائے۔ انسانی افراد، جسدِ انسانیت کے مختلف اعضا کی طرح ہیں۔ اگر بعض افراد کی انسانیت مریض ہو جاتی ہے، تو رسولؐ انتہائی کوشش کرتا ہے کہ ناصحانہ حکمت و موعظت اور مشفقانہ انذار و تبشیر سے اس کا علاج ہو جائے۔ لیکن اگر مریض کی ضد اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اُسے دوائی پینے سے انکار ہے اور بد پرہیزی پر اصرار، تو بعض اوقات یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ باقی جسدِ انسانیت کی صحت و سلامتی کے لیے اس لاعلاج اور زہر فشاں حصّہ کو کاٹ کر الگ کر دیا جائے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں نظامِ حق و عدل کے قیام کے لیے جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے۔ سو اگر اس انگلی کا کاٹ کر پھینک دینا جس کا ناسور لاعلاج ہو چکا ہے، ڈاکٹر کی مشفقانہ حکمت ہے نہ کہ منتقمانہ جلاّدیت، تو ایسے مواقع پر ایک رسولؐ کا عملِ جراحی کبھی معاندانہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، وہ ان افراد کی اصلاح کی کوشش میں اپنے دل کو پگھلاتا اور اپنی روح کو انڈیلتا ہے۔ ان کی ہلاکت اور تباہی کا تصوّر اس کے قلبِ حسّاس میں تھرتھری پیدا کر دیتا ہے۔ وہ ان کی صحت کے لیے دوائیں کرتا اور دعائیں مانگتا ہے۔ ان کے مرض کی شدّت اور اس کے انجام کے خیال سے اس کا جگر گداز ہو جاتا ہے۔ لیکن ان کی ہٹ دھرمی اور علاج سے انکار سے اسے سخت صدمہ ہوتا ہے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں نبیٔ اکرمؐ سے کہا گیا کہ ان لوگوں کے انکار (جحود) اور ضد اور ہٹ دھرمی سے رنجیدہ خاطر ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ان کا ناسور لاعلاج ہو چکا ہے۔ ان کی انسانیت اس حد تک مُردہ ہو چکی ہے کہ اس میں زندگی پیدا ہی نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے ان کے انجام و عواقب پر دل گیر نہیں ہونا چاہیئے۔

وَ لَا تَحْزَنْ عَلَیْهِمْ وَ لَا تَكُنْ فِیْ ضَیْقٍ مِّمَّا یَمْكُرُوْنَ ○ (۱۶/۱۲۷؛ ۲۷/۷۰؛ ۱۵/۸۸؛ ۳۱/۲۳؛ ۳۶/۷۶)

اور (اے پیغمبرؐ)، ان کے اوپر غم نہ کھاؤ اور جو کچھ یہ لوگ خفیہ تدبیریں کرتے ہیں اُن کی وجہ سے دل میں تنگی محسوس نہ کرو۔

تمہارا کام یہ ہے کہ اس پیغامِ حیات آور کو عام کرتے جاؤ۔ جن قلوب میں زندگی قبول کرنے کی ذرا سی بھی

صلاحیت موجود ہے وہ، زُود یا بدیر اس پر توجہ دیں گے اور اپنے علاج پر مائل ہو جائیں گے لیکن وہ جن کے دل بالکل مُردہ ہو چکے ہیں[1]، اِس طرف کا رُخ کبھی نہیں کریں گے۔ ان کے اعمال کی وجہ سے ان پر تباہی آ کر رہے گی۔ ان کے دِق کا مرض چوتھے درجہ میں پہنچ چکا ہے اور اس کے ساتھ ہی دماغ ایسا مفلوج ہو چکا ہے کہ یہ عیب کو ہنر، دوست کو دشمن اور تریاق کو زہر سمجھ رہے ہیں۔ اس لیے ان کا انجام موت کے سوا کچھ نہیں۔

اصلاح زندوں کی ہوسکتی ہے

ان کی حالت پر آنسو بہانا بیکار ہے اور تدابیر سوچنا لاحاصل۔ علاج زندوں کا ہو سکتا ہے مُردوں کا نہیں۔ مُردوں میں زندگی پیدا کر دینا آپ کے امکان میں نہیں، اس لیے آپ کے دائرۂ فرائض سے باہر ہے۔ تُو ان پر داروغہ نہیں مقرّر کیا گیا کہ مار مار کر انہیں علاج پر آمادہ کرے۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۭ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ (۴۲/۴۸)

لہٰذا (اے پیغمبرؐ!) اگر وہ گردن پھیر کر چل دیں (تو جانے دو) ہم نے تمہیں کوئی نگران بنا کر نہیں بھیجا (کہ زبردستی انہیں راہِ حق پر لے آؤ) تمہارے ذمہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ تم (پیغامِ حق کو) اُن تک پہنچا دو!

آپ انہیں ان کی روشِ زندگی کے انجام و عواقب سے آگاہ کرتے جائیے۔ یہی آپ کا فریضہ ہے۔

فَذَكِّرْ ۣ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۭ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَۜيْطِرٍ ۙ (۸۸/۲۱-۲۲)

چنانچہ (اے پیغمبرؐ!) تم یاد دہانی کراتے رہو۔ کیونکہ تم یاد دہانی کرانے والے ہی ہو۔ کچھ تمہیں لوگوں پر داروغہ مقرر نہیں کیا گیا ہے۔

یہ تھا رسُولِ اکرمؐ کا مشن اور یہ تھی اس مشن کی غرض و غایت۔ وہ غرض و غایت جسے قرآن نے ایک جامع آیت میں ایسے درخشندہ الفاظ میں بیان کر دیا جس سے کسی کو شک و شبہ نہ رہے کہ دنیا میں قرآنی ملّت کی زندگی کا منتہیٰ اور اس کی تگ و تاز کی غرض و غایت کیا ہے۔ فرمایا:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ (۶/۱۶۲-۱۶۳)

---

[1] یاد رکھیے! ان کے دل ان کے اپنے اعمال — ضِد اور تعصّب — کی وجہ سے مُردہ ہو گئے تھے۔ یہ نہیں کہ خدا نے ان کے دلوں کو بنایا ہی ایسا تھا۔

میرے فرائض زندگی کی ادائیگی اور اس ادائیگی کے طور طریق حتّٰی کہ میری زندگی اور میری موت اُس خدا کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے ہے جس نے ربوبیّتِ عالمینی کا ذمہ اپنے اوپر لے رکھا ہے۔ میں اس مقصد میں کسی اور جذبہ یا مفاد کو شریک نہیں کرتا۔ اس کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اس کے سامنے سب سے پہلے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔

استدراک

(۱) شاعری کیا ہے؟

عنوان زیرِ نظر میں دو تین باتیں ایسی آئی ہیں جو ذرا وضاحت طلب ہیں۔ آپ نے دیکھا ہے کہ مخالفین حضورؐ کے متعلق یہ بھی کہتے تھے کہ آپ شاعر ہیں، اس لیے آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ حقیقت پر مبنی نہیں اور نہ ہی اس قابل کہ اس پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔ قرآنِ کریم نے اس کی تردید کی اور فرمایا کہ:

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۙ (۳۶/۶۹)

اور دیکھو، ہم نے اس رسول کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ ہی شاعری اس کے لیے مناسب ہو سکتی ہے۔ یہ (کتاب، پیامِ حق کی) یاددہانی اور واضح قرآن ہے۔

یعنی یہ کہ آپ شاعر نہیں، اس لیے کہ شاعری ایک پیغمبر کے شایانِ شان ہی نہیں۔ اس سے بظاہر مترشح ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم نے شعر و شاعری کی مخالفت کی ہے اور اسے مسلکِ پیغمبری کے خلاف قرار دیا ہے۔ قرآنِ کریم کی آیات سے یہ استنباط وضاحت طلب ہے۔

زبان، اظہارِ مدعا کا ذریعہ ہے اور نوعِ انسانی کے لیے بہت بڑا امتیاز۔ اس اظہارِ مدعا کے لیے انسانوں نے دو انداز اختیار کیے ہیں۔ ایک تو وہ جس میں ہم روزمرہ باتیں کرتے ہیں۔ اسے نثر کہتے ہیں۔ دوسرے شعر۔ شعر کیا ہے؟ نثر کے الفاظ کو ایک خاص ترتیب میں رکھ دیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے نثر اور نظم الفاظ کی ترتیب کے دو مختلف اسلوب ہیں۔ قرآنِ کریم جو زندگی کے حقائق پیش کرتا ہے، ایسی سطح پر نہیں اُتر سکتا کہ اِن دو اسالیبِ بیان میں سے ایک کی ایسی مذمت کرے کہ وہ کسی بلند شخصیت کے شایانِ شان ہی نہ رہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ جب قرآن نے یہ کہا ہے کہ شاعری رسول کے شایانِ شان نہیں، تو اس سے مقصود الفاظ کی وہ

خاص ترتیب نہیں جس سے شعر موزوں ہو جاتا ہے بلکہ ایک خاص نفسیاتی کیفیت ہے جسے اس نے "شاعری" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ نفسیاتی کیفیت یا مسلکِ حیات کیا ہے؟ اس کی قرآن نے خود ہی دوسرے مقام پر تشریح کر دی ہے۔ قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ انسانی زندگی کا ایک خاص نصب العین ہے اور اس نصب العین کا حصول اس کی تمام جدّوجہد کا مقصود۔ بالفاظِ دیگر، یوں سمجھیے کہ اس کے نزدیک سفرِ زندگی میں صحیح منزل کی تعیین کا نام ہے ایمان اور اس منزل تک پہنچنے کی کوشش کا نام اعمالِ صالحہ۔ ایمان وعمل کی زندگی اس کے نزدیک انسانیّت کی زندگی ہے، لہٰذا، ایک مومن کی زندگی اور رسول کے شایانِ شان اسلوبِ حیات۔ اس کے برعکس، ایک دوسرا اسلوبِ زندگی ہے جس میں نہ انسان کی آنکھوں کے سامنے صحیح نصب العین ہوتا ہے نہ دل میں اس نصب العین کے حصول کی تڑپ۔ اس کے جذبات اس کا معبود[1] ہوتے ہیں اور ان کی تسکین اس کی زندگی کا منتہیٰ۔ یہ جذبات اس کی ناک میں نکیل ڈالے اسے زندگی کی مختلف شاہراہوں پر اِدھر اُدھر لیے پھرتے ہیں۔ کبھی تصوّرات کی ان حسین وادیوں میں، کبھی تخیّلات کے اُن نگاہ فریب مناظر کی طرف۔ چونکہ زندگی کا نصب العین متعیّن نہیں ہوتا اس لیے آج جذبات کی رَو میں کچھ کہہ رہے ہیں، کل کچھ اور۔ جس قسم کا جذبہ دل میں موجزن ہوا اسی قسم کی آواز زبان پر آ گئی۔ چونکہ جذبات کے اظہار کے لیے شعر کی زبان زیادہ موزوں سمجھی گئی ہے، اس لیے جذبات پرستی کی اس نہجِ زندگی کا نام قرآن نے شاعری رکھا ہے جو ایک مومن کی زندگی کے بالکل برعکس زندگی ہے۔ یہ دو مختلف اسالیبِ حیات ہیں جن کا تقابل قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

شاعر کی نفسیات

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۞ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۞ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۞ (۲۶/۲۲۴-۲۲۶)

اور شاعروں کی پیروی ہمیشہ گمراہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ (اے پیغمبرؐ!) تم نے دیکھا نہیں کہ وہ (روز) ہر (نئی) وادی میں ایک ایسے اونٹ کی طرح جسے جھوٹی پیاس کی بیماری اِدھر اُدھر لیے پھرے بھٹکتے پھرتے ہیں۔ اور یہ لوگ وہ باتیں کہتے ہیں جو خود کرتے نہیں ہیں۔

یعنی نہ ان کی فکر کا صحیح مرکز متعیّن ہے اور نہ ان کے قول اور عمل میں تطابق۔ یہ ہے نفسیاتِ شاعر۔ یعنی وہ

---

[1] اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (۲۵/۴۳؛ ۴۵/۲۳)
(اے پیغمبرؐ!) تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جنہوں نے اپنے جذبات ہی کو اپنا معبود بنا لیا ہے؟

اسلوبِ حیات جس کی خصوصیت پریشانیٔ فکر و نظر، آوارگیٔ قلب و نگاہ اور فقدانِ عمل و کردار ہے۔ اس کے برعکس دوسرا اندازِ حیات ہے جس میں زندگی کا نصب العین متعین ہے اور انسان کا ہر قدم اس نصب العین کی طرف اُٹھتا ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ ذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ انْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ وَ سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝ (۲۶/۲۲۷)

وہ لوگ ان میں شامل نہیں جو (پیغامِ حق پر) ایمان لے آئے ہیں اور جنہوں نے صلاحیت بخش کام کیے اور قوانینِ خداوندی کو ہمیشہ سامنے رکھا اور اس کے بعد کہ اُن پر ظلم کیا جا چکا انہوں نے اپنی مدافعت کی (یہ لوگ ایک متعین راستہ پر چلنے والے اور گفتار و کردار میں یکساں ہوتے ہیں) اور جن لوگوں نے (ان پر) ظلم کیا ہے وہ بہت جلد معلوم کرلیں گے کہ کس منزل کی طرف پلٹ رہے ہیں!

مسلمان شاعروں کی قوم بن چکی ہے

سورۂ شعراء کی ان آیات کے دونوں حصوں کو ایک مرتبہ پھر دیکھئے۔ ان کے درمیان جو اِلَّا (مستثنیٰ) آیا ہے اس سے یہ مراد نہیں کہ "مسلم شعراء" ہدایت و سعادت کی راہ پر ہیں اس لیے قرآن کے نزدیک پسندیدہ اور "غیر مسلم شعراء" ضلالت و غوایت پر ہیں اس لیے مغضوب۔ مفہوم اس سے یہ ہے کہ جو لوگ اوّل الذکر اندازِ زندگی اختیار کیے ہوئے ہیں وہ غلط روش پر جا رہے ہیں لیکن جو دوسرا انداز اختیار کیے ہیں وہ صحیح راستہ پر چل رہے ہیں۔ قرآنی اندازِ زندگی اختیار کرنے والا، اپنے مدعا کا اظہار نظم میں بھی کرے تو جائز اور درست۔ غیر قرآنی اسلوبِ حیات اختیار کرنے والا اپنا مفہوم نثر میں ادا کرے تو بھی غلط۔ قرآن، اسالیبِ زندگی سے بحث کرتا ہے نہ کہ طرقِ اظہارِ مدعا سے۔ لہٰذا، قرآن نے جب "شاعری" کو غوایت کی راہ کہا ہے تو اس سے مفہوم وہ نفسیاتی کیفیت ہے جو انسان کو غلط روشِ زندگی پر لے جاتی ہے اور فکر و عمل کی دنیا میں کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ یہی وہ "شاعری" ہے جو ایک مدت سے مسلمانوں کے ہر شعبۂ حیات پر مستولی ہے اور ان کی کسی کوشش اور تحریک کو ثمر بار نہیں ہونے دیتی۔ اگر ان کی باتیں سنیئے تو ایسا معلوم ہوگا گویا ایک سیلاب امنڈتا چلا آرہا ہے جو دنیا کی ہر قوت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا اور جب عمل کی طرف آئیے تو یہ حالت کہ ادنیٰ سے ادنیٰ چوکھٹ پر بھی سجدہ ریزی کے لیے تیار۔ اجتماعاتِ قومی میں اُن کے ریزولیوشنز کے الفاظ سے ان کے عزائم کا اندازہ لگائیے تو ایسا معلوم ہوگا گویا یہ لوگ:

سمندر پھاڑ دیں گے ، کوہ سے دریا بہا دیں گے !

اور انہیں ان کے کردار کے ترازو میں تو لیئے تو ایک پر کاہ ثابت ہوں گے جسے ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا اُڑائے اُڑائے پھرے ۔ جذبات کی شعلہ مزاجی کا یہ عالم کہ ذرا سے اختلاف پر نعل بر آتش ہو جائیں گے لیکن عدم استقلال کی یہ کیفیت کہ بگولے کا سایہ تمام رقص و وجد اور جوش و خروش آن کی آن میں خاک نشین ہو جائے گا ۔ یہ ہے ان کی حالت دنیائے عمل و استقامت میں ۔ دوسری طرف پریشانیٔ فکر و نظر کا یہ عالم کہ ہر ٹولی کا قبلۂ مقصود الگ اور ہر گروہ کا کعبۂ مدعا جُدا گانہ ۔ چار اس کے پیچھے مصروف دشت پیمائی ، دس اس کے ساتھ مشغولِ صحرا نوردی ۔ ہر گروہ فِیۡ کُلِّ وَادٍ یَّهِیۡمُوۡنَ کی عبرتناک تصویر اور ہر جماعت یَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا یَفۡعَلُوۡنَ کا تأسف انگیز مرقع ۔ اور اس طرح پوری کی پوری قوم اس "شاعری" کا عملی پیکر جس کی قرآن نے مذمت کی ہے ۔ لیکن بایں ہمہ اس فریب میں مبتلا کہ یہ مذمت دوسروں کی کی گئی ہے ہماری نہیں ۔ اس لیے کہ ہم تو اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے استثنا میں آگئے ہیں ۔

خدا ایں سخت جاں را یار بادا
کہ اُفتاد است از بامِ بلندے !

اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھیے کہ عربوں کا عقیدہ تھا کہ شعراء صاحبِ الہام ہوتے ہیں ۔ یہ جو کچھ کہتے ہیں "عالمِ بالا" کے ساتھ رابطہ رکھنے کی وجہ سے کہتے ہیں ۔ یہ عقیدہ قریب قریب دنیا کی ہر قوم میں پایا جاتا ہے شعر کا ماخذ وجدان (INTUITION) سمجھا جاتا ہے ۔ اس کی "صریرِ خامہ" کو "نوائے سروش" قرار دیا جاتا ہے ۔ نبی کا بھی یہ دعویٰ ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ کہتا ہے اپنی طرف سے نہیں کہتا ۔ اسے یہ باتیں "عالمِ بالا" سے بذریعہ وحی ملتی ہیں ۔ اس سے لوگ اس التباس میں مبتلا ہو جاتے کہ نبی اور شاعر کا ماخذِ علم ایک ہی ہے ۔ قرآن نے اس کی تردید کی اور کہا کہ نبی کا سرچشمۂ علم ذاتِ خداوندی ہوتی ہے اور یہ چیز کسی اور کو حاصل نہیں ہوتی ۔ نبی اپنی وحی میں منفرد ہوتا ہے اور کسی غیر از نبی کے لیے وحی پا لینے کا امکان ہی نہیں ہوتا ۔ قرآن نے کشف ، الہام وغیرہ کے عقاید کی یکسر تردید کی ہے ۔ اس نے کہا ہے کہ جو علم انسانوں کو خدا کی طرف سے براہِ راست ملتا تھا اسے وحی کہتے ہیں اور چونکہ وحی کا سلسلہ نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی پر ختم ہو گیا اس لیے اب کسی کے لیے ممکن نہیں کہ وہ خدا سے براہِ راست ہمکلام ہو سکے ۔ خدا کا کلام ' قرآنِ کریم کے اندر ہے اور اس کے باہر کہیں اور نہیں ، نہ ہی کسی اور کو اب مل سکتا ہے ۔

(۲) رَجُلٌ مَّسْحُوْرٌ! کفار کا اتہام

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ کفار نبی اکرمؐ کے متعلق یہ بھی کہتے تھے کہ آپؐ (معاذاللہ) رَجُلٌ مَّسْحُوْرٌ" ہیں (دیکھئے ۱۷:۴۷)، یعنی آپؐ پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بار بار اس کی تردید کی اور قرآن میں بصراحت فرما دیا کہ ان لوگوں کی کتنی بڑی گمراہی ہے جو اس قسم کے بیہودہ خیالات رکھتے اور پھیلاتے رہتے ہیں۔ لیکن آپ حیران ہوں گے کہ خود ہم میں ایک ہزار سال سے یہ عقیدہ چلا آ رہا ہے کہ رسول اللہؐ پر جادو کیا گیا تھا اور آپؐ (معاذاللہ) رَجُلٌ مَّسْحُوْرٌ تھے۔ یقیناً یہ امر آپ کے لیے موجبِ تعجب ہوگا کہ مسلمان ایک ایسا عقیدہ کس طرح رکھ سکتے ہیں جو صریحاً قرآن کے خلاف ہو اور جس سے نبی اکرمؐ کی شانِ اقدس کے خلاف ایسا طعن پایا جائے۔ لیکن اس کے باوجود یہ عقیدہ چلا آ رہا ہے اور اس کی بنیاد ہے ایک ایسی حدیث پر جو بخاری میں موجود ہے۔

چنانچہ بخاری (جلد دوم، مطبوعہ مصر) صفحہ ۳۷ میں ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَحَرَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى كَانَ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ أَنَّهُ يَفْعَلُ الشَّيْءَ وَمَا يَفْعَلُهُ حَتّٰى كَانَ ذَاتَ يَوْمٍ دَعَا وَدَعَا ثُمَّ قَالَ أَشَعَرْتِ أَنَّ اللّٰهَ أَفْتَانِيْ فِيْمَا فِيْهِ شِفَائِيْ أَتَانِيْ رَجُلَانِ فَقَعَدَ أَحَدُهُمَا عِنْدَ رَأْسِيْ وَالْآخَرُ عِنْدَ رِجْلَيَّ فَقَالَ أَحَدُهُمَا لِلْآخَرِ مَا وَجَعُ الرَّجُلِ قَالَ مَطْبُوْبٌ قَالَ وَمَنْ طَبَّهُ قَالَ لَبِيْدُ ابْنُ الْأَعْصَمِ قَالَ فِيْمَا ذَا قَالَ فِيْ مُشْطٍ وَّمُشَاقَةٍ وَجُفِّ طَلْعَةٍ ذَكَرٍ قَالَ فَأَيْنَ هُوَ قَالَ فِيْ بِئْرِ ذَرْوَانَ فَخَرَجَ إِلَيْهَا النَّبِيُّ صلعم ثُمَّ رَجَعَ فَقَالَ لِعَائِشَةَ حِيْنَ رَجَعَ نَخْلُهَا كَأَنَّهَا رُؤُوْسُ الشَّيَاطِيْنِ فَقُلْتُ اِسْتَخْرَجْتَهُ فَقَالَ لَا أَمَّا أَنَا فَقَدْ شَفَانِيَ اللّٰهُ وَخَشِيْتُ أَنْ يُّثِيْرَ ذٰلِكَ عَلَى النَّاسِ شَرًّا ثُمَّ دُفِنَتِ الْبِئْرُ۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور اکرمؐ پر ایسا جادو کیا گیا تھا کہ آپؐ خیال کرتے تھے کہ میں نے فلاں کام کر لیا حالانکہ آپؐ نے وہ کام نہیں کیا ہوتا تھا۔ ایک روز حضورؐ نے دُعا کی پھر دعا کی۔ دعا کے بعد مجھ سے فرمایا، عائشہ! تمہیں معلوم ہے کہ خدائے تعالیٰ نے مجھے وہ حکم دیا جس میں میری صحت (مضمر) ہے۔ میرے پاس (خواب میں) دو آدمی آئے۔ ایک میرے سرہانے بیٹھا، دوسرا پائنتی۔ ایک دُوسرے

سے بولا۔اس شخص کو کیا بیماری ہے؟ اس نے کہا اس پر جادو کیا ہوا ہے۔ پہلا شخص بولا کس نے کیا ہے؟ دوسرے نے کہا، لبید ابنِ اعصم نے۔ پہلے نے پوچھا، کس چیز میں کیا ہے؟ دوسرے نے جواب دیا، کنگھی میں اور کنگھی سے جھڑے ہوئے بالوں اور نر چھوارے کے غلاف میں۔ پہلا بولا، یہ چیزیں کہاں رکھی ہیں؟ دوسرا بولا چاہِ ذروان میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ ذروان پر تشریف لے گئے اور لوٹ کر مجھ سے فرمایا کہ اس کنویں کے درخت کے کھجور شیطانوں کے سروں کی طرح ہیں میں نے عرض کیا حضورؐ نے جادو کی چیز وہاں سے نکال ڈالی؟ فرمایا، نہیں لیکن خدا تعالیٰ نے مجھے صحت عطا کر دی۔ مجھے خوف ہوا کہ کہیں لوگ اس فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اس کے بعد وہ کنواں پاٹ دیا گیا۔

غور کیجیے۔ صاف نظر آتا ہے کہ یہ معاندینِ اسلام کی مذموم کوششوں کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے ایک روایت وضع کی اور اسے یا تو امام بخاری نے غلطی سے صحیح سمجھ کر اپنے مجموعہ میں درج کر لیا اور یا، ان کے بعد، کسی اور نے اسے ان کے مجموعہ میں شامل کر دیا۔ اب مسلمان اسے ہزار برس سے سینے سے لگائے لگائے پھر رہا ہے اور نہیں سوچتا کہ یہ قرآنِ کریم کی تصریحات کے کس قدر خلاف ہے اور نبیؐ اکرمؐ کی عظمت و شان کے کس درجہ منافی! لیکن اسے تو تعلیم یہ دی گئی ہے کہ سب کچھ روا رکھا جا سکتا ہے لیکن یہ سُننا برداشت نہیں کیا جا سکتا کہ امام بخاریؒ یا کسی اور جامعِ حدیث نے اپنے مجموعہ میں ایک غلط روایت شامل کر لی ہے! یہ ہے وہ شخصیت پرستی، جو ہمیشہ سے حق پرستی کے راستہ میں حائل ہوتی چلی آ رہی تھی اور جسے مٹانے کے لیے قرآنِ کریم آیا تھا لیکن مسلمانوں نے قرآن کو غلافوں میں لپیٹ کر رکھ دیا اور اطاعت انسانوں کی شروع کر دی۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے!

(۳) اجرِ رسالت

یہ بھی ہمارے سامنے آ چکا ہے کہ نبیؐ اکرمؐ نے کس طرح بار بار اعلان فرمایا کہ آپؐ اپنی دعوتِ اصلاح و ارشاد کے لیے کسی صلہ کے خواہاں نہیں تھے اور ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ رسولؐ کس مقامِ بلند و رفیع سے یہ اعلان فرماتا ہے کہ اس کا اجر اس اللہ کے ہاں ہے لیکن اس ضمن میں بھی ایک آیت ایسی ہے جسے مسلمانوں کے ذوقِ شخصیت پرستی نے کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ گزشتہ اوراق میں گزر چکا ہے کہ قریش نے کس طرح تمام خاندان بنو ہاشم کا بائیکاٹ کر دیا تھا اور انہوں نے کن مشکلات میں محصور و محبوس زندگی گزاری تھی جسے صلۂ رحمی (رشتہ داری کا پاس) خاطر، عربوں کی قومی خصوصیت تھا

میں سے تھا اور اس پر انہیں بڑا ناز تھا لیکن رؤسائے قریش نے آپکی مخالفت میں اس قومی خصوصیت کو بھی فراموش کر دیا اور رشتہ داری کے تعلقات کو بھی پس پشت ڈال دیا۔ اس پر نبی اکرمؐ نے ان سے کہا کہ تم لوگ میری دعوتِ انقلاب کی مخالفت کرنا چاہتے ہو تو شوق سے کرو، لیکن اس جوشِ مخالفت میں صلۂ رحمی کے اس جذبہ کو تو فراموش نہ کرو جو تمہارا قومی شعار ہے۔ بنو ہاشم کے خاندان سے تمہارے رشتہ دارانہ تعلقات ہیں۔ ان تعلقات پر تو نگاہ رکھو۔

مؤدۃ فی القربیٰ

ذٰلِكَ الَّذِیْ یُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی ؕ وَمَنْ یَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِیْهَا حُسْنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ۝ (۴۲/۲۳)

ان (نعمائے ابدی اور باغاتِ جنت) کی خدا اپنے بندوں کو بشارت دیتا ہے جو (دعوتِ حق پر) یقین لے آئے ہیں اور جنہوں نے صلاحیت بخش کام کیے ہیں (اے پیغمبرؐ!) تم کہہ دو، کہ (اس دعوتِ حق کے لیے) میں تم سے کسی معاوضہ کا خواہاں نہیں ہوں سوائے قرابت دارانہ تعلقات کے۔ اگر دعوتِ حق کو قبول کر کے اچھے کام کرو گے تو خود ہی فائدہ اٹھاؤ گے (کیونکہ خدا کا وعدہ ہے) کہ جو شخص بھی کوئی اچھا کام کرے گا ہم اس کی خوشگواریوں کو اور زیادہ کر دیں گے۔ خدا غفور و شکور ہے۔

دیکھئے! بات کس قدر واضح ہے۔ لیکن مسلمانوں کو اپنے جذبۂ شخصیت پرستی کی تسکین کا سامان قرآن سے کہیں نہ ملا تو انہوں نے اس قسم کے کمزور سہارے ڈھونڈنے شروع کر دیئے۔ اس آیت کے معنی یہ کیے گئے کہ

میں تم سے اجرِ رسالت نہیں مانگتا بجز اس کے کہ تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرو۔

رشتہ داروں سے مراد "آلِ محمد" لی گئی اور پھر اس کی تائید میں روایات کے انبار لگ گئے۔ حتیٰ[1] کہ صحیح مسلم میں حضرت زید بن ارقمؓ سے یہ روایت مرقوم ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، ایک قرآن، دوسرا اہلِ بیت (ترمذی میں عترت[1] آیا ہے)۔ ان روایات کی روشنی میں آیت مندرجہ صدر کی تفسیر یہ کی گئی کہ حضورؐ نے مسلمانوں سے کہا ہے کہ میں تم سے اپنی رسالت کا کوئی اجر نہیں مانگتا صرف یہ

---

[1] بحوالہ تفسیر ابنِ کثیر۔

مانگتا ہوں کہ تم میری آل سے محبت کرو۔

ذرا غور کیجئے۔ رسول اللہؐ کی بعثت اس لیے ہوئی تھی کہ آپؐ تمام نسلی امتیازات کو مٹا کر اس کی جگہ خالص تقویٰ کو معیارِ تکریم و تعظیم قرار دیں۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ۴۹:۱۳ ملوکیت، قرآن کی رُو سے اِسی لیے ناجائز ہے کہ اس میں حقوق و مفاد کی اجارہ داری موروثی (نسلی) استحقاق کی بنا پر ہوتی ہے۔ نبی اکرمؐ اس غلط معیارِ استحقاق کی تردید کے لیے مبعوث ہوئے اور تمام عمر اس غلط معیار کو مٹانے اور اس کی جگہ صحیح معیار قائم کرنے میں مصروف رہے۔ حتیٰ کہ حضورؐ نے وفات سے کچھ عرصہ پہلے رومیوں کی طرف جس فوج کا بھیجنا تجویز کیا، اس کی سپہ سالاری حضرت اسامہ بن زیدؓ کو تفویض فرمائی۔ چونکہ آپ (حضرت اسامہؓ) ایک "غلام زادہ" تھے اس لیے بعض لوگوں نے اس پر اعتراض کیا تو حضورؐ نے فرمایا کہ:

> اگر اسامہ کی سرداری پر تم کو اعتراض ہے تو اس کے باپ کی سرداری پر بھی تم معترض تھے۔ خدا کی قسم وہ اس منصب کا مستحق تھا۔

یہ اس اہم معیار کا ایجابی پہلو تھا۔ دوسری طرف سلبی پہلو لیجئے تو حضورؐ نے وفات سے پہلے جو آخری خطبہ ارشاد فرمایا، اس کے آخری الفاظ تھے۔

> اے پیغمبر کی بیٹی فاطمہؓ! اور اے پیغمبر کی پھوپھی صفیہؓ! خدا کے ہاں کے لیے کچھ کر لو۔ میں تمہیں خدا سے نہیں بچا سکتا۔[1]

یعنی زندگی کے آخری لمحات میں اس حقیقتِ کبریٰ کے دونوں پہلوؤں کو واضح کر دیا کہ ایک غلام کا بیٹا اگر جوہرِ ذاتی کی بنا پر کسی بلند ترین منصب کا مستحق ہے تو باقی سب کو اس کی سرداری قبول کرنی ہوگی خواہ وہ حسب و نسب میں اس سے کتنے ہی اونچے کیوں نہ ہوں اور دوسری طرف یہ کہ خدا کی میزان میں اصل وزن عمل کا ہے حسب و نسب کا نہیں۔ حتیٰ کہ پیغمبر کی بیٹی بھی اس معیارِ خداوندی سے مستثنیٰ نہیں۔ ان حقائق کو سامنے رکھیے اور اس کے بعد آیت مندرجہ صدر کی اس تفسیر اور اس کی تائید میں ان روایات کو دیکھیے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ صاف نظر آجائے گا کہ یہ اس پارٹی پروپیگنڈہ کا اثر ہے جو اسلام کے خلاف سب سے بڑی سازش تھی اور جس کے اثرات اسلامی تعلیم و تصوراتِ حیات کے انحطاط کے ساتھ ساتھ یوں بڑھتے گئے جیسے سورج ڈھلنے کے ساتھ ساتھ سائے بڑھتے جاتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ہمارے ہاں سادات کی سیادت بالکل برہمنوں کی

---

[1] مسند امام شافعیؒ

طرح ملّت کے سر پر مسلط ہو گئی ہے اور ہر سیّد کا یہ پیدائشی حق سمجھا جاتا ہے کہ وہ واجب التکریم سمجھا جائے اور اُسے غیر سیّدوں سے بلند مرتبہ پر رکھا جائے۔ سیّد اور غیر سیّد میں نسلی امتیاز کے غیر اسلامی جراثیم وہاں سے بڑھ کر آگے پھیلے اور مسلمان بھی ہندوؤں کی طرح ذاتوں اور گوتوں میں بٹ گئے اور یہی ذاتیں اونچ اور

ذاتوں کی تقسیم

نیچ کا معیار قرار پا گئیں اور اس طرح مسلمان رفتہ رفتہ اس عہدِ جاہلیت میں جا پہنچا جہاں سے اسلام نے کفارِ عرب کو نکالا تھا۔ اس قبائلی تفریق نے اس وحدت کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جسے قرآن نے اقرارِ توحید کا عملی اور فطری نتیجہ بنایا تھا۔ مذہبی گروہ بندیوں نے اسے شیعہ اور سُنّی، مقلّد اور غیر مقلّد کے شرک سے ملوّث کیا اور نسلی امتیازات نے اسے عصبیّتِ جاہلیت کے جہنّم میں دھکا دیا۔ بایں ہمہ مُسلمان مطمئن ہے کہ دنیا میں یہ توحید پرست ہے اور باقی سب مشرک۔ اور پھر قیامت بالائے قیامت یہ کہ جاہلیت کی اس غیر اسلامی زندگی کی تائید میں جو شہادات (روایات) پیش کی جاتی ہیں، انہیں منسُوب کیا جاتا ہے اس ذاتِ اقدس و اعظم کی طرف، جو ساری دنیا سے اس عصبیّتِ جاہلیت کو مٹانے کے لیے مبعوث ہوئی تھی۔ آیت زیرِ نظر کی اس تفسیر پر ایک مرتبہ پھر غور کیجیے جو اُوپر درج کی گئی ہے اور سوچئے کہ اس نشتر کی زد کہاں تک پہنچتی ہے۔ اس تفسیر کی رُو سے گویا نبیٔ اکرمؐ یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں تم سے کوئی اجرِ رسالت نہیں مانگتا بجز اس کے کہ تم میری اولاد سے محبّت کیا کرو۔ اب ظاہر ہے کہ نبیٔ اکرمؐ اس کے علاوہ جو اجر بھی مانگتے وہ آپؐ کی زندگی تک محدُود ہوتا یعنی آپؐ زیادہ سے زیادہ سلطنت اور حکومت مانگتے، دولت و حشمت طلب کرتے۔ یہ سب اجر آپؐ کی زندگی تک محدُود ہوتے۔ لیکن آپؐ نے جو اجر (بقول ان روایات کے) اُمّت سے مانگا ہے اس کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا، یعنی اس کی رُو سے ہر اُمّتی کو ہر سیّد سے محبّت کرنی ہوگی۔ سیّد خواہ کچھ بھی کرے، اس کے متعلق دل میں غیر از محبّت کوئی اور جذبہ پیدا نہیں ہونا چاہیئے۔ اس لیے کہ یہ فرمانِ رسولؐ ہے جس کی اطاعت ہر مسلمان پر فرض ہے۔ یہ اجرِ رسالت ہے جس کی ادائیگی پر ہم مامور ہیں۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ کیا یہ تصوّر بھی کیا جا سکتا ہے کہ یہ فرمانِ رسُولؐ اللہ ہوگا۔ کیا نبیٔ اکرمؐ کبھی ایسا ارشاد فرما سکتے ہیں کہ "میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، ایک قرآنِ پاک اور دوسرے اہلِ بیت"۔ لیکن اِن چیزوں کو احادیثِ رسولؐ اللہ کہہ کر مسلمانوں کو ان کے صحیح ماننے پر مجبور کیا جاتا ہے اور یہ سب اس لئے کہ یہ چیزیں ان کتابوں (صحاح ستّہ) میں شامل ہو گئی ہیں جنہیں غلطی سے مبرّا تسلیم کیا جاتا ہے اور اگر کوئی یہ کہہ دے کہ ان کتابوں کے مشمولات کو

قرآن کی روشنی میں پرکھ کر دیکھ لینا چاہیئے اور جو قرآن کے خلاف ثابت ہوں' انہیں وضعی مان کر ان کتابوں سے نکال دینا چاہیئے، تو ایسا کہنے والے پر" منکرِ حدیث" کا لیبل لگا کر اسے کافر بنا دیا جاتا ہے۔ یہ حالت ہے ہمارے مذہبی طبقہ کی۔ اور اس کے بعد مسلمان انکوائری (تحقیقاتی) کمیٹیاں بٹھاتے ہیں کہ تحقیق کر کے بتائیں کہ اُن کے زوال کے اسباب کیا ہیں؟

خضر کیونکر بتائے کیا بتائے
اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے

تشکیلِ جماعت

حرفِ بے صوت اندریں عالم بُدیم
از رسالت مصرعِ موزوں شدیم

گزشتہ عنوان میں یہ حقیقت ہمارے سامنے آچکی ہے کہ نبئ اکرمؐ کی دعوتِ انقلاب کی کس شدت سے مخالفت ہوتی تھی اور حضورؐ کو اس مخالفت کے مقابلہ کے لیے کیسے کیسے جانگسل مصائب اور صبر آزما حوادث کا سامنا کرنا پڑتا تھا لیکن حضورؐ کے سامنے صرف اس مخالفت کا مقابلہ ہی نہیں تھا، اس سے کہیں زیادہ اہم اور محنت طلب فریضہ اپنی جماعت کی تشکیل و تربیت کا تھا۔ بلکہ یوں سمجھیے کہ تزاحم و تصادم کی وہ تخریب بھی اِسی تعمیر کے لیے تھی، چٹانوں کو توڑ کر سنگریزوں میں تبدیل کر دینا مقصود نہ تھا، مقصود یہ تھا کہ ان سنگریزوں کے ربط و ضبط اور ترتیب و تنظیم سے ایک ایسا محکم قلعہ تعمیر کیا جائے جو انسانیت کے لیے حصارِ امن و عافیت کا کام دے اور یہ ظاہر ہے کہ تعمیر کا کام تخریب سے بھی زیادہ صبر آزما اور استقامت طلب ہوتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ نبئ اکرمؐ کا نصبُ العینِ زندگی ایک ایسے نظام کا قیام تھا جس میں انسانی افکار و

تعمیرِ ملّت

اعمال حق سے ہم آہنگی و یک رنگی حاصل کر سکیں۔ اس نظامِ زندگی کے قیام و استحکام کے لیے جماعت کا وجود لاینفک تھا۔ لہٰذا، نبئ اکرمؐ کی یہ تمام جدّ و جہد اور سعی و کاوش،

درحقیقت، اس جماعت کی تشکیل و تعمیر کے لیے تھی۔ حضورؐ کو جب اللہ کی طرف سے حکم ملتا تھا کہ آپ حق و صداقت کی اس آواز کو بلند کرتے چلے جائیے وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ؁ خواہ یہ بات مشرکین پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے، تو اس سے مفہوم ان مخالفین کو چڑانا نہیں تھا۔ مفہوم یہ تھا کہ یہ آواز کسی نہ کسی طرح ان سعید روحوں کے عمقِ قلب تک جا پہنچے جن میں ہنوز زندگی اور حرارت کے آثار موجود تھے تاکہ وہ حقیقت کو محسوس کرلیں اور اس طرح حق و صداقت کی راہ پر آجائیں۔

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّ يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ط (۸/۴۲)

تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے، اتمامِ حجت کے بعد ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے، اتمامِ حجت کے بعد زندہ رہے۔

مخالفتوں کے اس ہجوم اور مزاحمتوں کے اس طوفان میں آپؐ کی یہ صوتِ سرمدی زندہ قلوب کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے تھی۔

بایں بہانہ دریں بزم محرمے جویم
غزل سرایم و پیغامِ آشنا گویم

آپ نے آہنگر کی فسان کے نیچے رکھی ہوئی ریت کو دیکھا ہوگا۔ فسان پر لگائے جانے والے فولاد کے ذرّات اُس ریت میں اس طرح رل جاتے ہیں کہ بڑی سے بڑی باریک بین نگاہ بھی انہیں متمیز نہیں کرسکتی لیکن جب مقناطیسی پتھر کا ٹکڑا اس ریت پر پھیر دیا جائے تو فولادی ذرّات تڑپ تڑپ کر ریت سے الگ ہوجاتے اور کہکشانی ستاروں کی طرح اس پتھر کے گرد جمع ہوجاتے ہیں۔ رسول کی آواز بھی اسی قسم کا مقناطیسی اثر اپنے اندر رکھتی ہے جس سے وہ تمام منتشر ذرّات جو اپنے اندر قبولِ کشش و جذب کی صلاحیت رکھتے ہیں، اس مرکزِ حق و صداقت کے گرد پروانہ وار جمع ہوجاتے ہیں اور ریت کے وہ ذرّات جن میں جذب و انجذاب کی صلاحیت نہیں ہوتی ان سے الگ ہوجاتے ہیں۔

لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَ يَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ ٥ (۸/۳۷)

(یہ سارا پروگرام اس لیے ہے کہ) خدا، خوشگوار نظریۂ حیات رکھنے والی جماعت کو جس میں برگ و بار لانے کی صلاحیت ہے، اس جماعت سے الگ کردے جو تخریبی نظریہ کی حامل ہونے کی وجہ سے،

نشو و بالیدگی کی تمام صلاحیتیں کھو چکی ہے۔

دو متمیز فریق یہ ہے وہ عملِ تفریق و تمیز جس سے نوعِ انسان دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایک وہ جو حق کے مطابق زندگی بسر کرنے کا تہیہ کرتا ہے۔ اس گروہ کو مؤمنین کی جماعت یا حزبُ اللہ کہا گیا ہے۔ دوسرا وہ جو اس نظامِ زندگی کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ غیر خدائی قوتوں کے وضع کردہ آئین و دساتیر کے ماتحت زندگی بسر کرتا ہے اسے کفّار کی جماعت یا حزبُ الشّیطان کے نام سے پکارا گیا ہے۔ یہی وہ تقسیم ہے جو زمان اور مکان کی حدود و قیود سے بلند ہو کر، نوعِ انسان کو تصوّرِ زندگی..... (IDEOLOGY) کے اختلاف کی بنا پر الگ الگ قوموں میں تقسیم کرتی ہے۔ آپ قرآنِ کریم میں بیان کردہ انبیاءِ کرامؑ کے تذکارِ جلیلہ پر ایک نگاہ ڈالیے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہر ایک نے اسی معیار کے مطابق انسانوں کی تقسیم کی اور اس طرح ایک ایسی جماعت کی تشکیل کی جو دنیا میں حق کے لیے جیئے اور حق کے لیے مرے ایسی ہی جماعت کی تعمیر نبیِ اکرمؐ کے پیشِ نظر تھی۔ جونہی کوئی شخص اس نظامِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا اقرار کرتا (کہ اسی کا نام ایمان لانا ہے) وہ دوسرے انسانوں سے کٹ کر اس نئی برادری کا فرد اور نئی جماعت کا ممبر بن جاتا اور اس طرح حبش کے غلام اور مکّہ کے سردار میں ایسے برادرانہ تعلقات پیدا ہو جاتے کہ دنیا کی کوئی آنکھ ان میں امتیاز نہ کر سکتی۔ دین کی رُو سے قومیت کی تشکیل کا معیار ہی یہ ہے۔

یہ حضرات، نبیِ اکرمؐ کے پیغامِ حیات آور میں حقیقت کی جھلک دیکھ کر، اس جماعت میں شامل ہو جاتے لیکن ان کے لیے ابھی بہت کچھ کرنے کا کام باقی ہوتا۔ یہ لوگ، بہرحال، اس سوسائٹی کے افراد اور اس ماحول کے پروردہ تھے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اس معاشرہ اور فضا کی خصوصیات ان کی زندگی کا جزو بن چکی تھیں۔ انہیں، ان کے اعماقِ قلب سے نکال کر، ان کی جگہ صحیح قرآنی خصوصیات کو جاگزیں کرنا، بڑا محنت طلب مرحلہ تھا۔ یہ کام تعلیم و تربیت کی رُو سے کیا جانا تھا جو حضورؐ کا اہم فریضۂ رسالت تھا۔ ان میں بعض کی حالت

تعلیم و تربیت کا مرحلہ یہ تھی کہ جمعہ کی نماز میں بیٹھے ہیں۔ حضورؐ خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں۔ باہر سے کسی بازی گر کی ڈگڈگی یا جرسِ کارواں کی آواز کان میں آئی اور یہ حضورؐ کو اسی عالم میں چھوڑ کر تماشا دیکھنے یا کاروبار کرنے کے لیے اُٹھ بھاگے۔

وَ اِذَا رَاَوۡا تِجَارَۃً اَوۡ لَہۡوَا انۡفَضُّوۡۤا اِلَیۡہَا وَ تَرَکُوۡکَ قَآئِمًا ؕ قُلۡ مَا عِنۡدَ اللّٰہِ خَیۡرٌ مِّنَ اللَّہۡوِ وَ مِنَ التِّجَارَۃِ ؕ وَ اللّٰہُ خَیۡرُ

الرّٰزِقِیۡنَ ؏ (۶۲/۱۱)

اور (اے پیغمبرؐ!) یہ لوگ جب کوئی تجارت یا کھیل کود دیکھتے ہیں تو اسی کی طرف لپک جاتے ہیں اور تمہیں (خطبہ میں) کھڑا ہوا ہی چھوڑ جاتے ہیں۔ تم ان سے کہہ دو کہ خدا کے پاس جو کچھ (دنیوی اور اُخروی) اجر ہے وہ اس کھیل تماشے اور تجارت سے (کہیں) بہتر ہے اور اللہ تو رزق دینے والوں میں سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔

ان لوگوں کو دنیا کی امامت (LEADERSHIP OF THE WORLD) کے قابل بنانا جوئے شیر کا لانا تھا۔ وہ قوم جو تمدّنی زندگی کے مبادیات تک سے ناآشنا تھی، جسے یہ کچھ سکھانے کی بھی ضرورت تھی کہ

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَدۡخُلُوۡا بُیُوۡتَ النَّبِیِّ اِلَّاۤ اَنۡ یُّؤۡذَنَ لَكُمۡ اِلٰی طَعَامٍ غَیۡرَ نٰظِرِیۡنَ اِنٰىهُ ۙ وَلٰكِنۡ اِذَا دُعِیۡتُمۡ فَادۡخُلُوۡا فَاِذَا طَعِمۡتُمۡ فَانۡتَشِرُوۡا وَ لَا مُسۡتَاۡنِسِیۡنَ لِحَدِیۡثٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكُمۡ كَانَ یُؤۡذِی النَّبِیَّ فَیَسۡتَحۡیٖ مِنۡكُمۡ ۫ وَ اللّٰهُ لَا یَسۡتَحۡیٖ مِنَ الۡحَقِّ ؕ وَ اِذَا سَاَلۡتُمُوۡهُنَّ مَتَاعًا فَسۡـَٔلُوۡهُنَّ مِنۡ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ (۳۳/۵۳)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! نبی کے گھروں میں یونہی اندر نہ چلے جایا کرو بجز اس صورت کے کہ کھانے کے لیے (پیغمبر تمہیں خود ہی بُلائے اور تمہیں اندر جانے کی) اجازت دے دی جائے اور اس صورت میں بھی تم اس کے کھانے پکانے کے برتنوں کو نہ تکا کرو۔ بلکہ جب تمہیں بلایا جائے تو اندر چلے جاؤ اور جب کھانا کھا کر فارغ ہو جاؤ تو اُٹھ آیا کرو۔ یہ نہ ہو کہ باتوں میں جی لگا کر جم کر بیٹھ جاؤ۔ تمہاری ان باتوں سے پیغمبر کو تکلیف ہوتی ہے مگر وہ (وسعتِ اخلاق کی وجہ سے) تمہیں کہتے ہوئے شرماتا ہے۔ لیکن خدا حق بات کہنے میں نہیں شرماتا۔ (لہٰذا آئندہ اس کی احتیاط رکھو) اور (دیکھو) جب امہات المؤمنین سے تمہیں کچھ سامان مانگنا ہوا کرے تو ان سے پردہ کے پیچھے سے مانگا کرو (یونہی اندر نہ گھس جایا کرو)۔

انہیں اس مقامِ بلند پر پہنچا دینا کہ وہ ساری دنیا کو جہانداری و جہانبانی کے آئین و دستور سے آگاہ کریں، بہت بڑا کام تھا۔ یہی ہے وہ عظیم المرتبت فریضہ جسے قرآنِ کریم نے تلاوتِ آیات، تعلیمِ کتاب و حکمت اور تزکیۂ قلوب سے تعبیر کیا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ
یُزَکِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَةَ ۗ وَ اِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ
ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۙ (٦٢/٢ ؛ ٢/١٢٩ ؛ ٢/١٥١ ؛ ٣/١٦٤)

(اور دیکھو) خدا کی وہ ذات ہے جس نے اَن پڑھ قوم میں انہی میں سے ایک پیغمبر بھیج دیا جو اُن کے سامنے خدا کے قوانین پیش کرتا ہے۔ انہیں کتاب کی تعلیم دیتا ہے اور یہ سمجھاتا ہے کہ اِن قوانینِ خداوندی کی غرض و غایت کیا ہے اور ان پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ کیا۔ وہ ان کی ذات کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ اس کے آنے سے پہلے وہ لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا تھے۔

اس فریضۂ رسالت میں تعلیم و تزکیہ کے الفاظ غور طلب ہیں۔ تعلیم کا تعلق بالعموم انسانی ذہن سے ہوتا ہے اور تزکیہ کا تعلق قلبِ انسانی سے۔ کسی شے کی حقیقت کو اس انداز سے واضح کر دینا کہ وہ دوسرے کی سمجھ میں آ جائے، تعلیم ہے، لیکن دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کے لیے ذہنی جلا ہی کافی نہیں اس کے لیے قلبی تبدیلی کی بھی ضرورت ہے جو، درحقیقت، اعمالِ انسانی کا سرچشمہ ہے۔ عمل کا جذبۂ محرکہ قوتِ ارادی ہے اور قوتِ ارادی کے منبع کو قلب کہا جاتا ہے۔ اسی کا نام "انسانی ذات کی نشوونما" ہے یعنی ان صلاحیتوں کی نشوونما جن سے شرفِ انسانیت عبارت ہے۔ ذات کی اسی نشوونما کو تطہیرِ قلب یا نگاہ کی تبدیلی کہا جاتا ہے قرآنِ کریم نے اسے "نفسیاتی تبدیلی" کی اصطلاح سے بھی تعبیر کیا ہے۔ اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کا ارادہ ہمیشہ صحیح سمت کی طرف رُخ کرتا ہے۔ دُنیا میں جسے "نیکی" کہا جاتا ہے، وہ نیک ارادے ہی کے مظاہر کا نام ہے۔ کانٹ کے الفاظ میں:

> بجز اچھے ارادے کے، دنیا بھر میں بلکہ دنیا سے باہر بھی کوئی ایسی شے نہیں جس کو علی الاطلاق بغیر کسی قید اور شرط کے اچھا کہا جا سکے۔

اخلاقیات کی تمام عمارت اسی بنیاد پر قائم ہے۔ بقول میکنزی "جس فعل میں ارادہ شامل نہیں اس کی اخلاقی حیثیت نہیں"۔ جس سوسائٹی کے نظام کی بنیاد تزکیۂ قلب و تطہیرِ فکر پر نہیں ہے، وہ نظام کبھی نشوونما

قلبی تبدیلی نہایت ضروری ہے

ارتقاءِ انسانیت کا کفیل نہیں ہو سکتا۔ اس کا نتیجہ ہمیشہ فساد ہوگا۔ بہترین دساتیر و قوانین بھی اطمینان بخش ب

نتائج مرتب نہیں کرسکتے جب تک ان قوانین کو نافذ کرنے والی جماعت اور ان پر عمل کرنے والی قوم کے قلب و نگاہ کی اصلاح نہ ہوچکی ہو۔ اسی کو قرآن نے "تزکیہ" کہا ہے جس کے لفظی معنی بڑھنے، پھولنے، پھلنے کے ہیں۔ اسی تزکیۂ نفس یا قلب و نگاہ کی تبدیلی کا نتیجہ تھا کہ اس قسم کی اونٹ چرانے والی قوم، چند دنوں میں، ایک نئی تہذیب کی مالک ہی نہیں بن گئی بلکہ اس نے دنیا میں تہذیب و تمدّن کے پیمانے بدل دیئے۔

یہ تھا "تزکیۂ نفس" کا قرآنی مفہوم لیکن ہماری بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ عجمی تصوّرات نے جہاں اور قرآنی اعمال و افکار پر رنگہ فریب پردے ڈالے ہیں، "تزکیۂ نفس" کے صحیح مفہوم کو بھی ایسی برفانی سِلوں کے نیچے دبایا ہے جس سے زندگی کی گرمیاں جمود و تعطّل کی افسردگیوں میں تبدیل ہوگئی ہیں۔ اب تزکیۂ نفس کے ساتھ ہی خانقاہوں میں چلّہ کشی اور زاویہ نشینی کا تصوّر سامنے آجاتا ہے۔ اس

اس کا غلط مفہوم

تصوّر کی رُو سے، دین کے احکام اور ان کی اطاعت "ظواہر پرستی" ہے اور تزکیۂ نفس کے لیے باطنی تعلیم کی ضرورت ہے۔ یہ تعلیم ان اسرار و رموز پر مشتمل ہے جسے رسول اللہؐ نے اُمّت کو کھلے بندوں نہیں دیا بلکہ مخفی طور پر، دو چار منتخب حضرات کو بتایا اور جو وہاں سے پھر سینہ بہ سینہ آگے منتقل ہوتا چلا آرہا ہے اور اسے منسوب کیا جاتا ہے اس ذاتِ گرامیؐ کی طرف جسے خدا کی طرف سے حکم تھا کہ

يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۶۷/۵)

اے پیغمبرؐ! تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر جو کچھ نازل ہوا ہے، اُسے (خدا کے بندوں تک) پہنچا دو (اور دشمنوں کی مخالفت کی کچھ پرواہ نہ کرو)، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو پھر، خدا کا پیغام نہیں پہنچایا (یعنی ادائے فریضۂ رسالت میں کوتاہی کی)، اور اللہ تمہارے مشن کو انسانوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ وہ اس گروہ پر (کامیابی کی) راہ نہیں کھولتا جس نے کفر کی راہ اختیار کی ہے۔

اور یہ ابلاغِ رسالت، مبین (کھلا کھلا، واضح) تھا۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ (۸۲/۱۶)

پھر (اے پیغمبرؐ!) اگر اس پر بھی لوگ اعراض کریں (اور سمجھنے بوجھنے کے لیے تیار نہ ہوں) تو (ان کی فکر چھوڑ دو)، تمہارے ذمّہ جو کچھ ہے وہ صرف یہی ہے کہ صاف صاف پیغامِ حق پہنچا دینا۔

اور خود اللہ تعالیٰ دیکھتا تھا کہ حضورؐ نے اس فریضہ کو سرانجام دے دیا۔

اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۙ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ۠ (۷۲/۲۷-۲۸)

(دیکھو، وہ) سوائے ان رسولوں کے جنہیں وہ منصبِ رسالت کے لیے چُن لیتا ہے (کسی کو بھی غیب کی باتوں پر مطلع نہیں کرتا)۔ ان کے آگے پیچھے (خدا کے) محافظ لگے ہوتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان رسولوں نے اپنے پروردگار کے پیغامات کو (لوگوں تک) پہنچا دیا ہے اور جو حالات ان کو درپیش ہوں، ان کو اپنے احاطۂ قدرت میں لے لے اور ہر چیز کا شمار اپنے پاس محفوظ رکھے۔

حضورؐ نے اس فریضۂ رسالت کو بایں حُسن و خوبی سرانجام دیا کہ حجۃ الوداع میں، پوری اُمت سے آپؐ نے دریافت فرمایا کہ اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ کیوں؟ میں نے پیغامِ خداوندی پہنچا دیا ہے یا نہیں؟ سب نے بیک زبان جواب دیا کہ ہاں! آپؐ نے پہنچا دیا۔ اس پر آپؐ نے خدا کو شاہد کر کے فرمایا کہ اَللّٰهُمَّ اَشْهَدْ ..... اے خدا! تو گواہ رہنا کہ میں نے تیرا پیغام سب تک پہنچا دیا۔ اور پھر لوگوں سے فرمایا فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ جو لوگ موجود ہیں ان کے ذمّے ہے کہ وہ ان تک پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں اور اس طرح تکمیلِ فریضۂ رسالت کے بعد حضورؐ دنیا سے تشریف لے گئے۔ غور کیجئے! رسول، پیغام کا پہنچانے والا، خدا اس فریضہ کی تکمیل کا ذمّہ لینے والا، ساری اُمّت شاہد کہ آپؐ نے پیغام پہنچا دیا لیکن اس کے باوجود ہم میں یہ عقیدہ موجود ہے کہ نہیں، حضورؐ نے ایک حصّہ چھپا کر رکھ لیا تھا اور وہ صرف سینہ بہ سینہ آگے منتقل ہوا ہے۔ اور اس عقیدہ کی سند؟ اوّل تو "اربابِ معرفت" کو ظاہری اسناد کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ ان کے رموز و اسرار کی طرح اسناد بھی سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی ہیں لیکن اس بنیادی عقیدہ کے لیے تو خود بخاری میں ایک روایت موجود ہے۔ بخاری کتاب العلم میں ہے۔

عن ابی ھریرۃ۔ قال حفظتُ عن رسول اللہؐ وعاءین۔ فاما احدھما فبثثتہ و اما الآخر فلو بثثتہ قطع ھذا البلعوم۔ (جلد اوّل صـ۲۴)

(حضرت) ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضورؐ سے دو برتن لے کر یاد رکھے۔ ایک کو تو میں (لوگوں کے سامنے) کھول چکا۔ رہا دوسرا، تو اگر اس کو بیان کر دوں تو یہ حلق کاٹ دیا جائے۔

اس کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جائے کہ ———— از باغباں شُداست کہ صیاد آں نکرد!

اس تزکیۂ نفس کے لیے جس کا ذکر قرآنِ کریم میں ہے حضورؐ نے کوئی باطنی تعلیم نہیں دی۔ وَمَا يَنۡبَغِىۡ لَهٗ (نہ ہی یہ آپؐ کے شایانِ شان تھا) حضورؐ نے ایک ایسا جماعتی نظام قائم کیا تھا جس میں احکامِ قرآن پر اس نہج و انداز سے عمل ہوتا تھا کہ ان اعمال کے درخشندہ نتائج واضح اور بیّن طور پر سامنے آجاتے تھے جس سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی تھی کہ یہ احکام زندہ حقائق ہیں مُردہ رسُوم نہیں ہیں۔ ان محسوس نتائج سے رُوح میں بالیدگی اور قلب میں کشاد پیدا ہوتی تھی۔ اسی کا نام **تزکیہ** تھا جس کا اظہار، روزمرّہ کے معاملاتِ زندگی میں حُسنِ سیرت اور بلندیٔ کردار کی شکل میں سامنے آتا تھا۔ اس جماعت کا معمول یہ تھا کہ زندگی کا جو معاملہ سامنے آتا، اس کے متعلق یہ دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق قرآنِ کریم میں کیا راہ نمائی دی ہے۔ اس کے بعد، اس پر غور کرتے کہ اس راہ نمائی کو ہم اپنے موجودہ حالات میں کس طرح رُوبہ عمل لا سکتے ہیں اور اس کے لیے کیا کیا عملی اقدامات کیے جا سکتے ہیں۔ ان امُور کا فیصلہ باہمی مشاورت سے کیا جاتا ———— خود نبیٔ اکرمؐ کو بھی خدا کا حکم تھا کہ آپؐ معاملات میں اپنی جماعت سے مشورہ کیا کریں اور مسلمانوں کو حکم تھا کہ اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کیا کریں۔ اس سلسلہ میں جو کام کسی کے ذمہ عاید کیا جاتا اُسے وہ انتہائی جذب و شوق سے سرانجام دیتا اور ہر موقع پر اپنی بلندیٔ سیرت اور حُسنِ کردار کا ثبوت پیش کرتا۔ یہ تھا نبیٔ اکرمؐ کی تعلیم و تربیّت کا نتیجہ۔ اس جماعت کے افراد کا ایک دوسرے سے تعلق برادرانہ تھا۔ قرآن نے انہیں ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا تھا جب کہا تھا کہ

اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَةٌ فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَ اَخَوَيۡكُمۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ۝ (۴۹/۱۰ ; ۳/۱۰۳ ; ۵/۹۱)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی، یاد رکھو!) تمام مومن (آپس میں) بھائی بھائی ہیں۔ لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان (ہمیشہ) صلح و صفائی رکھو (باہمی رنجشوں اور اختلافات کو راہ نہ دو) اور ہمیشہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو، تاکہ اللہ تمہارے لیے سامانِ نشوونما عطا کرے۔

اور امام کا تعلق جماعت سے ایک شفیق غمگسار اور دل سوز رفیق کا تھا۔

لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ عَزِيۡزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِيۡصٌ عَلَيۡكُمۡ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ۝ (۹/۱۲۸)

(اے افرادِ نسلِ انسانی !) تمہارے پاس (اللہ کا) ایک رسول آگیا ہے جو تم ہی میں سے ہے۔ تمہارا رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق گزرتا ہے۔ وہ تمہاری بھلائی کا بڑا ہی خواہش مند ہے اور (خصوصیت کے ساتھ) مومنوں کے لیے تو بڑا ہی شفقت رکھنے والا، رحمت والا ہے۔

اس جماعت میں جو افراد شامل ہوتے تھے ان میں اکثریت غریبوں اور ناداروں کی تھی۔ مکہ کی زندگی میں یہ جماعت کس انداز سے گزارہ کرتی تھی، اس کا اندازہ، صحیحین کی ایک روایت سے لگ سکتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ اشعر قبیلہ والوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے ہاں کھانا تھوڑا رہ جاتا یا ان کے بال بچوں میں ویسے ہی فاقوں کی نوبت آجاتی تو یہ لوگ اپنے اپنے کھانے کی چیزوں کو ایک جگہ جمع کر لیتے اور ایک برتن میں برابر حصے لگا کر آپس میں تقسیم کر لیتے؛

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان میں سے ہوں۔

یہ تھا انداز اُس زمانہ میں اس جماعت اور جماعت کے قائد (علیہ التحیۃ والسلام) کا۔ جو کچھ کسی کے پاس ہوتا، سب ایک جگہ اکٹھا کر لیتے اور مل بانٹ کر کھا لیتے ــــ جماعتِ مومنین کا شعارِ زندگی یہی ہے۔

مخالفت کے تلاطم اور نامساعدتِ حالات کے طوفان میں یہ مختصر سی جماعت اس صبر و سکون سے آگے بڑھ رہی تھی جیسے سیپ میں موتی، جو موجوں کے تھپیڑوں سے بے نیاز، بخود خزیدہ، اپنی خودی کو پختہ تر کیے چلا جاتا ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، شروع شروع میں اس جماعت کی اکثریت غریبوں اور ناداروں پر مشتمل تھی۔

جماعت کی توسیع

لیکن رفتہ رفتہ اُوپر کا طبقہ بھی اس دعوت سے متاثر ہونے لگا۔ حضورؐ کے چچا حضرت حمزہؓ ۶ نبوی میں اسلام لے آئے۔ قریش میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اس کے دو ہی چار روز بعد حضرت عمرؓ بھی اس جماعت میں شامل ہو گئے۔ اس مقام پر ایک اہم حقیقت کا سامنے لانا ضروری ہے۔ آپ قرآنِ کریم کو شروع سے اخیر تک دیکھئے۔ اس میں یہ صورت ہر مقام پر نظر آئے گی کہ حضرات انبیاء کرامؑ کی دعوت پر سب سے پہلے لبیک کہنے والے، غریب اور محنت کش ہوتے تھے اور آسودہ حال، دولت مند طبقہ کی طرف سے اس دعوت کی ہمیشہ مخالفت ہوتی تھی۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ یہ دعوت غریبوں اور محنت کشوں کو ان کے وہ حقوق دلانے کے لیے دی جاتی تھی جنہیں مستبد سرمایہ پرست

طبقہ نے سلب کر رکھا تھا۔ اس لیے غریبوں کا طبقہ سب سے پہلے اس کی طرف آتا تھا اور مرفہ الحال لوگوں کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوتی تھی۔ اگر یہ (آخر الذکر) طبقہ، اس دعوت کی کامیابی کو دیکھ کر اس طرف آنا بھی چاہتا تھا تو اس کا مطالبہ یہ ہوتا تھا کہ وہ نبی، غریبوں کو اپنے ہاں سے نکال دے۔ کیونکہ وہ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے کہ جس طبقہ کو وہ معاشرہ میں اِس قدر ذلت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں، وہ اس تحریک میں اُن کا ہمسر ہو کر سامنے آئے ــــ ہمسر ہو کر ہی نہیں بلکہ السابقون الاولون ہونے کی وجہ سے، اس میں ان کا مقام، اِن بعد میں آنے والوں کے مقابلہ میں، بلند ہو۔ اس آسمانی دعوتِ انقلاب کو سب سے پہلے حضرت نوحؑ نے پیش کیا۔ قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ ان کی قوم کے سرداروں نے اس کی سخت مخالفت کی اور جو لوگ اس میں شامل ہوئے ان کے متعلق وہ نہایت حقارت آمیز انداز میں کہتے وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ (۱۱/۲۷) "یہ لوگ جو تیرا اتباع کرتے ہیں، یہ ہمارے معاشرہ کے ذلیل ترین افراد ہیں۔ نہ کسی عقل و فکر کے مالک، نہ مال و دولت والے۔ ہم ان کے ساتھ اس جماعت میں کیسے شامل ہو جائیں؟" یہ مقام، اس انقلاب کے داعی کے لیے بڑا آزمائش طلب ہوتا ہے۔ ایک طرف، قوم کا صاحبِ اثر و نفوذ طبقہ ہے جو مال و دولت بھی فراواں رکھتا ہے، جس کے تحریک میں شامل ہونے سے، اسے بڑی تقویت پہنچ سکتی ہے۔ دوسری طرف غریبوں کا طبقہ ہے جس کا تحریک کے لیے موجبِ تقویت ہونا تو ایک طرف، وہ تحریک پر بوجھ ہے۔ عام تحریکوں میں نگاہیں، اول الذکر کی طرف ہی اُٹھتی ہیں لیکن آسمانی دعوت کا انداز و معیار اس سے مختلف ہوتا ہے۔ اس میں وزن، ایمان و عمل اور خلوص و دیانت کا ہوتا ہے نہ کہ دنیاوی وجاہت کا۔ اس لیے یہ داعی، ان دولت مندوں کے اس قسم کے مطالبے کے جواب میں صاف صاف کہہ دیتا ہے کہ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ (۱۱/۲۹) میں تمہاری خاطر، ان غریبوں کو دھتکار نہیں سکتا جو نہایت خلوص و دیانت سے اس دعوت کی صداقت پر ایمان لائے ہیں۔ تم اگر اسی طرح خلوص و دیانت سے اس میں شریک ہونا چاہتے ہو تو بسم اللہ، چشمِ ما روشن دلِ ما شاد۔ لیکن اگر تم اپنی اسی قسم کی شرطیں منوانا چاہتے ہو تو اس کی اس تحریک میں گنجائش نہیں۔

تشکیلِ جماعت کے سلسلہ میں یہی تلقین نبیٔ اکرمؐ سے کی گئی۔ آپؐ سے کہا گیا کہ یہ جو غریب اور محنت کش تمہارے ساتھ آملے ہیں وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ (۱۵/۸۸) انہیں اپنے سایۂ عاطفت میں نہایت نرمی سے رکھو۔ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ (۱۵/۸۸) اور ان

دولت مندوں کو جو طرح طرح کا سامانِ آسائش میسر ہے، اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھ۔ یہی السابقون الاولون کی وہ جماعت جس کے متعلق کہا کہ هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ ۙ (۶۲) اے رسولؐ! اللہ نے اپنی نصرت اور اس جماعت کے ذریعے تمہیں تقویت پہنچائی۔ بلکہ یہاں تک کہ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۠ (۶۴) تیرے لیے خدا کی نصرت اور یہ جماعتِ مومنین کافی ہے۔ یہی غریبوں اور ناداروں کی وہ جماعت جو اس انقلابی تحریک کا اوّلین خمیر بنی۔ ان میں، بعد میں، صاحبِ اثر و رسوخ طبقہ کے جو حضرات شامل ہوئے، وہ بھی علیٰ وجہ البصیرت شامل ہوئے اور ان کا مقام اس اعتبار سے بلند ہے کہ انہوں نے اتنی آسائشوں کی زندگی کو چھوڑ کر اس قدر مصائب و تکالیف کا راستہ بطیبِ خاطر اختیار کیا۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

اُس زمانہ میں وسائلِ نشر و اشاعت اور ذرائع رسل و رسائل اس طرح عام نہیں تھے جس طرح آج کل ہیں۔ بلکہ اگر آج کے مقابلہ میں دیکھا جائے تو ان ذرائع و وسائل کی کمی کیا، فقدان تھا۔ اس لیے اس وقت کسی تحریک کے اغراض و مقاصد کے عام کرنے کا یہی طریقہ تھا کہ انفرادی طور پر مبلّغین کو مختلف اطراف و انواح میں بھیجا جائے یا لوگوں کی اجتماعی تقاریب سے فائدہ اٹھایا جائے۔ مکّہ میں یہ دوسری صورت زیادہ موزوں تھی۔ اس لیے کہ تمام قبائلِ عرب حج کے موقع پر مکّہ میں جمع ہو جاتے تھے۔ داعیانِ انقلابِ اسلام کی یہ مختصری

حج کے موقعہ پر دعوت

جماعت اس اجتماع سے فائدہ اٹھاتی اور اگرچہ قریش کی مخالفت کی شدّت ان دنوں اور بھی بڑھ جاتی لیکن، بایں ہمہ، یہ سرشارانِ کیفِ حق و صداقت، خطرات و صعوبات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے، این و آں سے بے نیاز، اِس دعوتِ انقلاب کی نشر و اشاعت میں منہمک نظر آتے۔ اس طرح نیّرِ اسلام کی تابندہ شعاعیں مکّہ سے باہر تک بھی پھیل گئیں۔ اس دعوت پر اگرچہ مختلف قبائل کے افراد نے لبیک کہا لیکن اس شجرِ مقدّس کی باریابی کے لیے جو زمین سب سے زیادہ سازگار نکلی، وہ ارضِ یثرب تھی۔

یثرب کا شہر (جو بعد میں مدینۃ النبی کے ممتاز لقب سے باعثِ فروغِ نورِ دیدۂ عالمیان ہوا اور

مدینہ کے باشندے

پھر مختصر ہو کر مدینہ کے نام سے وجہِ تسکینِ خاطرِ انام) ایک قدیم بستی تھی جہاں یہودی ایک مدّت سے آباد تھے۔ جب یمن میں مشہور سیلاب آیا ہے،

تو وہاں کے کچھ لوگ یہاں آکر آباد ہوئے۔ ان میں سے اوس اور خزرج دو بھائی مشہور سردار تھے۔ انہی دو کے نام سے دو خاندانوں کی بنیاد پڑی۔ یہودیوں کے علاوہ یثرب کی آبادی انہی دو خاندانوں پر مشتمل تھی اور یہی وہ دو فرخندہ اختر قبائل تھے جو آسمانِ سعادت پر انصار کے درخشندہ ستارے بن کر چمکے۔ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ ؕ ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۵/۱۱۹۔

یہودی وہاں اثر و اقتدار بھی کافی رکھتے تھے اور انصار کے مقابلہ میں صاحبِ علم بھی زیادہ تھے اس لئے انصار پر ان کا اچھا خاصا اثر تھا۔ یہ یہودیوں سے، انبیائے سابقہ کے قصے کہانیاں بھی سنتے رہتے تھے اور یہودی عقیدہ کے مطابق ایک آنے والے پیغمبر کے نام سے بھی آشنا تھے۔ یہ لوگ بھی حج کے موقع پر مکہ آتے تھے۔ ۱۰ سنہ نبوی میں جب یہ لوگ حج کے لیے آئے تو نبیٔ اکرمؐ نے قبیلۂ خزرج کے کچھ لوگوں تک اسلام کی دعوت پہنچائی۔ ان میں سے چھ حضرات نے ایک ساتھ اسلام قبول کر لیا۔ دوسرے سال بارہ حضرات یثرب سے آئے اور بیعت سے مشرف ہوئے۔ انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ کوئی معلم ان کے ساتھ بھیج دیا جائے جو انہیں اسلامی احکام کی تعلیم دے۔ حضورؐ نے مصعبؓ بن عمیر کو اُن کے ساتھ روانہ فرما دیا۔ ان کی تبلیغ سے گھر گھر اسلام کا چرچا ہونے لگا۔ اگلے سال حج کے زمانہ میں بہتّر آدمی مکہ میں آئے اور حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

بیعت کا مفہوم

جب یہ لوگ بیعت کر رہے تھے تو سعد بن زرارہ نے کھڑے ہو کر کہا کہ بھائیو! یہ بھی خبر ہے کہ کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ یہ عرب و عجم اور جن و انس سے اعلانِ جنگ ہے۔" سب نے کہا کہ ہاں! ہم اسی پر بیعت کر رہے ہیں۔!!

"عرب و عجم اور جن و انس سے اعلانِ جنگ" اللہ اکبر! ان حضرات نے اسلام کی حقیقت کو کس قدر صحیح طور پر سمجھا تھا۔ "دنیا کی ہر طاغوتی قوت کے خلاف اعلانِ جنگ" یہ تھا حقیقی اسلام! اور آج؟ —— باطل کی ہر قوت کے سامنے جھک جانا اور اس کی عطا فرمودہ "آزادی" کی حدود میں چند رسموں کا ادا کر لینا —— یہ ہے آج کا اسلام!

اس طرح یہ سلسلۂ رُشد و ہدایت آہستہ آہستہ بتدریج آگے بڑھتا گیا، نہایت خاموشی سے۔ جیسے چاندنی کی نورانی چادر فرشِ صحرا پر بچھتی جائے یا نسرین و یاسمن کی شمیم جاں نواز، نسیمِ صبحگاہی کے غیر محسوس جھونکوں کے ساتھ فضائے عالم کو معطر کرتی جائے —— آہستہ آہستہ! بتدریج!!

بتدریج

اس تمہید میں پورا تیرہ (۱۳) برس کا عرصہ صرف ہوگیا۔ ذرا غور کیجیے کہ حضورؐ کی نبوت کی کل عمر تیئیس (۲۳) برس کی تھی اور یہ نبوت تمام نوعِ انسانی کے لیے قیامت تک کے لیے جاری و ساری رہنی تھی۔ اِس تیئیس برس کی مدت کو قیامت تک پھیلا کر دیکھئے۔ ایک ایک سانس ایک ایک صدی کے برابر دکھائی دے گا یا شاید اس سے بھی زاید۔ اتنا گراں قیمت وقت اور اس میں سے نصف سے زیادہ (یعنی تیرہ برس) اسی تمہید میں صرف ہوگیا۔ اور اس تیرہ برس کی تگ و تاز اور سعی و کاوش کا ماحصل ؟ زیادہ سے زیادہ تین سَو افراد کی جماعت! عام پیمانوں سے ناپئے تو نتائج کی یہ رفتار کسی تحریک کے لیے کامیاب قرار نہیں دی جا سکتی۔ لیکن جن کی نگاہیں حقائق پر ہیں، وہ جانتے ہیں کہ باقی دس برس کے سارے نتائج جو آج تک ہر مورّخ کو محوِ حیرت کیے ہوئے ہیں، اِنہی تیرہ برس کی "سُست رفتار" تمہید کے پیدا کردہ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک صحیح داعیٔ انقلاب کی نگاہ اپنی جماعت کے اعداد و شمار پر نہیں ہوتی بلکہ افرادِ جماعت کے دل و دماغ پر ہوتی ہے۔ وہ افرادِ جماعت کو گنتا نہیں تولتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایک ہیرا۔ کوئلہ کے ہزاروں من ڈھیر پر بھی بھاری ہوتا ہے۔ اس لیے وہ کوئلے (CARBON) کو ہیرے میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتا ہے، کوئلے کے انبار جمع کرنے کی نہیں۔ اور یہ آپ جانتے ہی ہیں کہ کوئلے کو ہیرا بننے کے لیے کتنی لمبی مدت درکار ہوتی ہے۔ وہ اپنی تعلیم و تربیت کی نگہِ گرم سے اُن کی رگوں میں دوڑنے والے خون کو برقِ تپاں میں تبدیل کر دیتا ہے کہ باطل کے جس انبار پر شعلہ ریز ہوں، اُسے راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیں۔ وہ انہیں ایمانِ محکم اور عملِ پیہم کے آتش دانوں سے گزار کر ان کی خودی کا استحکام کرتا ہے اور اس طرح ان میں وہ فولادی جوہر پیدا کر دیتا ہے کہ ان کا ہر نفس شمشیرِ عریاں بن جاتا ہے۔ لیکن قطرے کو گہر بننے اور آہنِ خام کو شمشیرِ جوہر دار میں تبدیل ہونے کے لیے ہزار جگر گداز مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ رسولؐ کی تعلیم و تربیت، افرادِ جماعت کو انہی صبر آزما مراحل سے گزارتی تھی۔ حضورؐ نے تیرہ برس کی مدت میں قدسیوں کی ایک ایسی ہی جماعت تیار کی جو گنتی میں کچھ زیادہ نہیں تھی لیکن جس نے دنیا میں وہ انقلاب پیدا کر دیا جسے آسمان کی آنکھوں نے ایک ہی بار دیکھا ہے اور جسے دوبارہ دیکھنے کے لیے وہ آج تک سرگرداں ہیں۔ سطحِ بیں

مکّی اور مدنی زندگی

نگاہیں اس تیرہ (۱۳) برس اور بعد میں آنے والے دس (۱۰) برس میں ایک حدِ فاصل قائم کرتی ہیں اور اس (مکّی) زندگی کو نبوّت کے جمالی پہلو کا ترجمان بتاتی ہیں اور دوسری (مدنی) زندگی کو جلالی گوشے کا مظہر لیکن یہ مکّی اور مدنی کا فرق اور جمالی اور جلالی کا امتیاز—

مقامِ نبوّت سے بے خبری کی دلیل اور منصبِ رسالت سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ اس غلط نگہی کا نتیجہ ہے کہ مغرب کے مستشرق حضورؐ کو (معاذ اللہ) ایک (OPPORTUNIST) ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قیامِ مکہ میں آپؐ کی زندگی محض "مذہبی مصلحین" کی سی تھی جس میں آپؐ کے پیشِ نظر عربوں کی اخلاقی اصلاح تھی۔ مدینہ پہنچ کر جب قوت اور جمعیت حاصل ہو گئی تو آپؐ کو سلطنت قائم کرنے کا خیال پیدا ہو گیا جس کے لیے لڑائیوں کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، یہ خیال مقامِ نبوّت سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔ ایک رسول کے سامنے یومِ بعثت ہی سے ایک واضح اور غیر مبہم نصب العین ہوتا ہے اور اس نصب العین کا حصول اس کی زندگی کا مقصد۔ اس کی زندگی پہلے دن سے آخری دن تک ایک ہی نصب العین کی طرف رواں اور ایک ہی نظام کی پابند ہوتی ہے۔ فرق صرف اس کے پروگرام کی تقسیم کا ہوتا ہے، یعنی کبھی تیاری کا زمانہ ہوتا ہے اور کبھی تیار شدہ اجزاء و عناصر کو بروئے کار لانے کا۔ یہ نہیں کہ تیاری کے زمانہ میں اس کا عقیدہ اور نصب العین کچھ اور ہوتا ہے اور بعد کے زمانہ میں کچھ اور۔ ایک ماہرِ فنِ تعمیر (ARCHITECT) کے پنسل کے پہلے نشان سے لے کر تیشۂ معمار کی آخری ضرب تک۔ تمام مراحل، عمارتِ پیشِ نظر کی تکمیل ہی کے اجزاء ہوتے ہیں، انہیں الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔

اس تیرہ برس کے عرصہ میں اس کاروانِ ہدایت و رشادت کا ہر قدم آہستہ آہستہ اس نصب العین کی طرف بڑھ رہا تھا جو پہلے دن سے ان کے لیے معین ہو چکا تھا اور جس تک پہنچنا ان کی زندگی کا منتہیٰ تھا۔ اس وادی میں، اس کاروانِ سعادت کے نقوشِ قدم کے تابندہ ستارے، ہر دیکھنے والی آنکھ سے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ مسلکِ حق و صداقت کا تقاضا ہے کہ ؎

بالشۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

ہجرت

اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است

دعوت وتبلیغ کا وہ سلسلہ جس کا ذکر گزشتہ اوراق میں ہو چکا ہے، برابر جاری رہا اور وہ فولادی ذرّات جو اس ریت کے ڈھیر میں پوشیدہ تھے، اس طرح اُڑ اُڑ کر اس مقناطیسِ حق وصداقت سے آکر ملتے رہے جس طرح حضرت ابراہیمؑ کے تمثیلی واقعہ میں پرندے آپ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے دوڑے آئے تھے۔ حتّٰی کہ یہ تمام فولادی ذرّات جن میں اس مرکزِ رُشد وہدایت کے گرد جمع ہونے کی صلاحیت باقی تھی، جامد پتھر کے ذرّوں سے الگ ہو گئے۔ تحریکِ انقلابِ آسمانی کا یہ پہلا دور اسی عملِ تلخیص اور اپنی جماعت کی تعمیر و تطہیر کے لیے تھا۔

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ○ (۳/۱۴۱)

تاکہ جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں، انہیں محکم بنا دے اور جو منکرینِ حق ہیں، انہیں کمزور کر کے مٹا دے۔

اب پیچھے وہی لوگ رہ گئے جو قوّت و دولت کے نشہ میں بدمست، محض بربنائے بغض وعداوت، مخالفت کیے جا رہے تھے۔ تمرّد وسرکشی نے ان سے عقل وبصیرت اور دانش وبینش کی تمام صلاحیتیں سلب کر لی تھیں۔ تعصّب وجہالت نے ان کی آنکھوں پر پردے ڈال رکھے تھے اور انکار وجحود نے ان کے دلوں پر مہریں لگا رکھی تھیں۔ چنانچہ ان کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ

سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ۝ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ وَعَلٰى سَمۡعِهِمۡ ؕ وَعَلٰۤى اَبۡصَارِهِمۡ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ۝ (۲/۶-۷)

(اے پیغمبرؐ!) تم انہیں (انکارِ حق کے نتائج سے) آگاہ کرو یا نہ کرو، وہ کبھی ماننے والے نہیں۔ (انہوں نے روشنی کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو آنکھیں بند کر لیتا ہے اس کے لیے تاریکی ہی تاریکی ہوتی ہے۔ پس اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہے کہ) ان کے دلوں اور کانوں پر خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے مُہریں لگ چکی ہیں اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے (کوئی بات کتنی ہی سچی ہو، سمجھ نہیں سکتے۔ کوئی آواز کتنی ہی اُونچی ہو، سُن نہیں سکتے۔ کوئی چیز کتنی ہی روشن ہو، دیکھ نہیں سکتے)۔ سو (جن لوگوں نے اپنا یہ حال بنا لیا ہے، وہ کبھی ہدایت نہیں پا سکتے۔ کامیابی کی بجائے) ان کے لیے عذابِ جانکاہ ہے۔

یہ وہ لوگ تھے کہ نہ انہیں حسنِ عمل کے خوشگوار نتائج کی بشارات، قبولیتِ حق پر آمادہ کر سکتی تھیں اور نہ ہی ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے انہیں آگاہ کرنا، ان کے دل میں نرمی اور جھکاؤ پیدا کر سکتا تھا۔ لہٰذا ان کے

جو باقی رہ گئے

متعلق نبی اکرمؐ سے کہہ دیا گیا کہ ان کے پیچھے سر کھپانے کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ نہیں سنتے، تو ان سے اعراض برتئے۔ یہ اسی سلوک کے مستحق ہیں۔

فَاَعۡرِضۡ عَنۡ مَّنۡ تَوَلّٰى ۙ عَنۡ ذِكۡرِنَا وَلَمۡ يُرِدۡ اِلَّا الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا ؕ (۵۳/۲۹)

تو (اے پیغمبرؐ!) تم ان لوگوں سے اعراض برتو جو ہمارے ذکر سے گردن موڑ کر چل دیتے ہیں اور جو دنیوی زندگی کے مفاد کے سوا کسی اور بات کا ارادہ ہی نہیں رکھتے۔

اس سے قبل جب ہنوز ان لوگوں سے کچھ توقعات باقی تھیں، یہ کہا گیا تھا کہ

فَاِنۡ اَعۡرَضُوۡا فَقُلۡ اَنۡذَرۡتُكُمۡ صٰعِقَةً مِّثۡلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوۡدَ ؕ (۴۱/۱۳)

پس (اے پیغمبرؐ!) اگر وہ منہ موڑ کر چل دیں تو ان سے کہہ دو کہ میں نے تمہیں (انکار و بدعملی کے نتیجہ میں) قومِ عاد و ثمود والی کڑک کی طرح (خدا کے عذاب کی) ایک کڑک سے آگاہ کر دیا اور اس طرح اپنا فرض پورا کر دیا ہے)۔

اعراض

لیکن اب ان کی طرف سے جب پوری پوری مایوسی ہو گئی، تو کہہ دیا گیا کہ

فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَ قُلْ سَلٰمٌ ؕ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۠ (۴۳/۸۹)

پس (اے پیغمبرؐ!) ان سے (اب) درگزر کرو اور کہہ دو کہ اب تمہارا خدا حافظ! چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد وہ خود ہی جان لیں گے (کہ جو کچھ تم کہتے تھے اس میں کس قدر صداقت تھی)۔

اس لیے کہ انہیں حکمت و موعظت کے ہر طریق و نصیحت و عبرت کے ہر انداز سے سمجھا کر دیکھ لیا۔ نخوت و تکبّر انہیں سمجھنے کی طرف مائل ہی نہیں ہونے دیتا۔ اس لیے ان کی ہلاکت یقینی اور تباہی اٹل ہے۔

وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ۙ حِكْمَةٌ ۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۙ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ ۘ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ ۙ (۵۴/۴-۶)

اور یہ واقعہ ہے کہ ان کے سامنے وہ خبریں بھی آچکی ہیں جن میں کافی تنبیہ موجود تھی اور انتہائی عقل و بصیرت کی باتیں بھی آچکیں۔ مگر ان تمام آگاہ کرنے والی باتوں نے ان پر کچھ بھی تو اثر نہ کیا۔ لہٰذا (اے پیغمبرؐ! اب) تم بھی ان سے اعراض برتو اور انہیں اس دن کے حوالہ کردو جس دن پکارنے والا (قانونِ مکافات) انہیں ایک سخت چیز (یعنی عذابِ الٰہی) کی طرف پکارے گا (تب انہیں حقیقت معلوم ہوگی)۔

رسول کے ذمہ پیغاماتِ الٰہی کا پہنچا دینا ہے، دلوں کی حالت کا بدل دینا نہیں۔

فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَ مَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۠

(۳/۱۹ ; ۴/۴۳ ; ۶۴/۱۲)

پھر اگر یہ لوگ تم سے جھگڑا کریں تو (اے پیغمبرؐ!) تم کہہ دو، کہ میرا اور میرے پیروؤں کا طریقہ تو یہ ہے کہ ہم نے اللہ کے قوانین کے آگے سرِ اطاعت جھکا دیا ہے۔ اور اہلِ کتاب اور (عرب کے) لوگوں سے پوچھو، تم بھی اللہ (کے قانون) کے آگے جھکتے ہو یا نہیں؟ اگر وہ جھک جائیں تو (سارا جھگڑا ختم ہوگیا، اور) انہوں نے سلامتی کی راہ پالی۔ اگر رُوگردانی کریں، تو پھر (جن لوگوں کو خدا پرستی ہی سے انکار ہو اور محض تقلیدِ آباء ہی کو دین داری سمجھ رہے ہوں ان کے لیے دلیل و موعظت کیا سود مند ہوسکتی ہے؟ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور اپنا کام

کیسے جاؤ) تمہارے ذمہ جو کچھ ہے وہ پیامِ حق پہنچا دینا ہے اور اللہ اپنے بندوں کے حال سے غافل نہیں۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔

آپ ان پر داروغہ نہیں مقرر کیے گئے۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ؕ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ

(۴۲/۴۸ ؛ ۴/۸۱ ؛ ۸۸/۲۳ ؛ ۹۶/۱۳)

لہٰذا (اے پیغمبرؐ!) اگر وہ اعراض برتیں (تو جانے دو) ہم نے تمہیں ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا۔

اس لیے آپ پر اس اعراض سے کوئی ملامت نہیں آسکتی۔ آپ نے اپنا فریضہ ادا کر دیا۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ۟ (۵۱/۵۴)

لہٰذا (اے پیغمبرؐ!) تم ان سے (آئندہ) اعراض برتو۔ (اس کی وجہ سے) تم کسی ملامت کے مستحق نہیں ٹھہرو گے!

نبیٔ اکرمؐ ان بدنصیبوں کی فلاح و سعادت کی فکر میں جس طرح اپنی جان گھلا رہے تھے، اس کا تفصیلی ذکر سابقہ عنوان میں ہمارے سامنے آچکا ہے۔ ایک مشفق طبیب کی طرح آپؐ شقاوت و قساوتِ قلبی کے ان مریضوں کی صحت یابی کی فکر میں دن رات غلطاں و پیچاں رہتے۔ ادائیگیٔ فرض کے احساس اور اُن

جوشِ تبلیغ اور شدتِ غم گساری

لوگوں کو ہلاکت اور تباہی سے بچانے کی فکر کے انہماک میں آپؐ این و آں سے بے نیاز، انتہائی جذب و شوق کے عالم میں آگے بڑھتے چلے جاتے تا آنکہ بعض مقامات پر اس علّام الغیوب اور واقفِ احوالِ قلوب کو اپنے دستِ تادیب سے حضورؐ کو روکنا پڑتا۔ اس لیے کہ حضورؐ دلوں کے حالات سے واقف نہیں تھے آپؐ کی نگاہ صرف ظواہر تک جا سکتی تھی۔ اس لیے آپ ان لوگوں کی انتہائی مخالفت و معاندت کے باوجود، ان کی طرف سے اپنی اُمیدیں قطع نہیں ہونے دیتے تھے۔ یہ خیال کہ ان میں سے کوئی بھی اپنی بدبختیوں کی وجہ سے ہلاک نہ ہو جائے

اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖ (۶/۷۰)

کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی انسان اپنی بدعملی کی وجہ سے ہلاکت میں چھوڑ دیا جائے۔

آپ کو دعوت و تبلیغ کی راہ میں آگے ہی آگے بڑھائے جاتا تھا۔ اس لیے کہ آپ انسانی زندگی کی قیمت سے

آگاہ تھے۔ آپ کو خوب معلوم تھا کہ ایک انسان کو ہلاکت سے بچا لینا گویا تمام نوعِ انسانی کو ہلاکت سے بچا لینا ہے۔

وَ مَنْ اَحْیَاھَا فَکَاَنَّمَآ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ (۵/۳۲)

اور جس کسی نے کسی ایک کی زندگی بچالی، تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی دے دی۔

اس لیے وفورِ رافت ومحبت اور نوعِ انسانی سے جوشِ ہمدردی وغمگساری میں آپ کسی مقام پر نہیں رُکتے تھے۔ لیکن خدائے علیم وخبیر کی نگاہِ لطیف ظواہر سے نیچے اُتر کر دل کی گہرائیوں تک پہنچتی تھی اور جانتی تھی کہ جن لوگوں میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہی ان کے بچانے کی فکر میں سعی وعمل کوئی مفید نتیجہ مرتب نہیں کر سکتی۔ اور چونکہ ایک رسول، اور بالخصوص رسولِ خاتم النبیینؐ کی حیاتِ مقدسہ کا ایک ایک لمحہ نہایت گراں بہا اور عظیم القدر ہوتا ہے، اس لیے ایسے قیمتی وقت کو یوں ضائع نہیں ہونے دیا جا سکتا۔ یہ ہے علت اُن لوگوں سے اعراض برتنے کے حکم کی۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ آپؐ اب اُن لوگوں کا خیال چھوڑ دیجیے جو کسی بات کو سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں اور یہی وقت اپنی جماعت کی تنظیم وتطہیر میں صرف کیجیے کہ اس کے بعد کا سارا پروگرام انہی کے ہاتھوں تکمیل تک پہنچنا ہے یا کسی نئے مقام میں، ان لوگوں تک پیغامِ خداوندی پہنچانے میں، جن میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہو۔

اعراض کیوں؟

لِّیُنْذِرَ مَنْ کَانَ حَیًّا وَّ یَحِقَّ الْقَوْلُ ۔ (۳۶/۷۰)

تاکہ (اے پیغمبرؐ! تم (انکار وبدعملی کے نتائج سے) ان لوگوں کو آگاہ کر دو جن میں زندگی کے کچھ آثار ہیں۔

اور (اس طرح خدا کی) بات پوری ہو جائے۔

ان لوگوں کی طرف سے اس قسم کا اعراض خفگی کا اظہار نہیں تھا۔ انتہائی رنج وغم اور ان کی طرف سے شدتِ یاس ونومیدی کا اظہار تھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کسی طبیبِ مشفق کا مریض کی بالیں سے ایک آہِ سرد بھر کر اُٹھ جانا، کس قیامت کے آنے کی پیش گوئی ہوتا ہے؟ اس اعراض سے یہی مفہوم تھا۔ یہ اس امر کا اعلان تھا کہ انگلی کا ناسور لاعلاج ہو چکا ہے۔ یہ آخری وعید تھی کہ اب ان لوگوں کو تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُکُمْ عَلٰی سَوَآءٍ ؕ وَ اِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ۝ (۲۱/۱۰۹)

پھر اگر وہ رُوگردانی کریں، تو کہہ دے، میں نے تمہیں (تمہاری غلط روش کے نتائج سے) یکساں طور پر

خبردار کر دیا ہے۔ یہ تو میں نہیں جانتا کہ جس بات کا وعدہ کیا گیا ہے اُس کا وقت قریب آ لگا ہے یا ابھی دُور ہے (تاہم وہ ٹلنے والی نہیں)۔

آپؐ سے کہا گیا کہ ان لوگوں کو اب خدا کے قانونِ مکافات کے حوالے کر دو جو اپنی کارفرمائی اور نتیجہ براری میں نہ کسی کی رعایت کرتا ہے نہ کسی پر ظلم۔

فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ؕ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ (۶۸/۴۴)

چنانچہ (اے پیغمبرؐ!) ان لوگوں کو جو اس بات (یومِ مکافاتِ عمل) کو جھٹلا رہے ہیں، ہم پر چھوڑ دو۔ ہم آہستہ آہستہ ان کی گرفت کرتے جائیں گے جہاں سے ان کو پتہ بھی نہ چلے گا۔

مُہلت کی گھڑیاں

بس اتنا ہے کہ یہ نتائج و عواقب اس کے قانونِ مُہلت کے ماتحت وقتِ معیّن پر برآمد ہوتے ہیں۔ اگر اس وقفہ سے بھی فائدہ نہ اُٹھایا جائے اور جس غلط روش پر چل رہے ہیں اس سے مُنہ نہ موڑا جائے، تو پھر وہ نتائج سامنے آکر رہتے ہیں جن کی گرفت محکم اور جن کے اثرات اٹل ہیں۔

وَاُمْلِيْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ۝ (۶۸/۴۵)

اور میں انہیں مُہلت دے رہا ہوں (یہ نہیں کہ میں نے انہیں بالکل چھوڑ دیا ہے، یاد رکھو) یہ حقیقت ہے کہ میری تدبیر بڑی مستحکم اور مضبوط ہے۔

اس حقیقت کو سورۂ مزمل میں ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے۔

وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ۝ (۷۳/۱۱)

اور (اے پیغمبرؐ!) ان دولت کے نشہ میں بدمست، (دعوتِ حق کو) جھٹلانے والوں کو مجھ پر چھوڑ دو اور تھوڑی سی انہیں مُہلت دو (تاکہ عمل کو نتیجہ پیدا کر لینے کا وقفہ مل جائے)۔

حضرات انبیاء کرامؑ کی دعوتِ انقلاب کی تاریخ پر غور کیجئے۔ صاف نظر آجائے گا کہ ہر تحریک تین مراحل سے گزرتی رہی ہے۔ پہلا مرحلہ دعوت و تلقین اور تبلیغ و تبیین کا ہوتا ہے جس میں اس پیغام کی عام نشر و اشاعت کی جاتی ہے اور افہام و تفہیم کے ذریعہ سعید روحوں کو اس کی طرف بلایا جاتا ہے۔ یہ لوگ آہستہ آہستہ

اس جماعت (مومنین) کے حلقہ میں شامل ہوتے چلے جاتے ہیں تاآنکہ ایسا وقت آجاتا ہے جب نظر آتا ہے کہ ان بقایا لوگوں میں حق وصداقت کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں اور ان کی طرف سے سوائے مخالفت کے اور کسی سلوک کا امکان نہیں۔ اس وقت برأت و ہجرت کا مرحلہ آتا ہے جس میں ان متمرد و سرکش انسانوں سے قطعِ علائق کر لیا جاتا ہے اور تیسرا مرحلہ فتح و کامرانی کا ہوتا ہے جس میں حق، باطل پر غالب آجاتا ہے۔ یہ دوسرا مرحلہ اپنی نزاکت اور اہمیّت کے اعتبار سے ایک خاص امتیازی مقام رکھتا ہے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں پہنچ کر حضرت نوحؑ نے اپنے رب کو پکارا اور کہا کہ

مرحلہ برأت وہجرت

وَ قَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ○ (۲۶/۷۱)

اور نوحؑ نے کہا، "اے میرے پروردگار! انکارِ حق کرنے والوں میں سے رُوئے زمین پر کسی رہنے والے (متنفس) کو (زندہ) نہ چھوڑ!

اور اس کے بعد اس متمرد قوم کا جو کچھ انجام ہوا اس پر بھنور کی آنکھ آج تک روتی ہے۔ یہی حضرت ہودؑ نے قومِ عاد سے کہا۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ؕ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَ لَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ○ (۵۷/۱۱)

پھر اگر (اس پر بھی)، تم نے رُوگردانی کی تو جس بات کے لیے میں بھیجا گیا تھا، وہ میں نے پہنچا دی (اس سے زیادہ میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے) اور (مجھے تو نظر آرہا ہے کہ) میرا پروردگار کسی دوسرے گروہ کو تمہاری جگہ دے دے گا اور تم اس کا کچھ بگاڑ نہ سکو گے۔ یقیناً میرا پروردگار ہر چیز کا نگرانِ حال ہے!

اور اس کے بعد۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ قَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ○ (۷۲/۷)

پھر ایسا ہوا کہ ہم نے ہودؑ کو اور اس کے ساتھیوں کو اپنی رحمت سے بچا لیا اور جنہوں نے ہماری

نشانیاں جھٹلائی تھیں، ان کی بیخ و بنیاد تک اکھاڑ دی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کبھی ایمان لانے والے نہ تھے۔
اور حضرت صالحؑ نے بھی اسی مقام پر پہنچ کر اسی طرح اعراض برتا۔

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَ
لٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۷/۷۹﴾

پھر صالح ان سے کنارہ کش ہو گیا۔ اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! میں نے اپنے پروردگار کا پیغام تم تک پہنچایا اور نصیحت کی مگر (افسوس تم پر!) تم نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔
اور اس کے بعد:

وَثَمُوْدَاْ فَمَآ اَبْقٰى ﴿۵۳/۵۱﴾

اور قومِ ثمود کو خدا نے باقی نہ رہنے دیا۔

ملتِ حنیفہ کے موسّسِ اوّل حضرت ابراہیمؑ کی تحریک میں یہ مقامِ برأت و ہجرت نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔

اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا
بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ
وَحْدَهٗٓ ﴿۶۰/۴﴾

جب انہوں نے اپنی قوم سے علانیہ کہہ دیا کہ "ہم" (حضرات ابراہیمؑ اور آپ کی جماعت) ان سے جنہیں تم اللہ کے سوا معبود بنائے ہوئے ہو، بیزاری کا اعلان کرتے ہیں۔ ہم تمہارا انکار کرتے ہیں اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت اور نفرت آشکارا ہو گئی یہاں تک کہ تم اللہ واحد پر ایمان لاؤ۔
اور اس کے بعد ان سے کہہ دیا۔

اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۹/۲۶﴾

میں اس وطن کو چھوڑ کر اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں جو غالب اور حکمت والا ہے۔

یہی مرحلہ حضورؐ کے سامنے

اور اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ اس ملک کو چھوڑ کر دوسری طرف چلے گئے تا کہ کسی بارآور زمین میں حکومتِ خداوندی کے شجرِ مقدس کی تخم ریزی کی جائے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں پہنچ کر نبی اکرمؐ نے ان مخالفین کو مخاطب کر کے یہ زلزلہ انگیز اعلان کر دیا کہ

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۙ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۙ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ
مَآ اَعْبُدُ ۚ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۙ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ
مَآ اَعْبُدُ ۭ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۧ (۱۰۹ / ۱-۶)

(اے رسولؐ!) تم کہہ دو "اے منکرینِ دعوتِ حق! میں اُن کی عبودیّت (اطاعت وفرماں برداری) اختیار نہیں کروں گا جن کی عبودیّت تم اختیار کیے ہوئے ہو اور نہ تم ہی اُس (خدائے واحد) کی عبودیّت (اطاعت) اختیار کروگے جس کی عبودیّت میں اختیار کر رہا ہوں (لہٰذا میری اور تمہاری راہ الگ الگ ہے) اور نہ میں ان کی عبودیّت (اطاعت) اختیار کرسکتا ہوں جن کی عبودیّت تم نے اختیار کر رکھی ہے اور (بظاہر حالات) تم بھی اُس (خدائے واحد) کی عبودیّت (اطاعت) اختیار کرنے والے نہیں ہو جس کی عبودیّت میں نے اختیار کرلی ہے۔ تمہارے لیے تمہارے اعمال کی جزا ہے اور میرے لیے میرے اعمال کی جزا ہے۔ (مکافاتِ عمل کے دن حقیقت واضح ہو جائے گی)۔

اِس اعلانِ براءت وعلیحدگی کی شدّت، تاکید اور وضاحت پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ چند جُملوں کے تکرار سے حق و باطل کو کس طرح الگ الگ کر کے رکھ دیا ہے کہ ان میں مفاہمت و مصالحت کا کوئی شائبہ تک نہیں۔ وہ 'رسول' ان سے کہتا ہے کہ میں نے تمہیں اچھی طرح آگاہ کر دیا کہ جس راستے پر تم چل رہے ہو، اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ تم اس کے جواب میں کہتے ہو کہ نہیں! "جس راستے پر ہم چل رہے ہیں وہ تو کامیابیوں کا راستہ ہے، لیکن جس راستے کی طرف تم ہمیں بلا رہے ہو، وہ تباہیوں کی طرف لے جانے والا ہے۔" اب اس کے بعد اس بات کا فیصلہ کرنے کی کوئی اور صورت نہیں بجُز اس کے کہ تم اپنے راستے پر چلتے جاؤ اور مجھے میرے راستے پر چلنے دو۔ نتائج خود بخود بتادیں گے کہ کس کا راستہ کس منزل کی طرف لے جاتا ہے۔

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ۭ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ۙ
وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۝ (۱۱ / ۱۲۱-۱۲۲)

اور (اے رسولؐ!) تم ان لوگوں سے کہہ دو "تم اپنی جگہ کام کیے جاؤ، ہم بھی (اپنی جگہ) سرگرمِ عمل ہیں۔ (تم بھی نتیجہ کے) منتظر رہو، ہم بھی منتظر ہیں۔"

اب اسی موضوع کے دوسرے گوشے کی طرف آئیے۔ جیسا کہ اس سے پیشتر لکھا جا چکا ہے، رسول کا مقصد خالی وعظ و نصیحت نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسے نظامِ حکومت کا قیام ہوتا ہے جس میں احکاماتِ خداوندی نافذ ہوں۔ وعظ و تلقین اور تبلیغ و تفہیم سب اسی مقصد کے حصول کے ذرائع اور اسی منزل کی طرف لے جانے والے راستے ہوتے ہیں۔ وہ جس جگہ پیدا ہوتا ہے، کوشش کرتا ہے کہ اس نظامِ حکومت کا قیام اسی جگہ سے شروع ہو۔ وہ اس فضا کو اس نظامِ زندگی کے لیے سازگار بنانے میں سعی و عمل کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑتا۔ وہ پوری جدوجہد کرتا ہے کہ لوگ سمجھ سکیں کہ وہ انہیں کس زندگی بخش نظام کی طرف بلاتا ہے۔ لیکن سرکش قوتیں جو اس نظام کے قیام میں اپنے مفاد و مقاصد کی موت دیکھتی ہیں، اس کی سرتوڑ مخالفت کرتی ہیں لیکن جب صورت یہ پیدا ہو جائے کہ اس مقام پر اس نظام کے قیام کا امکان نظر نہ آئے تو اس وقت یہ داعیٔ انقلاب یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان نہیں دے لیتا کہ میرے ذمہ جو فریضہ عاید ہوتا تھا، میں نے اسے ادا کر دیا۔ اب اگر یہ لوگ نہ مانیں، تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اس کا مقصد، ان پیشِ نظر لوگوں تک دعوتِ حق و صداقت کا پہنچانا ہی نہیں ہوتا۔ وہ ان تک یہ پیغام پہنچاتا ہی اس لیے ہے کہ وہ اپنے غلط معاشرہ کی جگہ صحیح معاشرہ قائم کر لیں۔ اگر وہ دیکھتا ہے کہ ایسے معاشرہ کا قیام اس جگہ ناممکن ہے، تو وہ پاؤں توڑ کر اسی جگہ نہیں بیٹھا رہتا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر ایسے مقام کی طرف چلا جاتا ہے جہاں کی فضا اس معاشرہ کے قیام کے لیے مساعد ہو۔

وطن کا مفہوم رسول کی نگاہوں میں

وطن کی حدود و ثغور اس کے نزدیک کچھ معنی نہیں رکھتے۔ اس لیے اس کی چار دیواری اس کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہو سکتی۔ اس کے نزدیک وطن وہ ہے جس کی زمین اس نظامِ خداوندی کے لیے سازگار اور بار آور ہو۔ لہٰذا جب وہ کسی ایک مقام پر اس نظام کے قیام کے امکانات نہیں دیکھتا تو کسی ایسے مقام کا رُخ کر لیتا ہے جہاں اس کے امکانات نسبتاً زیادہ ہوں۔ اسی کا نام رسول کی زبان میں "ذَھَابَ اِلَی اللّٰہِ" یا "ھجرت اِلَی اللّٰہِ" ہے۔ ہجرت کے معنی ہیں چھوڑ دینا، ترک کر دینا۔ ایک مسلم کی زندگی کا ایک ایک لمحہ "ہجرت" کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ہر وہ تعلق جو اس کے نصب العین کے حصول میں مانع ہو، اسے بلا تامل و توقف چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ یہی وہ کانٹے ہیں جنہیں راستے سے ہٹانا بڑی ہمت کا کام ہے۔ ذاتی جذبات و خواہشات، عیش و آرام، مال کی محبت، اولاد سے وابستگی، رشتہ داروں سے تعلقات، دیگر رجحانات و میلانات، ان میں سے "جو کانٹا" بھی دامن گیر ہو، اسے جھٹک کر

الگ کر دیا جائے۔ ایک سہل انگار اور تن آسان آدمی کے لیے وطن کی جاذبیت بڑی محکم گیر ہوتی ہے اس لیے انسان وطن کی زمین میں بُری طرح پابگِل ہو جاتا ہے۔ وطن کی یہی کشش و جاذبیت تھی جو ایک جگہ رہنے والے انسانوں کے لیے وجہِ جامعیت اور باعثِ اتحاد و اتفاق بنی اور اس کے بعد اس نے رفتہ رفتہ ایسی پختگی اختیار کر لی کہ آج دنیا میں قومیّتوں کا انحصار اوطان پر قرار پا گیا اور خدا کی یہ وسیع زمین محض پہاڑوں اور دریاؤں کے فرضی خطوط سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر انسانوں کی بستیوں کے بجائے درندوں کا بھٹ بن گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان جس مقام پر رہتا ہے اس کی حفاظت ضروری ہوتی ہے لیکن غور کیجئے کہ جس مکان کو آپ اتنے شوق سے بناتے ہیں، پھر اس میں اپنے مال و متاع کو محفوظ رکھتے ہیں، مختلف کام کاج کرنے کے بعد آپ کا ہر قدم غیر شعوری طور پر اس کی طرف اٹھتا ہے۔ جب آپ کو اطلاع ملتی ہے کہ دریا چڑھ گیا ہے اور عنقریب سیلاب کا رُخ اسی بستی کی طرف ہونے والا ہے جس میں آپ کا یہ مکان ہے تو آپ کس طرح ہر کشش و جاذبیت کو جھٹک کر الگ کر دیتے ہیں اور دیوانہ وار یہاں سے بھاگ اُٹھتے ہیں۔ اس وقت نہ مکان کی محبّت آپ کے راستہ میں حائل ہوتی ہے نہ اس کے مشمولات سے وابستگی عناں گیر۔ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اس لیے کہ آپ کے پاس ایک ایسی چیز ہے جسے آپ مکان اور اس کے تمام متعلقات سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔ اس کی حفاظت کے لیے آپ ان تمام چیزوں کو بلا توقف و تردد چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ متاعِ گراں بہا جس کی حفاظت میں آپ کسی تعلق اور وابستگی کی پرواہ نہیں کرتے، آپ کی جان ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جان بڑی گراں بہا متاع ہے لیکن جن کی نگاہیں طبیعی زندگی کی چاردیواری سے آگے بھی جاتی ہیں، ان کے نزدیک جان سے بھی زیادہ گراں بہا اور عزیز تر شے ایک اور ہے، جسے جوہرِ خودی، شرفِ انسانیت، کلمۃ الحق یا ایمان کے جامع لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی دیکھے کہ باطل کا سیلابِ بے پناہ ہے جو چاروں طرف سے اُمنڈے چلا آ رہا ہے اور اس میں اس کی اس متاعِ نایاب کی خیر نہیں، تو کہیئے کہ اس وقت اس کے نزدیک وطن کی حیثیت کیا رہ جائے گی؟ وہ بلا تردّد و تامّل وطن کی خار دار جھاڑی کو اپنے راستہ سے الگ پھینک دے گا اور کسی ایسے مقام کی طرف رُخ کرے گا جہاں اس کی یہ متاعِ بے بہا محفوظ ہو جائے (اور اس کی حفاظت صرف اسی نظام میں ممکن ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا

ہجرت سے مفہوم

چکا ہے)۔ اس کا نام **ہجرت** ہے۔ حتّٰی کہ اس کی حفاظت میں اسے اپنی جان تک بھی دینی پڑ جائے تو، زیادہ عزیز شے کی حفاظت کی خاطر، کم عزیز شے کی قربانی کے

اصول کے مطابق وہ اس میں بھی دریغ نہیں کرے گا۔ لہٰذا ہجرت ایمان کا تقاضا اور مردِ مومن کی مجاہدانہ زندگی کا شعار ہے

ہجرت آئینِ حیاتِ مُسلم است   ایں ز اسبابِ ثباتِ مُسلم است
معنیٔ اُو از تنک آبی رم است   ترکِ شبنم بہرِ تسخیرِ یم است

یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر قرآن کریم نے ہجرت کو اس قدر اہمیت دی ہے اور مختلف طرق و اسالیب سے اس کی اساسی حکمت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ سورۂ عنکبوت میں ہے۔

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ٥ (۲۹/۵۶)

اے میرے بندو! جو میرے قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہو، اس حقیقت کو سمجھ لو کہ تمہاری زندگی کا مقصد یہ ہے کہ تم میری اور صرف میری محکومیت اختیار کرو۔ اگر ایسا کرنا کسی ایک خطۂ زمین میں ممکن نہیں، تو میری زمین بہت وسیع ہے۔ تم کسی ایسے خطۂ زمین کی طرف ہجرت کر جاؤ جہاں اس انداز کی زندگی بسر کرنے کے امکانات زیادہ روشن ہوں۔

فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ کے انقلاب انگیز ٹکڑے پر غور کیجئے۔ یعنی مومن کی زندگی یہ ہے کہ وہ خدا اور صرف خدا کی محکومیت اختیار کرے۔ اگر ایسا ہونا اُس سرزمین میں ممکن ہے جہاں وہ پیدا ہوا ہے، تو هُوَ الْمُرَادُ۔ اور اگر وہاں اس کا امکان نہیں، تو اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔ پاؤں توڑ کر ایک جگہ بیٹھے رہنا اور غیر اللہ کی محکومیت پر قناعت کر جانا، یہ تو مردِ مومن کی زندگی نہیں۔ دیکھئے! سورۂ نساء میں اسی حقیقت کو کس طرح کھول کر بیان کیا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ط قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ط قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ط فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ط وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ٥ (۴/۹۷)

جو لوگ غیر خداوندی ماحول میں رہ کر اپنے ہاتھوں اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں، ان کی روح قبض کرنے کے بعد فرشتے ان سے پوچھتے ہیں "تم کس حال میں تھے"؟ (یعنی دین کے اعتبار سے تمہارا کیا حال تھا؟) وہ جواب میں کہتے ہیں "ہم کیا کرتے؟ ہم ملک میں بے بس اور کمزور تھے" (یعنی بے بسی کی وجہ سے دین کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتے تھے)۔ اس پر فرشتے کہتے ہیں (اگر تم اپنے ملک میں مغلوب و بے بس تھے، تو) کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ کسی دوسری جگہ ہجرت کر کے چلے جاتے؟

غرضیکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے اور (جس کا ٹھکانا دوزخ ہُوا تو) کیا ہی بُری جگہ ہے۔

معذورین معذرت صرف ان لوگوں کی قابلِ قبول ہے جو طبیعی (نہ کہ قلبی) طور پر کمزور و ناتواں اور ہجرت کی کوئی راہ نہ پاتے ہوںؑ۔

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ۙ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ○ (۴/۹۸-۹۹)

مگر (ہاں) جو مرد، عورتیں، بچے ایسے مجبور و بے بس ہوں کہ کوئی چارۂ کار نہ رکھتے ہوں اور (ہجرت) کی) کوئی راہ نہ پاتے ہوں، تو اُمید ہے کہ اللہ (ان کی معذوری دیکھتے ہوئے) انہیں معاف کر دے اور وہ درگزر کر دینے والا، سامانِ حفاظت عطا کرنے والا ہے!

باقی رہے ہجرت کر جانے والے تو۔

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○ (۴/۱۰۰)

اور (دیکھو) جو کوئی اللہ کی راہ میں (اپنا گھر بار چھوڑ کر) ہجرت کرے گا تو اُسے خدا کی زمین میں بہت سی اقامت گاہیں ملیں گی اور (ہر طرح کی) کشائش پائے گا (کہ معیشت کی نئی نئی راہیں اس کے سامنے کھل جائیں گی) اور جو کوئی اپنے گھر سے ایسے مقام کی طرف ہجرت کر کے نکلے جہاں کی سرزمین نظامِ خداوندی کے لیے زیادہ سازگار ہو اور پھر (راہ ہی میں) موت آجائے، تو اس کا اجر اللہ کے حضور ثابت ہو گیا (وہ اپنی نیت کے مطابق اپنی کوشش کا ضرور اجر پائے گا) اور اللہ تو (ہر حال میں) حفاظت اور سامانِ نشو و نما دینے والا ہے۔

مہاجرین کے مدارج خدا کی راہ یعنی قیامِ نظامِ حکومتِ الٰہیہ کے لیے ہجرت کرنے والوں کے فضائل و مناقب قرآن کے مختلف مقامات پر اُبھرے ہوئے

ؑ ہجرت کی راہ نہ پانے والوں پر یہ لازم آجاتا ہے کہ وہ اپنے ہی مقام کو حکومتِ خداوندی کے لئے سازگار بنانے کی جدّ و جہد کریں نہ کہ اپنی حالت پر قناعت کر کے بیٹھ جائیں۔

حروف میں ملتے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (۲/۲۱۸)

جو لوگ ایمان لائے (اور راہِ ایمان میں ثابت قدم رہے) اور جن لوگوں نے ہجرت کی سختیاں برداشت کیں اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، تو بلاشبہ ایسے ہی لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کی (سچی) امیدواری کرنے والے ہیں اور (جو کوئی اللہ کی رحمت کا سچے طریقہ پر امیدوار ہو تو) اللہ سامانِ حفاظت اور پرورش عطا کرنے والا ہے۔

قرآنِ کریم میں اس قسم کی متعدد آیات ہیں۔ ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ مدینہ کی سرزمین اس دعوتِ حق و صداقت کے لیے زیادہ موزوں ثابت ہو رہی تھی۔ وہاں سے ہر سال حجاج آتے اور سعادتِ اسلام سے مشرف ہوتے۔ اُدھر وہاں بھی سلسلۂ تبلیغ و تلقین جاری تھا جس سے سال بھر نیرِ اسلام کی شعاعیں اُن کے قلوب و نگاہ کو منور کرتیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں اندازہ ہو گیا کہ اس تحریکِ انقلابِ آسمانی کی اوّلین جولانگاہ وہی ارضِ مقدس بنے گی۔

مدینہ کی طرف ہجرت

اس لیے حضورؐ نے صحابہؓ کو اجازت دے دی کہ وہ آہستہ آہستہ اس دارالسلام کی طرف منتقل ہوتے چلے جائیں۔ نظر بظاہر جماعتِ مومنین کا اس طرح ترکِ وطن کرنا ان کی کمزوری پر محمول کیا جاتا تھا اس لیے قریش اسے اپنی فتح اور ان کی شکست قرار دیتے تھے۔ اور ایک قریش ہی پر کیا موقوف ہے، دنیا کا ہر وہ شخص جس کی نگاہ فقط مادی اسباب و ذرائع پر ہو، اسے گریز اور فرار ہی قرار دے گا۔ تیرہ برس تک مسلسل، ان ضعیفوں اور ناتوانوں پر مصائب و شدائد کے پہاڑ توڑے گئے۔ انہیں طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ برسوں تک ان پر سامانِ خورونوش کی راہیں مسدود کر دی گئیں۔ لہٰذا ہر سطح بیں یہی کہے گا کہ (یہ تنگ آکر بھاگ نکلنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن عین اس زمانہ میں جبکہ ساری دنیا اسے ان کی شکست و ہزیمت قرار دے رہی تھی، ایک بے صوت صدا انہیں پکار پکار کر نشیدِ کامرانی اور نویدِ شادمانی دے رہی تھی اور واضح اور غیر مبہم الفاظ میں ان سے کہہ رہی تھی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں،

دیباچۂ فتح و کامرانی

چند ہی دن کے بعد دیکھو گے کہ فتح و نصرت کس کے حصے میں آتی ہے اور شکست و نامرادی کس کے مقدر میں ہے۔

ان سے برملا کہا جا رہا تھا کہ:

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ○ (۵۸/۲۱)

یہ تو خدا نے لکھ دیا ہے کہ (بالآخر) میں اور میرے رسول غالب آکر رہیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ بڑی قوت اور غلبہ والا ہے (لہٰذا اُس پر کون غالب آسکتا ہے؟)۔

اور کہیں یہ:

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ○ (۹۳/۵)

اور (اے پیغمبرؐ!) کچھ دنوں بعد خدا تمہیں اتنا کچھ دے دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔

کسی جگہ اس اشارہ سے:

وَلَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ○ (۹۳/۴)

اور (اے پیغمبرؐ) یقیناً اس آغاز کے مقابلہ میں تمہارے لیے انجام بہت بہتر ہوگا۔

ان آیات کے علاوہ جو قرآنِ کریم کے مختلف مقامات پر، اس موضوع سے متعلق، بکھری پڑی ہیں، قرآنِ کریم

قرآن کی آخری سورتیں

کے آخری پارے کی آخری مختصر سورتوں کو دیکھئے اور غور کیجئے کہ منذرات و مبشرات کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی چلی جا رہی ہیں۔

یہ سورتیں کم و بیش اسی زمانہ سے متعلق ہیں جب ایک طرف ان مخالفین کو آخری وعید سے متنبہ کیا گیا کہ ان میں سے جو لوگ آنے والی ہلاکت سے بچنا چاہیں اب بھی بچ جائیں اور دوسری طرف، ایسے یاس انگیز اور حزن آمیز حالات میں جماعتِ مومنین کو فتح و نصرت اور غلبہ و تسلط کی بشارت دی گئی۔ ان میں سورۂ عصرؔ، سورۂ فیلؔ، سورۂ کوثرؔ، سورۂ نصرؔ، سورۂ لہبؔ اور معوذتین خاص طور پر اس حقیقت کو سامنے لاتی ہیں کہ عنقریب ان مخالفین کی قوت ٹوٹ جائے گی اور اس انقلابِ آسمانی کو کامیابی حاصل ہوگی۔[1]

شروع شروع میں تو قریش خوش تھے کہ یہ مومنین، مکہ چھوڑ کر بھاگتے چلے جا رہے ہیں لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ اس طرح یہ جماعت مدینہ میں قوت پکڑتی جا رہی اور ان کے لیے ایک زندہ خطرہ بن رہی ہے، تو انہوں نے اس معاملہ پر گہری توجہ دینا ضروری سمجھا چنانچہ اس غرض کے لیے انہوں نے دارالندوہ میں ایک

---

[1] ان سورتوں کے صحیح مفہوم کے لیے "مفہوم القرآن" دیکھئے۔

اجلاسِ عام کیا جس میں ہر قبیلہ کے رؤسا شریک تھے۔ لوگوں نے مختلف رائیں پیش کیں۔ کسی نے کہا کہ حضورؐ کو قید کر دیا جائے۔ کسی نے کہا کہ جلاوطن کر دینا کافی ہوگا۔ ابوجہل نے کہا کہ ہر قبیلہ سے ایک ایک شخص منتخب ہو اور پورا مجمع ایک ساتھ مل کر حضورؐ کو قتل کر دے۔ اس صورت میں آپؐ کا خون تمام قبائل میں بٹ جائے گا اور بنو ہاشم کے لیے سارے قریش کا مقابلہ کرنا مشکل ہوگا۔ یہ تجویز سب کو پسند آئی۔ قرآنِ کریم میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کر کے کہا گیا ہے کہ

حضورؐ کے قتل کی سازش

وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۚ
وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ۝ (۸/۳۰)

اور (اے پیغمبرؐ!) وہ وقت یاد کر جب (مکہ میں) کافر تیرے خلاف اپنی چھپی تدبیروں میں لگے تھے تاکہ تجھے گرفتار کر رکھیں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کر دیں۔ وہ اپنی مخفی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی مخفی تدبیریں کر رہا تھا اور اللہ بہتر تدبیریں کرنے والا ہے۔

سورۃ طارق میں ہے۔

إِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا ۝ وَأَكِيدُ كَيْدًا ۝ فَمَهِّلِ الْكَافِرِينَ أَمْهِلْهُمْ
رُوَيْدًا ۝ (۸۶/۱۵-۱۷)

یہ واقعہ ہے کہ وہ اپنی مخفی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں اور میں اپنی خفیہ تدبیریں میں مشغول ہوں (دونوں طرف سے تدبیریں ہو رہی ہیں)۔ لہٰذا (اے پیغمبرؐ!) ان منکرینِ حق کو کچھ مہلت دے دو۔ تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دو (بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ کون اپنی تدابیر میں کامیاب ہوتا ہے اور کس کی تدابیر ناکامی و نامرادی کا منہ دیکھتی ہیں)۔

نبی اکرمؐ کو مخالفین کے ان ارادوں کا علم ہو چکا تھا۔ آپ نے بمشاورت حضرت ابوبکرؓ ہجرت کے سامان مکمل کر لیے۔ دوسری طرف مخالفین بھی اپنی قرارداد کے مطابق، اس فکر میں تھے کہ موقع پا کر آپؐ کا (معاذ اللہ) خاتمہ کر دیا جائے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ حضورؐ کو یقیناً اس کا علم ہوگا۔ بالآخر ایک رات طے پا گیا کہ آپؐ مکہ چھوڑ دیں۔ مکان میں حضرت علیؓ حضورؐ کے پاس تھے۔ آپؓ نے دیکھا کہ اگرچہ سامانِ سفر وغیرہ کے متعلق حضورؐ کو کوئی فکر نہیں تھی، وہ حضرت صدیق اکبرؓ کے ذمہ تھا۔ بایں ہمہ کسی بات کا تردد ہے جو حضورؐ کے لیے وجۂ پریشانی ہو رہا ہے! حضرت علیؓ نے دریافت کیا تو

شبِ ہجرت

اور ایک تردد

آپؐ نے فرمایا کہ ہاں! ایک تردد ہے جو میرے لیے فی الواقع باعثِ پریشانی ہو رہا ہے۔

بھلا آپ سوچئے تو سہی کہ اس وقت کون سی بات وجہِ تردد اور باعثِ پریشانیٔ خاطر ہو سکتی تھی؟ خود سوچئے یا کسی اور صاحبِ دانش و بینش سے پوچھئے۔ طائرِ فکر زیادہ سے زیادہ انہی گوشوں تک پہنچ سکے گا کہ ان حالات میں حضورؐ کو یہی فکر لاحق ہوگی کہ ان حالات میں کس طرح جان بچائی جا سکتی ہے؟ یا یہ کہ اگر میں بطفت نکل بھی گیا تو پسماندگان کا کیا حشر ہوگا؟ وقس علیٰ ہذا۔

یہ اندیشے بھی اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں۔ لیکن سیرت کی بلندی، انسان کو ان حدود سے کہیں آگے لے جاتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ مجھے تردد یہ لاحق ہو رہا ہے کہ میں آج کی رات یہاں سے نکل جاؤں گا لیکن میرے پاس ان لوگوں کی (جو آپؐ کے قتل کے درپے تھے) کچھ امانتیں موجود ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ان امانتوں کو اپنے ساتھ لے جاؤں یا ایسی شکل میں چھوڑ جاؤں کہ وہ اپنے حقداروں تک نہ پہنچ سکیں۔

غور فرمایا آپ نے کہ اُس وقت کون سا تردد حضورؐ کے لیے وجہِ پریشانی ہو رہا تھا؟ چنانچہ یہ طے پایا کہ حضرت علیؓ یہ امانات اپنی اپنی جگہ پر پہنچا دیں۔

کچھ رات گئے حضورؐ قوانینِ خداوندی کی حفاظت پر کامل یقین رکھتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئے۔ حسبِ تجویز حضرت ابوبکرؓ بھی آپؐ سے مل گئے۔ اور آپؐ۔

(وَقُلْ) رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ۝ (۱۷/۸۰)

اے پروردگار! مجھے (جہاں کہیں پہنچا، تو) سچائی کے ساتھ پہنچا اور (جہاں کہیں سے نکال، تو) سچائی کے ساتھ نکال اور مجھے اپنے حضورؐ سے قوت عطا فرما۔ ایسی قوت کہ (ہر حال میں) مددگاری کرنیوالی ہو!

کی دُعائیں مانگتے مکّہ سے جانب مدینہ روانہ ہوگئے۔ صبح، قریش نے دیکھا کہ حضورؐ گھر میں نہیں ہیں۔ انہوں نے حضرت علیؓ کو کچھ وقت کے لیے ستایا لیکن پھر چھوڑ دیا اور حضورؐ کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے۔

حضورؐ کی ہجرت

یہ ۲۷ صفر ۱۳ نبوت (مطابق ۱۲ ستمبر ۶۲۲ء[1]) کا واقعہ ہے۔ مکّہ سے دائیں جانب

[1] ہم نے مختلف مقامات پر نبوی یا ہجری سنوں اور تاریخوں کی عیسوی سنوں اور تاریخوں کے ساتھ جو مطابقت دکھائی ہے تو وہ اس قاعدے کی رُو سے ہے جو اس سے پیشتر عام طور پر مروج تھا۔ اب تحقیقِ مزید کے بعد بعض مؤرخین نے ایک نیا قاعدہ وضع کیا ہے جس کی رُو سے، بعض تاریخوں میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔

تین چار میل کے فاصلہ پر، پہاڑ کی چوٹی پر ایک غار ہے (جسے غارِ ثور کہتے ہیں) حضورؐ اور حضرت ابوبکرؓ صبح سے پہلے پہلے اُس غار میں جا چھپے۔ دُشمن تعاقب کو نکلے تو اسی طرف کو ہولیے حتیٰ کہ وہ اتنے قریب آگئے کہ ان کے پاؤں کی آہٹ غار میں سُنائی دیتی تھی۔

اس مقام پر ذرا ٹھہر رُکیے اور حالات کا جائزہ لیجئے۔ آبادی سے دُور غار کی تنہائیوں میں دُو (اور صرف دُو) متنفس چھپے بیٹھے ہیں۔ متعاقبین کا گروہ غار کے دہانہ کے قریب آپہنچا ہے۔ خطرہ کی آمد حضرت ابوبکرؓ کے دِل

غار کی تنہائیاں

میں پریشانی کی رمق پیدا کر رہی ہے جس کے آثار آپ کے خطوطِ جبیں سے جھلک پڑتے ہیں۔ یہ پریشانی اپنی وجہ سے نہیں، بلکہ اس ذاتِ گرامی کی خیر طلبی کے جذبہ سے ہے جو دنیا میں ہر متاع (حتیٰ کہ اپنی جان) سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ حضورؐ ان آثار کو بھانپ لیتے ہیں اور سکونِ قلب اور جمعیتِ خاطر کے اس انداز سے جس میں طمانیتِ قلب کی ہزاروں جنّتیں جھلک رہی ہیں، فرماتے ہیں کہ

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ج (۹/۴۰)

(اے دوست!) فکر نہ کر، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

یہ ہے ایمان کا وہ مقام جس پر نبی خود فائز المرام ہوتا ہے اور جس تک وہ اپنے متبعین کو پہنچانا چاہتا ہے۔ تین شب و روز حضورؐ نے اپنے "یارِ غار" کے ساتھ یہیں بسر کیے۔ چوتھی شب حضرت ابوبکرؓ کے گھر سے سواری کی اونٹنیاں آگئیں اور آپؐ آگے روانہ ہو گئے۔ مدینہ میں اطلاع پہنچ چکی تھی کہ آپؐ نے مکہ چھوڑ دیا ہے۔ تمام انصارؓ وفورِ شوق و جذبۂ محبّت سے سرشار، صبح نور کے تڑکے، بستی سے باہر آکر دیدہ و دِل فرشِ راہ کیے انتظار میں بیٹھ جاتے۔ ہر صبح یہی کیفیت رہتی۔

قریش نے آپؐ کی گرفتاری پر سو اُونٹوں کا انعام مشتہر کر رکھا تھا۔ بریدہ اسلمی، ایک قبیلہ کا سردار،

دشمن سامنے

اس انعام کے لالچ میں حضورؐ کی تلاش میں نکلا اور آپؐ کو راہ میں پالیا۔ جب سامنے آیا اور ہمکلام ہوا تو اثر و جذب کا ایک تیر تھا جو سیدھا دل تک اُتر گیا اور اپنی قوم کے ستّر آدمیوں سمیت مسلمان ہو گیا۔ جوشِ مسرت سے اپنی سفید پگڑی نیزہ پر باندھ کر اس کاروانِ رشد و سعادت کے آگے آگے چل پڑا۔ پگڑی کا پھریرا ہوا میں لہراتا اور رقص انگیز انداز سے بشارتیں سُناتا چلا جا رہا تھا کہ "امن کا بادشاہ، صُلح کا حامی، دنیا کو انصاف و عدالت سے بھرپور کر دینے والا" آرہا ہے۔ اس طرح رواں دواں، نور و نکہت کی ہزار دنیائیں اپنے جلو میں لیے یہ قافلہ جذب و سرور مدینہ کی طرف بڑھتا گیا اور ۸ ربیع الاوّل ۱۳ نبوی

کی صبح مدینہ کے قریب جا پہنچا۔ مشتاقین کی جماعت حسبِ معمول انتظار کے بعد لوٹ چکی تھی۔ ایک یہودی

مدینہ میں تشریف آوری

نے دُور سے دیکھا تو قرائن و آثار سے معلوم کر لیا کہ وہی قافلہ ہے جس کے انتظار میں اتنے دنوں سے انصار کی آنکھیں فرشِ راہ بن رہی ہیں۔ اس نے آواز دی کہ "اہلِ عرب! لو جس کا تم انتظار کر رہے تھے وہ آگیا"۔ تمام شہر اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اُٹھا اور انصار ہتھیار سج سج کر بیتابانہ گھروں سے نکل آئے اور پروانہ وار اس آواز کی سمت بڑھے۔ مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر انصار کے کچھ خاندان آباد تھے۔ اس بستی کو قبا کہتے ہیں۔ حضورؐ یہاں پہنچے تو تمام خاندان نے جوشِ مسرت میں نعرہ ہائے تکبیر بلند کیے۔ ان کے مقدر نے یاوری کی اور حضورؐ نے ان کی میزبانی قبول فرمائی۔ یہاں سب سے پہلا کام مسجد کا تعمیر کرنا تھا، اس لیے کہ نظامِ خداوندی کا مرکز ہوتی ہی مسجد ہے۔ یہ مسجد قبا تھی۔

چودہ دن کے بعد آپؐ شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ راہ میں بنی سالم کے محلہ میں جمعہ کی نماز ادا فرمائی۔ اِس سرزمین میں جسے حکومتِ خداوندی کا گہوارہ بننا تھا، جماعتِ مومنین کا پہلا اجتماع تھا۔ کس قدر حسین تھی یہ ابتداء! قباء سے مدینہ تک راستہ میں دورویہ فدائیوں کی صفیں تھیں۔ سارا شہر جوشِ مسرت اور فرطِ عقیدت سے معمورہ جذب و نشاط اور گہوارۂ حسن و بہار بن رہا تھا۔ گلی کوچوں سے خدا کی حمد و ستائش کے نغمے اور تشکر و امتنان کے زمزمے ساری فضا کو کیف بار اور مسرت بیز بنا رہے تھے۔ جوشِ استقبال سے قلوب کے ساغر اس طرح بے محابا چھلک رہے تھے کہ صہبائے محبت، مسرت و ابتہاج کے نورانی آنسوؤں کی شکل میں دامانِ آستین کو صحنِ گلستان و کفِ باغبان بنا رہی تھی۔ کہیں جبیں ہائے نیاز بحضور ربِّ ذوالمنن سجدہ ریز و زمین بوس تھیں اور کہیں ہجومِ جذبات سے مرتعش ہاتھ تھے کہ بارگاہِ صمدیت میں اس مہمانِ عزیز کی خیرسگالی اور خوش بختی کی حسین دعائیں اور معصوم التجائیں لیے ہوئے یوں جانبِ عرشِ عظیم اُٹھ رہے تھے جیسے خاموش صحرا میں نخیلِ بلند ایستادہ، خاکِ یثرب کے ذرات ابھر ابھر کر ہمہ تن دیدبن رہے تھے کہ آج انہیں اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کی کف بوسی کی سعادت نصیب ہونے والی تھی جو تمام عالم کے لیے سرمایۂ افتخار تھی۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں جوشِ مسرت میں دف بجاتیں اور یہ استقبالیہ نغمہ گاتی تھیں کہ:

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا　　مِنْ ثَنِیَّاتِ الْوَدَاعِ
وَجَبَ الشُّکْرُ عَلَیْنَا　　مَا دَعَیٰ لِلّٰہِ دَاعٍ

خلوص و محبت کے ان رُوح پرور نظاروں میں یہ کاروانِ حُسن و خوبی یثرب کی بستی میں داخل ہوا جس کا نام اس کے بعد مَدِیْنَۃُ النَّبِیؐ ہو گیا۔ ہر شخص منتظر تھا کہ دیکھیں حضورؐ کی میزبانی کی سعادت کس کے نصیب ہوتی ہے۔ یہ شرف حضرت ایوّب انصاریؓ کے مقدّر میں تھا۔ جہاں اب مسجدِ نبوی ہے حضرت ایوبؓ کا مکان اس سے متصل تھا۔ حضورؐ وہیں فروکش ہو گئے۔

اس جہانِ نو میں اب اس نظام کی تشکیل کے خطوط متعیّن ہونے شروع ہو گئے کہ گزشتہ تیرہ[۱۳] برس کا عرصہ گویا جس کی تمہید تھا۔ اس نظام کی تربیت گاہ اور دار المشاورت مسجد ہوتی ہے اس لیے سب سے پہلے مسجد ہی تعمیر کی گئی۔ بالکل سادہ عمارت، کچی اینٹوں کی دیواریں، کھجور کے پتّوں کی چھت، کچا فرش لیکن مٹی اور پانی کی

مسجدِ نبوی کی تعمیر

اس کچی عمارت کے اندر تربیت پانے والوں کے قلب و دماغ اس قدر پختہ کہ دنیا کی آہنی قوتیں ان سے ٹکرائیں اور پاش پاش ہو گئیں۔ مسجد سے متصل ہی سکونتی مکانات بنوائے گئے۔ مکانات کیا؟ کچی اینٹوں کے مختصر سے حجرے تھے، کوئی دس دس فٹ چوڑے، بارہ بارہ فٹ لمبے چھتیں اتنی نیچی کہ آدمی کھڑا ہو تو سر چھت سے جا ٹکرائے۔ دروازوں پر کمبل کے پردے — یہ نہیں کہ زمانۂ غربت و افلاس میں مجبوراً ایسے مختصر سے حجروں میں سکونت اختیار کر لی گئی تھی۔ جب پورے عرب کی بادشاہت مِل گئی، اس وقت کے "محلات و قصُور" بھی یہی مختصر سے کچے حجرے ہی تھے۔

اس کے بعد خاص اہتمام سے اجتماعات کا التزام کیا گیا اور لوگوں کو بلانے کے لیے اذان تجویز ہوئی اس

مواخاۃ کا سلسلہ

اجتماعیت کا سلسلہ مسجد کی چار دیواری سے آگے بڑھا اور مواخاۃ کے نام سے اس کی تاسیس ہوئی۔ مکّے کے مسلمان، ایک شہر کے رہنے والے اور بالعموم باہمی قرابت دار تھے۔ یہاں پہنچے تو انصار دُوسرے "وطن" کے باشندے اور غیر قبائل سے متعلق۔ اب فی الحقیقت، اس اسلامی قومیّت کی بنیاد رکھی گئی جو نسل اور وطن کی غیر فطری حدود سے بے نیاز اور رنگ اور زبان کے امتیازات سے بلند ہوتی ہے۔ مہاجرین میں بعض دولت مند بھی تھے لیکن مکّہ سے چونکہ چھُپ چھُپا کر نکلے تھے اس لیے مدینہ پہنچے تو بالکل نادار تھے۔ انصار کا مال و متاع ان کے نخلستان تھے۔ انہوں نے اپنی تمام کائنات اس مرکزِ ملت کے قدموں میں ڈھیر کر دی اور خود درخواست کی کہ انہیں مہاجرین اور انصار میں نصفا نصف بانٹ دیا جائے۔ حضورؐ نے اس تقسیم کے بجائے مختلف مہاجرین کو مختلف انصار کا "بھائی بھائی" بنا دیا۔ یہی وہ سلسلہ مواخاۃ و موالات

تھا جس کا ذکر قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ (۸:۷۲)

جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی اور اللہ (کے دین) کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جانوں سے جہاد کیا اور جن لوگوں نے (مکہ کے مہاجرین کو مدینہ میں) جگہ دی اور ان کی مدد کی، تو یہی لوگ ہیں کہ ان میں سے ایک، دوسرے کا کارساز و رفیق ہے۔

ان کی کیفیت یہ تھی کہ خود بھوک اور افلاس کی سختیاں برداشت کرتے تھے لیکن کیا مجال جو اپنے بھائیوں کو ذرا بھی تکلیف ہونے دیں۔ مومنین کی یہی وہ خصوصیت ہے جس کا ذکر سورۂ حشر میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۹:۹)

اور (دیکھو) جو لوگ (قبائل انصار شہر مدینہ میں) پہلے سے گھر بنا چکے ہیں (یعنی ان کے گھر موجود ہیں) اور (ساتھ ہی) دعوتِ حق پر یقین (رکھنے کی دولت) سے بھی مالا مال ہیں، وہ ان لوگوں سے جو ان کی طرف ہجرت کر کے آئے ہیں، محبت کرتے ہیں اور جو کچھ انہیں (یعنی مہاجرین کو خدا کی طرف سے) دیا گیا ہے اس کے لیے اپنے سینوں میں کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے (یعنی اس میں اپنا حصہ بٹانے کا خیال بھی نہیں لاتے)، اور اگرچہ کتنی ہی تنگ دستی میں مبتلا ہوں پھر بھی مہاجرین کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں (کہ خود بھوکے رہ جائیں گے مگر انہیں کھلا دیں گے اور حقیقت یہ ہے کہ) جنہیں نفس کی خست اور بخیلی سے نجات مل جاتی ہے تو وہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہوتے ہیں۔

یہی وہ لوگ تھے جنہیں قرآن کی شہادت نے "مومن حقًا" قرار دیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (۸:۷۴)

(غرضیکہ) جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ (کے دین) کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے (مہاجرینِ مکہ کو) پناہ دی اور مدد کی، تو فی الحقیقت یہی سچے مومن ہیں۔ ان کے لیے حفاظت[1] اور عزت کی روزی!

کتنی عظیم الشان ہے یہ شہادت اور کتنا بلند تھا ان حضرات کا نصیبہ۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔ یہ رشتۂ اخوت ایسا استوار ہوا کہ انصاری بھائی کی موت پر اس کے ترکہ کا وارث مہاجر بھائی قرار دیا جاتا۔ لیکن جب بعد میں اس کی ضرورت نہ رہی تو قرآنِ کریم نے اس کی صراحت کر دی کہ ترکہ میں رشتۂ قرابت مقدم ہونا چاہیے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ؕ وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۟ (۸:۷۵)

اور جو لوگ بعد کو ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمہارے ساتھ ہو کر جہاد کیا، تو وہ بھی تم ہی میں داخل ہیں (انہیں اپنے سے الگ نہ سمجھو اور باقی رہے) قرابت دار، تو وہ اللہ کے قانون کی رُو سے ایک دوسرے کی میراث کے زیادہ حقدار ہیں (پس باہمی بھائی چارگی میں ان کے حقوق فراموش نہ کر دیئے جائیں) بلاشبہ اللہ ہر بات کا علم رکھتا ہے۔

آج یورپ کے علمائے عمرانیات کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی کہ وہ لوگ جو ایک دوسرے سے قطعاً واقف نہ ہوں، کس طرح ایک دوسرے کے معاون و مددگار اور شریکِ غم و الم ہو سکتے ہیں؟ اس لیے کہ یورپ کے تمام نظامِ تعاون و تناصر کی بنیاد سوداگری

یورپ اسے نہیں سمجھ سکتا

(BUSINESS) پر ہے۔ ان کی نگاہیں نفع اور نقصان (PROFIT AND LOSS) کے اعداد و شمار سے آگے جا ہی نہیں سکتیں۔ چنانچہ عمرانیات (SOCIOLOGY) کا مشہور ماہر (COOLY) اپنی کتاب

---

[1] رسول اللہ کے صحابہؓ (یعنی ان مہاجرین و انصار) کو خود خدا نے "مومنون حقا" کہا ہے۔ لہٰذا اُن کی طرف کسی ایسی بات کا منسوب کرنا جس سے یہ (معاذ اللہ) مقامِ مومن سے گر جائیں، قرآنِ کریم کی صریح مخالفت اور شہادتِ خداوندی کی تکذیب ہے۔ بدقسمتی سے ہماری تاریخ میں ایسی باتیں راہ پا گئی ہیں جن سے ان حضرات کی شان میں طعن پایا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم کی اس بیّن شہادت کے پیشِ نظر اس قسم کے تمام تاریخی بیانات وضعی ہیں اور ناقابلِ تسلیم!

(SOCIAL ORGANISM) میں لکھتا ہے۔

محبت، تعاون اور اخوت کے بنیادی جوہر یکسر جذباتی اور ذاتی ہیں اور بڑی بڑی جماعتوں پر ان کا اطلاق ناممکن ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ آپ اپنے اس ہمسایہ سے پیار کریں جسے آپ ذاتی طور پر جانتے ہیں لیکن یہ تقاضا کہ آپ ان لوگوں سے محبت کریں جن سے آپ متعارف نہیں، ایک ناممکن مطالبہ ہے۔

یہ اس لیے کہ مغرب کے یہ علمائے عمرانیات و تمدن اس رشتہ کی گہرائیوں اور حدود فراموشیوں سے یکسر ناآشنا ہیں جس کی بنیاد ایمان جیسے گہرے جذبہ پر ہوتی ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے جس کے تحت روئے زمین کے تمام مومن اپنے آپ کو جسدِ واحد کی طرح محسوس کرتے ہیں کہ پاقلیما کے انگوٹھے میں کانٹا چبھ جائے تو آنکھ کے آبگینے سے آنسو چھلک پڑے اور جب تک وہ کانٹا نکل نہ جائے تمام جسم پر راحت و آرام اور خورد و نوش حرام ہو جائے۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ مدینہ اور اس کے اطراف میں یہود[1] آباد تھے اور ان کا اثر و اقتدار بھی کافی تھا۔ یہ تین قبیلے تھے: بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ کتبِ تاریخ میں ہے کہ حضورؐ نے مدینہ کی حفاظت کے متعلق مہاجرین و انصار اور یہودِ مدینہ کے درمیان ایک معاہدہ کیا۔ ذرا حالات کے پس منظر پر نگاہ رکھیے۔ مہاجرین، بے کس و نادار، ایک نئی بستی میں آکر پناہ گزین ہوئے ہیں۔ جن کے ہاں پناہ لی ہے وہ بھی یہود کے مقابلہ میں زیادہ اثر و اقتدار نہیں رکھتے لیکن بایں ہمہ اس معاہدہ کی دفعات پر نگاہ ڈالیے تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ یہ معاہدہ مغلوبانہ تو کجا، مساویانہ حیثیت سے بھی نہیں کیا گیا، بلکہ ایک ایسا معاہدہ ہے جیسے ایک بالادست جماعت مشترکہ دفاع کے لیے کسی پارٹی سے عہد کرتی ہے۔ معاہدہ کا سرنامہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔

یہود سے معاہدہ

هٰذَا كِتَابٌ مِّنْ مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ (صلعم) بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قُرَيْشٍ وَيَثْرِبَ وَمَنْ تَبِعَهُمْ فَلَحِقَ بِهِمْ وَجَاهَدَ مَعَهُمْ۔

یہ تحریر ہے محمد النبی (صلعم) کی قریش اور یثرب کے مومنین اور ان لوگوں کے باب میں جو ان کے

---

[1] یہود اور نصاریٰ دعوتِ اسلام کے کس طرح اور کیوں مخالف ہو گئے، اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

اتباع میں ان کے ساتھ شامل ہوں اور ان کے ساتھ مل کر جہاد کریں۔

اور

وَ إِنَّ الْمُؤْمِنِيْنَ بَعْضُهُمْ مَوَالِيْ لِبَعْضٍ دُوْنِ النَّاسِ۔

اور سب مومن ایک دوسرے کے بھائی اور مددگار ہیں اوروں کے مقابلہ میں۔

اور

وَ إِنَّهُ مَنْ تَبِعَنَا مِنْ يَهُوْدَ فَإِنَّ لَهُ النَّصْرُ وَالْمُرُوْءَةُ غَيْرَ مَظْلُوْمِيْنَ وَ لَا مُتَنَاصِرِيْنَ عَلَيْهِمْ۔

جو یہودی ہمارے اتباع میں (ہمارا ساتھ دیں) وہ امداد و مروّت کے حقدار ہوں گے، اس طرح کہ نہ ان پر ظلم ہوگا اور نہ ان کے خلاف مومن باہم ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

اور یہ کہ

وَ إِنَّهُ مَا كَانَ بَيْنَ أَهْلِ هٰذِهِ الصَّحِيْفَةِ مِنْ حَدَثٍ وَّ اشْتِجَارٍ يُخَافُ فَسَادُهُ فَإِنَّ مَرَدَّهُ إِلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَ إِلَى مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰهِ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ)

اس تحریر کے ماننے والوں میں اگر کوئی نئی بات پیدا ہو (جس کا ذکر اس معاہدہ میں نہیں) یا کوئی اور جھگڑا اُٹھے جس سے فساد کا اندیشہ ہو تو اس متنازعہ فیہ امر میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔[1]

---

[1] یہ ہیں اس معاہدہ کی بعض دفعات جسے بعض لوگ مسلم و غیر مسلم کے امتزاج سے "متحدہ قومیت" کی تشکیل کے لیے بطور سند پیش کرتے ہیں۔ لیکن معاہدہ تو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ ایک دوسرے میں جذب ہو جانے سے ایک متحدہ قومیت کی تشکیل نہیں بلکہ ایک مشترکہ مقصد میں باہمی رضامندی سے متحدہ محاذ قائم کرنے کی صورت تھی اور وہ بھی اس شکل میں کہ مسلمانوں کا ہاتھ، بہرکیف غالب رہے۔ یہ حضرات اپنے دعویٰ کی دلیل میں یہ چیز پیش کرتے ہیں کہ اس معاہدہ کے سرنامہ کے بعد یہ بھی مذکور ہے کہ:

أَنَّهُمْ أُمَّةٌ وَّاحِدَةٌ مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ۔

یہ باہمی معاہدہ کرنے والے لوگ، دوسروں کے مقابلہ میں ایک جماعت ہوں گے۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

اس طرح مدینہ میں اندرونی سازشوں اور بیرونی خدشات کے امکانات کو کم کرنے کے بعد نبی اکرمؐ اپنی جماعت کی تعلیم و تربیتِ خصوصی کی طرف متوجہ ہو گئے کہ اصل کام ان افرادِ صالحہ کو ایک خیرِ اُمت میں تبدیل کر کے انھیں عالمگیر انقلاب کا اوّلین خمیر بنانا تھا تاکہ اس کے بعد، وہ نوعِ انسانی کے جس آٹے میں جا کر ملیں، اس میں بھی وہی خمیر پیدا ہو جائے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ
وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ ۲/۱۴۳

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ گزشتہ) اس لیے مُسلم اور غیر مُسلم مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں۔ اس دلیل کی کمزوری واضح ہے۔ "امتِ واحدہ" سے مفہوم ایک فریق (ONE PARTY) ہے نہ کہ مصطلحہ قوم (NATION)۔ جیسا کہ ہم شروع سے کہتے چلے آ رہے ہیں، حضرات انبیاءِ کرامؑ کی دعوت کی اساس و بنیاد اس اہم اصل پر ہوتی ہے کہ قومیت کا مدار کفر و اسلام ہے۔ اس تمام تعلیم کے مقابلہ میں، اس معاہدہ کے الفاظ "اُمَّةً وَّاحِدَةً" سے یہ دلیل لانا کہ مُسلم و غیر مُسلم مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں، قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ یہ معاہدہ تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے۔ نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ کا آئینہ قرآن ہے۔ تاریخ کے واقعات کو اس کے تابع رکھنا ہوگا۔ اگر کوئی روایت قرآن کے خلاف جائے گی تو قرآن کو صحیح اور تاریخی روایت کو کمزور ماننا ہوگا۔

اس معاہدہ کے آخری الفاظ ہیں کہ متنازعہ فیہ امور میں "اللہ اور اس کے رسولؐ" کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد مسلمانوں کا اجتماعی نظام ہے۔ واضح رہے کہ قرآنِ کریم میں بھی جہاں "اللہ اور رسولؐ" کی اطاعت وغیرہ کا ذکر ہے، اس سے مراد نظامِ خداوندی کی اطاعت ہے۔

قِبلہ

(مرکزِ ملّت)

قوم را ربط و نظام از مرکزے
روزگارش را دوام از مرکزے

قوموں کی ہستی کا مدار اُن کی مرکزیت پر ہوتا ہے۔ ان کی جُداگانہ حیثیت اور امتیازی خصوصیت اسی نقطۂ ماسکہ سے وابستہ ہوتی ہے، اگر ان کی مرکزیت میں خلل و انتشار واقع ہو جائے تو ان کی مِلّی حیثیت کا شیرازہ اس طرح بکھر جاتا ہے جس طرح پُرکار کے پاؤں کے مرکز (CENTRE) سے ہِل جانے سے پورے کا پورا دائرہ بگڑ جاتا ہے۔ قوموں کا خصوصی امتیاز اُن کا اندازِ فکر ہے جو تہذیب و تمدن کے محسوس پیکروں میں دُنیا کے سامنے آتا ہے اور تہذیب و تمدن کی محافظ اس قوم کی قوّت و سطوت ہوتی ہے۔ دنیا میں کوئی تہذیب زندہ نہیں رہ سکتی جب تک اس کے پسِ پشت قوّت و اقتدار موجود نہ ہو لیکن یہ قوّت و اقتدار بھی ایک مرکز کا محتاج ہوتا ہے اور مرکزی تشتّت و خلفشار، بڑی سے بڑی قوّت تاھرہ کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔ قوّت اور حکومت کا مرکز اس قوم کا دارالسلطنت ہوتا ہے۔ تاریخ کے شواہد پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ قوموں کے قیام و فنا میں اُن کے دارالسلطنت کو کتنا بڑا دخل رہا ہے۔ بڑی سے بڑی وسیع و عریض سلطنت کو مغلوب کرنے کے لیے اُس کے دارالخلافہ کو فتح کر لینا کافی ہے۔ یوں دیکھئے تو دارالخلافہ بھی دوسری بستیوں کی طرح اینٹ اور پتھر کی عمارات کے مجموعہ کا نام ہوتا ہے۔ لیکن وہ درحقیقت، نشان (SYMBOL) ہوتا ہے اس قوم کی قوّت اور اجتماعیت

کا، جس طرح عَلَم (جھنڈا) کسی قوم کی حکومت کا محسوس نشان ہوتا ہے اور جھنڈے کے سرنگوں ہو جانے سے مراد خود اس قوم کی حکومت کا زوال پذیر ہو جانا ہوتا ہے۔ جب آپ ماسکو کہتے ہیں تو اس سے مقصد ایک شہر نہیں ہوتا، اس سے مُراد خود کمیونزم ہوتی ہے۔ جب آپ کہیں گے کہ وہ اپنا رُخ ماسکو کی طرف کیے رہتا ہے تو اس سے مُراد یہ ہوتی ہے کہ وہ کمیونزم کے رجحانات رکھتا ہے۔ لندن ہر انگریز کے نزدیک اس کی قومیت کا نشان اور انگریزی تمدن کا مرکزِ محسوس ہوتا ہے۔ اس مرکز کی اہمیت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ انسان دنیا کے کسی گوشے میں ہو اس کے

مرکز کی اہمیت

رُجحانات قلب و میلاناتِ نظر کی طنابیں غیر محسوس طور پر اس مرکز کے ساتھ یوں پیوستہ ہوں گی جس طرح فضا کی پہنائیوں میں گم ہو جانے کے باوجود پرندے کی نگاہیں ایک لاسلکی سلسلہ کی وساطت سے شاخِ آشیانہ سے مربُوط رہتی ہیں مرکز کا جذب وکشش افرادِ قوم کو اس طرح باہمد گر متمسک رکھتا ہے جس طرح اجرامِ فلکی اپنے اپنے محوری نظام کی کشش سے، باوجود فصلِ مکانی ایک دُوسرے سے متصل و ملحق ہوتے ہیں۔ لیکن جونہی یہ مرکزی کشش ختم ہوئی، وہ ایک ہی جگہ ہونے کے باوجود اس طرح ایک دُوسرے سے بیگانہ ہو جاتے ہیں جس طرح صحرا میں ریت کے ذرّے ــــ اور پھر ان کا مآل! یعنی پانی کی ہر موج انہیں اپنے ساتھ بہا کرلے جائے اور ہَوا کا ہر تیز جھونکا انہیں جدھر چاہے اُڑائے اُڑائے پھرے۔ ملّتِ اسلامیہ

مِلّتِ اِسلامیہ کا فکرِ خصُوصی

کا فکرِ خصوصی خدا کی حاکمیت کا تصور ہے۔ یہی وہ خصُوصیتِ کبریٰ ہے جو اسے تمام اقوام و مللِ عالم سے متمیز و ممتاز کرتی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَانًا وَيُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿۸/۲۹﴾

مسلمانو! اگر تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو گے تو وہ تمہیں الگ امتیاز عطا کر دے گا اور تمہاری ناہمواریاں دُور کر کے تخریبی عناصر سے تمہاری حفاظت کا سامان مہیا کر دے گا۔

خدا کی حاکمیت کا عملی نفاذ اُن کی زندگی کا نصب العین اور قوائے فکر و عمل کا مرجع ہے۔ یہ نفاذ، قوّتِ سطوت

مرکزِ مشہُود

کے بغیر ناممکن ہے اور ان کی قوّت کا مرکزِ مشہُود بیتُ الحرام ہے۔ اس ملّت کی تاسیس حضرت ابراہیمؑ کے مقدّس ہاتھوں سے عمل میں آئی تھی اور انہی کے ہاتھوں

دُنیا کے بُت کدوں میں پہلا وہ گھر خُدا کا

وجود پذیر ہُوا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے پہلوٹے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کی زندگی کو اسی گھر کی تولیّت کے لیے

وقف کر دیا اور یہی وہ ذبحِ عظیم ہے جس کا تعارف قرآنِ کریم نے ایسے درخشندہ الفاظ میں کرایا لیکن نبیٔ اکرمؐ سے پہلے نبوت و رسالت حضرت ابراہیمؑ کی شاخِ فلسطینی (یعنی اولادِ حضرت اسحٰقؑ) کے حصہ میں رہی جو بعد میں بنی اسرائیل کے نام سے دنیا میں متعارف ہوئے۔ انھوں نے یروشلم کے بیت المقدس کو اپنا قومی مرکز قرار دیا اور جب تک وہ مرکز پایندہ رہا یہ قوم بھی زندہ رہی جب یہودیوں کے ہاتھ سے قوت چھن گئی تو یہ قومی مرکز محض ایک "مقدس" شہر بن کر رہ گیا جس میں ان کے بزرگوں کے مقبرے اور اسلاف کے تبرکات تھے۔ یہود کا مذہب بھی قومی تھا اس لیے ان کا مرکز بھی قومی ہی رہا۔ برعکس اس کے اسلام، نوعِ انسانی کے لیے نظامِ زندگی تھا اس لیے اس کے مرکزِ محسوس کے لیے بھی ضروری تھا کہ وہ انسانیت کا مرکز اور دنیا میں امن و سلامتی کا ضامن ہو۔ یہ بلند مقصد تھا جو کعبہ کی عمارت کا گویا سنگِ بنیاد تھا۔ غور کیجئے! جب کعبہ کی بنیاد رکھی گئی ہے، تو اس وقت یہ اعلان کر دیا گیا کہ یہ گوشہ تمام نوعِ انسانی کے لیے امن و عافیت کا ذمہ دار اور سکون و سلامتی کا کفیل ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔

وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ (۲/۱۲۵)

ہم نے (مکہ کے) اس گھر کو (یعنی خانۂ کعبہ کو) انسانوں کی گرد آوری کا مرکز اور امن و حرمت کا مقام ٹھہرا دیا۔

یعنی اس مقام کو عالمِ انسانیت کی اجتماعیت کا مرکز اور امن کا مقام قرار دیا ——— پوری کی پوری نوعِ انسانی کا مرکز اور مقامِ امن ———

اور سورۂ آلِ عمران میں ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۚ (۳/۹۶)

بلاشبہ، پہلا گھر جو نوعِ انسانی کے لیے (حکومتِ الٰہیہ کا مرکز) بنایا گیا ہے، وہ یہی ہے جو مکہ میں ہے، برکت والا اور تمام نوعِ انسانی کے لیے راہ نمائی کا سرچشمہ۔

یہاں پھر یہی کہا گیا ہے کہ یہ مقام پوری انسانیت کے لیے مرکز ہے۔ اور آیت کے آخر میں ہے وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ (۳/۹۷) جو بھی اس میں داخل ہو اُسے امن مل جائے، یعنی پوری نوعِ انسانی کے لیے مقامِ امن و حفاظت۔ غور کیجئے! قرآن انسانیت کو کس قدر بلند مقام پر لے جاتا ہے۔ آج ساری دنیا کا ستایا ہوا انسان للچائی ہوئی نگاہوں سے چاروں طرف تکتا ہے کہ کوئی ایسا مقام مل جائے جہاں اسے انسانی درندوں کے

پنجہ ہلائے خوں سے پناہ مل جائے۔ لیکن اس کی للچائی ہوئی نگاہیں چاروں طرف سے خاسر و نامراد اور مایوس و نا اُمید لوٹ آتی ہیں اور حسرت بن کر کنجِ قلب میں گوشہ نشین ہو کر رہ جاتی ہیں۔ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ

ساری دُنیا کے امن کا ذمّہ دار

ستم کدۂ دہر میں کوئی ایسا مقام ہونا ضروری ہے کہ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا کہ جو شخص وہاں سے پناہ طلب کرے، اُسے ایسا امن میسّر آجائے کہ دنیا میں کسی کی عتاب آلود نگاہ اس میں خلل نہ ڈال سکے۔ یہ مقام، نظامِ توحید کے مرکز کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ مقام ہے جو قوموں اور گروہوں کے مفاد کا محافظ نہیں بلکہ نوعِ انسانی کی حفاظت کا ضامن ہے۔

مکّے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیّتِ اقوام کہ جمعیّتِ آدم؟

اسی لیے قرآن نے کعبہ کو قِیَامًا لِّلنَّاسِ کہا ہے۔

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ - (۵/۹۷)

اللہ نے کعبہ کو حرمت کا گھر بنایا ہے۔ سب نوعِ انسان کے لیے قیام کا ذریعہ ٹھہرایا ہے۔

یعنی اس نظام کا مرکز جس میں انسان، انسان کی غلامی سے چھٹکارا پا کر سرفرازی و سربلندی حاصل کر سکے اور اس طرح گری ہوئی انسانیت کو پھر سے قیام کی سعادت نصیب ہو جائے۔ اس نظام کا مرکز جس کا نصب العین یہ ہے کہ نوعِ انسانی اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جائے۔ کوئی کسی کا دست نگر اور محتاج نہ ہو۔ سَوَآءَ نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ (۲۲/۲۵) یہ مقام 'یہاں کے رہنے والوں اور باہر سے آنے والوں' سب کے لیے "کھلا ہوا شہر" (OPEN CITY) ہو۔ آپ پورے قرآنِ کریم کو دیکھ جائیے۔ حج اور کعبہ کا جہاں جہاں ذکر ہے، وہاں کسی خاص قوم کا ذکر نہیں۔ (حتیٰ کہ مسلمانوں کا بھی الگ ذکر نہیں) وہاں النّاس کا ذکر ہے یعنی قرآنِ کریم کا متعیّن کردہ نظام پوری کی پوری نوعِ انسانی کا محافظ اور اس کی منفعت کا ضامن ہے۔ جماعتِ مومنین کے ذمّہ صرف اس نظام کا قیام و استحکام ہے۔ اس کی منفعت بخشیوں میں پوری کی پوری انسانیت شامل ہے۔ اجتماعِ حج میں بھی جماعتِ مومنین کی حیثیت داعیان اور انتظام کنندگان (CONVENERS) کی ہے۔ اس کا مقصد پورے عالمِ انسانیت کی فوز و فلاح ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس نظامِ امن و سلامتی کے مرکز کی

اس کی تولیّت کے مستحق

تولیّت کے مستحق وہی ہو سکتے ہیں جو قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کریں

اور انہیں دنیا میں عملاً نافذ کرنا جن کا مقصودِ حیات ہو۔

اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۸/۳۴)

اس کے متولی وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کریں لیکن ان میں سے اکثر اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

جب تک نبیٔ اکرمؐ مکہ میں رہے، کعبہ کی اہمیت کے متعلق کوئی سوال پیدا نہ ہوا۔ اس لیے کہ کعبہ کی اہمیت خود قریش کے ہاں بھی مُسلّم تھی۔ وہاں سوال یہی تھا کہ قریش نے کعبہ کو بُت کدہ بنا رکھا تھا اور جس مقصد کے لیے اُسے تعمیر کیا گیا تھا وہ مقصد یکسر ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ نبیٔ اکرمؐ کی دعوتِ انقلاب کا مقصد یہ بھی تھا کہ کعبہ کو پھر سے وہی مقام حاصل ہو جائے جو اس کی تعمیر کا منتہیٰ تھا۔ قریش اس دعوت کی مخالفت اس لیے بھی کرتے تھے کہ کعبہ کے مقام کی اس اصلاح میں ان کے مفاد پر زد پڑتی تھی۔ وہاں بہرحال کعبہ کے متعلق یہی کشمکش تھی۔

جب آپؐ مدینہ تشریف لائے تو یہاں یہودیوں کا زور تھا۔ ان کی وجہ سے یہاں اسلام کے متعلق اور ہی قسم کی بحثیں شروع ہو گئیں۔ یہ بحثیں یہود و نصاریٰ کی طرف سے تھیں۔ (مثلاً) یہودی کہتے تھے کہ اگر اسلام وہی ہے جو سابقہ انبیاء کرامؑ کی وساطت سے ملتا چلا آرہا تھا تو اس میں فلاں فلاں بات یہودی شریعت کے خلاف کیوں ہے۔ یا یہ نیا نبی، بنی اسرائیل میں سے کیوں نہیں۔ اس سلسلہ میں ان کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ بیت المقدس، انبیاء سابقہ کا مرکزی مقام (قبلہ) چلا آرہا تھا مسلمانوں نے اِسے چھوڑ کر، کعبہ کو اپنا قبلہ کیوں قرار دے رکھا ہے۔

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ (۲/۱۴۲)

یہ لوگ جہالت و نادانی کی بنا پر، یہ اعتراض بھی کریں گے کہ جب ان کا (یہودیوں کا) قبلہ بیت المقدس چلا آرہا تھا تو مسلمانوں نے اسے چھوڑ کر، کعبہ کو اپنا قبلہ کیوں بنایا ہے؟

اُن سے کہا گیا کہ تم نے اپنے مذہب کو بھی قومی بنا لیا تھا، بنی اسرائیل کے علاوہ کوئی اور اس کے دائرے میں داخل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اسی طرح تمہارا قبلہ بھی تمہارا قومی مرکز بن کر رہ گیا تھا۔ لیکن اسلام، نوعِ انسانی کا دین ہے اور قومی نسبتوں سے بلند۔ اس لیے اس کے قبلہ کو بھی بین الاقوامی ہونا چاہیے۔ یہ وجہ ہے کہ ان کے لیے کعبہ کو بطور مرکز تجویز کیا گیا ہے۔ انہوں نے ایک بین الاقوامی اُمت (اُمَّةً وَّسَطًا) بننا ہے۔ "قومیت" سے "بین الاقوامیت" کی طرف رُخ کرنا، بجائے خویش ایک بہت بڑی آزمائش (TEST) ہے۔ اس طرف

وہی لوگ آسکیں گے جو اپنے سینے میں اس قدر کشادگی رکھیں گے۔ یہ اعلان، درحقیقت ایک بہت بڑے انقلاب کا اعلان تھا اور ایسے وقت میں کیا گیا تھا جب مسلمانوں کی حیثیت مدینہ میں بڑی کمزور تھی اور وہاں کے یہودی بڑے اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ یہ اعلان بھی اسی نوعیت کا تھا جس نوعیت کا اعلان مکہ میں کیا گیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ تمہارے ساتھ ہماری کوئی مفاہمت نہیں ہوسکتی۔ یہی بات یہود سے کہی گئی کہ ہم تمہارے قبلہ کے تابع نہیں ہوسکتے۔ ہمارا نصب العین حیات (قبلہ) تم سے یکسر الگ ہے۔

اس کے ساتھ ہی ایک اور سوال بھی تھا جو نبیٔ اکرمؐ کے دل میں رہ رہ کر اُٹھ رہا تھا۔ اس جدید اُمت کا مرکزِ نظام (قبلہ) کعبہ کو قرار دیا گیا اور کعبہ اس نظام کے مخالفین (قریش) کے قبضہ میں تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ کیسے ہوسکے گا کہ اس نظام کا مرکز تو کعبہ ہو لیکن کعبہ اس نظام کے مخالفین کے قبضہ میں ہو۔ یہ ہے وہ حقیقت جس کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا گیا کہ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا ص (۲/۱۴۴) ہمیں اس کا بھی علم ہے کہ تمہارے دل میں یہ آرزو بار بار اُبھر رہی ہے کہ جس مقام (کعبہ) کو ہمارے نظام کا مرکز قرار دیا گیا ہے، اس پر قبضہ و تصرّف بھی ہمارا ہی ہونا چاہیئے۔ یہ ٹھیک ہے۔ ایسا ضرور ہو کر رہے گا۔ آخر الامر کعبہ پر تصرّف تمہارا ہی ہوگا۔ اس دوران میں تمہارے کرنے کا کام یہ ہے کہ تم زندگی کے کسی گوشے میں بھی ہو، اپنی توجّہات کا رُخ اسی قبلۂ مقصود کی طرف مرکوز رکھو، اسی کو اپنی سعی و کاوش کا محور بناؤ۔

وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ (۲/۱۴۴)

(جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) کعبہ کو اپنی تمام توجّہات کا مرکز، اپنی تمناؤں کا محور، اپنی سعی و کاوش کا مقصود اور تگ و تاز کا منتہیٰ بنانے کا مفہوم ایسا ہی سمجھو جیسے آج (مثلاً) کہہ دیتے ہیں کہ ہر اشتراکی کا رُخ ماسکو کی طرف ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ساری زندگی اس مشن کو کامیاب بنانے میں صرف کر دیتا ہے جس کا مرکز ماسکو ہے ——— یعنی اشتراکی نظام ——— مومن کا شعار بھی یہ ہے کہ وہ اپنی تمام توجّہات کا رُخ کعبہ کی طرف رکھے، یعنی اس کی زندگی اس پروگرام کی تکمیل کے لیے وقف ہو جس کا مرکزِ محسوس کعبہ ہے ——— یعنی قرآنی نظامِ مملکت ——— یہ جو ہم اپنی نمازوں میں کعبہ کی طرف رُخ کرتے ہیں تو یہ اُسی حقیقت کا محسوس مظاہرہ ہے۔ اس سے ایک تو تمام دنیا کے مسلمانوں میں وحدتِ عمل، یک نگہی اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور دوسرے بار بار اس بات کی یاد دہانی ہو جاتی ہے کہ ہماری زندگی اس نظام کی کامیابی کے لیے وقف ہے جس کا مرکز کعبہ ہے۔ خود قرآنِ کریم نے، کعبہ کو تمام مسلمانوں کا قبلۂ مقصود بنانے کے ساتھ ہی

فرمایا کہ:

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ﴿۲/۱۲۰﴾

اور (حقیقت یہ ہے کہ تم اپنی سچائی کی کتنی ہی نشانیاں پیش کرو لیکن) یہود و نصاریٰ تم سے خوش ہونے والے نہیں۔ وہ تو صرف اس حالت میں خوش ہو سکتے ہیں کہ تم ان کی (بنائی ہوئی) ملتوں کے پیرو ہو جاؤ۔ (لیکن جس بات کو انہوں نے دین سمجھ رکھا ہے، وہ گروہ پرستی کے تعصب کے سوا کچھ نہیں ہے) پس تم ان سے (صاف صاف) کہہ دو کہ خدا کی ہدایت کی راہ تو وہی ہے جو ہدایت کی حقیقی راہ ہے۔ اور یاد رکھو کہ اگر تم نے ان لوگوں کی خواہش کی پیروی کی، باوجودیکہ تمہارے پاس علم و یقین کی روشنی آچکی ہے، تو (یہ ہدایتِ الٰہی سے صریح انحراف ہوگا، اور پھر) اللہ کی دوستی اور مددگاری سے تم یکسر محروم ہو جاؤ گے!

اگلی آیت میں اس کی وضاحت فرمادی:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲/۱۴۳﴾

اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی اُمت بنا دیا جس کا مقصد یہ ہے کہ تم تمام دنیا کے انسانوں کے اعمال کے نگران رہو اور تمہارے اعمال کا نگران تمہارا مرکزِ ملت (رسول) ہو۔ اور جس قبلہ کی طرف تم رُخ کیے ہوئے ہوا سے ہم نے اس لیے قبلہ بنا دیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ کون اللہ کے رسول کی پیروی میں سچے ہیں اور کون اُلٹے پاؤں پھر جانے والے ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ ہدایت یافتہ لوگوں کے سوا اور سب کے لیے اس معاملہ میں بہت ہی سخت آزمائش ہے۔ بہرحال، (جو لوگ آزمائش میں پورے اُتریں، وہ یقین کریں کہ ان کی استقامت کے ثمرات بہت جلد انہیں حاصل

ہوں گے، ایسا نہیں ہو سکتا کہ خدا تمہارا ایمان رائیگاں جانے دے۔ وہ تو انسانوں کے لیے سرتاسر شفقت و رحمت رکھنے والا ہے۔

"کَذٰلِكَ" پر غور کیجئے یعنی تعینِ قبلہ سے مقصود، تشکیلِ اُمت، یعنی تمہاری جداگانہ ملّی ہستی کا تشخص ہے۔ اس سے مفہوم یہ ہے کہ تمھیں دنیا میں ایک ممتاز اور متمیز حیثیت عطا کی جائے اور تمہارا فریضۂ حیات یہ ہو کہ تم تمام نوعِ انسانی کے اعمال کے نگران (شہید) رہو اور تمہارے اعمال کا نگران تمہارا مرکز ہو۔ پھر اسی سے یہ مقصد بھی حاصل ہو گیا کہ جو لوگ منافقانہ طور پر تمہاری جماعت میں شامل ہونا چاہتے تھے، وہ تم سے الگ ہو گئے۔ اس لیے کہ ہزار منافقت کے باوجود یہ وہ اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کا رشتہ ان کے قومی مرکز سے ٹوٹ جائے۔ اس کے بعد پھر توجہ اس حقیقتِ کبریٰ کی طرف مبذول کرا دی کہ اس تعینِ جہت ہی کو مقصود بالذّات نہ سمجھ لینا۔ اصل شئے تو اعمالِ صالحہ میں مسابقت ہے۔

تشکیلِ ملّت

وَ لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ٥ (۲/۱۴۸)

اور (دیکھو) ہر گروہ کے لیے ایک سمت ہے جس کی طرف وہ رُخ پھیر لیتا ہے۔ (پس یہ کوئی ایسی بات نہیں جو دین کے اصول و مہمات میں سے ہو اور جسے حق و باطل کا معیار سمجھ لیا جائے۔ اصلی چیز جو اس طرح کے تمام احکام سے مقصود ہے، وہ نیک عملی ہے) پس نیکیوں کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرو۔ تم جہاں کہیں بھی ہو خدا کا قانونِ مکافات تمہیں وہاں موجود ملے گا۔ یقیناً اس نے ہر بات کے لیے پیمانے (قوانین) مقرر کر رکھے ہیں۔

یعنی کسی حقیقت کے نشان (SYMBOL) کو مقصود بالذّات نہیں سمجھ لینا چاہیئے۔ نگاہ ہمیشہ اصل حقیقت کی طرف رکھنی چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ (SYMBOL) مقصود بن جائے اور حقیقت نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔

وَ اِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ٥ (۲/۱۴۹)

اور (اے پیغمبرؐ!) تم کہیں سے بھی نکلو (یعنی کسی سمت اور کسی مقام میں بھی ہو) لیکن اپنا رُخ اسی طرف کو پھیر لو اور یقین کرو، یہ معاملہ تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک امرِ حق ہے۔ اور جانتے رہو کہ اللہ تمہارے اعمال کی طرف سے غافل نہیں ہے (اس کا قانونِ مجازات تمہارے ایک ایک عملِ حق کی نگرانی کر رہا ہے)۔

آج کعبہ کی حیثیت

تقررِ قبلہ کے ان حیات بخش مقاصد پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ آج ہمارے نزدیک قبلہ کی کیا حیثیت باقی رہ گئی ہے؟ کیا بعینہٖ وہی نہیں جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے بار بار تاکیداً کہا تھا کہ جس کعبہ کی صحیح حیثیت یہ ہے کہ وہ تمہاری ملّی ہستی کا محور، تمہاری قوت کا مرکز اور تمہارے فکر و عمل کی یک نگہی و یک رنگی کی دلیل ہے، اس کے متعلق یہ نہ سمجھ لینا کہ اس کا تقرر محض اس لیے ہوا ہے کہ تم اپنی نمازوں میں منہ اس طرف کر لیا کرو اور بس! یہ تعیینِ جہت تو اس مقصد کے حصول کا محسوس مظاہرہ ہے۔ دیکھئے کہ کیا آج کعبہ سے مقصود فقط اتنا ہی نہیں رہ گیا کہ اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لی جائے یا اس کا طواف کر کے حج کی رسم ادا کر لی جائے۔ قرآن نے یہ بتایا تھا کہ توجیہ سے مقصود یہ ہے کہ خدا کی حاکمیت قبول کرنے والوں میں وحدتِ ملّی پیدا ہو۔

چیست ملّت ایکہ گوئی لَآ اِلٰہَ؟ ‏ ‏ با ہزاراں چشم بودن یک نگہ

ذرّہ ہا از یک نگاہی آفتاب ‏ ‏ یک نگہ شو تا شود حق بے حجاب

یہ یک نگہی و ہم آہنگی مرکز کے بغیر ناممکن ہے۔ اور تمہاری نگاہوں کا مرجع محسوس اور قلب کا مرکز مشہود بیت الحرام ہے۔

قوم را ربط و نظام از مرکزے ‏ ‏ روزگارش را دوام از مرکزے

راز دار و رازِ ما بیت الحرم ‏ ‏ سوزِ ما ہم سازِ ما بیت الحرم

ظاہر ہے کہ اِس مرکز کو اس قدر مستحکم ہونا چاہیئے تھا کہ تمام دُنیا کی قومیں اپنے اپنے تنازعات و اختلافات میں اس کی طرف رجوع کرتیں اور نوعِ انسانی سے متعلق جب کوئی نیا سوال پیدا ہوتا تو ہر ایک کی نگاہ اس مرکز کی طرف اُٹھتی اور یہاں کا فیصلہ تمام فیصلوں پر غالب رہتا کہ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ کا یہی مفہوم اور شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ کا یہی مطلوب ہے۔ مومن کا تو مقام یہ تھا کہ

قُدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے

دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

ہر قوم کے اعمال اسی میزان پر آکے تُلتے تھے اور خیر و شر کے فیصلوں کا یہی معیار تھا۔ مومن کے اس مقام کا راز، حرم کی تقویت میں پوشیدہ تھا۔ اس کی کشتِ حیات کی سیرابی وہیں کے زمزم سے ہوتی تھی۔ آج غلط نظامہائے زندگی کا ستایا ہُوا انسان جن مصائب و مشکلات کا حل یونائیٹڈ نیشنز (اقوامِ متحدہ) میں تلاش کر

رہا ہے، ان کا صحیح حل عرفات کے میدان سے ملنا تھا. لیکن آج خود "مومن" کی کیا حالت ہے؟ اس حدیثِ اَلَم کو نہ ہی چھیڑا جائے تو اچھا ہے. کیا آزاد اور کیا محکوم، ہر خطہ کے مسلمان کی حالت یہ ہے کہ دوسروں کے معاملات میں حَکَم بننا تو کجا، خود اپنے معاملات میں غیروں کے فیصلوں کا محتاج ہے اور جس طرح ان کا جی چاہتا ہے وہ اسے نکیل سے پکڑ کر لیے لیے پھر رہے ہیں۔

گاہ اُورا با کلیسا ساز باز گاہ پیشِ دَیریاں اندر نیاز

فکر ان کی غیروں کی مستعار، عمل ان کا دوسروں کی نقالی. کہیئے کہ اس فکر اور اس عمل سے کیا نتائج مرتب ہوں گے۔

ازاں فکرِ فلک پیما چہ حاصل؟ کہ گردِ ثابت و سیارہ گردد
مثالِ پارۂ ابرے کہ از باد بہ پہنائے فضا آوارہ گردد

کعبہ اسی طرح موجود ہے (بلکہ اس سے کہیں زیادہ چمک اور دمک کے ساتھ. اُس وقت تو وہ صرف اینٹ اور پتھر کی کھُردری سی عمارت تھی اور اب یاقوت و مرمر کے در و دیوار پر چاندی اور سونے کی مرصع کاری) لیکن وہ اُس وقت جسدِ ملت کا قلبِ متحرک تھا اور اب ——— ہماری بے جان نمازوں کی جہت اور یہ روح طواف کی چار دیواری. یہ ہے فطری نتیجہ اس تبدیلی

دین مذہب بن کر رہ گیا

کا جس سے اسلام جیسا "دین" مذہب بن کر رہ گیا ہے. رسُوم باقی، خود فنا. رسم کی پابندی ایسی کہ غیروں کو کعبہ کی عمارت کے قریب نہیں آنے دیا جاتا اور رُوح سے بے نیازی ایسی کہ انہی غیروں کا اثر و اقتدار اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر رہا ہے. نماز میں تمام روئے زمین کے مسلمانوں کا رُخ اسی ایک قبلہ کی طرف ہوتا ہے اور زندگی کے تمام گوشوں میں ان کی نگاہوں کے قبلے جُدا جُدا. حج کعبہ سے مقصود یہ تھا کہ تمام دنیا کے مسلمان اس مرکزی مقام پر جمع ہو کر، اپنے معاملاتِ حیات کو بطریقِ احسن حل کرنے کی تدابیر سوچیں اور اس پر بھی غور و فکر کریں کہ انسانیت جن مشکلات میں مبتلا ہے ان کا مداوا کس طرح ہو سکتا ہے. لیکن اب ہم حج کرنے جاتے ہیں تاکہ عمر بھر کے گناہوں کا کفارہ ادا کر آئیں اور آتے وقت زمزم کا پانی ٹین کی ڈبیوں میں بند کر کے لیتے آئیں تاکہ اُسے مُردوں کے کفن پر چھڑکا جائے. نتیجہ اس کا وہ سکراتِ موت کی ہچکیاں جن میں پوری کی پوری اُمت آج گرفتار ہے. حساس قلوب اُن کے درد کا مداوا سوچتے ہیں لیکن گھبرا کر رہ جاتے ہیں کہ:

سینہ تمام داغ داغ پنبہ کجا کجا نہم!

لیکن نہیں سمجھتے کہ اُن کے مرض کا علاج مختلف زخموں پر مرہم لگانا نہیں کہ یہ تو علاماتِ مرض ہیں۔ علاج علّتِ مرض کا ہونا چاہیئے۔ یاد رکھیئے! جس طرح انسانی صحت کا مدار قلب کی صحت پر ہے' اسی طرح قوموں کے امراض کا علاج ان کے مرکز کی تقویت میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ جب تک ہمارا مرکزِ ملّت، یعنی کعبہ، اپنا صحیح مقام اختیار نہیں کر لیتا، اُس وقت تک ہمارے کسی دُکھ کا بھی علاج نہیں ہو سکتا۔ اور مرکز کی صحت کا راز حج کی تقریب (INSTITUTION) کی صحت میں مضمر ہے۔ جب تک حرم کی صحیح پوزیشن متعیّن نہیں ہوتی ہماری زندگی کا کوئی گوشہ بھی کامیاب و شادکام نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھیئے۔

حرم جز قبلۂ قلب و نظر نیست　　طوافِ اُو طوافِ بام و در نیست
میانِ ما و بیت اللہ رمزیست　　کہ جبریلِ امیں راہم خبر نیست

"حرم" سے مقصود ہے' جماعتِ مؤمنین کے عالمگیر نظامِ خداوندی کا مرکز۔ جس قدر یہ نظام' ذی قوت ہوگا اسی نسبت سے حرم مستحکم ہوگا۔ لیکن ہمارے ہاں یہ عجیب تماشا ہے کہ نظام سرے سے مفقود ہے اور نظام کے مرکز کی پرستش ہو رہی ہے! جب حضور نبیِ اکرمؐ کے مبارک ہاتھوں سے نظامِ خداوندی کی تشکیل ہوئی تھی تو اس نظام کے مرکز (کعبہ) کا اس نظام کی تحویل میں آنا ضروری تھا۔ یہ تھیں وہ آرزوئیں جو حضورؐ کے قلبِ اطہر میں بار بار بیدار ہوتی تھیں اور جو، بالآخر ثمربار ہو کر رہیں اور کعبہ اس نظام کی تحویل میں آگیا۔

یہی وہ کشمکش ہے جس کی داستان آئندہ صفحات میں ہمارے سامنے آئے گی۔

سِلسلۂ غزوات

زندگی نام ہے جہدِ مسلسل اور سعیٔ پیہم کا۔ جب یہ جہد و کاوش، حق کی حمایت کے لیے کی جائے تو اسے قرآنِ کریم کی اصطلاح میں **جہاد** کہا جاتا ہے۔ اس میں مستقل اقدارِ خداوندی کے عام کرنے اور انہیں ایک زندہ حقیقت بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرنے کے سلسلہ میں ہر قسم کی کوشش شامل ہے۔ اسی کوشش میں ایک مقام ایسا بھی آجاتا ہے جب حق کی مدافعت میں، سر بکف اور شمشیر بدست، میدانِ جنگ میں نکلنا پڑتا ہے۔ اسے قتال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے تصادم کو غزوہ کہتے ہیں۔ اب ہم نبی اکرمؐ کے سفرِ حیات کی اس منزل میں آتے ہیں جہاں آپؐ کو، حق کی مدافعت کے لیے، غزوات سے واسطہ پڑا۔

جنگِ بدر

یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ نبی اکرمؐ کی ہجرت، قریشِ مکہ پر کس قدر گراں گزری تھی۔ اس سے ان کے تمام عزائم خاک میں مل گئے۔ لیکن عرب کا جوشِ انتقام، اور وہ بھی اس قسم کی اجتماعی حیثیت لیے ہوئے، ایسا نہ تھا کہ یونہی ٹھنڈا پڑ جاتا۔ انہوں نے تہیہ کر لیا کہ مسلمانوں کا تعاقب کیا جائے اور جب تک ان کی تحریک (اسلام) کا استیصال نہ کر لیا جائے، چین سے نہ بیٹھا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس خیال کو عام کیا اور اس طرح سارے عرب کو مخالفت و مبارزت کے لیے مشتعل کر دیا۔ ہجرت سے پہلے عبداللہ بن اُبی وہاں کا رئیس تھا۔ قریش نے اسے خط لکھا کہ:

> تم نے ہمارے آدمیوں کو اپنے ہاں پناہ دی ہے۔ ہم خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ یا تو تم لوگ انہیں قتل کر ڈالو یا مدینہ سے نکال دو، ورنہ ہم سب لوگ تم پر حملہ کر دیں گے اور تم کو فنا کر کے تمہاری عورتوں پر تصرف کر لیں گے۔ (بحوالہ سنن ابی داؤد)

نبئ اکرمؐ کو جب اس کا علم ہوا تو آپؐ نے عبد اللہ بن اُبی کو سمجھایا کہ اس مخالفت میں تم خود اپنے بیٹوں اور بھائیوں سے لڑو گے، اس لیے کہ انصار مسلمان ہو چکے تھے۔ اس کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور اس نے قریش کی بات نہ مانی۔ قریش نے مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ۲ ہجری کے اوائل میں مکہ کے ایک رئیس کرز بن جابر فہری نے مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کر دیا اور مسلمانوں کے مویشی لوٹ کرلے گیا۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب قریش کا قافلہ شام کی طرف تجارت کے لیے گیا ہوا تھا۔ اس قافلہ کو واپسی پر اسی راستہ سے گزرنا تھا۔ امیر کارواں ابوسفیان کو کسی نے یہ غلط خبر پہنچا دی کہ مسلمان تمھارے قافلہ کو لوٹنے کی فکر میں ہیں۔ اس نے اس کی اطلاع قریشِ مکہ کو بھیج دی۔ وہ پہلے ہی تیار بیٹھے تھے۔ خوئے بدرا بہانہ بسیار، ایک لشکرِ جرار ساتھ لے کر مدینہ کی طرف اُمنڈ آئے۔ نبئ اکرمؐ کو معلوم ہوا تو آپؐ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ ان کی بے سرو سامانی کا جو عالم تھا وہ ظاہر ہے لیکن یہ تو قدوسیوں کی وہ جماعت تھی جس نے اپنی جان اور مال حق کی حمایت کے لیے وقف کر رکھے تھے۔ وہ ہر حکم کی تعمیل کے لیے حاضر تھے۔ آپؐ نے انصار کی طرف نگاہ اُٹھائی تو ان کے رئیس سعد بن معاذؓ نے کہا کہ آپؐ حکم دیں تو ہم سمندر میں کود پڑیں۔ چنانچہ آپؐ فدائیوں کی اس مختصر سی جماعت کو لے کر غنیم کے مقابلہ کے لیے روانہ ہوئے۔ اس وقت خدا کی اس وسیع و عریض زمین میں خدا کا نام لینے والوں کی کل کائنات یہی تین سو کے قریب جاں نثار تھے جو لوائے حق و صداقت کے سائے میں اپنے دعوائے ایمان کی شہادت کے لیے اس طرح چل دیئے تھے۔ شوقِ شہادت کے وفور کا یہ عالم تھا کہ جب ایک کم عمر بچے (عمیر بن ابی وقاص) سے کہا گیا کہ وہ واپس چلا جائے تو وہ رو پڑا اور حضورؐ کو مجبوراً اجازت دینی پڑی کہ وہ ساتھ ہو لے۔ اس جوشِ مسرت میں اس کا بڑا بھائی (سعد بن ابی وقاص) اٹھا اور چھوٹے بھائی کے گلے میں خود تلوار حمائل کی۔ آسمان کے فرشتے اس حسین منظر کو دیکھ رہے تھے اور خدائے علیم و خبیر سے عرض کر رہے تھے کہ بارِ الٰہا! آپ نے سچ کہا تھا کہ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ۔ جاں نثار دل کی یہ کل جماعت ۳۱۳ نفوس پر مشتمل تھی اور بے سرو سامانی کا یہ عالم کہ ان کے ساتھ کُل دو گھوڑے تھے۔ مقابلہ میں قریش بڑے کرّوفر اور شان و شوکت سے نکلے تھے۔ ہزار سپاہیوں کی جمعیت، سو سواروں کا رسالہ، تمام رؤسائے قریش (باستثنائے ابولہب) شریکِ فوج، رسد کا یہ انتظام کہ دس دس اُونٹ روزانہ ذبح ہوتے تھے۔

قریش کو بدر کے قریب معلوم ہوا کہ ابوسفیان کا قافلہ خطرہ کی زد سے باہر نکل گیا ہے اور اب اندیشہ کی کوئی بات نہیں۔ لیکن ان کی تو نیت ہی جنگ کی تھی۔ وہ واپس کیوں لوٹتے؟ وادی کے دوسری طرف نبئ اکرمؐ نے ڈیرہ ڈال دیا۔ حبابؓ بن منذر ایک صحابی تھے۔ انہوں نے خدمتِ اقدس میں عرض کیا کہ محلِ فروکشی کا یہ انتخاب وحی

کی رُو سے ہُوا ہے یا حضورؐ نے اپنی رائے سے ایسا کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ وحی کا حکم نہیں۔ اس پر حبابؓ بن منذر نے عرض کیا کہ پھر اس مقام سے فلاں مقام زیادہ مناسب ہے۔ ہمیں وہاں جا کر اُترنا چاہیئے۔ حضورؐ نے معاملہ کے تمام پہلوؤں پر غور کیا جو حضرت حبابؓ نے پیش کیے تھے اور فرمایا کہ حبابؓ کی رائے زیادہ صائب ہے چنانچہ آپؐ نے اسی رائے پر عمل فرمایا۔ رات کو بارش ہوئی تو موقع کے حُسنِ انتخاب نے میدان کا نقشہ اُلٹ دیا۔ اب جو دیکھا تو

پہلا رمضان

بساطِ جنگ کا ہر گوشہ مجاہدین کے حق میں تھا۔ یہ اُس رمضان کی سترہ تاریخ تھی جس میں پہلے پہل روزے فرض ہوئے تھے۔ دشمن کے مقابلہ کے لیے تو سترہ روزے ہی کافی ہیں، بشرطیکہ روزے سے مفہوم محض نان وآب سے اجتناب نہ ہو بلکہ نگاہ اس کے اس مفہوم پر ہو جو آب وگِل کے پیکروں میں بجلیوں کی تڑپ پیدا کر سکتا ہے۔ ہاں تو سترہ رمضان، ۲ سنہ ہجری (مطابق ۱۳ مارچ ۶۲۴ء) کی صبحِ بدر کے میدان میں، دو صفیں ایک دوسرے کے سامنے نبرد آزما تھیں اور دنیا میں اس حقیقتِ کبریٰ کا اعلان کر رہی تھیں کہ انسانی تقسیم (قومیّت) کا صحیح معیار کیا ہے؟ حضرت نوحؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک کے حضرات انبیائے کرامؑ کے کوائف واحوال پر ایک نگاہ ڈالیے، آپ کو نظر آجائے گا کہ کس طرح کفر وایمان نے باپ اور بیٹے، بھائی اور بھائی، میاں اور بیوی، خویش واقارب میں ایک بدیہی تفریق کر کے رکھ دی تھی۔ وہ واقعات فرداً فرداً تاریخ کے صفحات پر رُونما ہوئے لیکن آج وہ تمام کے تمام ان دو صفوں میں سمٹ کر سامنے آگئے۔ یہ دو صفیں جو ایک دُوسرے کے مقابل شمشیر بکف کھڑی تھیں، کن افراد پر مشتمل تھیں؟ اُن پر، جن کا ملک ایک تھا، زبان ایک تھی، رنگ ونسل ایک تھی، حسب ونسب ایک تھا، لیکن اس کے باوجود ایک وجۂ افتراق تھی، جس نے ان تمام وجوہِ جامعیت کو منسوخ کر کے انہیں ایک دوسرے کے مدِمقابل کھڑا کر دیا تھا اور اس طرح دنیا کو بتلا دیا تھا کہ قرآن کی رُو سے قوموں کی تشکیل کس طرح ہوتی ہے۔ وہ وجہِ تفریق وعلتِ تقسیم تھی ایمان!

انسانی تقسیم کا فطری معیار

ایک طرف حضرت ابوبکرؓ تھے تو دوسری طرف مقابلہ میں ان کا بیٹا۔ اِدھر حضرت حذیفہؓ تھے، تو صفِ غنیم میں ان کا باپ عتبہ۔ اِدھر حضرت عمرؓ تھے تو اُدھر آپؓ کا ماموں جس کے خون سے آپ کی تلوار رنگین تھی۔ اِدھر حضرت علیؓ تھے تو مخالف صف میں ان کے بھائی عقیل۔ نہیں! اور آگے بڑھیئے۔ اِدھر خود محمد صلعم تھے تو سامنے کی صف میں آپؐ کے حقیقی چچا (حضرت) عباسؓ اور آپؐ کے داماد ابوالعاص! اِدھر اُمّ المومنین حضرت سودہؓ تھیں تو سامنے ان کے عزیز سہیل بن عمر۔ یہ تھی وہ حقیقی تقسیم جو وطن، رنگ، زبان، نسل کے غیر فطری حدود وثغور سے ماورا تھی، حبش کا

رہنے والا بلالؓ اپنوں میں سے تھا، لیکن حقیقی چچا عبّاس غیروں میں سے۔ روم کا صہیب یگانہ تھا لیکن حقیقی بیٹا بیگانہ۔ صفیں کھڑی ہوئیں تو امامِ جماعت (حضور نبیٔ اکرمؐ) نے ان پر ترچی ہوئی نگاہ ڈالی اور ایک تیر کے اشارے سے صفیں سیدھی کیں۔ (یہ جو آپ نماز باجماعت کے وقت "صفیں سیدھی کرلو" کی تاکید سنا کرتے ہیں، یہ اُسی زندگی بخش اور حیات آفریں "سنّت کی پیروی" ہے)۔

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن	مُلّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں	کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

عین اُس وقت حذیفہؓ بن الیمان اور ابوحسیلؓ دو صحابی دوڑتے دوڑتے صفوں میں شامل ہوتے۔ یہ کہیں دوسری

ایفائے عہد کا عدیم النظیر واقعہ

طرف سے آرہے تھے۔ ایسے موقع پر لشکر میں ایک آدمی کا اضافہ بھی ہزار مسرّت کا باعث ہوتا ہے۔ مجاہدین کو بڑی خوشی ہوئی۔ حضورؐ کے دریافت کرنے پر انہوں نے کہا کہ وہ کسی اور طرف سے آرہے تھے۔ راستہ میں کفار نے روکا کہ تم محمدؐ کی مدد کو جارہے ہو۔ انہوں نے انکار کیا اور وعدہ کیا کہ وہ اس جہاد میں شرکت نہیں کریں گے۔ اس طرح وہ مجاہدین سے آکر ملے ہیں۔ آپؐ نے سُنا تو فرمایا کہ تم نے ان سے عدمِ شرکت کا وعدہ کیا ہے تو اس کا ایفا کرنا ضروری ہے۔ تم جہاد میں شریک نہیں ہوسکتے۔ فکر نہ کرو! ہماری مدد اللہ کرے گا۔

غور فرمایئے! بلندیٔ کردار اور حُسنِ سیرت کی اس قدر تابندہ مثال کہیں اور بھی ملتی ہے؟

اب اس معرکۂ حق و باطل کی مزید تفصیلات قرآنِ کریم کے الفاظ میں سُنئے۔ چونکہ خیر و شر کی آویزش میں

قرآنی تفاصیل

یہ جنگ بڑی اساسی اہمیت رکھتی ہے، اس لیے قرآنِ کریم نے شرح و بسط سے اس کا تذکرہ کیا ہے اور پوری کی پوری سورۃ انفال گویا اسی کے کوائف و عواطف پر مشتمل ہے۔ بات یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ مدینہ میں یہ اطلاع آچکی تھی کہ ایک طرف سے قریش کا قافلہ آرہا ہے اور دوسری طرف سے ان کا لشکرِ جرّار۔ اب فطری طور پر بعض لوگوں کا رُجحانِ طبیعت اس طرف ہوگا کہ اگر مقابلہ ہونا ہے تو قافلہ والوں کے ساتھ ہو کیونکہ اس بے سروسامانی کے عالم میں جو اس وقت مدینہ کے مسلمانوں پر مسلط تھی، قریش کے جنود و عساکر کا مقابلہ مشکل نظر آتا تھا۔ لیکن دین کا تقاضا تھا کہ حق و باطل کا فیصلہ میدانِ جنگ میں ہوجائے اور رؤسائے قریش اپنی قوت کے زعمِ باطل پر جو اس قدر حق کی مخالفت پر تُلے ہوتے ہیں انہیں معلوم ہوجائے کہ

حق کی اس آواز کو دبا لینا آسان نہیں۔ چنانچہ یہ تھا وہ فیصلہ جس کے ماتحت مجاہدین کی یہ بے سروسامان جماعت گھر سے نکلی۔

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۙ .... لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۚ (۸-۵ تا ۸)

(اس معاملہ میں بھی ویسا ہی سمجھو) جس طرح (جنگ بدر میں) یہ بات ہوئی تھی کہ تو اپنے پروردگار کے پروگرام کے مطابق حق کے ساتھ مدینہ سے باہر نکلا تھا۔ حالانکہ تمہاری جماعت میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جس پر یہ فیصلہ ناگوار گزرا تھا۔ وہ تجھ سے اس باب میں جھگڑتے تھے حالانکہ معاملہ واضح ہو چکا تھا (وہ باہر نکل کر مقابلہ کرنے سے اس درجہ ناخوش تھے) گویا انہیں زبردستی موت کے منہ میں دھکیلا جا رہا ہے اور وہ (اپنی موت اپنی آنکھوں سے) دیکھ رہے ہیں۔ پھر جب تم آگے بڑھے تو حالات بتا رہے تھے کہ خدا کے اُس وعدے کے مطابق جو اُس نے ایمان و اعمالِ صالحہ کے بدلے میں استخلاف فی الارض کے متعلق کر رکھا ہے، تم مقابل کے دو گروہوں میں سے ایک پر ضرور غالب آجاؤ گے۔ (اس گروہ کی جو جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا) یہ خواہش تھی کہ مقابلہ اس گروہ کے ساتھ ہو جو مسلح نہیں تھا۔ اس لیے لڑائی کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن خدا کے قانونِ مشیت کا تقاضا یہ تھا کہ تمہارا مقابلہ ان کے لشکر سے ہو، تاکہ یہ بات ثابت ہو جائے کہ حق، باطل پر کس طرح غالب آیا کرتا ہے اور اس سے انکار اور سرکشی کرنے والوں کی جڑ کیسے کٹ جایا کرتی ہے۔ اور یوں، حق، حق ـ اور باطل، باطل بن کر دُنیا کے سامنے آجائے، خواہ مجرمین پر یہ بات کیسی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔

اب ہم میدانِ جنگ میں جا پہنچے ہیں۔ دونوں جماعتیں آمنے سامنے صف آرا ہیں۔ ایک طرف طاغوتی قوتیں اپنی پوری شوکت و شدت کے ساتھ آمادۂ پیکار ہیں۔ دوسری طرف خدا پرستوں کی یہ مختصر سی جماعت جو تین سو تیرہ نفوس پر مشتمل ہے، بے ساز و یراق، حق و صداقت کی مدافعت و حفاظت کے لیے سربکف سامنے کھڑی ہے۔ ظاہر ہے کہ آج کا معرکہ انسانیت کی تاریخ میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کرنے والا ہے۔ معاملہ کی نزاکت، اور اس واقعۂ عظیمہ کی اہمیت کے احساس سے نبیٔ اکرمؐ کا یہ عالم تھا کہ فوجیں میدان میں ہیں اور حضورؐ اُس خدائے ناصر و معین کی بارگاہِ عالیہ میں جھولی پھیلائے کھڑے ہیں جس کے قانون کی رفاقت و تائید کے بغیر زندگی

کے کسی گوشہ میں بھی کامیابی وکامرانی نصیب نہیں ہوسکتی۔ جھولی پھیلائی ہوئی ہے اور محویت کا یہ عالم ہے کہ ردائے مبارک کندھوں سے گر گر پڑتی ہے اور آپ کو خبر تک نہیں ہوتی۔ اسی والہانہ جذب وانہماک سے بحضورِ ربّ العزت عرض کرتے ہیں کہ :

بارِ الٰہا! اگر یہ مٹھی بھر جماعت آج مٹ گئی تو پھر قیامت تک تیری عبودیت اختیار کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔

مانگنے والے نے اس الحاح وزاری سے مانگا اور دینے والے نے اس بذلِ کریمانہ اور ترحّمِ خسروانہ سے نوازا اور کہا کہ :

فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ○ (۹)

ہم نے تمہاری بات سن لی ہے۔ تم گھبراؤ نہیں۔ (اگر دشمن کا لشکر ایک ہزار پر مشتمل ہے تو) ہم تمہاری مدد ایک ہزار ملائکہ سے کریں گے جو مسلسل آئیں گے (دلوں کا تسانی قوتیں تمہاری مدد کریں گی)۔

ملائکہ کی مدد

یہ ملائکہ کیا کریں گے؟ کیا مسلمانوں سے یہ کہیں گے کہ تم جاؤ، آرام سے گھروں میں بیٹھو۔ ہم ان دشمنوں سے خود ہی نپٹ لیں گے؟ نہیں، خدا کی نصرت اس طرح نہیں آیا کرتی۔ اس کی نصرت دلوں میں طمانیت ویقین کی بہار آفریں جنّتیں بسادیتی ہے اور دلوں کی حالت بدل جانے سے خارجی دنیا از خود بدل جایا کرتی ہے۔ میدانِ جنگ میں جس چیز پر فتح وشکست کا مدار ہے، وہ سپاہی کی روح ہے۔ اگر اسے اپنے مقصد کی صداقت پر یقین ہے اور اس طرح اسے جمعیتِ خاطر نصیب ہے، تو وہ دشمن کے جمِّ غفیر کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ اسی کا نام ملائکہ کی تائید تھی۔

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ (۱۰)

اللہ نے اس نصرت کے وعدے کو تمہارے لیے خوشخبری بنا دیا تاکہ تمہیں اس سے اطمینانِ قلب حاصل ہوجائے۔ حقیقت یہ ہے کہ فتح ونصرت قانونِ خداوندی کے مطابق ملتی ہے (وہ قانون جس میں قوت اور تدبیر دونوں موجود ہوتی ہیں)۔

سورۂ آلِ عمران (آیات ۱۲۶-۱۲۴) میں اس حقیقت کی وضاحت یہ کہہ کر کردی گئی ہے کہ نزولِ ملائکہ سے مقصود جماعتِ مؤمنین کے دلوں میں سکون اور اطمینان پیدا کرنا تھا۔ چنانچہ اس سے اُن کے اندر ایک

نفسیاتی تبدیلی پیدا ہوگئی۔

واضح رہے کہ "ملائکہ کی یہ تائید" معرکۂ بدر ہی سے مخصوص نہ تھی۔ قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ جہاں اور جب بھی یقینِ محکم کے ساتھ استقامت شامل ہو جائے، ملائکہ کی اس قسم کی تائید ہو جاتی ہے۔ سورۂ حٰمٓ سجدہ میں ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ .... مَا تَدَّعُوْنَ ۝ (۴۱/۳۰-۳۱)

جو لوگ اس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا نشو ونما دینے والا اللہ ہے اور پھر اپنے اس اقرار و اعلان پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں، تو ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ (کائناتی قوتیں ان کے لیے باعثِ تقویت بنتی ہیں اور) ان سے کہتی ہیں کہ تم کسی قسم کا خوف نہ کرو، نہ ہی افسردہ خاطر ہو۔ تمہارے لیے اس جنتی معاشرہ کی خوشخبری ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہیں اور آخرت میں بھی تمہارے رفیق ہوں گے۔ اس جنتی زندگی میں وہ سب کچھ ملے گا جسے تم طلب کرو گے۔

اسی کو دوسری جگہ "خدا اور اس کے ملائکہ کے مومنین پر درود بھیجنے" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (۳۳/۴۳)

اس تشریح کے بعد پھر بدر کے میدان کی طرف چلیے۔ اس کے ساتھ ہی خارجی دنیا میں بھی ایک ایسا واقعہ رونما ہو گیا جس سے فضا مسلمانوں کے لیے سازگار ہو گئی۔ قریش چونکہ بدر کی وادی میں پہلے آ پہنچے تھے اس لیے انہوں نے پانی کے چشمہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس سے مسلمانوں کو فطرۃً تردّد ہوا۔ پھر اس وادی میں زمین ریتلی تھی جس سے

بارش

پیادہ فوج کے پاؤں ریت میں دھنسے جاتے تھے (اور مسلمان تمام تر پیادہ ہی تھے)۔ لڑائی کی رات بارش ہو گئی جس سے مجاہدین کے پاس پانی کی بھی افراط ہو گئی اور زمین کی بھی حالت بدل گئی۔ ان کا خوف امن میں بدل گیا، تو وہ نہایت اطمینان سے رات بھر سوئے اور صبح تازہ دم میدان میں آ گئے۔ اس کیفیت کو سورۂ انفال کی آیات (۱۱-۱۲) میں بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ مجاہدین کی اسی قسم کی نفسیاتی تبدیلی کا اثر ہوتا ہے جو ان کی تعداد کی کمی اور سامان کی قلّت کی تلافی کر دیتا ہے اور ان میں کا ایک ایک سپاہی، مخالفین کے دو دو سپاہیوں، اور بسا اوقات دس دس پر بھاری ہو جاتا ہے جیسا کہ اسی سورہ کی آیات (۶۵-۶۶) میں بتایا گیا ہے۔ یہی وہ فرق تھا جو نمایاں طور پر میدانِ بدر میں سامنے آ گیا۔ سردارانِ قریش اور ان کے لشکر اپنی تعداد کے نشہ میں سرشار تھے اور فریقِ مقابل کی تعداد کی قلّت اور سامان و اسلحہ کی کمی کے پیشِ نظر انہیں خاطر میں ہی نہیں لاتے

تھے۔ ادھر مجاہدین کے دل استقامت و عزم اور یقین و ثبات سے ایسے مضبوط ہو چکے تھے کہ وہ فریقِ مخالف کی تعداد

ثبات و یقین

سے گھبراتے ہی نہیں تھے۔ انہیں ایک طرف خدا کے اس وعدہ پر کہ ایک ایک مردِ مومن، ڈیڑھ ڈیڑھ کفار پر غالب آجاتا ہے۔ ایسا پختہ ایمان تھا، اور دوسری طرف اپنی کامیابی پر ایسا محکم یقین کہ دشمنوں کی تعداد، انہیں اپنی تعداد سے زیادہ سے زیادہ دُگنی دکھائی دیتی تھی، یعنی ان کی اصلی تعداد سے ایک تہائی کم۔ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو دو مقامات پر بیان کیا ہے۔ ایک سورۂ آلِ عمران کی آیت (۱۲) میں اور دوسرے سورۂ انفال کی آیات (۴۳-۴۴) میں۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد فریقِ مخالف سے پہلے ہی کم تھی لیکن کفار کے نشۂ رعونت و تکبر نے یہ کہہ کر اس تعداد کو اور بھی کم کر دکھایا، کہ یہ بے سروسامان مُٹھی بھر جماعت ہے ہی کیا! اسے ہم ابھی کچل دیں گے۔ دوسری طرف مسلمانوں نے اپنے نصبُ العین کی صداقت اور عزم و استقامت کی بنا پر انہیں اپنے سے زیادہ سے زیادہ دوگنا خیال کیا جس پر غالب آنا وعدۂ خداوندی کی رُو سے یقینی تھا۔ سپاہیوں کی قلبی کیفیت یوں بساطِ مصاف اُلٹ دیا کرتی ہے۔

ثابت قدمی کی تاکید

اب فوجیں آمنے سامنے ہیں۔ ادھر صحابۂ کبارؓ کی وہ جماعت ہے جس کا ایمان ساری دنیا کے مومنین کے لیے نمونہ ہے۔ لیکن انہیں بھی تاکید کی جاتی ہے کہ یاد رکھو! جو باطل کے مقابلہ میں پیٹھ دکھاوے گا، سیدھا تباہی و بربادی کے جہنم میں چلا جائے گا۔

وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۸/۱۶﴾

مسلمانو! جب کافروں کے لشکر سے تمہاری مڈھ بھیڑ ہو جائے (یعنی وہ تم پر ہجوم کر کے چڑھ دوڑیں اور تم اُن کے مقابل ہو) تو انہیں پیٹھ نہ دکھاؤ (سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرو) اور جو کوئی ایسے موقع پر پیٹھ دکھلائے گا، بجُز اس کے کہ وہ لڑائی کے لیے پینترا بدلے یا اپنی جماعت کی طرف پناہ جوئی کے لیے رُخ کرے تو سمجھ لو کہ وہ خدا کے غضب میں آگیا اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہوا (اور جس کا ٹھکانا دوزخ ہوا تو) اس کے پہنچنے کی جگہ کیا ہی بُری جگہ ہے۔

اطاعت، ضبطِ نفس، استقامت ایثار اور حق کی مدافعت میں باطل کے مقابلہ کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہوگی؟ اب فوجیں باہم گُتھم گُتھا ہو گئیں۔ اس مقام پر ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ انسانی دُنیا میں خدا کا پروگرام، انسانی جماعتوں کے ہاتھوں جامۂ تکمیل تک پہنچتا ہے۔ جماعتِ مومنین اسی مقصد کے لیے

وجود میں آتی ہے۔ اس کی زندگی، اس کی موت، سب اسی کے پروگرام کی تکمیل کے لیے وقف ہوتی ہے۔ اسی لیے، یہ جماعت، اس پروگرام کی تکمیل میں جو قدم بھی اُٹھاتی ہے، اللہ تعالیٰ اسے خود اپنے عمل سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ جماعت بدر کے میدان میں اسی مقصد کے لیے آئی تھی۔ دیکھیے! ان کے اس اقدام کو اللہ تعالیٰ کس طرح خود اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ ارشاد ہے:

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ص وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ج وَ لِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ط اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾

پھر کیا تم نے انہیں (جنگ میں) قتل کیا؟ نہیں خدا نے کیا۔ (اے رسول!) وہاں تیر اندازی تم نے نہیں کی۔ درحقیقت خدا نے کی تھی۔ اور یہ اس لیے ہوا تھا تاکہ اس کے ذریعہ ایمان والوں کی محنتوں کا ماحصل اور زندگی کا خوشگوار پہلوؤں کے سامنے آجائے۔ بلاشبہ اللہ سُننے والا علم رکھنے والا ہے۔

تُم انہیں قتل نہیں کر رہے تھے، خود خدا کا قانون ان کے اعمال کے نتائج ان کے سامنے لا رہا تھا۔ تلواریں تمہاری تھیں لیکن قانونِ الٰہی کا ہاتھ تھا جو انہیں چلا رہا تھا۔ تیر تمہارے تھے لیکن قانونِ مشیت کے فیصلے تھے جو قضائے مبرم بن کر ان کی اَنیوں کے ساتھ لپٹ رہے تھے۔ غالبؔ نے اس حقیقت کو کیسے حسین اور بلیغ انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ:

تیرِ قضا ہر آئینہ از ترکشِ حق است
لیکن کشود آں ز کمانِ محمدؐ است

خدا اور عبدِ مومن کے باہمی تعلق کا اظہار، اس سے بہتر انداز میں شاید ہی کہیں اور کیا گیا ہو۔ خدا کے ترکش کے تیر، انسانی کمانوں سے نکل کر ہی حق کے دشمنوں کے سینوں میں پیوست ہوتے ہیں۔ بہرحال، تھوڑے ہی عرصہ میں سردارِ لشکر عتبہ بن ربیعہ، اس کے بیٹے ولید اور بھائی شیبہ کی لاشیں میدان میں تھیں۔ ابوجہل کہ جس کی عداوت و سرکشی کی داستانیں ضرب المثل بن چکی تھیں، انصار کے دو نوجوان بھائیوں (معوذ اور معاذ) کی تلوار سے پیوست زمین ہو گیا۔ سردارانِ لشکر کے قتل سے قریش کے حوصلے پست ہو گئے اور انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ مسلمانوں میں سے چودہ [۱۴] مجاہدین نے شہادت پائی۔ کفار کے ستر [۷۰] آدمی قتل اور اسی قدر گرفتار ہوئے۔ اسیرانِ جنگ میں حضرت عباس، عقیل اور حضورؐ کے داماد ابوالعاص بھی تھے۔ حق و باطل کے اس پہلے معرکہ میں یوں حق غالب آیا اور باطل لپسپا ہوا کہ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا [۱۷/۸۱]۔

ذٰلِكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ○ (۸:۱۸)

اور یہ تو ابھی تمہاری پہلی فتح ہے۔ اس کے بعد اللہ کافروں کی مخفی تدبیروں کو (جو دعوتِ حق کے مٹانے کے لیے کر رہے ہیں)، نامراد بنانے والا ہے۔

اس کے بعد قرآن کریم، نگاہوں کا رُخ اصل حقیقت کی طرف پھیر دیتا ہے۔ وہ رؤسائے قریش سے کہتا ہے کہ تم بات کا فیصلہ افہام و تفہیم سے نہیں بلکہ شمشیر و سناں کے ذریعے چاہتے تھے۔ سو یہ لو! فیصلہ تمہارے سامنے ہے۔ اسے دیکھ لو اور آئندہ کے لیے فیصلہ کر لو کہ حق و صداقت کی اس تحریک کی مخالفت اسی طرح کیے جاؤ گے یا اپنے تمرّد و رعونت سے باز آ جاؤ گے؟

اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۧ (۸:۱۹)

(اے رؤسائے مکہ!) اگر تم فتح مندی کے ظہور کے طلب گار تھے تو دیکھ لو ہماری فتح مندی تمہارے سامنے آ گئی (یعنی جنگِ بدر کے نتیجہ نے ہار جیت کا فیصلہ آشکارا کر دیا)۔ اگر تم (آئندہ لڑائی سے) باز آ جاؤ، تو تمہارے لیے بہتری کی بات ہے، لیکن اگر تم پھر بھی چال چلے تو ہم بھی ایسا ہی کریں گے۔ اور یاد رکھو تمہارا جتھا تمہارے کچھ کام نہ آئے گا، اگرچہ بہت سے آدمی اکٹھے کر لو! یقین کرو اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے۔

جنگ کے قیدی

اسیرانِ جنگ کے متعلق چونکہ ابھی کوئی بات طے نہیں ہوئی تھی اس لیے انہیں بطور سرکاری مہمان (STATE GUEST) رکھا گیا۔ اور اس غرض کے لیے دو دو چار چار کر کے انہیں صحابہؓ میں بانٹ دیا گیا۔ ان کے پاس کپڑے نہیں تھے اس لیے سب سے پہلے کپڑے فراہم کیے گئے۔ (حضرت) عباسؓ کشیدہ قامت تھے اس لیے کسی کا کُرتہ ان کے بدن پر پورا نہیں آتا تھا۔ عبداللہ بن اُبی نے جو خود دراز قد تھا، اپنا کُرتہ منگا کر دیا۔ (حضرت) عباسؓ نبی اکرمؐ کے چچا تھے۔ ذرا اس احساسِ احسان کو دیکھئے کہ عبداللہ بن اُبی تمام عمر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتا رہا۔ لیکن اس کی وفات پر نبی اکرمؐ نے خود اپنا کُرتہ کفن کے لیے بھیجا اور بخاری کی روایت کے مطابق یہ کُرتہ اُسی کُرتے کے بدلے میں تھا۔

قیدیوں میں ایک شخص سہیل بن عمر تھا جو فصیح اللسان ہونے کی وجہ سے عام مجمعوں میں نبیٔ اکرمؐ کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا حضرت عمرؓ نے تجویز کیا کہ اس کے سامنے کے دو دانت اکھڑوا دیئے جائیں تاکہ یہ آئندہ تقریر کرنے کے قابل نہ رہے۔ یہ چونکہ ذاتی انتقام ہوجاتا اس لیے حضورؐ نے اس کی اجازت نہ دی۔ قیدیوں کے ساتھ کس تواضع کا سلوک ہوتا تھا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایئے جسے خود ایک قیدی (ابوعزیز) نے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس انصاری نے مجھے اپنے گھر مہمان رکھا تھا ان کی حالت یہ تھی کہ وہ صبح و شام کھانا لاتے، تو کھانا میرے سامنے رکھ دیتے اور خود کھجوروں پر گزارہ کرتے۔ مجھے شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دے دیتا۔ لیکن وہ اسے ہاتھ بھی نہ لگاتے اور زبردستی مجھے کھلا دیتے۔

یہ تھا قیدیوں کے ساتھ سلوک۔ اللہ اکبر! تربیت نبویؐ نے ان "وحشی قبائل" کے افراد کو کیا سے کیا بنا دیا تھا! چونکہ قیدیوں کے متعلق ابھی تک خدا کی طرف سے کوئی حکم نہیں آیا تھا اس لیے آپؐ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ حضرت عمرؓ کی رائے تھی کہ قیدیوں کو قتل کر دیا جائے (بلکہ یہاں تک کہ ہر شخص اپنے رشتہ دار قیدی کو خود قتل کر دے) تاکہ یہ فتنہ ہمیشہ کے لیے پاک ہو جائے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ کی رائے یہ تھی کہ ان سے زرِ فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ حضورؐ نے اسی رائے کو پسند کیا اور قیدیوں سے زرِ فدیہ لے کر رہا کر دیا گیا۔ جو ناداری کی وجہ سے زرِ فدیہ نہ دے سکے ان سے کہا گیا کہ وہ دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ جو ایسا بھی نہ کر سکتے تھے، انہیں احساناً چھوڑ دیا گیا۔ جن سے زرِ فدیہ لیا گیا ان کے متعلق فرمایا گیا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۸/۷۰)

اے رسولؐ! ان قیدیوں سے، جو تمہاری گرفت میں آ چکے ہیں، کہہ دو کہ اگر خدا نے دیکھا کہ تمہارے دل میں خیرسگالی کے جذبات موجود ہیں، تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے تمہیں اس سے بہتر واپس دے دیا جائے گا اور تمہاری ہر طرح سے حفاظت کی جائے گی۔ قانونِ خداوندی میں حفاظت اور رحمت کا سامان موجود ہے۔

یہ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ بعد میں جب قرآن میں قیدیوں کے متعلق حکم آیا تو وہ بھی اسی کے مطابق تھا یعنی حکم یہ تھا کہ جنگ کے قیدیوں کو یا تو فدیہ لے کر رہا کر دو یا بطورِ احسان (۴۷/۴)۔

اہلِ مکہ نے اپنے قیدیوں کا فدیہ ادا کر دیا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ان قیدیوں میں حضورؐ کے داماد (حضرت زینبؓ کے شوہر) ابوالعاص بھی تھے (جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے)۔ حضرت زینبؓ بھی ابھی مکہ ہی میں تھیں آخر

دل کے نرم گوشے کی دھڑک

رسول کی بیٹی تھیں، دل کے نازک گوشوں پر نگاہ رکھتی تھیں۔ آپ کی شادی کے وقت ماں (حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ) نے ایک ہار بطور جہیز دیا تھا۔ شوہر کا زرِ فدیہ بھیجا تو اس کے ساتھ ہی وہ ہار بھی بھیج دیا۔ اس ہار نے زمانہ کی طنابوں کو بیس پچیس برس پیچھے کھینچ دیا اور حضورؐ کو وفا شعار بیوی کی رفاقت یاد دلا دی جس نے تمام مصائب و مشکلات میں بڑی جگر سوزی اور دل دوزی سے ساتھ دیا تھا۔ گزرے ہوئے واقعات ایک ایک کر کے سامنے آگئے اور حضورؐ کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔ ذرا حضورؐ کے مقام کو سامنے رکھیے۔ بہ حیثیت رسول اور امیرِ ملت مسلمانوں کے مال و جان کے مختار ہیں۔ کسی کی مجال نہیں کہ آپ کے فیصلوں سے سرتابی تو ایک طرف، دل میں گرانی بھی محسوس کرے۔ جی چاہتا ہے کہ اُس کی ماں کی یادگار، ہار، بیٹی کو واپس دے دیں لیکن اصُول پرستی کا یہ عالم ہے کہ خود فیصلہ نہیں فرماتے۔ صحابہؓ سے کہتے ہیں کہ اگر تم راضی ہو تو اس ہار کو واپس لوٹا دیا جائے۔ سب نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور ہار واپس کر دیا گیا۔

ماہِ رمضان میں نزولِ قرآن کا آغاز ہُوا تھا۔ اس لیے جسے عیدُ الفطر کہا جاتا ہے وہ "درحقیقت" جشنِ نزولِ قرآن ہے۔ اس سے پہلے مکی زندگی تھی۔ مدنی زندگی میں اپنی آزاد مملکت کی بُنیاد رکھی گئی۔ اس کے بعد یہ پہلی جنگ تھی جو رمضان کے مہینے میں لڑی گئی اور

سب سے پہلی عید

اس میں ایسی نمایاں کامیابی ہوئی۔ اس لیے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ عید کس قدر مسرتوں اور شادکامیوں کی عید ہوگی۔ نزولِ قرآن کے جشن کی عید، بدر کی کامیابیوں اور کامرانیوں کی عید، یعنی اُس وقت کی دُنیا میں، سب سے پہلی اسلامی مملکت کی عید۔ عید کہلانا اسی کے شایانِ شان تھا نہ کہ ہماری رسمی عیدوں کا۔

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں عیدِ محکوماں ہجومِ مومنیں

بدر کی شکست نے کفار کے دلوں پر مسلمانوں کی ہیبت بٹھا دی اور اس طرح باطل کا وہ کرّ و فر جو اپنی سرکشی اور عناں تابی میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا، حق کے ساتھ پہلی ہی ٹکر میں بُری طرح مجروح ہُوا۔ اور یہی تھی وہ پہلی فتح جس کی یاد مسلمانوں کو بعد میں ان الفاظ میں دلائی جاتی تھی کہ،

وَ اذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَ اَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (۸/۲۶)

اور (اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) وہ وقت یاد کرو جب (مکہ میں) تمہاری تعداد بہت تھوڑی تھی اور تم مُلک میں کمزور سمجھے جاتے تھے۔ تم اس وقت ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں اُچک کر نہ لے جائیں۔ پھر اللہ نے تمہیں (مدینہ میں) ٹھکانا دیا، اپنی مددگاری سے قوت بخشی اور اچھی چیزیں دے کر رزق کا سامان مہیا کر دیا تاکہ تم شُکرگزار رہو!

نعمائے خداوندی کے دونوں گوشوں پر نگاہ ڈالیے (فَاٰوٰىكُمْ) تمہاری حفاظت کا سامان کیا لیکن اصل مقصد اتنا ہی نہیں تھا کہ تم کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر محصور ہو جاؤ، بلکہ مقصد یہ تھا کہ طاغوتی قوتوں کی سرکوبی ہو جائے تاکہ دُنیا میں قوانینِ حق و عدل کا نفاذ ہو! اس کے لیے تمہارے بازوؤں میں کوہ شکن قوت عطا فرمائی (وَ اَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ) جس سے تم نے سرکشی و عُدوان کے بڑھتے ہوئے کف بدہان سیلاب کو روکا اور اس طرح تمہیں آزادی کی فضا میں رزقِ طیب عطا ہوا (رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ) کہ رزقِ طیب فی الحقیقت اسی قوم کے نصیب میں ہے، جو اُس فضا میں سانس لے جو طاغوتی حکومتوں کے انسانیت کُش جراثیم سے پاک ہو اور اسے اس کی معراجِ کبریٰ تک پہنچنے کے لیے اِذنِ بال کشائی دے۔ غلامی کا رزق تو وہ شجرۃ الزقوم ہے جسے اہلِ جہنم کا مقدر بتایا گیا ہے۔ اس رزق سے تو دم گھٹ کر مر جانا اچھا کہ زہر آلود نانِ شیریں سے فاقہ ہزار درجہ بہتر ہے!

اے طائرِ لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی!

جنگِ اُحد

۱۴ شوال ۳ھ مطابق ۲۹ مارچ ۶۲۵ء

بدر کی شکست نے قریش کی آتشِ خاموش کو شعلۂ جوالہ میں بدل دیا۔ جن کے اقرباء مارے گئے تھے، ان کے سینے جوشِ انتقام سے جہنم زار بن گئے۔ وہ سب مل کر ابوسفیان کے پاس گئے اور یہ فیصلہ کیا کہ شام کے قافلہ کے سامانِ تجارت میں سے راس المال تو حصہ داروں کو واپس دے دیا جائے لیکن زرِ منافع مقتولین بدر کے انتقام کے لیے الگ رکھ لیا جائے۔ اس کے بعد انہوں نے پھر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اپنے قومی شاعروں کو ملک کے طول و عرض میں بھیجا کہ وہ اپنی آتش نوائیوں سے ساری فضا کو مشتعل کر دیں۔ بدر کی لڑائی میں عورتیں ساتھ نہیں گئی تھیں۔ اس مرتبہ بڑے بڑے اونچے گھرانوں کی عورتیں بھی فوج کی معیت میں تیار ہو گئیں، تاکہ میدانِ جنگ میں مردوں کو غیرت دلائیں اور ان کے پاؤں نہ اُکھڑنے دیں۔ اس ساز و سامان اور شکوہ دسطوت کے ساتھ باطل کا یہ بحرِ موّاج شوال ۳ھ میں مدینہ کی طرف اُمنڈا۔ حضورؐ نے اطلاع پانے پر صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ اکابر صحابہؓ کی رائے تھی کہ عورتوں کو قلعوں میں بھیج دیا جائے اور خود شہر کے اندر پناہ گیر ہو کر مقابلہ کیا جائے۔ عبداللہ بن اُبی نے بھی یہی رائے دی لیکن نوجوانانِ ملت کے شوقِ شہادت کا یہ عالم تھا کہ

سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

انہوں نے اصرار کیا کہ شہر سے باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ ان کے اصرار پر حضورؐ نے بھی باہر نکل کر لڑنا منظور کر لیا۔ قریش کا لشکر مدینہ سے ڈیڑھ دو میل باہر، کوہِ اُحد کے قریب آ چکا تھا۔ حضورؐ ایک ہزار کی جمعیت کے ساتھ باہر نکلے جن میں عبداللہ بن اُبی کی تین سو کی جماعت بھی تھی جو بنو سلمیٰ اور بنو حارث کے قبائل پر مشتمل تھی۔ یہ رئیس المنافقین

یہ کہہ کر راستہ سے اپنی جماعت سمیت واپس لوٹ آیا کہ چونکہ محمدؐ نے میری بات نہیں مانی اس لیے میں ساتھ نہیں جانا چاہتا۔ اب حضورؐ کے ساتھ سات سَو کی جماعت رہ گئی۔ ان میں کمسن بچوں کو واپس کر دیا گیا۔ بدر کی طرح یہاں بھی

شوقِ شہادت

بچوں کا شوقِ شہادت اس فیصلہ کے نفاذِ کلی میں عناں گیر ہو گیا جب رافعؓ بن خدیج سے کہا گیا کہ تم چھوٹے ہو، واپس چلے جاؤ تو وہ پنجوں کے بل تن کر کھڑے ہو گئے کہ قد بڑا نظر آئے۔ انہیں اذنِ معیت دیا گیا تو ایک اور نوجوان (سمرۃ) جو اُن کے ہم سن تھے مُصر ہو گئے اور انہوں نے یہ دلیل دی کہ میں رافع کو لڑائی میں پچھاڑ لیتا ہوں۔ اگر انہیں اجازت دی گئی ہے، تو مجھے کیوں محرُوم رکھا جاتا ہے؟ چنانچہ ان کا مقابلہ کرایا گیا اور سمرہ نے رافع کو زمین پر گرا دیا۔ اس بنا پر انہیں بھی اجازت دے دی گئی۔ حضورؐ نے اُحد کو پُشت پر رکھ کر صفیں قائم کیں۔ پُشت کی طرف سے دشمن کی یورش کا خطرہ تھا۔ آپؐ نے تیراندازوں کا دستہ اس طرف متعین فرمایا اور تاکید فرما دی کہ کچھ بھی ہو وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹیں۔

جنگ شروع ہوئی۔ اگرچہ مقابلہ میں تین ہزار کا لشکر تھا جس میں قریب دو سَو سوار بھی تھے لیکن یہ جمعیت بھی مجاہدین کا مقابلہ کیا کر سکتی تھی؟ تھوڑے ہی عرصہ میں اُن کے پاؤں اُکھڑ گئے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے لیکن

فتح مُبدّل بہ شکست

عین اُس وقت ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے اس فتح کو مبدل بہ شکست کر دیا۔ تیراندازوں کا وہ دستہ جو پُشت پر حفاظت کے لیے متعین کیا گیا تھا، ضبط نہ کر سکا اور مالِ غنیمت لوٹنے کے لیے اپنی جگہ چھوڑ کر میدان میں آ گیا۔ ان کے سپہ سالار حضرت عبداللہ بن جبیرؓ نے بہت روکا لیکن وہ نہ رُکے۔ اُن کے ساتھ صرف چند جاں باز رہ گئے۔ تیراندازوں کی جگہ خالی دیکھ کر خالدؔ نے پیچھے سے حملہ کر دیا۔ مجاہدین میدان میں بے خطر مالِ غنیمت سمیٹنے میں مصرُوف تھے۔ دیکھا تو سر پر تلواریں برس رہی ہیں۔ ایسی پریشانی پھیلی کہ اپنے بیگانے کی خبر نہ رہی۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ جو رسول اللہؐ سے صورت میں مشابہ تھے، شہید ہو گئے تو غُل مچ گیا کہ رسول اللہؐ نے شہادت پائی ہے۔ اس سے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ اس اضطراب اور بدحواسی میں یہ بھی یاد نہ رہا کہ خود رسول اللہؐ کہاں ہیں؟ عبداللہ بن قمیہ جو قریش کا مشہور بہادر تھا کسی طرح حضورؐ کے قریب آ گیا اور چہرۂ مبارک پر تلوار ماری جس سے مغفر کی دو کڑیاں چہرۂ مبارک پر چُبھ کر رہ گئیں۔ اتنے میں شمعِ نبوت کے پروانوں نے حضورؐ کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ نیزوں اور تلواروں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی لیکن یہ جاں نثاران سب کو اپنے سینوں پر لے رہے تھے تاکہ حضورؐ ان کی زد سے محفوظ رہیں۔ مخالفین یہ کچھ کر رہے تھے اور اُدھر حضورؐ کی زبان پر یہ الفاظ تھے کہ رَبِّ اغْفِرْ قَوْمِي فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (مسلم) اے خدا! میری قوم کو معاف کر دے کہ

وہ جانتے نہیں ہیں"۔ حضورؐ تیروسناں کی اِس بارش کے باوجود، ثابت قدمی سے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے جہاں دشمنوں کی رسائی نہ تھی۔ ابوسفیان خوش تھا کہ رسول اللہ نے شہادت پالی ہے۔ اس نے مقابل کی پہاڑی پر چڑھ کر پکارا کہ:

اُعْلُ هُبَلْ ــــ ہبل کا بول بالا ہو۔

صحابہؓ نے حضورؐ کے حکم سے جواب دیا کہ

اَللّٰهُ اَعْلٰى وَ اَجَلُّ ــــ بلند و بالا تو اللہ کا بول ہے۔

ابوسفیان نے کہا کہ

لَنَا الْعُزّٰى وَ لَا عُزّٰى لَكُمْ ــــ ہمارے پاس عزّٰی (بُت) ہے تمہارے پاس نہیں۔

صحابہؓ نے کہا کہ

اَللّٰهُ مَوْلَانَا وَ لَا مَوْلٰى لَكُمْ ــــ خدا ہمارا آقا ہے۔ تمہارا کوئی آقا نہیں[1]۔

قرآنی تفاصیل

ابوسفیان کو جب معلوم ہوا کہ حضورؐ شہید نہیں ہوئے، زندہ ہیں تو اپنی فوج سمیت واپس چلا گیا۔ قرآنِ کریم نے واقعۂ اُحد کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

وَ لَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ .... وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (۳/۱۵۱)

اور دیکھو، یہ واقعہ ہے کہ اللہ نے اپنا وعدۂ نصرت پورا کر دکھایا تھا جبکہ تم اُس کے حکم سے دشمنوں کو تہِ تیغ کر رہے تھے (اور ہر طرح جیت تمہاری تھی)، لیکن جب ہم نے تمہیں فتح مندی کا جلوہ دکھا دیا جو تمہیں اس قدر محبوب ہے، تو تم نے کمزوری دکھلائی اور جنگ کے بارے میں باہم دِگر جھگڑنے لگے (ایک گروہ نے کہا اب مورچہ پر بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے؛ دوسرے نے کہا نہیں، ہم تو آخر تک یہیں جمے رہیں گے)، اور (بالآخر اپنے کمانڈر کے حکم سے نافرمانی کر بیٹھے)، تم میں کچھ لوگ تو ایسے تھے جو مفادِ عاجلہ کے خواہش مند تھے (یعنی مالِ غنیمت کے پیچھے پڑ گئے)، لیکن کچھ ایسے بھی تھے جن کی نظر مستقبل پر تھی (یعنی مالِ غنیمت سے بے پرواہ ہو کر، اپنی جگہ پر جمے رہے اور شہید ہوئے)۔ یوں تمہارا رُخ دشمن کی طرف سے ہٹ کر دوسری طرف ہو گیا اور تمہاری فتح شکست سے بدل گئی اور اس طرح تمہاری حقیقت واشگاف ہو گئی۔ (اس کے بعد تم نے اپنی غلطی کو محسوس کیا اور پھر اپنے مقام پر واپس آ گئے)، تمہیں کامیابی حاصل ہو گئی اور اس طرح تمہاری

[1] بحوالہ بخاری۔

لغزش کے آثار مٹ گئے۔ اللہ کا قانون یہی ہے کہ ایک بار کی لغزش سے انسان ہمیشہ کے لیے کامرانیوں سے محروم نہیں ہوجاتا۔ وہ جب بھی غلطی کا احساس کر کے صحیح راستے پر آجائے خدائی نوازشات سے بہرہ یاب ہوجاتا ہے۔

یہ دو جماعتیں تیر اندازوں کے دو گروہ تھے۔ ایک گروہ وہ جو اپنے امیر کے حکم کے خلاف مالِ غنیمت پر ٹوٹ پڑا۔ دوسرا وہ جو اس کے ساتھ اپنی جگہ پر جما رہا۔ اُس وقت حالت یہ تھی کہ

إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ ۗ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ○ (۳/۱۵۲)

تم (میدانِ جنگ سے) بھاگے جارہے تھے اور (بدحواسی کا یہ حال تھا کہ) ایک دوسرے کی طرف مڑ کر دیکھتا تک نہ تھا، اور اللہ کا رسولؐ تھا کہ پیچھے سے پکار رہا تھا۔ یوں تمہیں نقصان پر نقصان ہوا۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ تم آئندہ کے لیے نصیحت پکڑو کہ اپنے مقام سے از خود کبھی نہیں ہلنا چاہیئے۔ اگر تم دیکھ رہے ہو کہ کوئی چیز تمہارے ہاتھوں سے نکلی جارہی ہے تو اس کے پیچھے لپک نہ پڑو۔ یا اگر کوئی سخت مصیبت آرہی ہے تو اس سے گھبرا کر اپنا مقام نہ چھوڑ دو۔ خدا اچھی طرح جانتا ہے کہ تم کیا کر رہے ہو۔

پھر جب نبیٔ اکرمؐ امن و حفاظت سے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے اور ابو سفیان کا لشکر لوٹ گیا، تو مسلمانوں کو اطمینان نصیب ہوا۔ اب جو مافات پر تبصرہ شروع ہوا تو ایسے کمزور دل لوگ بھی تھے جو اسے طرح طرح کے ظنون و اوہام پر محمول کرتے تھے۔ سورۃ آلِ عمران کی آیات (۱۵۵ سے ۱۷۷ تک) میں ان تمام واقعات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی ضروری ہدایات بھی دی گئی ہیں کہ آئندہ ایسے حالات میں کیا کرنا چاہیئے۔

خواتین کی شرکت

اس جنگ میں کئی ایک خواتینِ اسلام نے بھی شرکت کی۔ حضرت عائشہؓ کے متعلق روایت ہے کہ آپ مشکیں بھر بھر لاتی تھیں اور زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں۔ حضرت اُمِّ عمارہؓ کے متعلق منقول ہے کہ جب نبیٔ اکرمؐ کو دشمنوں نے نرغہ میں لے لیا تو آپ نے سپر بن کر حضورؐ کو اپنی اوٹ میں لے لیا اور تیروں کی بوچھاڑ کو اپنے اوپر روکنے لگیں۔ جب ابنِ قمیہ حضورؐ کے قریب آیا تو اُمِّ عمارہؓ نے تلوار سے اُس پر وار کیا۔ وہ چونکہ زرہ پوش تھا اس لیے وار سے بچ گیا، لیکن اس

کی تلوار سے ان کے کندھے پر گہرا زخم آگیا۔ جب نبیِ اکرمؐ کی شہادت کی (غلط) خبر مدینہ پہنچی تو خواتینِ اسلام بے تابانہ گھروں سے نکل آئیں اور میدان کی طرف چل پڑیں۔ حضرت فاطمۃ الزہراؓ نے آکر دیکھا تو حضورؐ کے چہرۂ مبارک سے جو مغفر کی کڑیوں سے زخمی ہو گیا تھا، ابھی تک خون جاری تھا۔ حضرت علیؓ اور آپ نے مل کر زخموں کو دھویا۔

دوسری طرف غیر مسلم خواتین کا یہ حال تھا کہ جب حضرت حمزہؓ کو وحشی غلام نے شہید کیا تو ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے آکر ان کا مُثلہ کیا اور کلیجہ نکال کر کچا چبا گئی (اِس سے اُن لوگوں کی خوئے درندگی کا اندازہ لگائیے)۔

حضرت حمزہؓ کی بہن حضرت صفیہؓ شکست کی خبر سُن کر میدان میں آئیں۔ حضورؐ نے اس خیال سے انہیں لاش دیکھنے سے روک دیا کہ مبادا بھائی کی لاش کو اس حالت میں دیکھ کر ضبط نہ کرسکیں۔ انہوں نے حضورؐ کا پیغام سُنا تو کہا کہ کوئی بات نہیں، میں بھائی کے متعلق سب ماجرا سُن چکی ہوں۔ یہ خدا کی راہ میں کوئی بڑی قربانی نہیں۔ حضورؐ نے اجازت دے دی تو آپ لاش پر گئیں۔ جان سے پیارے بھائی کے ٹکڑے خاک و خون میں آغشتہ سامنے پڑے تھے۔ مغفرت کی دعا مانگی اور ضبط کی ایک دُنیا آنکھوں میں لیے خاموش واپس آگئیں۔

اس لڑائی میں مسلمانوں کی طرف سے ستّر آدمی شہید ہوئے۔ مسلمانوں کی بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ شہیدوں کے کفن کے لیے پُورا کپڑا تک بھی نہ تھا۔ چنانچہ حضرت مصعب بن عمیرؓ کے سر کو کپڑے سے ڈھانپا گیا اور پاؤں کو گھاس سے۔ دو دو شہیدوں کو ملا کر ایک ایک قبر میں دفنایا گیا۔ جسے قرآن زیادہ یاد ہوتا تھا، اُسے مقدّم کیا جاتا۔

ایک صاحب عمرو بن ثابت، جو اصیرم کے نام سے مشہور تھے، مسلمانوں کے ساتھ احسان و مروّت سے پیش آیا کرتے تھے لیکن اسلام نہیں لائے تھے۔ غزوۂ اُحد کے دن اُن کے دل میں صداقت نے جوش مارا، مسلمان ہوئے اور تلوار ہاتھ میں لے کر کسی کو خبر کیے بغیر سیدھے میدان میں جا پہنچے۔ جانفروشانہ لڑے اور شہید ہوگئے۔

معراجِ شہادت

انہی کے متعلق (بروایت حضرت ابوہریرہؓ) مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا، اصیرم نے ایک وقت کی بھی نماز نہ پڑھی، لیکن سیدھا جنت میں چلا گیا۔

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں!

دوسری طرف یہ واقعہ بھی قابلِ غور ہے کہ مدینہ میں ایک شخص تھا قزمان نامی۔ اس کی مذموم حرکات اس قدر واضح تھیں کہ حضورؐ فرماتے تھے کہ یہ شخص جہنمی ہے۔ غزوۂ احد کے دن اُس نے کفارِ قریش کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا۔ اکیلے سات آٹھ مشرکوں کو قتل کیا۔ صحابہؓ اس کی بہادری پر بہت خوش تھے اور حیران تھے کہ ایسے شخص

محض قومیت و حمیت کا جذبہ

کے متعلق مخبرِ صادقؐ نے کیسے فرمایا کہ یہ جہنمی ہے۔ وہ زخمی ہوا تو صحابہؓ اس کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ قزمان! ہم تجھے بشارت دیتے ہیں، تو نے بہت بڑا کام کیا۔ اس نے کہا کہ بشارت کاہے کی؟ یہ تو مکہ اور مدینہ والوں کی جنگ تھی۔ قومی حمیت نے اُبھارا اور میں میدان میں آگیا۔ یہ نہ ہوتا تو میں کبھی نہ لڑتا۔ اب صحابہؓ کی سمجھ میں آیا کہ میدانِ جنگ میں مسلمانوں کی طرف سے کفار کے مقابلہ میں لڑتے ہوئے جان دے دینے کے باوجود، مرنے والا کس طرح جہنمی کا جہنمی رہتا ہے۔ شہادت اسی وقت ہے جب جذبۂ محرکہ حق کی مدافعت[1] ہو۔

---

[1] واضح رہے کہ اگر کوئی خطۂ زمین اس لیے حاصل کیا گیا ہو کہ اس میں اسلامی نظام کی تشکیل کی جائے تو اس خطۂ زمین کی حفاظت ہر مسلمان پر فرض ہوگی اور اس کی مدافعت میں جنگ کرنا جہاد اور جان دے دینا شہادت۔ ذریعہ کا تحفظ خود مقصد کا تحفظ ہوتا ہے۔

جنگِ احزاب

ذیقعدہ ۵ھ

میدانِ بدر میں مسلمانوں کی فتح نے مخالف عناصر کے حوصلے فی الجملہ پست کر دیئے تھے لیکن انہیں اُحد میں جو دوبارہ شکست ہوئی تو اس نے راکھ کے نیچے دبی ہوئی چنگاریوں کو پھر سے ہوا دے دی اور مخالفت و عداوت کے جذبات میں ازسرِنو سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ اب ان فتنہ پردازیوں کا سب سے بڑا مرکز خود مدینہ تھا۔ یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ مدینہ میں یہودیوں کا بڑا اثر و اقتدار تھا۔ نبیٔ اکرمؐ نے اُن سے معاہدہ کر رکھا تھا لیکن ان میں مُدت ہائے دراز کی بے مرکزی اور غلامی سے دنایت و سفاہت کی ایسی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں جن کی وجہ سے انہیں عہد معاہدہ

مدینہ کے یہود

کا کوئی پاس ہی نہ تھا۔ پھر مصیبت بالائے مصیبت یہ کہ یہ لوگ قریش کی طرح کھُلی ہوئی دُشمنی نہیں کرتے تھے بلکہ مارِ آستین بن کر ڈستے تھے۔ منافقت سے مُسلمان ہو جاتے اور اس طرح ان کی جماعت میں داخل ہو کر تخریبی سازشیں کرتے۔ یہ سب سے بڑا فتنہ تھا جو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے سینہ کا ناسُور بن گیا تھا۔ قرآنِ کریم کو اُٹھا کر دیکھئے، اہلِ کتاب و منافقین کی اسلام برانداز سازشوں اور انسانیت کُش و انسانیت سوز دسیسہ کاریوں کی اجمالی اور تفصیلی داستانیں ہر جگہ بکھری ہوئی نظر آئیں گی۔ ان تفاصیل کا یہ موقع نہیں۔ مختصراً یوں سمجھیئے کہ مومنین کی قوتوں کا بڑا حصہ اسی فتنہ کے استیصال کی نذر ہو گیا۔ منافقین کی یہ رُوباہ بازیاں ان کے اپنے دائرہ سے نکل کر عرب قبائل کو بھی متأثر کر گئیں جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ انہوں نے بھی بدعہدی اور غداری شروع کر دی۔ سنہ ۴ھ کا ذکر ہے کہ قبیلۂ کلاب کے رئیس، ابوالبراء نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ چند مبلغین کو اس کے ساتھ بھیج دیا جائے تاکہ وہ اس کے قبیلہ کو اسلام کی دعوت دیں۔ حضورؐ نے ستّر انصار

اس کے ساتھ کر دیئے۔ انہوں نے اپنے نمائندہ حرام بن ملحان کو اس قبیلہ کے دوسرے سردار عامر بن طفیل کے پاس

مسلم مبلغین کی شہادت

بھیجا۔ عامر نے حرام کو قتل کر دیا اور خود آس پاس کے قبائل کے ساتھ ایک لشکر لے کر آگے بڑھا اور تمام صحابہؓ کو نرغے میں لے کر شہید کر دیا۔ صرف ایک (عمروؓ امیہ) کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ میری ماں نے ایک غلام آزاد کرنے کی منت مانی تھی۔ میں تجھ کو آزاد کرتا ہوں۔ اس واقعۂ فاجعہ اور حادثۂ ہائلہ سے حضورؐ اور صحابۂ کبارؓ کے دل پر جو قیامت گزری ہوگی اس کا اندازہ ہر قلبِ مومن لگا سکتا ہے۔ اسی طرح عضل اور قارۃ کے دو قبیلوں کے چند آدمیوں نے آکر کہا کہ ہمارے قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ چند آدمیوں کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے تاکہ وہ انہیں اسلام کے احکام سکھا دیں۔ آپؐ نے حضرت عاصم بن ثابتؓ کی سیادت میں دس صحابہؓ کو ساتھ کر دیا۔ راستہ میں ان بدبختوں نے غداری کی اور بنولحیان کے دو سو آدمیوں کو اشارہ کر دیا کہ انہیں قتل کر دو۔ صحابہؓ یہ بھانپ کر ایک ٹیلہ پر چڑھ گئے۔

کفار کی پناہ میں نہیں آنا چاہتے

تیر اندازوں نے کہا کہ تم نیچے اُتر آؤ۔ ہم تمہیں پناہ دیں گے۔ لیکن حضرت عاصمؓ نے کہا کہ ہم کفار کی پناہ میں نہیں آنا چاہتے۔ سات مجاہد تو وہیں شہید ہو گئے اور تین کو یہ قیدی بنا کر ساتھ لے گئے۔ ایک کو راستہ میں شہید کر دیا اور باقی دو (حضرت خبیبؓ اور حضرت زیدؓ) کو اہلِ مکہ کے پاس فروخت کر دیا۔ حضرت خبیبؓ نے جنگِ اُحد میں حارث بن عامر کو قتل کیا تھا۔ انہیں اس کے لڑکوں نے خرید لیا کہ باپ کے بدلہ میں قتل کریں گے۔ ایک دن یہ انہی کے گھر میں حارث کی نواسی کو کھلا رہے تھے۔ بچی کی ماں اتفاقاً کہیں سے آگئی اور دیکھا کہ حضرت خبیبؓ کے ہاتھ میں ننگی چھری ہے۔ یہ دیکھ کر کانپ اٹھی۔ حضرت خبیبؓ نے کہا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ ہم بچوں کو قتل نہیں کیا کرتے۔ حارث کے بیٹے انہیں باہر لے گئے اور انہیں قتل کرنا چاہا۔ آپ نے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت مانگی۔ انہوں

قابلِ رشک شہادت

نے اجازت دے دی۔ انہوں نے نماز پڑھ کر کہا کہ جی تو چاہتا تھا کہ دیر تک نماز پڑھتا رہوں لیکن اس سے شاید تمہیں خیال گزرتا کہ میں موت سے ڈرتا ہوں، اس لیے نماز ختم کرتا ہوں۔ اللہ اکبر! عین تلوار کے نیچے گردن رکھ کر اس قدر طمانیتِ قلب صرف ایمان محکم سے ہی نصیب ہو سکتی ہے۔ اسی زمانہ سے یہ دستور ہو گیا ہے کہ کسی کو قتل کرتے ہیں تو مقتول دو رکعت نماز پڑھ لیتا ہے۔ حضرت زیدؓ کو قتل کرنے لگے تو ابوسفیان نے (جو تماشائیوں کے ہجوم میں کھڑا تھا) کہا کہ سچ بتلاؤ اگر اس وقت تمہارے بدلے محمدؐ قتل کیے جاتے تو کیا تم اس کو اپنی خوشی نہ سمجھتے! انہوں نے قہر آلود نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا

اور کہا کہ او بدبخت! کیا کہتا ہے؟ میں تو اپنی جان کو اتنا بھی عزیز نہیں رکھتا کہ اس کے عوض رسول اللہؐ کے کانٹا بھی چبھ جائے۔ یہ تھا قرآن کی تعلیم کا اثر!

یہود کی عہد شکنی

اب خود یہود کی طرف آئیے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ان کے تین قبیلے (بنو قینقاع، نضیر اور قریظہ) مدینہ میں تھے جن سے حضورؐ نے معاہدہ امن و اتحاد کیا تھا۔ اس معاہدہ کو سب سے پہلے قینقاع نے توڑا اور مسلمانوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ حضورؐ نے ان کا محاصرہ کیا۔ پندرہ دن کے محاصرہ کے بعد وہ تنگ آ گئے۔ انہوں نے عبداللہ بن اُبی کو ثالث بنایا جس کے فیصلے کے مطابق انہیں مدینے سے جلاوطن کر دیا گیا۔ بنو نضیر کی طرف سے بھی نقضِ عہد کے آثار و قرائن پے درپے ظہور میں آ رہے تھے۔ حتیٰ کہ اُنہوں نے حضورؐ کی جان تک پر حملہ کرنے میں بھی دریغ نہ کیا۔ آپؐ نے ان سے تجدیدِ عہد کے لیے کہا لیکن وہ اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ انہیں اپنے قلعوں پر ناز تھا اور منافقین درپردہ ان کی حمایت پر تُلے بیٹھے تھے۔ حضورؐ نے اُن کا بھی محاصرہ کیا اور درختوں کے وہ جھنڈ جن سے وہ کمین گاہوں کا کام لیتے تھے، کٹوا دیئے۔ پندرہ دن کے بعد انہوں نے بھی امان چاہی، تو انہیں اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنا مال و متاع لے کر مدینہ سے چلے جائیں۔ چنانچہ اُن میں سے اکثر خیبر کی طرف چلے گئے۔ سورۂ حشر کی ابتدائی پندرہ آیات میں انہی یہودیوں اور ان کے خُفیہ مددگار (منافقوں) کا ذکر ہے۔

جنگِ احزاب

جنگ احزاب تک پہنچنے کے لیے ان تمہیدی تفاصیل کو سامنے لانا ضروری تھا۔ قریش اور یہود کی اس متفقہ سازش نے عالمگیر حیثیت اختیار کر لی۔ بنو نضیر نے خیبر پہنچنے کے بعد قریشِ مکہ کو مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے اُکسایا۔ وہ پہلے ہی سے آمادہ بیٹھے تھے۔ پھر یہ قبیلۂ غطفان کے پاس پہنچے اور انہیں بھی جنگ کے لیے آمادہ کر لیا۔ قبیلۂ بنو سلیم سے قریش کی قرابت تھی۔ اس تعلق کی بنا پر وہ بھی شرکت کے لیے تیار ہو گئے۔ بنو سعد کا قبیلہ یہود کا حلیف تھا۔ وہ بھی آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ یہ تمام طاغوتی قوتیں اپنے اپنے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر حق کے مقابلہ کے لیے یکجا ہو گئیں کہ اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ۔ اسی جہت سے اس جنگ کو جنگِ احزاب کہتے ہیں، یعنی مختلف جماعتوں کا اسلام کے خلاف متحدہ محاذ! یہ لشکرِ جرار آندھی کی طرح اُٹھا اور مدینہ کے مضافات تک آ پہنچا۔ بنو قریظہ کے یہود جنہوں نے مسلمانوں سے عہد کیا تھا، ابھی تک الگ تھے لیکن

بنی نضیر کی ترغیب سے یہ بھی مخالفین کے ساتھ شامل ہو گئے اور اب کفار اور یہود کی پوری قوتیں حق کے مقابلہ میں آگئیں۔ تصادم و تزاحم کا یہی وہ ہجوم تھا جس کی تصویر قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝ هُنَالِكَ ابْتُلِیَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝ (۳۳ / ۱۰-۱۱)

(اے مسلمانو! وہ وقت یاد کرو!) جب وہ لوگ (یہود و کفار) تم پر اوپر اور نیچے ہر طرف سے (نرغہ کر کے) آچڑھے تھے اور (دہشت کے مارے تمہاری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور حالت یہ تھی کہ کلیجہ مُنہ کو آنے لگا تھا (اور جو تم میں سے کمزور تھے)، ان کے دل میں اللہ کے دعوں کے متعلق طرح طرح کے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود جماعتِ مومنین نے بتا دیا کہ ان میں کس قدر قوتِ ایمان پیدا ہو چکی ہے۔ (انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا) حالانکہ وہ بُری طرح جھنجھوڑ ڈالے گئے تھے۔

خندق کی تیاری

نبئ اکرمؐ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا تو حضرت سلمانؓ پارسی کی رائے سے یہ طے پایا کہ عورتوں کو قلعوں میں بھیج دیا جائے اور خود ایک خندق کے اندر پناہ گزین ہو کر مدافعت کریں۔ چنانچہ ایک بہت بڑی خندق کھودی گئی۔ اللہ کے ان "مزدوروں" میں خود حضورؐ بھی شامل تھے۔ یہ تھی جماعتِ مومنین کی وہ سپاہیانہ زندگی جس سے باطل کی ہر قوت پر غلبہ حاصل ہونا تھا۔ یہ معرکہ بڑی ہمت اور استقامت کا متقاضی تھا۔ دن رات کی مشقت، بھوک اور خوف کی صعوبت، سامنے ایک جمِّ غفیر بحرِ مواج کی طرح متلاطم۔ مسلمانوں کی فوج میں منافقین بھی موجود تھے لیکن منافقت و ایمانِ خالص کی تو پرکھ ہی ایسے جاں گداز مراحل میں ہوتی ہے۔ وہ لگے بہانہ سازیاں اور رُوباہ بازیاں کرنے۔

وَ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ وَ اِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰۤاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَ يَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِیَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛؕ وَ مَا هِیَ بِعَوْرَةٍ ۚۛ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ۝ (۳۳ / ۱۲-۱۳)

اور (یاد کرو!) جب وہ منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں کھوٹ اور نفاق کا مرض تھا، یُوں کہہ رہے تھے کہ ہم سے تو اللہ نے اور اس کے رسولؐ نے جھوٹا وعدہ کیا ہے! اور جب اُن (منافقین)

کے ایک گروہ نے کہا کہ اے یثرب (مدینہ) والو! تمہارے لیے یہاں ٹھہرنے کا موقع نہیں۔ سو (اپنے گھروں کو) لوٹ چلو۔ اور ان میں سے بعض لوگ رسول اللہؐ سے (گھر جانے کی) اجازت مانگتے تھے اور کہتے تھے کہ (چونکہ) ہمارے گھر بالکل غیر محفوظ ہیں (اس لیے ہمیں واپسی کی اجازت دے دیجئے۔ اے نبی!) اُن کے گھر (قطعاً) غیر محفوظ نہیں ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ (ان بہانوں سے) بھاگنا چاہتے ہیں۔

یہ تمام حیلہ جوئیاں محض اس لیے تھیں کہ ان کے قلبی رُجحانات کُفر کی طرف تھے۔ اگر انہیں انہی حالات میں مسلمانوں سے لڑنا پڑتا، تو سب سے آگے ہوتے۔ سورۂ احزاب کی آیات (۱۲ تا ۲۰) میں انہی منافقین کا ذکر ہے۔ ایک طرف منافقین کی یہ جماعت تھی اور دوسری طرف خدا کے مخلص بندوں کی جمعیت، جن کی کیفیت یہ تھی کہ

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ۝ (۳۳/۲۲)

اور جب جماعتِ مُومنین نے لشکروں کی طرف دیکھا تو کہنے لگے کہ یہ وہی (وقت و موقع) ہے جس کی خبر ہم کو اللہ اور رسولؐ نے دی تھی اور اللہ اور اس کے رسولؐ نے (بالکل) سچ کہا تھا۔ اور (اس سے یہی ہوا کہ) ان کے ایمان واطاعت میں اور ترقی ہو گئی۔

کچھ وہ جنہوں نے اللہ کی راہ میں جان دے کر اپنے معاہدہ کو سچّا کر دکھایا اور باقی وہ جو ابھی اس انتظار میں تھے کہ کب وقت آئے اور وہ اپنی صداقتِ عہد کی عملی شہادت پیش کریں۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝ (۳۳/۲۳)

ان مومنوں میں کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو اللہ سے کیے ہوئے عہد میں پورے اُتر چکے ہیں، یعنی وہ اپنا مقررّہ وقت (زندگی) پورا کر چکے۔ اور ان میں دوسرے وہ ہیں (جو شہادت کے) مشتاق ہیں اور (اب تک) انہوں نے (اپنے اس اشتیاق میں) کسی قسم کا تغیر و تبدّل نہیں ہونے دیا۔

اور یہ اس لیے کہ خود اُن کے سامنے اُن کا رسولؐ، روشنی کے بلند مینار کی طرح مستحکم و استوار کھڑا تھا کہ سرکشی و عُدوان کی موجیں چاروں طرف سے یلغار کر کے آئیں اور سر ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں۔ جن کے سامنے ایمان و ایقان اور صبر و استقامت کا ایسا نمونہ موجود ہو، اُن کے پائے ثبات میں لغزش کس طرح آجائے۔ یہ تھا وہ مقام جہاں کہا گیا تھا کہ:

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَکَرَ اللّٰهَ کَثِیْرًا ؕ (۳۳/۲۱)

تم میں سے ان لوگوں کے لیے خدا کے رسولؐ (کے عمل) میں ایک عمدہ نمونہ موجود ہے جو خدا کے قانون کی ہمہ گیری اور نتیجہ خیزی پر یقینِ کامل رکھیں اور ہر وقت قانونِ خداوندی کو اپنے پیشِ نظر رکھیں۔

محاصرہ جاری رہا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے مصائب و شدائد میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ان مشکلات کے پیشِ نظر حضورؐ کو خیال گزرا کہ کہیں انصار ہمت نہ ہار جائیں کیونکہ وہ اس قسم کی جنگ کے عادی نہ تھے۔ اس لیے آپؐ نے چاہا کہ غطفان سے اس شرط پر معاہدہ کر لیا جائے کہ مدینہ کی پیداوار کا ایک ثلث انہیں دے دیا جائے۔

انصار کا استقلال

رؤسائے انصار نے جب یہ سُنا تو عرض کیا کہ اگر یہ فیصلہ خداوندی ہے تو اس سے انکار کی مجال نہیں لیکن اگر حضورؐ اپنی رائے سے ایسا کرنا چاہتے ہیں تو پھر جرأتِ عرض معاف! ہم اس کے لیے تیار نہیں۔ ہم سے تو بحالتِ کفر بھی کسی کو خراج مانگنے کی جرأت نہیں ہوئی، چہ جائیکہ اب جبکہ اسلام نے ہمارا پایہ اتنا بلند کر دیا ہے، ہم اس پر آمادہ ہو جائیں۔ حضورؐ اس استقلال کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور معاہدہ کا خیال چھوڑ دیا۔

محاصرہ کی طوالت سے خود محاصرین بھی تنگ آ رہے تھے۔ وطن سے اتنی دُور ۲۴ ہزار کی فوج کو رسد پہنچانا کچھ آسان کام نہ تھا، سردی کا موسم، ذرائع رسل و رسائل کی قلت، گھر بار سے دُوری، تنگ آ کر اُنہوں نے ایک دن ہلّہ بول دیا اور خندق کا ایک ایسا حصہ جو زیادہ چوڑا نہیں تھا عبور کر لیا۔ جنگ شروع ہو گئی۔ یہ معرکہ بڑی سختی اور پریشانی کا تھا۔ تیروں اور پتھروں کی بارش ایک ثانیہ کے لیے بھی تھمنے نہیں پاتی تھی۔ جُوں تُوں کر کے دن ختم ہُوا تو رات کو اس سختی سے بادِ صرصر چلی کہ کفار کے خیموں کی طنابیں اُکھڑ گئیں۔ اس "جیشِ خداوندی" کے حملہ نے مخالفین کو بدحواس کر دیا۔ قرآنِ کریم نے اس واقعہ کو انعامِ خداوندی سے تعبیر کیا ہے (۳۳/۹)۔ اس کے ساتھ ہی یہودیوں نے بھی ہمت ہارنی شروع کر دی اور قریش کو محسوس ہونے لگ گیا کہ اب یہ ساتھ چھوڑ دینے پر آمادہ ہیں۔ ان تمام مشکلات کے پیشِ نظر انہوں نے بھی سمجھا کہ محاصرہ اُٹھا لیا جائے۔ چنانچہ ۲۰-۲۲ روز کی ناکام طُغیانیوں کے بعد یہ طوفان جدھر سے اُٹھا تھا، خاسر و ناکام اُدھر ہی کو واپس لوٹ گیا۔

وَ رَدَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِغَیْظِهِمْ لَمْ یَنَالُوْا خَیْرًا ؕ وَ کَفَی اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ الْقِتَالَ ؕ وَ کَانَ اللّٰهُ قَوِیًّا عَزِیْزًا ۚ (۳۳/۲۵)

(اور اے مسلمانو!) اللہ نے منکرینِ حق کو (مدینے سے) غصّہ میں پیچ و تاب کھاتا ہُوا لوٹا دیا کہ ان کی کوئی (بھی) مُراد پوری نہ ہو سکی اور قانونِ خداوندی جنگ میں مسلمانوں کے لیے خود ہی کافی ہو گیا اور (بلاشبہ) اللہ بڑا ہی قوّت والا (اور) بڑا ہی زبردست ہے۔

بنو قریظہ کی سرکوبی

بنی قریظہ (یہودیوں) نے کھُلی ہُوئی عہد شکنی کی تھی۔ اس لیے ان کی سرکوبی ضروری تھی۔ اگر حلیف قوتیں اس طرح وقت پر غداری کر جائیں تو نظامِ امن کس طرح قائم رہ سکے! اُن سے جب اس کے متعلق باز پُرس کی گئی تو بجائے اس کے کہ وہ اپنی حرکات پر نادم ہوتے، سبّ و شتم پر اُتر آئے۔ لہٰذا ان کے خلاف فوج کشی کی گئی۔ قریب ایک ماہ تک وہ محصور رہے اور پھر ان ہی کے مقرر کردہ ثالث کے فیصلے کے مطابق ان کے مستقبل کا فیصلہ کر دیا گیا۔

وَ اَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَ قَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَ تَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ۚ (۳۳/۲۶)

اور جن اہلِ کتاب نے ان (مشرکین) کی مدد کی تھی، (خدا) نے ان کو بھی اپنے ان قلعوں سے باہر نکال دیا (جن میں وہ محصور تھے) اور ان کے دلوں میں تمہارا رُعب بٹھا دیا جن میں سے بعض کو تم نے (میدانِ جنگ میں) قتل کر دیا اور بعض کو گرفتار کر لیا۔

اس طرح اللہ نے ان (دشمنوں) کے اموال و اراضی کا مالک مجاہدین کی جماعت کو بنا دیا اور نہ صرف انہی زمینوں کا بلکہ (مستقبل قریب میں) اُن زمینوں کا بھی جو ابھی تک ان کے قدموں سے پامال بھی نہیں ہوئی تھیں۔

وَ اَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَ دِيَارَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ وَ اَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا ۚ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ۚ (۳۳/۲۷)

اور (ہم نے) تمہیں ان کی زمینوں، ان کے گھروں اور ان کے اموال کا مالک بنا دیا اور (ایسی) زمین کا بھی مالک بنا دیا، جس پر تم نے ابھی قدم (تک) نہیں رکھا تھا۔ اور اللہ نے ہر بات کے لیے پیمانے مقرر کر دیئے ہیں جن پر اسے پورا پورا کنٹرول حاصل ہے۔

جنگِ حُدیبیہ

(ذیقعدہ سنہ ۶ھ)

نظامِ قرآنی میں جو مرکزی حیثیت کعبہ کو حاصل ہے اُس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اور یہ بھی ہم دیکھ چکے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے کن اضطراری حالات میں مکّہ کو چھوڑا تھا۔ کعبہ چونکہ اس تمام سعی و کاوش اور جدّ و جہد کا حاصل اور تمام تگ و تاز اور حرکت و عمل کا منتہیٰ تھا اس لیے مدینہ میں آنے کے بعد بھی وہ حضورؐ کی تمنّاؤں کا مرکز اور آرزوؤں کا محور رہا۔ آپ کا جسم یہاں تھا لیکن رُوح وہیں تھی۔ آپ کی نگاہ کا ہر تار اسی قبلۂ مقصود سے وابستہ اور دل کی ہر جُنبش اسی مرکزِ حیات سے ہم آہنگ تھی۔ چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے، خیال اسی سدرۃ المنتہیٰ کی طرف لگا رہتا تھا۔ پھر چونکہ اپنے مشن کی صداقت پر ایمانِ محکم اور اس کی آخری کامیابی پر یقینِ کامل تھا اس لیے یہ اُمّید آپؐ کے قلبِ اطہر کی انتہائی گہرائیوں میں ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر پیوست تھی کہ ایک نہ ایک دن پھر ہمیں مکّہ میں داخل ہونا ہے اور اس طرح کعبہ کو ملّتِ اسلامیہ کا مرکز بن کر رہنا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ خود اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ کر رکھا تھا کہ کعبہ کی تولیت آپ کو مل کر رہے گی۔ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا (۲/۱۴۴)۔ ذیقعدہ سنہ ۶ھ کا ذکر ہے کہ آپؐ نے خواب میں دیکھا کہ آپؐ اپنے متّبعین کے طائفہ کے ساتھ مکّہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ اگرچہ مسلمانوں پر حج فرض نہیں ہُوا تھا لیکن عربوں میں حج حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ سے ہی رائج تھا اور سنّتِ ابراہیمیؑ کے اتّباع میں وہاں حج بھی کیا جاتا تھا اور عمرہ بھی۔ حضورؐ نے عُمرہ کا ارادہ کیا۔ وفورِ شوق نے

عمرہ کے لیے روانگی

قریب چودہ سَو صحابیوںؓ کو بھی ہم رکاب کر دیا۔ زائرینِ بیتُ اللہ کا یہ کاروانِ عشق و محبّت، جذب و کیف کی ایک دُنیا اپنے جلو میں لیے رواں دواں دیارِ محبوب کی جانب

روانہ ہوا۔ قریش نے جب یہ سُنا تو خواہ مخواہ جنگ کی تیاریاں کرنے لگ گئے۔ حضورؐ جب مکّہ سے باہر ایک منزل کے فاصلہ پر مقامِ حدیبیہ پر پہنچے تو نہایت واضح الفاظ میں قریش تک یہ پیغام بھجوا دیا کہ ہم صرف زیارتِ بیتُ اللہ کے لیے آئے ہیں۔ عمرہ کا احرام باندھے ہوئے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ ایسی حالت میں کوئی لڑائی نہیں لڑا کرتا۔ اس لیے مفت کی ضد نہ کرو اور ہمیں زیارتِ کعبہ سے شرف یاب ہونے دو۔ لیکن ان کے سر پر قوتِ کاذبہ سوار تھا۔ انہوں نے جواب میں ایک دستہ فوج کا بھیج دیا۔ حالانکہ اس مہینہ میں عرب لڑائی نہیں کیا کرتے تھے۔ اس دستہ کو مسلمانوں نے آسانی سے گرفتار کر لیا۔ انہوں نے معافی مانگی تو اس ابرِ کرم کی گہرباریوں نے ان کے دامنِ اُمید کو خالی نہ لوٹایا اور سب کو معافی دے کر چھوڑ دیا۔ انہی کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۝ (۴۸/۲۴)

وہی ایسا ہے جس نے مکّہ کی وادی میں تمہارے ہاتھوں کو ان (منکرینِ حق کے قتل) سے اور ان کے ہاتھوں کو تمہارے (قتل) سے، بعد اس کے کہ خدا تمہیں ان پر فتحمند اور ظفریاب کر چکا تھا، باز رکھا اور اللہ تمہارے کاموں کو (اس وقت بھی) دیکھ رہا تھا!

اس کے بعد حضورؐ نے قریش سے گفتگوئے صُلح کے لیے حضرت عثمانؓ کو بھیجا۔ انہوں نے حضرت عثمانؓ

گفتگوئے صُلح

کو نظربند کر لیا اور خبر مشہور ہو گئی کہ آپ کو شہید کر دیا گیا ہے۔ یہ سرکشی اور طغیان کی انتہا اور دنایت و بدعہدی کی آخری حد تھی۔ آپ ایک ببول کے درخت کے نیچے تشریف فرما تھے۔ وہیں اپنے ساتھیوں سے اللہ کی راہ میں سرفروشی اور جاں سپاری کی بیعتؔ لی۔ یہی وہ بیعتِ رضوان ہے جس کا ذکر قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۙ وَّ مَغَانِمَ

ؔ غور کیجئے کہ اسلام میں بیعت سے کیا مفہوم تھا اور اس کے بعد جب دین عجمی تصوّف کی افسانوی فضا میں گم ہو گیا تو بیعت سے کیا مقصود رہ گیا۔

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل — یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست — یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

كَثِيرَةً يَّأْخُذُوْنَهَا ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ○ (۴۸ / ۱۸-۱۹)

ان حالات میں جب جماعتِ مومنین، اس درخت کے نیچے تجھ سے عہدِ اطاعت کر رہے تھے، تو ان کا یہ عمل قانونِ خداوندی کے عین مطابق تھا۔ وہ ٹھیک ٹھیک وہی کر رہے تھے جو ایسے حالات میں قانونِ خداوندی کا تقاضا تھا۔ اور ان کا یہ عمل محض میکانکی طور پر نہ تھا بلکہ دل کی پوری پوری رضامندی سے تھا جسے خدا اچھی طرح جانتا تھا اور اس کا نتیجہ تھا کہ ایسے مہیب خطرات کے باوجود انہیں پورا پورا اطمینان حاصل تھا۔ چنانچہ خدا نے ان کے لیے مستقبل قریب میں فتح و کامرانی کی راہیں کھول دیں۔

بیعتِ رضوان

یہ بیعت خدا سے اس بات کا عہد نامہ تھا کہ اس کی راہ میں سب کچھ قربان کر دیا جائے گا۔ اور چونکہ رسول اللہ ؐ بہ حیثیت سربراہِ نظامِ خداوندی بیعت لے رہے تھے، اس لیے حضورؐ کے ہاتھ کو خدا کا ہاتھ قرار دیا گیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللَّهَ ۗ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللَّهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ○ (۴۸ / ۱۰)

اے پیغمبرِ اسلامؐ! جو لوگ تم سے معاہدہ کر رہے ہیں وہ درحقیقت خدا سے معاہدہ کر رہے ہیں۔ اس لیے ان کے ہاتھوں پر خدا کا ہاتھ ہے۔ اس کے بعد جو شخص عہد کو توڑے گا تو اس کے عہد کے توڑنے کا وبال اسی پر پڑے گا اور جو شخص خدا سے کیا ہوا عہد پورا کر دکھائے گا تو عنقریب خدا اس کو (جزائے عمل کے طور پر) بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔

یہ بیعت (یعنی بیع و شریٰ کا معاملہ) درحقیقت اسی عہد کی تجدید تھی جو ہر مومن، ایمان لاتے وقت، اپنے خدا سے کرتا ہے اور جس کی رُو سے، عبدِ مومن اپنے جان و مال کو خدا کے ہاتھوں بیچ دیتا ہے اور اس کے عوض میں خدا کی طرف سے اسے جنّت مل جاتی ہے، اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی (دیکھئے ۹ / ۱۱۱)۔ جماعتِ مومنین نے اس عہد کی تجدید کی لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ حضرت عثمان ؓ کی شہادت کی خبر غلط تھی۔ چنانچہ قریش نے اپنی طرف سے سہیل کو گفتگوئے مصالحت کے لیے بھیجا۔ جن شرائط پر صلح ہوئی وہ حسبِ ذیل تھیں۔

(۱) مسلمان اس سال واپس چلے جائیں۔

(۲) آئندہ سال حج کے لیے آئیں اور صرف تین دن رہ کر چلے جائیں۔ ہتھیار ساتھ نہ ہوں صرف تلواریں

ہوں اور وہ بھی نیام میں۔

(۳) مکہ میں جو مسلمان پہلے سے مقیم ہیں، انہیں ساتھ نہ لے جائیں اور اگر کوئی مسلمان مکہ میں رہنا چاہے تو اسے اس سے روکیں نہیں۔

(۴) کفار میں سے اگر کوئی شخص مدینہ جائے تو اسے روکا نہ جائے لیکن اگر کوئی مسلمان مکہ میں آجائے تو کفار اسے واپس نہیں کریں گے۔

(۵) قبائل عرب کو اختیار ہوگا کہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ میں شریک ہو جائیں۔

نظر بظاہر یہ شرائط مسلمانوں کے مفاد کے خلاف تھیں حتیٰ کہ معاہدہ کی تحریر کے وقت جزئیات تک میں قریش کے نمائندہ (سہیل) نے جہاں جہاں کسی بات پر اصرار کیا، اُسے بھی مان لیا گیا۔ مثلاً کاتب معاہدہ (حضرت علیؓ) نے شروع میں حسب معمول بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ لکھا، تو سہیل نے کہا کہ عربوں کے دستور کے مطابق (بِاسۡمِکَ اللّٰھُمَّ) لکھو۔ یہ بھی منظور کر لیا گیا۔ اس کے بعد جب یہ لکھا گیا کہ یہ وہ معاہدہ ہے جو مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ نے تسلیم کر لیا ہے تو سہیل نے اس پر بھی اعتراض کیا اور کہا کہ آپ کا نام مُحَمَّدٌ ابنِ عبداللہ لکھیے کیونکہ ہم آپ کو رسول اللہ تسلیم ہی نہیں کرتے۔ یہ بھی مان لیا گیا۔ ابھی معاہدہ لکھا ہی جا رہا تھا کہ سہیل کے صاحبزادے (حضرت ابوجندلؓ) جو اسلام لا چکے تھے اور مکہ ہی میں کفار نے انہیں قید کر رکھا تھا اور طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے، کسی طرح بھاگ کر مسلمانوں کے پاس آ گئے۔ پاؤں میں بیڑیاں، جسم زخموں سے لالہ زار، مصائب و تکالیف سے حالت نزار، وہ کون سی آنکھ تھی جو انہیں اس حالت میں دیکھ کر اشکبار نہ ہو گئی ہو گی؟ لیکن سہیل نے کہا کہ ہر چند ابھی معاہدہ کی تکمیل نہیں ہوئی لیکن ابوجندلؓ کو مسلمان اپنے پاس نہیں رکھ سکتے۔ نبیٔ اکرمؐ نے کئی مرتبہ اسے سمجھایا لیکن وہ اپنی ضد پر اڑا رہا حتیٰ کہ حضورؐ نے اسے بھی تسلیم کر لیا اور ابوجندلؓ کو اس کی تحویل میں دے دیا۔ ابوجندلؓ چودہ سو مسلمانوں کی جمعیت سے فریاد کر رہے تھے کہ بھائیو! تم مجھے پھر انہی بھیڑیوں کے حوالے کر رہے ہو! ذرا میری حالت کو تو دیکھو!! اگر تم بھی مجھے ان شدائد و آلام سے نہ بچاؤ گے تو پھر میری امداد کو اور کون آئے گا! اس فریاد پر مسلمانوں کے دل تڑپ اُٹھے لیکن فیصلہ کے خلاف ایک اُنگلی تک نہیں اُٹھ سکتی تھی۔ چودہ سو کا جمِ غفیر کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔ رسول اللہؐ نے ابوجندلؓ کو مخاطب کر کے کہا کہ "ابوجندل"! ضبط اور تحمل سے کام لو! خدا تمہارے اور دوسرے مظلوموں کے لیے کوئی راہ نکالے گا۔ صلح اب ہو چکی ہے۔ ہم ان لوگوں سے بدعہدی نہیں کرنا چاہتے۔"

حضرت ابوجندلؓ

مسلمان اس صلح سے بہت دل شکستہ اور مغموم تھے۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک یہ اعتراف شکست تھا لیکن اللہ تعالےٰ نے اس شکست کو باب الفتح قرار دیا (دیکھیے ۴۸-۱،۳) چنانچہ بعد کے واقعات نے بتا دیا کہ یہ ظاہری شکست فی الواقع بعد کی فتوحات کے لیے کشادِ راہ تھی۔ اس وقت تک مسلمان محض اپنی حفاظت کی فکر میں تھے۔ اب اس کے بعد غلبہ و تمکن کی زندگی شروع ہوئی۔ ایک عرصہ کی کشیدگی

فتح کا پیش خیمہ

تعلقات اور سلسلۂ جنگ و جدال نے کفار اور مسلمانوں کے باہمی میل جول کا سلسلہ منقطع کر رکھا تھا۔ خود غرض عناصر مسلمانوں کے متعلق طرح طرح کے بھیانک افسانے مشہور کر دیتے تھے جس سے قریش وغیرہ کے دلوں میں نفرت و عداوت کے جذبات اور بھی بھڑک اٹھتے تھے۔ اس معاہدے نے آتشِ مبارزت کو فرو کیا تو مخالفین نے مدینہ آنا جانا شروع کر دیا۔ اور انہوں نے مسلمانوں کے قریب آکر دیکھا کہ یہ درحقیقت ویسے نہیں جیسی ان کی تصویر کھینچی جاتی ہے اور ان کے عزائم و مقاصد وہ نہیں جو ان کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ قریب دو سال (بائیس ماہ) کے عرصہ میں جب تک یہ معاہدہ قائم رہا لوگ مسلمانوں کی طرف کھنچے چلے آئے۔ حدیبیہ کے وقت نبیؐ اکرمؐ کی معیت میں صرف چودہ سو کی جمعیت تھی اور اس کے دو سال بعد جب مکہ فتح ہوا ہے تو آپؐ کے جلو میں دس ہزار کی جماعت تھی۔ اس لیے حدیبیہ کا معاہدہ جو بظاہر شکست خوردگی اور مرعوبیت کا منظر دکھائی دیتا تھا، درحقیقت حصولِ مقاصد کے لیے کشادِ راہ کی صورت تھی اور اسی لیے ایک فتح مبین۔ خود غیر مسلم مؤرخین بھی جب اس معاہدہ پر غور کرتے ہیں تو اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار اس باب میں رقمطراز ہے۔

> معاہدۂ حدیبیہ نے دونوں مصافی جماعتوں کو دم لینے کی فرصت دے دی اور اس کا تمام فائدہ نبیؐ اکرمؐ کو ہوا۔ یہ صلح قریب دو سال تک قائم رہی اور اس دوران میں اہلِ مکہ کے لیے پیہم ناکامیوں اور مسلسل ذلتوں کا باعث ثابت ہوئی۔ وہ شرط جس کی رو سے محمدؐ نے یہ عہد کر لیا تھا کہ مکہ کے آدمیوں کو ان کے پاس واپس کر دیا جائے گا اور جو بالکل قریش کے حق میں تھی، تمام توقعات کے خلاف ان کے لیے باعثِ نقصان ثابت ہوئی اور بالآخر انہیں خود ہی درخواست کرنی پڑی کہ اس شرط کو بدل دیا جائے۔

سورۃ الفتح، اس اجمال کی تفصیل ہے جس کے آخر میں کہا گیا ہے کہ

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ

كُلِّهٖ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ؕ ﴿۴۸/۲۸﴾

وہی ہے جس نے اپنے رسول کو یہ ضابطۂ ہدایت یعنی حق پر مبنی نظام دے کر بھیجا، تاکہ یہ نظام دنیا کے دیگر تمام نظامہائے حیات پر غالب آجائے اور اللہ اس کے لیے کافی نگران ہے۔

لہلہاتی کھیتی

مکہ کی پُراز صعوبات و مشکلات زندگی اور اس کے بعد مدینہ کی ابتدائی زندگی، اسی مقصدِ عظیم — یعنی نظامِ خداوندی کے غلبہ و تسلط — کے حصول کی تیاری اور اسی منزلِ عظمیٰ تک پہنچنے کا سفر تھا۔ یہ درحقیقت، وہ محنت تھی جو ایک کسان کو زمین کی تیاری، تخم ریزی، آب پاشی، کھیت کی حفاظت اور دیگر متعلقہ جزئیات کے لیے کرنی پڑتی ہے۔ یہ سب کچھ ہو چکا۔ اب وہ کھیتی جو ایمان و اعمالِ صالحہ سے پروان چڑھی تھی، پکنے کے قریب آگئی ہے۔ اس کے بعد دنیا دیکھے گی کہ وہ کس طرح جھولیاں بھر دیتی ہے۔

دیکھئے، قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو کیسے دل آویز اور وجد آفریں انداز میں بیان کیا ہے جب فرمایا کہ

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا ؗ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚۛ وَ مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚۛ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ۧ ﴿۴۸/۲۹﴾

اور یہ ہوگا محمد رسول اللہ اور اس کے رفقارِ کار کی جماعت کے ہاتھوں۔ یہ جماعت بھی کیا عجیب و غریب جماعت ہے! ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ حق کے مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت ہیں، لیکن باہمدگر بڑے ہی نرم دل اور ہمدرد (۵/۵۴) تو انہیں دیکھتا ہے کہ وہ کس طرح ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھانے کے لیے جُھک جاتے ہیں اور قوانینِ خداوندی کے سامنے پیکرِ تسلیم و رضا بن جاتے ہیں۔ (لیکن یہ تارک الدنیا راہبوں کی جماعت نہیں) یہ، قانونِ خداوندی کے مطابق، سامانِ زیست کی تلاش میں مصروفِ تگ و تاز رہتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اس کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا ہر عمل قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ اور ان کی سیرت، صفاتِ خداوندی سے یک رنگ ہو جائے۔ اس سے انہیں جو سکونِ قلب اور حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے اس کے اثرات ان کے چہروں سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ اُن کی

یہ علامات، سابقہ کتبِ آسمانی — تورات و انجیل — میں بھی مذکور تھیں۔

انہوں نے اس نظامِ خداوندی کو جس طرح قائم کیا اور پروان چڑھایا ہے، اس کی مثال یوں سمجھو کہ جب عمدہ بیج سے شگوفہ پھوٹتا ہے تو اس کی پہلی کونپل بڑی نرم و نازک ہوتی ہے۔ پھر جوں جوں اس کی جڑ مضبوط ہوتی جاتی ہے اس کی نال موٹی ہوتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ اتنی مضبوط ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے سہارے آپ محکم اور استوار طریق پر قائم ہو جاتی ہے (اس میں خوشے لگتے ہیں اور خوشوں میں دانے پڑ کر سخت اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ یوں وہ ننھا سا بیج، پکی ہوئی فصل میں تبدیل ہو جاتا ہے)۔ جب کاشتکار اپنی فصل کو اس طرح ثمر بار دیکھتا ہے تو وجد و مسرت سے جھوم اُٹھتا ہے۔ لیکن یہی چیز اس کے مخالفین کے سینے پر سانپ بن کر لوٹنے لگ جاتی ہے۔

اسی طرح اللہ، ہر اس جماعت کو جو اس کے قوانین کی صداقت پر ایمان لا کر، اس کے بتائے ہوئے پروگرام پر عمل پیرا ہوتی ہے، اس امر کا وعدہ دیتا ہے (یعنی یہ اُس کا قانون ہے) کہ ان کی کوششوں کا ننھا سا بیج، تمام خطرات سے محفوظ رہے گا اور ان کی کھیتی پک کر بہترین ثمرات کی حامل ہو جائے گی [24/55]۔ (لیکن اس کے لیے اس قسم کی محنت اور استقامت کی ضرورت ہو گی جس قسم کی محنت اور استقامت کا ثبوت کسان دیتا ہے — تخمِ صالح، قوانینِ فطرت سے مطابقت، مسلسل محنت اور استقلال و استقامت، کھیتی کی برومندی کے لیے یہ تمام شرائط لاینفک ہیں)۔

ذرا جماعتِ مؤمنین کی اس خصوصیتِ عظمیٰ پر نگاہ ڈالیے۔

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو، وہ شبنم!
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں، وہ طوفان

جماعتِ مؤمنین کی خصوصیات

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ وہی ہے جس کے متعلق سورۂ توبہ میں فرمایا وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً [9/123] تاکہ کفار تمہارے اندر سختی اور صلابت محسوس کریں اور اُن کے دِلوں میں تمہارا رُعب اور دبدبہ بیٹھ جائے اور دوسری جگہ کہا۔

وَ قَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَ تَأْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ۚ [33/26]

(اور حقیقت یہ ہے کہ) اللہ نے ان (اہلِ کتاب یہود) کے دلوں میں تمہارا رعب بٹھا دیا۔ (ان میں سے

ایک گروہ کو تم نے تہِ تیغ کر دیا اور ایک گروہ کو گرفتار کر لیا۔

اور وہ کبھی تمہارے اوپر غالب نہ آسکیں۔

وَلَنْ یَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِیْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا ۠ (۴:۱۴۱)

اور خدا کبھی ایسا نہیں کرے گا کہ منکرینِ (حق) ایمان رکھنے والوں پر غالب آجائیں۔

اور اپنی جماعت میں ایک دوسرے کے زخموں کے لیے مرہم، دل کا سرور آنکھوں کا نور، تمام قلوب مودّت و محبت کے سلسلہ میں منسلک، ایک نصب العین، ایک مقصدِ حیات، ایک راہِ عمل، فلہٰذا تمام کارواں ایک وحدت (UNIT) ایک کی خوشی میں سب کی خوشی، ایک کی مصیبت میں سب کی مصیبت ساری جماعت ایک جسدِ واحد کی مثل کہ اگر پاؤں کے انگوٹھے میں کانٹا چبھ جائے تو آنکھ کے آبگینے میں آنسو چھلک آئیں۔ نبیِ اکرمؐ کے ارشادِ گرامی کے مطابق:

مَثَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ فِیْ تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ مَثَلُ الْجَسَدِ اِذَا اشْتَكٰى لَهٗ عُضْوًا تَدَاعٰى لَهٗ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى۔

مسلمانوں کی مثال باہمی مودّت اور رحمت اور ہمدردی میں ایسی ہے جیسے ایک جسمِ واحد کی کہ اگر اس کے ایک عضو میں کوئی شکایت پیدا ہو جائے تو سارا جسم اس تکلیف میں شریک ہو جاتا ہے۔

یہی ہے ایک مومن کی زندگی کا شعار، دشمنوں کے مقابلہ میں حصارِ سنگین و شمشیرِ آتشیں، لیکن اپنوں کے لیے نظافتِ عنبریں و لطافتِ یاسمیں۔

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر — شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے — گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ۔

حسبِ معمول مسلمانوں کی طرف سے معاہدہ کی پابندی بڑی شدت سے ہوئی۔ مخالفینِ مکہ کے افراد، مدینہ میں

مسلمانوں کی طرف سے کسی قسم کی زیادتی نہیں پاتے تھے اس لیے وہاں آرام وسکون سے آتے جاتے اور رہتے سہتے تھے۔ برعکس اس کے جو مسلمان اہلِ مکہ کے ہاتھوں اذیتیں اٹھاتے تھے، اُن کے لیے اس کے سوا چارہ کار نہ تھا کہ وہ وہاں سے نکل کر کسی دوسری جگہ آزادانہ زندگی بسر کرسکیں، کیونکہ مدینہ بھی ان کے لیے حدِ ممنوعہ تھی۔ رفتہ رفتہ اس قسم کے مسلمانوں کی ایک الگ جماعت سمندر کے کنارے مقامِ عیص پر جمع ہوگئی۔ قریش کو ان سے خطرہ محسوس ہوا اور انہوں نے اسی میں خیریت سمجھی کہ نبی اکرمؐ سے درخواست کی جائے کہ معاہدہ کی اس شرط کو کالعدم تصور کیا جائے۔ یوں حدیبیہ کا معاہدہ آنے والی کامیابیوں کے لیے پیش خیمہ ثابت ہوا۔

غزوۂ خیبر

۷ھ

غزوۂ خیبر کا ذکر قرآنِ کریم میں بصراحت نہیں آیا لیکن سورۂ فتح میں جن مغانمِ کثیرہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ خیبر ہی کی فتح کے مآل میں حاصل ہوئی تھیں۔ علاوہ ازیں یہ جنگ اسلام کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتی ہے۔ اس لیے کہ یہ پہلی لڑائی ہے جس میں اہلِ کتاب سے نبرد آزمائی ہوئی اور انہیں مسلمانوں کی رعایا بنایا گیا۔ یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ جب یہودیوں کے قبائل مدینے سے نکلے ہیں تو سب خیبر میں مرکوز ہو گئے تھے جہاں انہوں نے بڑے بڑے مضبوط قلعے بنا لیے تھے۔ یہ سرزمین، اسلام کے خلاف پیہم سازشوں کا مرکز بن رہی تھی۔ احزاب کی جنگ ان ہی سازشوں کا نتیجہ تھی۔ حدیبیہ سے واپسی پر نبیٔ اکرمؐ کو معلوم ہوا کہ یہود اِدھر اُدھر کے قبائل سے ساز باز کر رہے ہیں تاکہ مل کر مدینہ پر حملہ کیا جائے۔ یہ سیلاب بلا ایسا نہ تھا جس کا انتظار مدینہ میں بیٹھ کر کیا جاتا۔ اس کا مقابلہ وہاں جا کر کرنا ہی ضروری تھا۔ اس لیے حضورؐ نے اس حملہ کو روکنے کے لیے شروع ۷ھ میں خیبر کا رُخ کیا۔ یہ مقام مدینے سے قریب دو سو (۲۰۰) میل کے فاصلے پر ہے۔ چودہ سو (۱۴۰۰) پیادہ فوج اور دو سو (۲۰۰) سوار حضورؐ کی معیت میں تھے۔ جب یہ فوج خیبر کے سواد میں پہنچی تو رات ہو چکی تھی۔ حضورؐ رات کو کبھی حملہ نہیں کیا کرتے تھے، اس لیے وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ بستی سامنے تھی۔ حضورؐ نے حسبِ معمول خدا سے دُعا مانگی کہ:

> اے خدا! ہم تجھ سے اس بستی کی اور اس بستی والوں کی اور بستی کی ہر شے کی بھلائی چاہتے ہیں اور ان سب کی شرارتوں سے تجھ سے پناہ کے جویا ہیں۔ (بحوالہ ابنِ ہشام)

غور فرمائیے ! یہ ایک "حملہ آور" کی آرزوئیں ہیں کتنی حسین ہیں یہ دعائیں اور کس قدر غمگسارانہ ہیں یہ تمنّائیں !

فتح خیبر

یہودی اپنے قلعوں میں پناہ گزین ہو گئے اور مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ کافی مدّت تک رہا۔ بالآخر یہودیوں نے اعترافِ شکست کیا اور صلح کی درخواست پیش کی۔ اسلام کا مقصد ہی امن و سلامتی ہے۔ یہ درخواست منظور کی گئی اور انہیں کافی مراعات دی گئیں۔

یہود نے صُلح بھی کی، ان سے اس قدر مراعات بھی برتی گئیں لیکن کینہ پروری اور دنایت، جو اُن کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی تھی، نہ جانی تھی، نہ گئی۔ ان کی ساری عمر سازشوں ہی میں گزر گئی۔ چنانچہ حضورؐ ابھی خیبر ہی میں تھے کہ ایک یہودی عورت نے آپ کی دعوت کی جسے حضورؐ نے ازراہِ کرم گستری قبول کر لیا لیکن اس

کھانے میں زہر

نے کھانے میں زہر ملا دیا۔ زہر کے فوری اثر سے حضورؐ تو بچ گئے لیکن ایک اور صحابی (بشر بن براءؓ) شہید ہو گئے۔ (یہ سازشیں بدستور قائم رہیں تا آنکہ حضرت عمرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں تنگ آکر یہود کو اضلاعِ شام کی طرف منتقل کر دیا۔

یہ غزوۂ خیبر ہی کا واقعہ ہے کہ اسود راعی، اہلِ خیبر کا ایک چرواہا بکریاں چراتا حضورؐ کے قریب آیا اور

حفظِ امانت

عرض کیا کہ اگر میں اسلام لا کر خدا کی راہ میں جان دے دوں تو مجھے بھی جنّت مل جائے گی؟ حضورؐ نے فرمایا کہ اس میں کیا شبہ ہے؟ تو اس نے کہا کہ "الحمد للہ" میں میدان میں جاتا ہوں۔ حضورؐ نے دریافت کیا کہ یہ بکریاں کس کی ہیں؟ اس نے عرض کیا کہ یہ گاؤں والوں کی ہیں۔ میں ان کا چرواہا ہوں۔ غور کیجئے! یہ بکریاں ان گاؤں والوں کی ہیں جن کے ساتھ جنگ ہو رہی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ بکریاں تمہارے پاس امانت ہیں۔ پہلے اس امانت کو اس کے مالکوں کے پاس پہنچاؤ، پھر جنگ میں شریک ہونا۔ چنانچہ وہ گیا اور بکریوں کو گاؤں کی طرف ہانک کر شریکِ جہاد ہوا۔

کہئے تاریخ کے اوراق سے کہ عین میدانِ جنگ میں اس قسم کے بلند اصول کی کوئی مثال پیش کر کے دکھائیں۔

جزیہ

جیسا کہ اُوپر لکھا جا چکا ہے، یہ جنگ ایک اہم خصوصیت اپنے اندر رکھتی تھی۔ قرآن کریم نے عام کفّار و مشرکین اور اہلِ کتاب سے جس قسم کے تعلّقات کا حکم دیا ہے اور قرآنی نظامِ حکومت کے ماتحت

ان کی جو پوزیشن متعین کی ہے اس کا ذکر اپنے مقام پر آئے گا۔ اس وقت صرف اتنا بتانا ضروری ہے کہ اہلِ کتاب سے جو جزیہ لینے کا حکم ہے اس سے کیا مفہوم ہے؟ اس لیے کہ معاندین نے اس کے متعلق بھی ایسا گمراہ کن پروپیگنڈا کر رکھا ہے کہ جزیہ کا نام سنتے ہی غیر مسلموں کی آنکھوں میں غصہ اور انتقام کا خون اُتر آتا ہے اور وہ اسے انسانیت کے خلاف جرمِ عظیم تصور کرتے ہیں۔ یہ واضح ہے کہ اسلام میں جنگ سے مقصود یہ ہے کہ جو مستبد اور سرکش قوتیں دنیا میں عدل و انصاف کا نظام قائم کرنے کے راستہ میں مزاحم ہوں ان کی قوت کو توڑ دیا جائے تاکہ دُنیا فساد کی آگ سے محفوظ ہو جائے۔ قرآنِ کریم میں ایک ہی جگہ جزیہ کا حکم ہے اور وہاں اس کے ساتھ ہی اس مفہوم کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے۔ سورۂ توبہ میں ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ ﴿۹/۲۹﴾

اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں کا یہ حال ہے کہ نہ تو خدا پر اور آخرت پر اس طرح ایمان رکھتے ہیں جس طرح خدا نے کہا ہے، نہ ہی ان امور کو اپنے اوپر واجب ٹھہراتے ہیں جنہیں خدا اور رسول (نظامِ خداوندی) واجب قرار دیتا ہے اور نہ ہی اس حق و صداقت پر مبنی نظام کی اطاعت قبول کرتے ہیں۔ ان سے (بھی) جنگ کرو، یہاں تک کہ وہ حکومت سے معاہدہ کر کے حفاظتی ٹیکس دینے پر آمادہ ہو جائیں اور اس طرح ان کی طرف سے سرکشی ختم ہو جائے۔

اس آیت کے آخری الفاظ "وَهُمْ صَاغِرُونَ" اس مقصد کی وضاحت کرتے ہیں یعنی اصلی غرض یہ ہے کہ ان کا زور ٹوٹ جائے اور وہ سرکشی سے باز آجائیں۔

اب دیکھئے کہ جِزْیَہ ہے کیا۔ اسلامی نظام میں ہر مسلمان سپاہی ہوتا ہے اور عند الضرورت اس سے فوجی خدمت "بہ جبر" لی جاتی ہے (بہ جبر سے یہ مطلب ہے کہ مسلمان ہونا اور فوجی خدمت دینا لازم و ملزوم ہیں۔ اور اس میں اسے کوئی اختیار نہیں ہوتا)۔ اسلام اپنی غیر مسلم رعایا پر یہ جبر نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے ایک غیر مسلم کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ چاہے تو فوجی خدمت ادا کرے اور چاہے تو اس سے الگ رہے۔ غور کیجئے کہ یہ پہلا قدم ہی کس قدر رعایت اور رواداری پر مبنی ہے یعنی جو اختیار حاکم قوم کے افراد کو حاصل نہیں، وہ محکوم قوم کو از خود دے دیا گیا ہے۔ اب آگے بڑھیئے۔ مسلمانوں پر اپنی غیر مسلم رعایا کی جان، مال، عزت، آبرو، مذہب اور مقدس مقامات وغیرہ

کی حفاظت لازمی ہے۔ اسی لیے انہیں ذمّی کہا جاتا ہے، یعنی وہ جن کی حفاظت کی ذمّہ داری مسلمانوں نے اپنے سر لے لی ہو۔ ان میں سے جو فوجی خدمت سے مستثنیٰ رہنا چاہیں اُن سے اس حفاظت کے بدلے میں تھوڑا سا ٹیکس لے لیا جاتا ہے تاکہ یہ روپیہ فوجی اخراجات میں کام آسکے۔ اس ٹیکس کا نام ہے جزیہ ہے!

اب دیکھیے کہ اس ٹیکس کی مقدار کیا تھی۔ اس کی عام شرح تین روپے اور چھ روپے فی کس سالانہ تھی اور زیادہ سے زیادہ بیس روپے۔ نیز بیس برس سے کم، اور پچاس برس سے زیادہ عمر والے مرد، تمام عورتیں، مفلوج، معطّل العضو، نابینا، مفلس اور تمام لوگ جو فوجی خدمت از خود قبول کر لیں، اس سے مستثنیٰ تھے۔ اب آپ فرمائیے کہ دنیا میں اس سے زیادہ سستی حفاظت بھی کہیں مِل سکتی ہے؟ اور پھر اس حفاظت کے عہد پر عمل کس

عہدِ حفاظت کی پابندی

شدّت سے ہوتا تھا اُس کا اندازہ اس قسم کے تاریخی واقعات سے لگائیے کہ شام کے علاقہ میں مسلمانوں نے عیسائیوں سے سال بھر کا جزیہ وصول کیا، لیکن کچھ دنوں بعد، ہرقل (عیسائی بادشاہ) کے حملہ کے مقابلہ کی وجہ سے مسلمانوں کو وہاں سے اپنی فوجیں ہٹانا پڑیں، تو زرِ جزیہ یہ کہہ کر واپس کر دیا گیا کہ یہ رقم تمہاری حفاظت کے عوض میں لی گئی تھی۔ جب ہم تمہاری حفاظت نہیں کر رہے، تو اس کا معاوضہ کیا؟ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ جب مسلمان فوجیں یہ شہر خالی کر رہی تھیں، تو وہاں کی عیسائی رعایا نم آلود آنکھوں سے انہیں رخصت کر رہی تھی اور یہ دعائیں مانگ رہی تھی کہ خدا تمہیں ہمارے شہروں کی حکومت پھر عطا کرے۔ اگر تمہاری جگہ عیسائی فوجیں ہوتیں، تو اس موقع پر واپس دینا تو درکنار، جو کچھ ہمارے پاس تھا وہ بھی نوچ کھسوٹ لیتیں۔

یہ ہے وہ جزیہ جسے مشرق و مغرب کے معاندینِ حق و صداقت نے کیا کچھ بنا کر دُنیا کے سامنے پیش کر رکھا ہے۔

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا!

فتحِ مکّہ

(رمضان ۸ھ ٭ جنوری ۶۳۰ء)

تاریک مایوسیوں اور ظلمت انگیز نا اُمیدیوں کے اس ہجوم میں، جس میں گھرے ہوئے اس کاروانِ متاعِ توحید وصداقت نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی، دُور، اُفق سے اُس پار، ایک بےصوت صدا تھی جو اپنے دل کش لاہوتی انداز میں، اس بے سروسامان، عاجز و درماندہ جماعت کے کانوں تک یہ نغمۂ جاں فزا اور مژدۂ رُوح افزا پہنچا رہی تھی کہ:

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (۳-۱۳۸)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) نہ تو ہمت ہارو، نہ غمگین ہو۔ تم ہی سب سے برتر و اعلیٰ ہو، اس لیے کہ تم مؤمن ہو۔!

گھبرانے اور دل چھوڑنے کی کوئی بات نہیں۔ یہ مظلومی اور یہ بے کسی، یہ درماندگی اور لاچاری، یہ ضعف و ناتوانی، یہ ہجومِ نوائب و انبوہِ مصائب، یہ تمام نوازل و زلازل، یہ نا اُمیدیاں اور مایوسیاں، یہ سب وقتی اور عارضی ہیں۔ انجامِ کار تمام کامیابیاں اور کامرانیاں، ہر قسم کی تازگیاں اور شادابیاں، قوت و غلبہ، شان و شوکت، جاہ و جلال، شرفِ انسانیت کے تمام مناصب و مراتب، تمہارے حصّہ میں آئیں گے۔ تمام تاریکیاں کافور ہو جائیں گی ظلمتوں کے بادل چھٹ جائیں گے۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدۂ غنچے کی نوا ہو جائے گی

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک | بزمِ گُل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے | یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

قرآن کریم میں ہجرت سے کچھ وقت پہلے اور ہجرت کے کچھ عرصہ بعد، اعدائے اسلام کی شکست و ریخت کی منذرات اور جیوشِ حق و صداقت کی فتح و نصرت کی مبشرات اس تواتر و تسلسل سے نازل ہوئیں کہ گویا مستقبل کی پوری تصویر حال کے آئینہ میں کھنچ کر آگئی (حقیقت یہ ہے کہ حال اور مستقبل کی دیواریں ہماری نارسائی نگاہ کی تعمیر کردہ ہیں۔ خدائے علام الغیوب کے سامنے ان حدود و فاصل کا کوئی وجود ہی نہیں ہوتا) ہجرت کے بعد سرکش قوتوں کی تخریب کے مراحل بتدریج طے پاتے چلے جا رہے تھے، لیکن ان کی تکمیل فتح مکہ میں جا کر ہوئی تھی، جہاں قانونِ خداوندی کی تائید و نصرت کو یوں بے محابا سامنے آنا تھا کہ کسی آنکھ کو اس کی جلوہ باریوں سے مجالِ انکار نہ ہو۔ تخریب و ہزیمت کے ان مواعید میں سورۃ لہب کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے کہ اس میں ان سرکش قوتوں کے عجز و درماندگی اور فنا و استیصال کی مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے۔ پھر اسے سورۃ نصر سے متصل رکھ کر جس معجزانہ بلاغت سے اس کے مفہوم کی وضاحت کر دی گئی ہے، چشمِ بصیرت جب اس پر غور کرتی ہے تو قرآنی حسنِ اعجاز پر وجد کرتی ہے۔

رؤسائے قریش میں عتبہ، ابوجہل، ابوسفیان جیسے سرغنے موجود تھے جنہوں نے نبی اکرمؐ کی مخالفت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا لیکن غور کیجئے کہ قرآن نے ان میں سے کسی کا نام لے کر نہیں کہا کہ وہ بے دست و پا

ابی لہب

ہو گیا اور اسے اسلام کے مقابلہ میں ہاتھ اٹھانے کی ہمت باقی نہ رہی۔ نام ابی لہب کا لیا گیا ہے۔ یہ کیوں؟ ابی لہب میں وہ کون سی خصوصیت تھی جس کی وجہ سے اسے خاص طور پر پکارا گیا اور اس کی شکست و ہزیمت کو اسلام کا غلبہ و تسلط شمار کیا گیا۔ یہ چیز غور طلب ہے۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اسلامی نظامِ حکومت میں کعبہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی تھی۔ اس لیے اس مرکز پر اقتدار، نظامِ اسلامی کے اقتدار کی علامت تھی۔ رؤسائے قریش میں سے مختلف افراد کے پاس مختلف مناصب تھے لیکن کعبہ کی تولیت ابی لہب کے سپرد تھی۔ قرآن نے ابی لہب کا ذکر کر کے قلب و نگاہ کی تمام توجہات کو اس طرف مرکوز کر دیا کہ نبی اکرمؐ کی اس تمام تگ و تاز اور جنگ و جدل کا مقصد رؤسائے قریش کی ریاست و قیادت کا حصول نہ تھا بلکہ کعبہ کو پھر سے اس مقام پر لانا تھا جس کے لیے اسے وضع و تعمیر کیا گیا تھا۔ ابی لہب اپنے اس دینی منصب کی وجہ سے دینِ حقہ کا حقیقی دشمن تھا اور باقی رؤسائے قریش اس کے تابع تھے۔ اس شخص

نے ایک طرف کعبہ کو، جو خدائے واحد کی عبودیت کا مرکز تھا، بتوں کا استھان بنا رکھا تھا اور دوسری طرف اپنی ہوسِ زرپرستی اور سرمایہ داری کی وجہ سے اپنی اس دینی ریاست سے بہت ناجائز فائدہ بھی اٹھا رہا تھا۔ افادہ کے مال میں جو محتاجوں اور مساکین کی حاجت روائی کے لیے وقف تھا، خورد بُرد کرتا رہتا تھا حتّٰی کہ کعبہ کے خزانے کے سونے کے ہرن چرانے کا الزام بھی اس پر عاید کیا جاتا تھا۔ نبیٔ اکرمؐ کی دعوتِ توحید میں اُسے ہر وقت اپنے منصب کے چھن جانے اور اس طرح حصولِ مال و دولت کے اتنے بڑے سرچشمے کے ہاتھ سے نکل جانے کا خطرہ نظر آتا تھا۔ اس لیے یہ اس دعوتِ انقلاب کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتا تھا۔ یوں سمجھیے کہ ابولہب، قریش کے اس نظامِ پیشوائیت کا امام تھا جس میں تقدّس آمیز قیادت اور مُفت کا مال و دولت، سب حاصل ہو جاتے تھے۔ سرمایہ داری اور ہوسِ زرپرستی نے اس کے ان تمام جوہروں کو تباہ کر دیا تھا جو قریش کی قومی خصوصیات تھیں۔ یہاں تک کہ یہ شخص بدر کے میدان میں کہ جس میں قریش کی قومی غیرت و حمیّت اپنے خُرد و کلاں سب کو کھینچ لائی تھی، خود شریک نہیں ہوا۔ عاص بن ہشام کے ذمّے اس سرمایہ دار کے چار ہزار درہم قرض تھے۔ وہ بوجہ تنگ دستی اس قرض کو ادا نہیں کرسکتا تھا۔ اس بخیل نے اس قرضہ کے عوض عاص کی جان خرید لی اور اسے اپنی جگہ میدانِ جنگ میں بھیج دیا۔ یہ تھا وہ ابولہب جس کے پاس تولیّتِ کعبہ جیسا اشرف و افضل منصب تھا۔ ایسے شخص کے بے دست و پا ہو جانے کے اعلان کا کُھلا ہُوا مفہوم یہ تھا کہ کعبہ کی تولیّت ان ہاتھوں میں آجائے گی جو اسے اپنے ذاتی اغراض کے حصول کا وسیلہ نہ بنائیں گے، بلکہ اسے نوعِ انسانی کے قیام (قِیَامًا لِّلنَّاسِ) کا ذریعہ بنائیں گے۔ ابولہب جان کے خوف سے بدر میں شریک نہ ہوا لیکن قدرت کے فیصلے دیکھیے کہ بدر کے ساتویں دن اپنے گھر میں بیٹھے، چیچک کے عارضہ سے مر گیا۔ اس کے دونوں بیٹے موجود تھے لیکن چھوت کے ڈر سے وہ اس کی لاش کے پاس تک نہ آئے۔ یہاں تک کہ لاش پڑی پڑی سڑ گئی۔ دوسروں کے غیرت دلانے پر انہوں نے اس پر دُور ہی سے کچھ پانی چھڑکا اور مکہ سے باہر ایک جگہ رکھ کر دُور سے پتھر وغیرہ پھینک کر لاش کو ڈھانپ دیا۔ یہ انجام ہُوا اس زمانہ کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا اور سرمایہ دار کا۔ مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ [۲] یہ انجام تو اس دُنیا میں ہُوا اور اس کے بعد کی دُنیا میں

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۚ [۳]

وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں پڑے گا۔

وہ اور اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی۔ اس لیے کہ ابولہب کی زراندوزی کی ہوس اس کی بیوی (اُمِّ جمیل) کی وجہ سے تھی۔ وہ اسے مجبور کرتی تھی کہ اس کی زینت و آرائش کے لیئے جائز و ناجائز ہر طریق سے مال اکٹھا کرے تاکہ وہ اپنے ساتھ کی دوسری عورتوں میں اکڑ کر چلے۔ وہ اپنے دوزخ کا ایندھن خود اپنے کندھوں پر اُٹھا کر لے گئی (حَمَّالَةَ الْحَطَبِ) اور جس گردن کی سرفرازی کے لیے یہ سب کچھ کیا جاتا تھا اسی میں مکافاتِ عمل کی رسّی بندھی جو اسے کشاں کشاں ذلت آمیز عذاب کے جہنّم میں لے گئی (فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ)۔
ابولہب اگرچہ بدر کے بعد ہی مر گیا لیکن اس سے کعبہ کی تولیت مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ آئی، اس کا وقت اب آرہا تھا۔ اس لیے ابی لہب کی شکستِ ید (بے چارگی و ناتوانی، مقابلہ سے عاجزی اور مخالفت سے درماندگی) کا اصل وقت فتحِ مکّہ تھا نہ کہ اس کی موت۔ اس لیے ابی لہب کی بے دست و پائی کی تنذیر، درحقیقت، فتحِ مکّہ کی بشارت تھی۔

معاہدۂ حدیبیہ کی شرط کے مطابق، مسلمان ۷ھ میں مکّہ گئے اور تین دن کعبہ کی زیارت کرکے واپس آگئے۔ چونکہ معاہدہ کی پابندی ضروری تھی اس لیے مسلمان امن و سکون سے گئے، امن و سکون سے ہی لوٹ آئے۔ لیکن قریش اس معاہدہ کو بھی نہ نبھا سکے۔ صلح حدیبیہ کی بناء پر قبائل عرب میں، خزاعہ مسلمانوں کے حلیف ہو گئے تھے اور ان کے حریف، بنو بکر، قریش کے۔ ان دونوں قبیلوں میں مدت سے باہمی پرخاش چلی آرہی تھی۔ بنو بکر نے خزاعہ پر حملہ کیا اور قریش نے معاہدہ کے صریحاً خلاف، بنو بکر کی حمایت کی اور عین حرم کے اندر افرادِ خزاعہ کا خون بہا دیا۔ خزاعہ کے کچھ لوگ نبیٔ اکرمؐ کے پاس مدد کے لیے آئے۔ آپ نے جنگ کی بجائے قریش کو کہلا بھیجا کہ ان تین شرطوں میں سے کوئی ایک مان لی جائے۔

۱۔ مقتولینِ خزاعہ کا خون بہا دے دیا جائے۔ یا
۲۔ قریش، بنو بکر کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں۔ اور یا پھر
۳۔ اعلان کر دیا جائے کہ حدیبیہ کا صلح نامہ لوٹ چکا ہے۔

قریش کے نمائندہ نے تیسری شرط مانی اور معاہدہ کالعدم ہو گیا (اگرچہ انہیں اپنی اس حرکت پر بعد میں بڑا افسوس ہوا،

معاہدۂ حدیبیہ توڑ دیا گیا

لیکن اب ان لوگوں کا اعتبار ہی اُٹھ چکا تھا)۔ نبیٔ اکرمؐ نے مکّہ پر حملہ کی تیاری شروع کر دی اور اس امر کی احتیاط برتی کہ قریش کو قبل از وقت

اس کی اطلاع نہ ملنے پائے۔ حاطب ایک معزز صحابی تھے۔ انہوں نے ایک مخفی خط کے ذریعہ قریش کو اس تیاری کی اطلاع دینی چاہی نبیٔ اکرمؐ کو اس واقعہ کا پتہ چل گیا اور قاصد کو راستہ ہی میں روک لیا گیا۔ یہ منافقین میں سے نہیں تھے، اس لیے صدرِ اوّل میں یہ ایک ہی واقعہ ہے جس میں 'اپنی جماعت کے مفاد کے خلاف' کسی سے کوئی حرکت سرزد ہوئی ہو۔ حضورؐ نے جب ان سے پوچھا تو انہوں نے نہایت ندامت آمیز نگاہوں سے اقرار کیا کہ ان کے عزیز و اقارب مکہ میں تھے جن کا وہاں کوئی حامی نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے قریش پر احسان رکھنا چاہا کہ اس کے صلہ میں ان کے عزیزوں کو کوئی صدمہ نہ پہنچائیں گے۔ یہ ان کی جذباتی کمزوری تھی۔ قرآنی تعلیم انسان کو ان کمزوریوں سے بلند لے جانا چاہتی ہے۔ لیکن جس لغزش کے ساتھ عرقِ انفعال ہو، وہ قابلِ عفو ہوتی ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے اس عُذر کو، جسے پرخلوص ندامت سے پیش کیا گیا تھا، قبول فرمالیا۔

مکہ کی طرف روانگی

رمضان ۸ھ میں "دس ہزار قدوسیوں کی جماعت" کی ہم رکابی میں نبیٔ اکرمؐ عازمِ مکہ ہوئے۔ ۲ھ کا پہلا رمضان تھا جب بدر کے میدان پر اس سلسلۂ مبارک حق و باطل کی ابتداء ہوئی تھی۔ چھ سال کے بعد پھر رمضان ہی کے مہینہ میں اس کشمکش حق و باطل کی تکمیل کا دن آجاتا ہے۔

مکہ سے باہر ڈیرے ڈال دیئے گئے۔ ابوسفیان اس لشکر کی تحقیق کرنے کے لیے خفیہ طور پر آیا لیکن گرفتار ہو گیا۔ یہ سرخیلِ جیوشِ فراعنہ، اب پابجولاں حضورؐ کے سامنے تھا۔ اس کی ساری عُمر انتہائی مخالفتوں میں گزری تھی۔ اس کا ایک ایک جرم اس قابل تھا کہ اس کی سزا میں اس کی گردن اُڑادی جائے۔ حضورؐ کی نگاہ اٹھی تو اُس نے کلمۂ شہادت پڑھ کر سر جھکا دیا۔ اس نے کلمہ پڑھا اور ادھر تمام رنجشیں ختم ہوگئیں۔

سارے گلے تمام ہوئے اِک نگاہ میں!

اب ابوسفیان اس قدر ذی عزت اور قابلِ اعتماد تھا کہ اعلان کر دیا گیا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا یا دروازے بند کرلے گا یا ابوسفیان کے گھر پناہ لے لے گا، اُسے امن دے دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد بغیر[1] جنگ کیے، حضورؐ مظفر و منصور مکہ میں داخل ہوگئے۔

جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝ (۸۱/۱۷)

(اے پیغمبرِ اسلام! آپ اعلان کر دیجئے کہ دیکھو!) حق آگیا اور باطل نابود ہوا اور باطل اسی لیے تھا

---

[1] اس میں ایک آدھ خفیف سی جھڑپ ہوئی جو قابلِ التفات نہیں۔

کہ نابود ہو کر رہے۔

"وہی بے کس و بے بس انسان" جو آج سے آٹھ سال پہلے اسی مکہ سے رات کے وقت صرف ایک ساتھی کی ہمراہی میں، دشمنوں کی نگاہوں سے بچتے بچاتے نکلا تھا، کسی غیر کی مدد لیے بغیر آج اس جاہ و حشمت سے اسی مکہ میں داخل ہو رہا ہے جو دنیا کے کسی شہنشاہ کو آج تک نصیب نہ ہوئی ہو۔ قدوسیوں کی جاں نثار جماعت جلو میں، لوائے حق و صداقت سر پر سایہ فگن اور اللہ اور اس کے فرشتے اس عدیم النظیر کامیابی اور فقید المثال شادکامی پر ہدایائے تحسین و تبریک و تحائفِ صلوٰۃ و سلام سے گل پاش۔

فتحِ مکہ

اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (۳۳/۵۶)

اس شانِ خسروانہ اور خدا کے حضور اندازِ فقیرانہ سے حضورؐ کعبہ کی طرف تشریف لائے۔ کعبہ کے اندر جا کر آپؐ بحضور ربُّ العزت سجدہ ریز ہوئے۔ اس کے بعد لوگوں کو جمع کر کے ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا۔ یہ دربارِ حکومت الٰہیہ کا پہلا خطبۂ سلطنت تھا خطبہ کیا تھا، ان تمام اصول و مبانی کا عظیم القدر مجموعہ تھا جس پر حکومتِ خداوندی کے قصرِ مشید کو استوار ہونا تھا۔ حضورؐ نے باوازِ بلند فرمایا۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی، باقی بُتانِ آزری

صَدَقَ وَعْدَهٗ قابلِ ہزار حمد و ستائش اور درخورِ صد ہزار تشکر و امتنان ہے وہ بارگاہِ صمدیت جس نے ان وعدوں کو پورا کیا جو اُس وقت کیے گئے تھے جبکہ ساری فضا نامساعد اور حالات ناسازگار تھے۔ "نَصَرَ عَبْدَهٗ" اُس نے اپنے بندے کی تائید و نصرت فرمائی۔ هَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ اور تمام طاغوتی قوتوں کو منہدم کر کے رکھ دیا۔

خطبۂ فتحِ مکہ

يَا مَعْشَرَ الْقُرَيْشِ! اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَذْهَبَ عَنْكُمْ نَخْوَةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَ تَعَظُّمَهَا بِالْاٰبَاءِ۔

اے قومِ قریش! جاہلیت کا غرورِ باطل اور نسب کا افتخارِ پندار آور، سب خدا نے مٹا دیئے۔

اَلنَّاسُ مِنْ اٰدَمَ وَ اٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ

تمام نوعِ انسان کی اصل ایک ہی ہے اور اس کا سلسلۂ تخلیق مٹی سے شروع ہوتا ہے۔

اَلَا کُلُّ مَاثُرَۃٍ اَوْ دَمٍ اَوْ مَالٍ یُدَّعٰی فَھُوَ تَحْتَ قَدَمَیَّ ھَاتَیْنِ۔

تمام مفاخر، تمام انتقامات، سب خون بہائے قدیم مٹ مٹا کر آج میرے قدموں کے نیچے ہیں۔

اب مساواتِ انسانی اور احترامِ آدمیت کا دور آگیا۔ اب عزت و تکریم کا معیار، حسب و نسب نہیں بلکہ جوہرِ ذاتی ہوگا۔

برخیز کہ آدم را ہنگامِ نمود آمد
ایں مشتِ غبارے را، انجم بسجود آمد

خطبہ کے بعد مجمع پر نگاہ ڈالی تو تمام متکبرین و مستبدینِ قریش سامنے کھڑے تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جنہوں نے اُس دن اِس دعوتِ حق و صداقت کی تضحیک و تحقیر کی تھی جب حضورؐ نے پہلے پہل صفا کی پہاڑی سے اللہ کا نام ان کے سامنے پیش کیا تھا۔ اور پھر جنہوں نے اُس دن سے لے کر آج تک اپنی زندگی کی تمام توانائیاں اس تحریکِ انقلاب کی مخالفت کے لیے وقف کر رکھی تھیں۔ وہ بھی تھے کہ جنہوں نے جتھہ بنا کر سازش کی تھی کہ شبِ ہجرت، سب مل کر اس داعیٔ الی اللہ کو (معاذ اللہ) ختم ہی کر دیا جائے۔ اور یہ سب اس جرم میں کہ وہ یہ کیوں کہتا ہے کہ "رَبُّنَا اللّٰہُ" "ہمارا رب صرف اللہ ہے"۔ اور یہ دوسری طرف وہ ہیں جنہوں نے بدر کے میدان میں اپنی تمام قوتوں کو اس لیے جمع کر دیا تھا کہ یہ مٹھی بھر جماعت جو دنیا میں خدا کا نام لیتی ہے، دنیا سے مٹا دی جائے۔ اور یہ وہ ہیں جنہوں نے اُحد کے میدان میں حضورؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کو شہید کیا اور خود حضورؐ کو بھی زخمی کر دیا۔ اور وہ دیکھو، انہی میں وہ خاتون، ہندہ ہے جس نے حضرت حمزہؓ کا کلیجہ نکال کر چبایا۔ یہ سب مفتوح و مغلوب سامنے کھڑے ہیں۔ اور دوسری طرف فاتح و منصور، نبیٔ اکرمؐ کہ جنہیں دنیا کا کوئی قانون اور عدل کا کوئی گوشہ ان مجرمین کے قتل سے نہیں روک سکتا۔ حضورؐ نے ان کی طرف دیکھا اور ان سے پوچھا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟ انہوں نے کہا کہ یہ تو معلوم نہیں لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ تو شریف بھائی ہے اور شریف زادہ ہے۔ یہ انہوں نے ازراہِ تملق نہیں کہا تھا۔ تملق اور خوشامد تو عرب کے کیرکٹر سے بعید تھی۔ انہوں نے ایک حقیقت کا اعتراف کیا تھا۔ نبی کی سیرت ہی یہ ہے کہ وہ ہر مقام پر شرافت کا مجسمہ ثابت ہو۔ انہوں نے اس

عفوِ عام

حقیقت کا اعتراف آج اس شکست خوردگی کے عالم میں ہی نہیں کیا تھا بلکہ نجاشی اور ہرقل کے دربار میں، جب یہ ایک فریقِ غالب کی حیثیت سے گئے تھے تو اُس وقت بھی یہی کہا تھا۔

حضورؐ نے نگاہ اٹھائی اور ان سے کہا کہ

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۔ اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَآءُ

آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں۔ جاؤ تم سب آزاد ہو۔

یہ ہے وہ عفو جس کی قرآن میں تعریف کی گئی ہے نہ کہ "اہمسا" کا وہ عفو کہ جس میں "عصمت بی بی از بیچارگی" کا مظاہرہ ہو۔ عفو اسی کا قابلِ ستائش ہے جس میں انتقام کی پوری پوری قوت موجود ہو۔ قریش نے مہاجرین کے مکانات پر قبضہ کر رکھا تھا۔ آپؐ نے مہاجرین سے کہہ دیا کہ اپنے حقوق سے دست بردار ہو جائیں۔ اِس سے بھی ایک قدم آگے بڑھیئے اور یہ دیکھیئے وہ سامنے کون ہے؟ یہ عثمان ابنِ طلحہ شیبی ہے جس کے پاس کعبہ کی کلید رہتی تھی۔ ہجرت کے وقت حضورؐ اس کے پاس آئے اور کہا کہ ذرا کعبہ کا دروازہ کھول دو تو میں اس کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو تسکین دے لوں۔ اس نے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ آپؐ خاموشی سے واپس آ گئے لیکن اتنا کہا کہ خیر! آج تم میری خاطر دروازہ کھولنے کے لیے تیار نہیں ہو، تم مختار ہو لیکن وہ وقت بھی آنے والا ہے کہ یہی کنجی میں جس کے ہاتھ میں دے دوں گا، قیامت تک اس سے کوئی چھین نہیں سکے گا۔ آج کعبہ کی وہی کنجی آپؐ کے ہاتھ میں تھی اور وہی عثمان سامنے کھڑا تھا۔ آپؐ نے پوچھا تمہیں وہ واقعہ یاد ہے۔ اُسے یاد تھا۔

سب کی نگاہیں منتظر تھیں کہ دیکھیں یہ کلید متاعِ دارین کسے عطا کی جاتی ہے! آپؐ آگے بڑھے اور معلوم ہے کہ یہ کنجی کس کے ہاتھ میں دے دی؟ اُسی عثمان کے ہاتھ میں! اللہ اکبر! اس ترحمِ خسروانہ اور نوازشِ شاہنشاہانہ کی نظیر اور کہاں مل سکتی ہے؟ یہ کنجی آج تک اسی عثمان کی اولاد میں منتقل ہوتی چلی آرہی ہے ــــ اگرچہ خلافت کی جگہ ملوکیت آجانے سے، یہ کنجی بھی، مذہبی پیشوائیت کی ہوسِ زراندوزی کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہے۔

جنگِ حنین

شوال ۸ھ

مکہ عربوں کا قومی مرکز تھا۔ اس کے فتح ہو جانے سے مختلف قبائلِ عرب کے حوصلے پست ہو گئے اور انہوں نے جوق در جوق آکر اسلام قبول کرنا شروع کر دیا (یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا)۔ واضح رہے کہ مکہ فتح ہونے پر کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن ہوازن اور ثقیف کے دو جنگجو قبیلے ایسے تھے جن کی آتشِ حسد و عداوت اور بھی بھڑک اٹھی اور انہوں نے بڑے شد و مد سے مسلمانوں پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ نبی اکرمؐ کو معلوم ہوا تو آپؐ مقابلہ کے لیے آگے بڑھے۔ مکہ اور طائف کے درمیان حنین کی وادی میں، دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوا۔ بدر اور احزاب کے زمانہ میں مسلمان کمزور اور قلیل التعداد ہوتے تھے۔ اس لیے انہیں اپنی قوتِ بازو سے کہیں زیادہ بھروسا تائید و نصرتِ قوانینِ خداوندی پر ہوتا تھا۔ حنین کی جنگ میں قریب بارہ ہزار کی مسلح فوج، ہر قسم کے ساز و سامان سے آراستہ، اس دبدبہ اور طنطنہ سے صف آرا ہوئی کہ بعض صحابہؓ کی زبان پہ بے اختیار آ گیا کہ آج ہم پر کون غالب آ سکتا ہے؟ دنیا میں مادی قوتیں نہایت ضروری ہیں لیکن اگر مادی قوتیں، قوتِ قلب (جسے قوتِ ایمانی کہتے ہیں) کو کمزور کرنے کا باعث بن جائیں تو یہی مادی قوتیں اس قوم کی تباہی کا باعث بن جاتی ہیں۔ قوتِ ایمانی کی کمزوری کے معنی یہ ہیں کہ انسان ان اصول و اقدار کے مقابلہ میں جن کے تابع مادی قوت کو رکھا جاتا ہے، مادی قوت کو زیادہ اہمیت دے دے۔ یہ بات کسی وقت

شکست

یونہی سہواً بھی ہو جاتی ہے۔ یہی چیز اس وقت ہوئی تھی۔ قدرت کا کرشمہ دیکھئے کہ پہلے ہی حملہ میں ایسی شکست کھائی کہ بارہ ہزار کے لشکر کا کچھ پتا ہی نہ تھا کہ کہاں تتر بتر ہو گیا۔ چاروں طرف سے

تیروں کی بارش ہورہی تھی، دشمنوں کا ریلا بپھرے ہوئے سیلاب کی طرح موجیں مار رہا تھا۔ اپنی فوج شکست کھا کر بھاگ رہی تھی۔ اس خلفشار میں ایک پیکرِ استقامت تھا جو روشنی کے بلند مینار کی طرح اپنے مقام پر کھڑا تھا۔ نہ کوئی گھبراہٹ تھی نہ پریشانی۔ نہ مایوسی تھی اور نہ ہزیمت کے کوئی آثار۔ یہ پیکرِ ہمت و استقلال خود ذاتِ گرامی تھی جنابِ محمد رسول اللہ کی۔ اس تشتت و انتشار کے عالم میں آپؐ نے پوری جمعیتِ خاطر سے دائیں طرف مڑ کر آواز دی کہ یا معشرالانصار! نہ معلوم اس آواز میں کیا اثر تھا کہ بھاگنے والوں کے قدم وہیں رُک گئے اور پوری دل جمعی سے آواز دی کہ لبیک یا رسول اللہ لبیک! پھر حضورؐ نے بائیں جانب یہی صدا بلند کی اور اس کا یہی جواب گونج کر واپس آیا۔ پھر آپؐ نے دشمنوں کو مخاطب کر کے آواز دی کہ " اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِب " (بحوالہ بخاری) "میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ اس میں کچھ جھوٹ نہیں"۔ اس لیے ہو نہیں سکتا کہ باطل ہم پر غالب آجائے۔ چند ثانیوں میں

اور فتح

پوری فوج پھر اسی مرکزِ حق و صداقت کے گرد جمع تھی اور اس کے بعد ایک ہی حملہ میں میدان صاف تھا۔ سورۃ توبہ میں اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِیْ مَوَاطِنَ كَثِیْرَةٍ ۙ وَّ یَوْمَ حُنَیْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَیْـًٔا وَّ ضَاقَتْ عَلَیْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّیْتُمْ مُّدْبِرِیْنَ ۚ (۲۵/۹)

(مسلمانو!) یہ واقعہ ہے کہ اللہ بہت سے نازک موقعوں پر تمہاری مدد کر چکا ہے (جبکہ تمہیں اپنی قلت و کمزوری سے کامیابی کی امید نہ تھی) اور جنگِ حنین کے موقع پر بھی جبکہ تم اپنی کثرت پر اترا گئے تھے (اور سمجھتے تھے کہ محض اپنی کثرت سے میدان مار لو گے)۔ لیکن وہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم میدان سے پیٹھ دکھا کر بھاگنے لگے۔

اس کے بعد:

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِیْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَ عَذَّبَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِیْنَ ۝ (۲۶/۹)

پھر اللہ نے اپنے رسول اور مومنین کے دل میں سکون پیدا کر دیا اور ایسی فوجیں نازل کیں جو تمہیں نظر نہیں آتی تھیں اور (اس طرح) ان لوگوں کو سخت سزا دی جنہوں نے سرکشی کی راہ اختیار کی تھی اور یہی سزا ہے ان لوگوں کی جو انکار (کفر) کی راہ اختیار کرتے ہیں (یعنی ان کی بدعملی کا لازمی نتیجہ یہی ہے)۔

طائف کا محاصرہ

حنینؔ کی بقیہ شکست خوردہ فوجِ کفار، طائف میں جاکر جمع ہو گئی حضورؐ نے جاکر شہر کا محاصرہ کیا۔ بیس دن تک محاصرہ رہا اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ ان کا زور ٹوٹ چکا ہے تو آپؐ محاصرہ اٹھاکر واپس تشریف لے آئے۔

حنینؔ میں بہت سامالِ غنیمت ہاتھ آیا تھا۔ اس کی تقسیم میں حضورؐ نے یہ رعایت ملحوظ رکھی تھی کہ قریشِ مکہ میں سے جو لوگ فتحِ مکہ کے وقت مسلمان ہوئے تھے ان کی تالیفِ قلوب کے لیے انہیں زیادہ حصہ دیا جائے۔ (واضح رہے کہ تالیفِ قلب سے مراد "رشوت" یا لالچ نہیں ہوتا۔ اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے دین کی خاطر کسی قسم کا نقصان اٹھایا ہو اُن کے اِس نقصان کی تلافی کر کے ان کی دلجوئی کا سامان کر دیا جائے) اس سے

مالِ غنیمت کی تقسیم

انصار کے بعض افراد کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ یہ لوگ چونکہ رسول اللہؐ اور مہاجرین کے اہلِ قبیلہ اور اعزہ واقارب ہیں اس لیے انہیں زیادہ مال دیا گیا ہے۔ نبیٔ اکرمؐ کو بحیثیتِ امیرِ ملت تقسیمِ غنیمت کے کلی اختیارات حاصل تھے۔ آپؐ کے فیصلوں کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں ہو سکتی تھی۔ حضورؐ چاہتے تو ایک لفظ سے اس خیال کو ابھرنے سے روک دیتے لیکن یہ مستبدانہ آمریت تصور میں بھی نہیں لائی جا سکتی تھی۔ حضورؐ نے انہیں جمع کیا اور ایک ایسا خطبہ ارشاد فرمایا جو ایک طرف فنِ بلاغت میں اعجاز کا حکم رکھتا ہے اور دوسری طرف ان قلبی تعلقات کو نکھار کر سامنے لا رہا ہے جو حضورؐ کو انصار کے ساتھ تھے۔ حضورؐ نے انصار کو مخاطب کر کے فرمایا۔

> کیا یہ سچ نہیں کہ تم پہلے گمراہ تھے۔ خدا نے میرے ذریعے تمہیں ہدایت دی۔ تم منتشر اور پراگندہ تھے، خدا نے میرے ذریعے تم میں اتفاق و ائتلاف پیدا کیا۔ تم مفلس تھے، خدا نے تمہیں میرے ذریعے دولتمند کر دیا۔

آپؐ یہ فرماتے جاتے تھے اور انصار ایک ایک فقرہ پر کہتے جاتے تھے کہ خدا اور رسولؐ کا احسان سب سے بڑھ کر ہے۔

> آپؐ نے فرمایا کہ نہیں تم ٹھیک جواب نہیں دے رہے۔ تم یہ جواب دو کہ
> محمدؐ! جب اور لوگوں نے تجھے جھٹلایا، تو ہم نے تیری تصدیق کی۔ جب لوگوں نے تجھے چھوڑ دیا تو ہم نے تمہیں پناہ دی۔ تو مفلس آیا تھا ہم نے تیری ہر طرح کی مدد کی۔

یہ کہہ کر آپؐ نے فرمایا کہ تم یہ کہتے جاؤ، اور میں ایک ایک فقرے پر کہتا جاؤں گا کہ تم سچ کہتے ہو۔ اس کے بعد

فرمایا کہ:

اے انصار! یہ سب سچ ہے لیکن کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ یہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے جائیں اور تم محمدؐ کو اپنے گھر لے جاؤ!

اب کسے یارائے ضبط تھا۔ مجمع کی بے اختیار چیخیں نکل گئیں اور انہوں نے پکار کر کہا کہ یا رسول اللہؐ! انہیں سب کچھ دے دیجئے اور ہمارے لیے صرف "محمدؐ" کو رہنے دیجئے۔

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اُٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد

اکثر کا یہ حال تھا کہ روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں۔ اس کے بعد حضورؐ نے انہیں سمجھایا کہ اس رعایت سے کیا مقصود[1] تھا۔ اور یوں ان کے "دل" کے ساتھ "دماغ" کو بھی مطمئن کر دیا کہ حضورؐ کا فیصلہ کس طرح عدل وانصاف پر مبنی تھا۔ اسلام میں بات منوائی ہی دل اور دماغ کے پورے پورے اطمینان کے ساتھ جاتی ہے۔ اس میں، نہ آمرانہ استبداد ہوتا ہے اور نہ ہی خالص جذباتی اپیل۔ اس میں "عشق اور زیرکی" دونوں کا حسین امتزاج ہوتا ہے۔

حنینؔ کے چھ ہزار قیدی ابھی تک محصور تھے۔ آپؐ نے انتظار کیا کہ ان کے اعزہ واقارب آئیں تو فدیہ کی بات کی جائے لیکن ان میں سے کوئی نہ آیا۔ تو آپؐ نے ایک سفارت کی درخواست پر سب کو احساناً چھوڑ دیا کہ یہی قرآن کا حکم ہے۔

فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (۴۷)

[1] بحوالہ بخاری و فتح الباری۔

غزوۂ تبوک

(رجب ۹ھ مطابق نومبر ۶۳۵ء)

اب تک مسلمانوں کی جنگ و پیکار کا سلسلہ اندرونِ عرب تک محدود تھا۔ ان کی بڑھتی ہوئی قوتوں کو دیکھ کر رومی حکومت کو خیال پیدا ہوُا کہ اس قوّت کو یہیں دبا دینا ضروری ہے۔ غسّانیوں کا عیسائی خاندان رومی حکومت کے زیرِ اثر، شام پر حکمران تھا۔ اس مقصد کے لیے رومی سلطنت نے اس خاندان کو متعیّن کیا۔ اس مہم کے لیے بڑی بڑی تیاریاں شروع کیں جن کی تفاصیل شامی سوداگروں کی زبانی اہلِ مدینہ تک پہنچ رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ خبریں سارے عرب میں پھیل گئیں۔ اب مدافعت ضروری تھی۔ اس لیے حضورؐ نے فوج کو تیاری کا حکم دیا۔ موسم سخت گرم تھا اور سوءِ اتفاق کہ ملک میں قحط پڑ رہا تھا۔ اس لیے حالات سازگار نہ تھے لیکن مہم کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے ملتوی بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لہٰذا یہ معرکہ، اخلاص و منافقت کی امتحان گاہ تھا۔ چنانچہ ایک طرف صحابہؓ کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ کسی کے پاس تھا، لے کر حاضر ہو گیا لیکن اس کے باوجود عُسرت کا یہ عالم تھا کہ مجاہدین کے لیے سواریاں تک پوری نہیں تھیں اور اس کا کوئی انتظام بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ انہی کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے۔

رومیوں کی مخالفت

عُسرت

وَّ لَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَاۤ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَاۤ اَجِدُ مَاۤ اَحْمِلُكُمْ
عَلَيْهِ۪ تَوَلَّوْا وَّ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا
يُنْفِقُوْنَ ۝ (۹/۹۲)

اور نہ وہ لوگ موردِ الزام ہیں جن کا حال یہ تھا کہ خود سواری کی مقدرت نہیں رکھتے تھے اس لیے تیرے

پاس آئے کہ ان کے لیے سواری کا انتظام کر دیا جائے۔ اور جب تو نے بھی معذوری کا اظہار کر دیا تو وہ (بے بس ہو کر) لوٹ گئے۔ درایں حال کہ ان کی آنکھیں اس غم میں اشکبار ہو رہی تھیں کہ افسوس آج ہمارے پاس اس راہ میں خرچ کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں۔

دوسری طرف منافقین کی یہ حالت تھی کہ عجیب عجیب بہانہ سازیوں سے جنگ سے بچنے کی کوششیں کرتے تھے۔

منافقین سورۃ توبہ کا ساتواں رکوع دیکھیے کس شرح و بسط سے قرآنِ کریم نے ان کی حیلہ جوئیوں کی نقاب کشائی کی ہے۔ یہ لوگ جھوٹی سچی مجبوریوں کا عذر پیش کر کے جنگ سے رخصت کی اجازت مانگتے۔

سورۃ توبہ کی آیات ($\frac{9}{۴۲ - ۵۹}$ ؛ $\frac{9}{۸۱ - ۸۳}$) میں دیکھئے۔ ان کا ذکر کس تفصیل سے آیا ہے۔

مدینہ کے ان منافقین کے علاوہ کمزور ایمان والوں کا ایک اور گروہ بھی تھا جو صحرا نشین اعراب پر مشتمل تھا۔

اعراب یہ ابھی نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور ہنوز ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں جاگزین نہیں ہوا تھا۔ ان کے متعلق فرمایا۔

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَ قَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ ($\frac{9}{۹۰}$)

اور (اے پیغمبرِ اسلام!) اعرابیوں میں سے (یعنی عرب کے صحرائی بدوؤں میں سے) بعض جھوٹے عذر کر کے تمہارے پاس آ رہے ہیں کہ انہیں بھی (رہ جانے کی) اجازت دی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی جنگ سے وہی لوگ جی چُراتے ہیں جو نظامِ خداوندی سے وابستگی کے دعوے میں جھوٹے ہوتے ہیں۔

سو ان میں سے جنہوں نے انکار (کفر) کی راہ اختیار کی وہ الم انگیز سزا کے مستحق ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ بعض صورتیں معذوری کی بھی ہوتی ہیں۔ ایسی صورتوں میں کسی پر کچھ الزام نہیں ہوتا۔

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَ لَا عَلَى الْمَرْضٰى وَ لَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ($\frac{9}{۹۱}$)

ناتوانوں پر، بیماروں پر اور ایسے لوگوں پر جنہیں خرچ کرنے کے لیے کچھ میسر نہیں، کچھ الزام نہیں (اگر وہ دفاع میں شریک نہ ہوں) بشرطیکہ وہ نظامِ خداوندی کی بہی خواہی میں کوشاں رہیں۔ کیونکہ ایسے لوگ حسنِ عمل کے دائرہ سے الگ نہیں ہوئے اور ایسے لوگوں پر الزام کی کوئی وجہ نہیں۔ اللہ حفاظت و رحمت

عطا کرنے والا ہے۔

لیکن یہ لوگ جو ہر طرح سے شرکتِ جنگ کی استطاعت رکھنے کے باوجود بہانہ تراشیاں کر رہے ہیں، انہیں کس طرح سے اجازت دی جا سکتی ہے؟

إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ وَهُمْ أَغْنِيَاءُ ۚ رَضُوا بِأَنْ يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطَبَعَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (۹/۹۳)

الزام تو در اصل ان پر ہے جو تجھ سے (بیٹھے رہنے کی) اجازت مانگتے ہیں، حالانکہ مال دار ہیں۔ انہوں نے اپنے لیے یہی پسند کیا کہ (جب سب لوگ راہِ حق میں کوچ کر رہے ہوں، تو یہ) گھروں میں رہ جانے والی عورتوں کے ساتھ رہیں! (حقیقت یہ ہے کہ) مفاد پرستی نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے جس سے یہ سمجھنے سوچنے کے قابل ہی نہیں رہے۔

ان کے برعکس مومنِ حقہ وہ لوگ ہیں۔

وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝ (۹/۱۰۰)

اور مہاجرین و انصار میں سے جو لوگ سبقت کرنے والے، سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں، اور وہ لوگ جنہوں نے راست بازی کے ساتھ ان کی پیروی کی تو انہوں نے اپنی زندگی کو قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ کیا اور قوانینِ خداوندی نے اپنی برکات و سعادات سے ان کا ساتھ دیا اور اللہ نے ان کے لیے (نعیمِ ابدی کے) باغ تیار کر دیئے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں (اور اس لیے وہ خشک ہونے والی نہیں ہیں) وہ ہمیشہ اس (نعمت و سرور کی زندگی) میں رہیں گے اور یہ بہت بڑی فیروزمندی ہے!

بغیر جنگ کے کامیابی

چونکہ مقابلہ بازنطینی شاہنشاہیت سے تھا، اس لیے نبیِ اکرمؐ تیس ہزار کا لشکرِ جرار لے کر شام کی طرف روانہ ہوئے۔ تبوک کے مقام پر جا کر معلوم ہوا کہ اگرچہ رومیوں میں کھچڑی ضرور پک رہی تھی لیکن ان کی طرف سے فوری حملہ کا کوئی امکان نہیں۔ اس لیے حضورؐ نے وہاں بیس دن تک قیام کیا۔ ادھر اُدھر کے عیسائی سرداروں نے جزیہ دے کر اطاعت قبول کی اور آپؐ واپس

تشریف لے آئے۔ اگرچہ جنگ نہیں ہوئی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس سفر میں مجاہدین کی بھوک پیاس و واماندگی سب کو اعمالِ صالحہ قرار دیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ سفرِ جہاد سے بڑھ کر منزلِ مقصود تک لے جانے والا اور کون سا سفر ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس راہ میں ہر تکلیف ابدی کامرانیوں کی کفیل ہے (۹/۱۲۰)۔

حضرت کعبؓ بن مالکؓ کا واقعہ

حضورؐ واپس مدینہ تشریف لائے تو متخلفین (پیچھے رہ جانے والوں کا) معاملہ پیش ہوا۔ یہ قریباً اسّی آدمی تھے۔ انہوں نے اپنی اپنی معذرت پیش کی اور حضورؐ نے اُسے قبول کر لیا۔ لیکن تین صحابہؓ ایسے تھے جن کے لیے وحی کے حکم کا انتظار کرنا پڑا۔ ان میں سے ایک کعبؓ بن مالک تھے۔ (باقی دو بلالؓ بن امیہ اور مرارہ بن ربیع تھے) یہ واقعہ خلوص و صداقت اور ضبط و انضباط کا ایسا مرقّع ہے جس کا ہر گوشہ نگہِ بصیرت کے سامنے لانے کے قابل ہے۔ بہتر ہو کہ یہ ماجرا خود حضرت کعبؓ کی زبان سے ہی سنیئے۔ آپ کا بیان ہے کہ اس سفر میں میرا گھر پر رہ جانا محض ابتلاء تھا۔ نہ ہی ایسا کرنے کا میرا ارادہ تھا اور نہ ہی کوئی عذر تھا۔ بلکہ میں نے اس کے لیے خاص تیاری کر رکھی تھی جس روز لشکرِ اسلام روانہ ہوا، مجھے کچھ کام تھا۔ میں نے کہا خیر، کل چلا جاؤں گا۔ دو تین دن اسی طرح سستی میں گزر گئے۔ اب لشکر اتنی دور نکل چکا تھا کہ جا کر اس سے ملنا بہت مشکل تھا۔ مجھے نہایت صدمہ تھا کہ یہ کیا ہوا؟ میں اسی تذبذب میں رہا کہ اتنے میں رسولؐ اللہ واپس بھی تشریف لے آئے۔ لوگوں نے مجھ سے کہا کہ جس طرح اور لوگوں نے حیلے بہانے بنا کر معذرت قبول کرالی ہے تم بھی ایسا ہی کرو! لیکن میری رُوح اس تصوّر سے کانپتی تھی کہ جھوٹ اور وہ بھی رسولؐ اللہ کے سامنے! میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا ماجرا ٹھیک ٹھیک بیان کر دیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "تم اپنے گھر میں ٹھہرو اور حکمِ خداوندی کا انتظار کرو!"

بلا کسی عذر کے ملت کے اجتماعی امور میں عدمِ شرکت اتنا بڑا جرم تھا کہ اس کا فیصلہ رسولؐ اللہ خود نہیں کرنا چاہتے تھے۔ حضورؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ کوئی شخص ان تینوں سے بات چیت نہ کرے اور نہ ان کے پاس بیٹھے۔ حضرت کعبؓ فرماتے ہیں کہ اب زندگی اور اس کی تمام جاذبیتیں ہمارے لیے وبالِ جان بن گئیں۔ زمین اپنی تمام وسعتوں کے باوجود ہم پر تنگ ہوگئی۔ میرے دو ساتھی تو گھروں میں بیٹھ کر روتے رہے۔ لیکن میں باہر نکلتا تھا اور نماز میں بھی شریک ہوتا تھا لیکن کوئی مجھ سے بات نہ کرتا تھا۔ میں حضورؐ کے قریب ہی نماز پڑھتا اور کنکھیوں سے حضورؐ کی طرف دیکھتا رہتا۔ لیکن نگہِ کرم کا میری طرف التفات نہ ہوتا۔ ایک شام میں اپنے چچا زاد بھائی کے باغ میں

گیا۔ انہیں مجھ سے بڑی محبت تھی۔ میں نے جاکر سلام کیا تو انہوں نے میرے سلام کا جواب تک نہ دیا۔ میں نے ان سے کہا کہ بھائی! میں تم سے قسمیہ پوچھتا ہوں کہ بتاؤ کیا میں خدا اور رسولؐ کو دوست نہیں رکھتا؟ انہوں نے اس پر بھی جواب نہ دیا۔ میں نے پھر پوچھا تو پھر بھی ساکت رہے۔ میں نے تیسری مرتبہ قسم دے کر پوچھا، تو انہوں نے کہا کہ اللہ اور اس کا رسولؐ ہی جانتا ہے۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ میں واپس چلا آیا۔ ایک دن میں بازار میں چکر لگا رہا تھا کہ ایک شامی سوداگر میرے پاس آیا اور ملک غسان کا خط مجھے دیا جس میں اس نے لکھا تھا کہ مجھے خبر ملی ہے کہ تمہارے آقا تم سے خفا ہو گئے ہیں اور باقی لوگ

ملت سے وفاشعاری

بھی تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کر رہے ہیں حالانکہ تمہارا مرتبہ بہت بڑا ہے۔ تم اس قابل نہیں ہو کہ اس طرح چھوڑ دیئے جاؤ تم یہ خط پڑھتے ہی ہمارے پاس چلے آؤ۔ یہاں آکر تم دیکھ لوگے کہ تمہاری قدر و منزلت کس طرح پہچانی جاتی ہے۔

غور فرمائیے۔ یہ کتنی بڑی آزمائش تھی۔ لیکن جس دل میں ایمان کی حرارت موجود ہو، اس کے لیے یہ آزمائش کیا حیثیت رکھتی ہے؟ حضرت کعبؓ فرماتے ہیں کہ اس خط سے میرے غم و غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں نے وہ خط اسی قاصد کے سامنے جلا دیا اور کہا کہ اپنے آقا سے جاکر کہنا کہ تمہاری عنایات و التفات سے مجھے میرے آقا کی بے التفاتی لاکھ درجہ خوشتر ہے! میں گھر پہنچا تو دیکھا کہ حضورؐ کی طرف سے ایک اور حکم موجود ہے کہ تم اپنی بیوی سے علیحدہ رہو۔ میں نے پوچھا کہ کیا طلاق کا حکم ہے؟ کہا نہیں صرف علیحدہ رہنے کا۔ یہ سن کر میں نے بیوی کو میکے بھیج دیا۔ پچاس دن اسی کرب و الم میں گزر گئے۔ پچاسویں دن میں اسی غم میں اپنی چھت پر بیٹھا تھا کہ میں نے آواز سنی کہ کوئی شخص جبلِ سلع سے بلند آواز میں پکار رہا تھا کہ لے کعب مبارک ہو! میں سجدہ میں گر گیا کہ اللہ نے میری توبہ قبول کر لی! اس کے بعد لوگ بشارت لے کر یکے بعد دیگرے میری طرف آنے لگے۔ لوگ گھوڑوں پر چڑھ کر اس تیزی سے آ رہے تھے کہ ہر طرف سے بشارت کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ جس نے سب سے پہلے آکر مجھے یہ مژدۂ جاں فزا سنایا، میرے پاس دو کپڑے تھے، میں نے دونوں اتار کر اسے دے دیئے۔ اس کے بعد میں جلدی جلدی خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہوا تو راستہ بھر لوگ، جماعت در جماعت، مجھے مبارک باد دے رہے تھے۔ مسجد میں پہنچا تو احباب دوڑ دوڑ کر آئے اور مجھ سے مصافحہ کرنے لگے۔ میں نے رسول اللہؐ کو سلام کیا تو حضورؐ نے فرمایا کہ اے کعبؓ! مبارک ہو آج کا دن تیرے لیے سب سے مبارک ہے۔ میں نے کہا یا رسول اللہؐ! یہ آپ کی طرف سے ہے یا خدا کی طرف سے۔ فرمایا خدا کی جانب سے! میں نے فرطِ مسرت میں عرض کیا کہ میں

چاہتا ہوں کہ میں خدا کے اس احسان کے شکریہ میں اپنا سب کچھ صدقہ کر دوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ کچھ اپنے لیے بھی رکھ لو حضرت کعبؓ فرماتے ہیں کہ میرے اللہ نے میری صداقت کو اپنے بذل و احسان سے اس طرح نوازا!

یہ واقعہ اس قدر اہم ہے کہ تاریخ کے علاوہ خود قرآنِ کریم نے اسے اپنے دامنِ حفاظتِ ابدی میں جگہ دی ہے۔ سورۂ توبہ میں ان حضرات کے متعلق ہے۔

وَ اٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَ اِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ (۹/۱۰۶)

اور (پچھلے تائب گروہ کے علاوہ) کچھ لوگ اور بھی ہیں جن کا معاملہ، اس انتظار میں کہ اللہ کا حکم کیا ہوتا ہے، ملتوی ہو گیا ہے۔ وہ انہیں سزا دے یا معاف کر دے اور اللہ (سب کچھ) جاننے والا (اپنے تمام کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے۔

اس کے بعد فرمایا:

وَّ عَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَ ضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَ ظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ (۹/۱۱۸)

اور اسی طرح، اس نے ان تین شخصوں کو بھی اپنی رحمت سے نوازا جو (جنگ میں) پیچھے رہ گئے تھے (اور جن کا معاملہ التوا میں رکھا گیا تھا ۹/۱۰۶)۔ ان کا معاملہ معلق رہنے کی وجہ سے ان کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ 'زمین' اپنی تمام وسعتوں کے باوجود، ان پر تنگ ہو گئی اور وہ خود اپنے آپ سے تنگ آ گئے۔ اور انہیں معلوم ہو گیا کہ نظامِ خداوندی کے حکم کی خلاف ورزی کے بعد، انہیں کہیں پناہ نہیں مل سکتی، بجز اسی نظام کے دامنِ عافیت کے۔ اس کے بعد، اللہ ان کی طرف اپنی رحمت سے ملتفت ہوا اور ان کی معذرت قبول کر لی تا کہ وہ، اپنے معاشرہ کی طرف واپس آ جائیں (جہاں سے انہیں الگ کر دیا گیا تھا)۔ اللہ کے قانون میں دل سے معذرت کرنے والوں کے لیے سامانِ مرحمت کی گنجائش ہے۔

هم نے اس واقعہ کو شرح و بسط کے ساتھ اس لیے بھی درج کیا ہے کہ اس میں آج ہمارے لیے عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں پوشیدہ ہیں۔ وہاں تو یونہی تکاسل اور سہل انگاری سے

عبرت و موعظت

ایسا ہوگیا تھا۔ آج ہماری حالت یہ ہے کہ کھلے بندوں ملّت کے اجتماعی مفاد کے خلاف غدّاری کی جاتی ہے اور اس کے بعد یہ غدّارانِ ملّت اسی طمطراق کے ساتھ اکڑتے پھرتے رہتے ہیں۔ نہ ان کے دل میں خدا کا خوف ہوتا ہے اور نہ ہی قوم میں یہ احساس کہ ایسے غدّاروں کا کم ازکم معاشرتی بائیکاٹ ہی کیا جائے۔ اور پھر یہ بھی دیکھئے کہ معاندین کس طرح اس تاک میں بیٹھے رہتے ہیں کہ ایسے ملّت فروشوں کو فوراً خرید لیا جائے۔ اس قسم کے سوداگروں کی پیش کش کا جواب وہ تنور ہے جس میں حضرت کعبؓ نے والئی غسّان کا خط چاک کر کے ڈالا تھا لیکن "جعفرانِ ایں زماں" تو خود ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں، یاد رکھیے۔

جعفر اندر ہر بدن ملّت کُش است
ایں مسلمانے کہن ملّت کُش است

ان کا ایک ہی علاج ہے کہ قوم ان کے ساتھ ایسا سلوک کرے کہ قرآن کے الفاظ میں :

ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنْفُسُهُمْ ۔ (۹/۱۱۸)

ان پر زمین، اپنی کشادگیوں کے باوجود تنگ ہو جائے۔ حتیٰ کہ وہ خود اپنی جان سے تنگ آجائیں اور انہیں یقین ہو جائے کہ

أَنْ لَا مَلْجَأَ مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ ؕ (۹/۱۱۸)

خدا سے بھاگے ہوئے کو سوائے خدا کے در کے اور کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔

اور وہ اس حقیقت کو محسوس طور پر اپنے سامنے رکھ لیں کہ

ایں جہاں بے ابتدا بے انتہا است
بندۂ غدّار را مولا کجا است؟

جب تک وہ قانونِ خداوندی کے سامنے آکر جھک نہ جائیں، انہیں دنیا میں کہیں سر چھپانے کو جگہ نہ ملے۔

حج

تبوک کی مہم عہدِ نبویؐ کے سلسلۂ غزوات و سرایا کی آخری کڑی تھی۔ تطہیرِ کعبہ سے حکومتِ خداوندی کی مرکزیت قائم ہو چکی تھی۔ تبوک سے واپسی پر حضورؐ نے مسلمانوں کا ایک قافلہ مدینہ سے حج کے لیے روانہ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ سالارِ کارواں (امیر الحجاج) اور حضرت علیؓ نقیبِ اسلام تھے۔ اب حج کو قرآنی خطوط پر متشکل کیا گیا (اس کی تفصیل حج کے عنوان میں آئے گی)۔ اس کے بعد حضرت علیؓ نے سورۂ توبہ کی ابتدائی

چالیس آیات پڑھ کر سنائیں اور اس طرح اعلان کر دیا کہ توحیدِ الٰہی کے اس مرکز کی تولیت سے مشرکین کا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ مشرکین سے جو معاہدات ہو چکے ہیں، ان کی مدت تک ان کی پابندی کی جائے گی۔ جن سے کوئی معاہدہ نہیں ہوا انہیں چار ماہ کی مہلت ہے۔ اس کے بعد اللہ اور رسولؐ (یعنی حکومتِ خداوندی) ان سے بری الذمہ ہے۔ اس کے بعد باقی ماندہ کفار بھی از خود مسلمان ہو گئے۔

قطراتِ خون کا شمار

مؤرخین کے فراہم کردہ اعداد و شمار کی رُو سے عہدِ نبوی میں (۸۲) مرتبہ جنگی مقاصد کے لیے نقل و حرکت کرنے کی ضرورت پڑی۔ ان میں سے (۱۹) میں خود نبیٔ اکرمؐ نے شرکت فرمائی۔ انہیں اصطلاح میں غزوات کہتے ہیں اور بقایا میں حضورؐ تشریف نہیں لے گئے۔ انہیں سرایا کہتے ہیں۔ ان تمام غزوات و سرایا میں کل (۲۵۹) مسلمان شہید ہوئے اور (۷۵۹) مخالفین، کل (۱۰۱۸)۔ اس تعداد کو (۸۲) پر پھیلائیے تو اوسط قریباً (۱۲½) نکلتی ہے۔ یہ ہیں قطراتِ خون نچوڑ، "وحشت و بربریت" کی ان خونچکاں داستانوں کا جو مخالفینِ اسلام، اسلامی شمشیر کی طرف منسوب کر کے دنیا کو اس دین سے خوفزدہ کرتے رہتے ہیں۔ نو سال کے عرصہ میں تمام لڑائیوں میں مقتولین کی تعداد (۱۰۱۸) کو دیکھئے اور دوسری طرف اس دورِ تمدن و تہذیب اور عصرِ علم و عقل کے مناقشات و تنازعات کے نتائج کو سامنے رکھیے۔ صاف نظر آ جائے گا کہ وحشت و بربریت کا دور کون سا ہے؟ چھوڑیئے ان اعداد و شمار کو جو ۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگِ عظیم نے دنیا کے سامنے پیش کیے یا پھر دوسری عالمگیر جنگ ۱۹۳۹-۴۵ء میں دیدۂ عبرت کے سامنے آئے۔ آج ہزاروں تک کی نوبت تو معمولی فسادات میں پہنچ جاتی ہے۔

پھر اس (۱۰۱۸) کی تعداد میں آپ کو غیر مصافی آبادی کا ایک فرد بھی دکھائی نہ دے گا۔ غیر مصافی آبادی تو ایک طرف غزوۂ بدر میں حضورؐ نے یہاں تک فرما دیا تھا کہ جو لوگ قریش کی طرف سے مجبوراً میدان میں لائے گئے ہیں؛ انہیں بھی قتل نہ کیا جائے۔ نیز ان میں کسی معصوم بچے یا بے گناہ عورت کا سر بھی آپ کو دکھائی نہ دے گا کہ حضورؐ نے تاکیداً حکم دے رکھا تھا۔

لَا تَقْتُلُوْا شَيْخًا فَانِيًا وَلَا طِفْلًا وَ لَا صَغِيرًا وَلَا امْرَأَةً۔ (ابوداؤد)

یعنی کسی کہن سال بوڑھے یا بچے یا کمسن عورت کو قتل مت کرو۔

پھر دیکھئے کہ ان (۱۰۱۸) انسانوں کی جانوں سے انسانیت کو کیا فائدہ پہنچا۔ سب سے پہلے عرب کی حالت کو لیجئے۔ عربوں

کے عہدِ جہالت کے کوائف وحالات گزشتہ صفحات میں ہمارے سامنے آچکے ہیں۔ ان کی ایک ایک لڑائی کا

اور خوں بہا!

سلسلہ سیکڑوں برس تک مسلسل جاری رہا کرتا تھا۔ ان ایک ہزار انسانوں کے خون سے لڑائیوں کے وہ تمام سلسلے منقطع ہوگئے۔ پھر ان کے انتقامات کا سلسلہ پشت در پشت چلا کرتا تھا۔ عہدِ جاہلیت کے تمام انتقامات موقوف ہوگئے۔ شراب، سُود خواری، قمار بازی، قبائلی عصبیت، وحشت و بربریت، درندگی وخونخواری اور اس قسم کی دیگر انسانیت سوز رسُوم ان کی گھُٹی میں پڑی ہوئی تھیں۔ ان سب کی اصلاح ہوگئی۔ قتل وغارت گری، قزاقی، رہزنی کا یہ عالم تھا کہ حرم کی چار دیواری کے باہر کسی کی جان اور مال کہیں بھی محفوظ نہ تھا۔ اب یہ حالت تھی کہ بخاری کی ایک روایت کے مطابق، جب عدیؓ بن حاتم اسلام لائے تو حضورؐ نے ان سے ارشاد فرمایا کہ خدا اس کام کو اس طرح سے پورا کرے گا کہ ایک عورت قادسیہ سے چلے گی اور کعبہ کی زیارت کرے گی اور اسے خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا۔ عدیؓ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ سارا عرب اس قدر پُرامن ہوچکا تھا کہ ایک تنہا عورت کو قادسیہ سے حرم تک کے سفر میں کسی قسم کا کوئی اندیشہ ہی نہ ہوتا تھا۔ ان سلبی خصوصیات سے آگے بڑھیے اور ایجابی منافع کو دیکھیے تو عربوں کی بادیہ نشین، کھجوروں کی گٹھلیوں پر گزارہ کرنے والی قوم کو ان کی اس پست سطح سے اٹھا کر اتنا بلند کر دیا کہ وہ چند ہی سال میں قیصر وکسریٰ کے تخت وتاج کی وارث بن گئی۔ نہ صرف قیصر وکسریٰ کے تخت وتاج کی وارث، بلکہ شرفِ انسانیت کے ان مدارج پر فائز، جو انسانی زندگی کا معراج کمال ہیں۔ پوچھیے تاریخ کے کسی ماہر سے، کہ ایک ہزار انسانوں کے خون سے (اور وہ بھی میدانِ جنگ میں تلوار لے کر آنے والوں کے خون سے) اس قدر تحیّر انگیز انقلاب کسی اور جگہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ اور عرب سے باہر نکل کر دیکھیے تو صاف نظر آجائے گا کہ اللہ والوں کی مٹھی بھر جماعت جس کے متعلق بدرؔ کے میدان میں حضورؐ نے فرمایا تھا کہ اگر یہ مٹ گئی تو دنیا میں خدا کا نام لینے والا کوئی باقی نہ رہے گا، اگر خدا کا نام بلند کرنے کے لیے آگے نہ بڑھتی اور باطل کی قوتوں

عالمگیر انقلاب

سے مرعوب ہوکر اپنے مقاصد کو ترک کر کے الگ ہو بیٹھتی تو آج دنیا کی کیا کیفیت ہوتی؟ دنیا کے تمدنی، معاشرتی، معاشی، عمرانی، ثقافتی، علمی، ادبی، غرضیکہ ہر قابلِ تحسین گوشے میں جو انقلاب اسلام کے ذریعے رونما ہوا ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اگر اسلام دنیا میں ایک زندہ تحریک کی حیثیت سے باقی نہ رہتا تو دنیا ازمنۂ مظلمہ کی ان ہی تاریکیوں میں ہوتی جن میں یورپ اسلامی تمدن سے رُوشناس ہونے سے پہلے تھا۔ اور اگر یہ صحیح ہے کہ

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

تو بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ انسانیت کی شب تیرہ و تار میں اس قدر نورانی سحر پیدا کرنے کے لیے ایک ہزار انسانوں کا خون کچھ بڑی قیمت نہیں ہے۔ اور یہ انقلاب نوعِ انسانی پر ایسا احسانِ عظیم ہے جس سے انسانیت کی گردنِ تشکر کبھی اوپر نہیں اُٹھ سکتی۔

یہ محیّر العقول انقلاب مادّی اسباب و ذرائع سے کہیں زیادہ ایمانی قوتوں کی رُو سے عمل میں آیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآنی انقلاب کے لیے مادّی قوتوں کی بھی از بس ضرورت ہے، اس لیے کہ ایمانی قوت، مادّی قوتوں کی رُو سے ہی قوتِ نافذہ بن سکتی ہے۔ لیکن اس نظام میں مادّی اقتدار ہمیشہ ایمانی اقتدار کے تابع رہتا ہے۔ (HITTI) اس باب میں لکھتا ہے۔

> مسلمانوں کی فوج ان کی تمام اُمت تھی، یعنی پوری کی پوری فعّال جماعت۔ ان کی قوت کا راز ان کے اسلحہ یا ان کی تنظیم کے تفوّق میں نہ تھا، بلکہ ان کے بلند ترین کیریکٹر میں تھا جس کی اساس اُن کے مذہب پر تھی۔ (تاریخِ عرب صفحہ ۱۷۳)

اس اُمت کی تمام سعی و کاوش کا مقصد یہ تھا کہ

> ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اسے حق پر جُھکا دیا جائے۔

(جامع ترمذی، تفسیر مائدہ)

حق قرآن ہے (یعنی ضابطۂ قوانینِ الٰہیہ) اور ظالم ہر وہ قوت جو خدا کے سوا کسی اور کے احکامات کی اطاعت کرے اور دوسروں سے ایسی اطاعت کرائے۔ یہ ہے مقصد قِتَال فِی سَبِیلِ اللّٰہ کا۔

تیغ بہرِ عزتِ دین است و بس!
مقصدِ اُو حفظِ آئین است و بس!

سلسلۂ دعوت و ارشاد اور تعلیم و تبلیغ

گزشتہ باب میں جن غزوات کا ذکر آیا ہے، اگر انہیں باقی متن سے الگ کر کے پڑھا جائے تو ایسا معلوم ہوگا گویا حضورؐ کی مدنی زندگی ساری کی ساری لڑائیوں ہی میں گزری۔ اس میں شبہ نہیں کہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے اس مرحلہ میں حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کا بہت سا وقت صرف ہوگیا (اور تاسیس و استحکامِ حکومتِ الٰہیہ کے لیے یہ ناگزیر بھی تھا) لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ دیگر امورِ متعلقہ مناصبِ رسالت وامارت تشنۂ توجہ رہ جاتے تھے۔ ہر کام اپنی اپنی جگہ ٹھکانے سے ہو رہا تھا۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ شروع شروع میں جب دیگر قبائلِ عرب کی طرف دعاۃ و معلّمین کو بھیجا جاتا تو وہ غدّاری کرتے اور اکثر اوقات ان حضرات کو ان کی دست درازیوں کا شکار ہونا پڑتا۔ فتح مکّہ کے بعد اس قسم کے خدشات بہت کم ہو گئے۔ اس لیے اب سلسلۂ دعاۃ و معلّمین باقاعدہ جاری کیا گیا۔ بایں ہمہ جب دعاۃ

دعاۃ و مبلّغین

کو دوسرے قبائل کی طرف بھیجا جاتا تو حفاظتِ خود اختیاری کی غرض سے کوئی حفاظتی دستہ بھی ساتھ کر دیا جاتا۔ جماعت میں سے جو شخص سب سے زیادہ قرآن جانتا، اسے ان کا امیر مقرر کر دیا جاتا۔ یہ جماعتیں لوگوں کے سامنے اسلام پیش کرتیں اور اس طرح اس نیّرِ درخشاں کی کرنیں دُور دراز تک پھیلتی چلی جاتیں۔ ان کے علاوہ جو عمّال، زکوٰۃ یا جزیہ وصول کرنے کے لیے جاتے، وہ بھی اسلام کے مبلّغ ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں تبلیغ و دعوت کے لیے کوئی "الگ فرقہ" مقرر نہیں تھا۔ ہر مسلمان اپنی اپنی استعداد

کے مطابق اسلام کا عالم، واعظ، مبلّغ اور مدرّس ہوتا تھا۔ ان دعاۃ کو بابِ نبوّت سے تاکید ہوتی تھی کہ وہ سہولت سے کام کریں۔ سختی نہ کریں۔ لوگوں کو خوشخبری سنائیں، نفرت نہ دلائیں۔ پہلے توحید و رسالت کی دعوت دیں اور اس کے بعد بتدریج احکامِ اسلامی ان تک پہنچائیں[1]۔ چنانچہ یمن، نجران، بحرین اور شام کے بعض اضلاع تک میں اسلام اسی طرح سے پہنچا۔

دوسری صورت یہ تھی کہ قبائلِ عرب کے وفود خود دربارِ رسالت میں تحقیقِ حال کے لیے پہنچتے اور اپنے ساتھ اسلام کا بیش بہا تحفہ اپنی قوم کی طرف لے جاتے۔ مزینہ، بنوتمیم، بنوسعد، بنوحرث، طے، ثقیف وغیرہ کے قبائل میں اسلام اسی طرح پھیلا تھا۔

وفود کی آمد

طائف کا وفد آیا تو حضورؐ نے انہیں مسجدِ نبوی میں اتارا۔ ان لوگوں نے اسلام پر آمادگی ظاہر کی لیکن ان شرائط کے ساتھ کہ (۱) ان کے لیے زنا جائز رکھا جائے۔ (۲) سود کی ممانعت نہ کی جائے اور (۳) شراب سے نہ روکا جائے۔ یہ شرطیں بھلا کب مانی جاسکتی تھیں؟ حضورؐ نے اس سے انکار کر دیا۔ پھر ان لوگوں نے نماز، زکوٰۃ اور جہاد سے مستثنیٰ رکھے جانے کی درخواست کی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ نماز سے تو مستثنیٰ نہیں رکھے جاسکتے (اس لیے کہ صلوٰت کے اجتماعات، اسلامی نظام کے قیام اور استحکام کا اہم ترین ذریعہ ہیں۔ انہی میں، اس نظام کی طرف سے جاری کردہ احکام و قوانین اور روزمرّہ کی زندگی کے سلسلے میں ضروری ہدایات و ضوابط کو سامنے لایا جاتا ہے)۔ البتہ زکوٰۃ اور جہاد کے بارے میں سرِ دست رعایت کی جاسکتی ہے۔ جب تم لوگ اسلام میں پختہ ہو جاؤ گے تو زکوٰۃ بھی دینے لگ جاؤ گے اور جہاد میں بھی شامل ہوا کرو گے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ انہیں مجبور نہ کیا جائے کہ وہ اپنے معبود (منات) کو اپنے ہاتھوں سے توڑیں۔ یہ درخواست بھی منظور کر لی گئی۔

نجران عیسائیوں کا بہت بڑا مرکز تھا جہاں ان کا ایک عظیم الشّان کلیسا تھا۔ نبئ اکرمؐ نے انہیں دعوتِ اسلام کا خط بھیجا اور اس میں لکھا کہ اگر اسلام قبول نہ ہو تو حکومتِ خداوندی کی سیاسی اطاعت قبول کر کے جزیہ ادا کرو تاکہ حکومت تمہاری حفاظت کی ذمّہ داری لے سکے۔ اہلِ نجران نے اپنے بطارقہ اور احبار پر مشتمل ایک وفد خدمتِ نبوی میں بھیجا۔ ان لوگوں نے حضورؐ سے بہت سی باتیں دریافت کیں جن کا جواب سورۃ آلِ عمران کی ابتدائی اسّی آیات میں بڑی شرح و بسط سے آیا ہے۔ ان ہی کو مخاطب کر کے کہا گیا تھا کہ:

---

[1] بخاری میں ہے کہ نبئ اکرمؐ نے جب حضرت معاذ بن جبلؓ اور ابو موسیٰؓ اشعری کو یمن میں تبلیغ کے لیے بھیجا تو یہ احکام صادر فرمائے۔

قُلْ یٰاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْھَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ (۳/۶۴)

تو ان یہود و نصاریٰ (دونوں) سے کہو کہ، ان جزئی باتوں کو چھوڑو اور اصل الاصول کی طرف آؤ جس کے ماننے کے تم بھی دعوے دار ہو اور جس کی طرف ہم بھی دعوت دیتے ہیں یعنی یہ کہ اللہ کے سوا کسی اور (کے قوانین) کی محکومی اختیار نہ کی جائے۔ اُس کے اس اقتدار و اختیار میں، کائنات کی کسی شے کو شریک نہ کیا جائے۔ نہ ہی اُس کے سوا، ہم ایک دوسرے میں سے کسی (انسان) کو 'خدائی اختیارات کا حامل سمجھیں۔

اگر یہ لوگ توحید کے اس مرکزی نقطہ پر جمع ہو جائیں تو ھوالمراد۔ اور اگر اس سے رُوگردانی کرنا چاہیں تو ان سے کہہ دو کہ تم جس طرف جانا چاہتے ہو جاؤ۔ ہم صرف ایک خدا کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں۔ اسے تم خود دیکھ رہے ہو۔

آپ اس دعوت پر غور کیجئے کس طرح دینِ خداوندی کی اساس اور بنیادی تعلیم اس کے اندر آگئی ہے۔ خدا کی "عبادت" کے اہلِ کتاب بھی قائل تھے لیکن ان کے ہاں "عبادت" سے مفہوم "پرستش" رہ گیا تھا۔ چنانچہ وہ "پرستش" خدا کی کرتے تھے لیکن اطاعت، قیصر کے قوانین، یا اپنے احبار و رہبان (مذہبی پیشواؤں) کے فرامین کی۔ قرآن نے انہیں دعوت دی کہ اطاعت و محکومیت اللہ کے قوانین کے علاوہ اور کسی کی جائز نہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ اس اصولی بات کو تسلیم کر لیتے تو پھر اگلا سوال بھی سامنے آتا تھا کہ وہ خدا کے قوانین اپنی اصلی اور منزہ شکل میں کہاں سے ملیں گے۔ اس سوال پر اگر علم و بصیرت کی رُو سے غور کیا جاتا تو ان کے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ تسلیم کرتے کہ یہ احکام ان کی کتابوں میں اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں۔ یہ قرآن کریم کے علاوہ اور کہیں مل ہی نہیں سکتے تھے۔

تفقّہ فی الدّین

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے مسلمانوں میں واعظوں اور معلّموں کا کوئی خاص طبقہ نہ تھا۔ ہر مسلم خدا کا سپاہی بھی تھا اور معلّم و واعظ بھی، کہ اس پوری کی پوری جماعت کا کام "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" تھا۔ اور یہ وہ فریضہ تھا جو بحالتِ جنگ اور بحالتِ صلح ہر میدان اور ہر مجلس میں سرانجام دیا جاتا تھا لیکن مرکزِ آئین و دساتیر اور منبعِ قوانین و ضوابط بہرحال 'مدینہ ہی تھا جو قبائل اطراف و

اکنافِ ملک میں پھیلے ہوئے تھے، ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس مرکز سے قوانین وضوابط کی تعلیم حاصل کریں۔ اس کے لیے خود قرآن نے یہ نظام قائم کر دیا کہ ہر قبیلہ اور ہر گروہ میں سے کچھ لوگ مدینہ میں آئیں اور یہ احکامات سیکھ کر اپنے قبیلہ والوں کے پاس لوٹیں اور انہیں بھی ان سے آگاہ کریں۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ۝ (۹/۱۲۲)

اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جنگ اور قتال میں مصروف رہنے کے یہ معنی نہیں کہ تم دین کے دوسرے شعبوں کو نظر انداز کر دو۔ یہ ضروری ہے کہ اس کے ساتھ تعلیم و تعلّم کا سلسلہ بھی جاری رہے۔ لہٰذا، جماعتِ مومنین کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ سب کے سب ایک ہی کام کے لیے نکل کھڑے ہوں۔ چاہیئے یہ کہ ہر جماعت میں سے کچھ لوگ (مرکزِ نظامِ خداوندی میں آکر) اس نظام کے متعلق پوری پوری سمجھ بوجھ حاصل کریں اور پھر اپنی جماعت کی طرف واپس جاکر انہیں اس سے آگاہ کریں۔ اس طرح پوری کی پوری قوم، اپنے آپ کو غلط باتوں سے محفوظ رکھ سکے گی (اور صحیح نظام کے مطابق چلنے کے قابل ہو جائے گی)۔

واضح رہے کہ یہ گروہ جو تعلیم و تفقّہ فی الدّین کی غرض سے آتے تھے، کوئی مستقل حیثیت اختیار نہیں کر لیتے تھے۔ یہ نظام، تمدنی ضروریات کے پیشِ نظر قائم کر دیا گیا تھا۔ جب یہ گروہ واپس جاکر دوسروں تک ان احکامات کو پہنچا چکتا تو سکھانے اور سیکھنے والے سب برابر ہو جاتے۔ یہ "علماء" کی جماعت اور "مولوی صاحبان" کا گروہ، جو ایک مستقل فرقہ کی حیثیت لیے ہوئے ہے، بہت بعد کی پیداوار ہے، جب اسلام کا حقیقی نظام اور اس کی اصلی روح نگاہوں سے پوشیدہ ہو چکی تھی۔ اسلام ــ اس برہمنیت کو مٹانے کے لیے آیا تھا نہ کہ اسے قائم کرنے کے لیے۔

اس تعلیم و تدریس کے لیے بھی الگ درس گاہیں نہیں تھیں۔ اُس زمانہ میں مسلمانوں کے تمام اجتماعی امُور کا مرکز ان کی مساجد تھیں۔ یہ سلسلۂ تفقّہ و تعلّم بھی مساجد ہی میں سرانجام پاتا تھا۔ جو قبیلہ مسلمان ہوتا سب سے پہلے مسجد تعمیر کرتا۔ جتنے قبائل مدینہ کے مختلف جوانب میں اقامت پذیر ہو گئے تھے، انہوں نے بھی اسی طرح مساجد تعمیر کر لی تھیں۔ قبیلہ کا جو مسلمان سب سے زیادہ قرآن جانتا وہی انکا امام ہوتا۔ (آپ نے غور کیا ہو گا کہ عہدِ نبوی میں ترجیح اور تفوّق کا ایک ہی معیار تھا اور وہ تھا قرآن دانی۔ نماز کی امامت کا سوال ہو یا میدانِ جنگ میں شہداء کی تدفین کا معاملہ، ہر مقام پر سبقت اُسے حاصل تھی جو زیادہ قرآن جانتا تھا)۔

مساجد کی حیثیت

اکثر یہی ائمۂ مساجد عمّالِ حکومت بھی ہوتے تھے کہ اس زمانہ میں نماز اور حکومت دو الگ الگ شعبے نہیں تھے۔ مسجد ان کی درس گاہ بھی تھی اور حکومت کا سیکریٹریٹ بھی، پارلیمنٹ کا ایوان بھی تھی اور معاشی اجتماعات کا مرکز بھی۔ حتیٰ کہ حبشیوں کا وہ ناچ بھی مسجد نبوی ہی میں ہوا تھا جسے نبی اکرمؐ نے خود بھی دیکھا تھا اور حضرت عائشہؓ کو بھی دکھایا تھا۔ (بخاری)

قضا اور محاسبہ

مدینہ اور اس کے حوالی کے مقدّمات کے فیصلے خود نبیٔ اکرمؐ فرماتے تھے۔ دوسرے بڑے بڑے مقامات میں قاضی مقرر کر دیئے گئے تھے۔ احتساب کا فریضہ بھی حضورؐ نے خود اپنے ہی ذمّے لے رکھا تھا۔ اس زمانہ میں تجارت ہی عام کاروبار تھا، اس لیے اسی میں احتساب کی زیادہ ضرورت تھی۔ آپؐ اکثر بازاروں میں نکل جاتے اور بیع وشرٰی کے آئین ودساتیر پر عمل پیرائی کو محتسبانہ نگاہ سے دیکھتے۔ ایک دن آپؐ بازار سے گزرے تو غلّہ کا ایک انبار سامنے نظر آیا۔ اس کے اندر ہاتھ ڈالا تو نمی محسوس ہوئی۔ دریافت کرنے پر دکاندار نے کہا کہ بارش سے بھیگ گیا ہے۔ ارشاد فرمایا کہ پھر بھیگے ہوئے غلّہ کو اوپر کیوں نہیں رکھا تاکہ ہر شخص کو معلوم ہو۔ یاد رکھو! جو لوگ فریب دیتے ہیں، وہ ہم میں سے نہیں ہیں (مسلم)۔ اسی طرح عمّال اور محصّلین کا بھی محاسبہ فرماتے اور اس انداز سے کہ جزئی سے جزئی معاملہ بھی نظر انداز نہ ہونے پاتا۔ ایک محصّل کا جائزہ لیا، تو اس نے کہا کہ مجھے یہ چیز ان لوگوں نے تحفۃً دی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ تمہیں گھر بیٹھے بیٹھے انہوں نے تحفہ کیوں نہ بھیجا؟ اس کے بعد اس سلسلہ میں عام ہدایات جاری فرمادیں اور اس طرح تحائف وصول کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔

گورنرز

ملک کے مختلف حصّوں میں والی (گورنر) مقرر کیے جاتے۔ ان کی تربیت حضورؐ خود فرماتے اور وہ پھر اپنے علاقہ میں مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کا ذریعہ بنتے۔ ان امور کا ہم نے اس لیے عنوان زیرِ نظر میں ذکر کیا ہے کہ اگرچہ بظاہر یہ معاملات نظم ونسق حکومت سے متعلق تھے لیکن درحقیقت یہ سب تعلیم وتبلیغ ہی کے شعبے تھے۔ اس لیے کہ ہر عامل اور ہر محصّل، ہر والی اور ہر محتسب، جہاں اہلِ حکومت کا اہل کار تھا وہاں اسلام کا مبلّغ اور معلّم بھی تھا۔ اس تعلیم وتبلیغ کے لیے انہیں الگ مدرسے اور مجالس قائم نہیں کرنی پڑتی تھیں۔ وہ خود اسلام کے زندہ پیکر تھے، اس لیے ان کی ہر نقل وحرکت اسلامی احکام کی چلتی پھرتی تفسیر تھی اور ان کے تمام اعمال و افعال پر ذاتِ رسالت مآبؐ کی نگہِ احتساب رہتی تھی۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط (۲/۱۴۳)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! ہم نے اسی لیے تم کو بین الاقوامی اُمّت کا درجہ عطا فرمایا ہے تاکہ تمام اقوامِ عالم (کے اعمال و افعال) کے نگران بنے رہو اور (خود) تمہارے (افعال کے) اُوپر رسول کی (محافظت و) نگرانی قائم رہے۔

دعوت نامے

اسلام سرزمینِ عرب ہی کے لیے نہ تھا بلکہ تمام نوعِ انسانی کے لیے دینِ خداوندی تھا۔ اس لیے صُلحِ حدیبیہ کے بعد جب مسلمانوں کو اندرونی شورشوں سے قدرے اطمینان حاصل ہُوا تو اس پیغامِ انقلاب کو آگے بڑھانے کی منزل سامنے آئی۔ اس کے لیے نبیِّ اکرمؐ نے قیصرِ رُوم، شہنشاہِ ایران، والیٔ مصر، شاہِ حبش اور رؤسائے یمامہ اور حارث غسّانی رئیسِ شام، کو دعوت نامے ارسال فرمائے۔ قیصرِ روم کے پاس جب حضورؐ کا گرامی نامہ پہنچا تو اتفاق سے ابوسفیان بسلسلۂ تجارت وہاں گیا ہُوا تھا۔ اس نے اُسے بلا کر حضورؐ کے متعلق حالات دریافت کیے۔ غور کیجیے! ابوسفیان اُس وقت اسلام کا سب سے بڑا دُشمن تھا، لیکن حضورؐ کے کیریکٹر کی عظمت (اور اس کے ساتھ ہی عربوں کی قومی خصوصیت کہ دُنی الطّبع نہیں تھے) دیکھئے کہ ابوسفیان نے بھرے دربار میں بتایا کہ مدّعیٔ نبوّت بڑے شریف خاندان سے متعلق ہے۔ اُس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، پیمان شکنی اور وعدہ خلافی نہیں کی، اور یہ کہ وہ خدا کی توحید اور پاک دامنی کی تعلیم دیتا ہے۔ ہرقل کے دل پر حضورؐ کی صداقت کا اثر ہو چکا تھا لیکن سلطنت کے مصالح اس کے اعتراف کی راہ میں مانع ہو گئے اور وہ اس شرفِ عظیم سے محروم رہ گیا۔ شہنشاہِ ایران نے اپنی قوّت اور نشہ کی بدمستی میں نامۂ مبارک کی تعظیم نہ کی اور چند ہی سال کے بعد اس کی سرزمین کے ذرّوں نے دیکھ لیا کہ حق و صداقت کی آواز کے سامنے سرکشی کا انجام کیا ہُوا کرتا ہے۔ نجاشی شاہِ حبش اسلام لایا اور حضرت جعفر طیارؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ مقوقس (عزیزِ روم) نے بھی والا نامہ کا احترام کیا اور اگرچہ اسلام نہیں لایا لیکن خدمتِ نبویؐ میں تحائف اور ہدایا بھیجے۔ رؤسائے عرب نے مختلف جواب دیئے لیکن حارث غسّانی کی نخوت نے اسے مخالفت پر آمادہ کیا۔ غزوۂ تبوک اسی کا نتیجہ تھا۔

یہ دعوت نامے درحقیقت ایک شجرِ مقدّس کے تخمِ صالح تھے جو اگرچہ اُسی وقت بار آور نہ ہوئے، لیکن زمانہ نے دیکھ لیا کہ جن جن علاقوں میں دعوتِ اسلام کی یہ تخم ریزی ہوئی تھی، ان میں کا ایک ایک خطہ مسلمانوں کے قبضہ میں آیا اور ان کی شوکت و عظمت کا گہوارہ بنا۔ حق و صداقت کی صدا کبھی صدا بصحرا نہیں ہُوا کرتی۔ قیصر و کسریٰ کی طرف جو دعوت نامے بھیجے گئے تھے، ان میں خصوصیت سے یہ کہا گیا تھا کہ تمہارے ہاں کے کاشتکاروں پر،

جس قدر مظالم زمینداروں کی طرف سے ہوئے ہیں، ان کا اگر ازالہ نہ کیا گیا تو ان کے جرائم کی ذمہ داری تمہارے سر پر عاید ہوگی اور ہمیں مظلوموں کی امداد کرنی پڑے گی۔ چنانچہ دُنیا نے دیکھ لیا کہ جب قرآن کا معاشی نظام قائم ہوا تو اس میں کس طرح ان مظلوموں کی دادرسی ہوئی اور کس طرح ظالموں کو ان کے مظالم کی سزا ملی۔

حضورؐ ان پڑھ نہیں تھے

دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں ایک اہم سوال سامنے آتا ہے جس کی وضاحت ضروری ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ حضورؐ ان پڑھ تھے۔ اس کے لیے سند یہ پیش کی جاتی ہے کہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ آپؐ "اُمیّوں" میں سے تھے یا "نبی اُمّی" تھے۔ لیکن ان مقامات میں اُمّی کے معنی ان پڑھ نہیں عرب میں ایک آبادی ان لوگوں (یہود و نصاریٰ) کی تھی جن کا دعویٰ تھا کہ ان کے پاس آسمانی کتابیں ہیں قرآن نے انہیں اہلِ کتاب کہہ کر پکارا ہے۔ دوسری آبادی ان (قریش وغیرہ) کی تھی جو کسی آسمانی کتاب کے مدعی نہیں تھے۔ انہیں "اُمّی" کہا جاتا تھا۔ چونکہ حضورؐ کا پیدائشی تعلق اس گروہ سے تھا اس لیے آپؐ بھی اُمّی کہلاتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپؐ نبوت سے پہلے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے لیکن اس کی شہادت خود قرآن کریم میں موجود ہے کہ نبوت کے بعد ایسی صورت نہیں تھی۔ سورۂ عنکبوت میں ہے وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ ...... (۲۹/۴۸) تو اس (نبوت ملنے) سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتا تھا اور نہ اپنے دائیں ہاتھ سے کچھ لکھتا تھا"۔ مِنْ قَبْلِهٖ (اس سے پہلے) کی تخصیص، اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ نبوت کے بعد یہ کیفیت نہیں رہی تھی۔ ویسے بھی آپ سوچئے کہ جس ذاتِ اعلم الناس کا اپنے متبعین کو ارشاد ہو کہ "علم حاصل کرنا ہر مُسلم مرد اور مُسلم عورت پر فرض ہے" اور تحصیلِ علم کی تاکید یہ کہہ کر فرما دی کہ "علم حاصل کرو خواہ اس کے لیے تمہیں چین تک بھی کیوں نہ جانا پڑے"، کیا آپ باور کر سکتے ہیں کہ وہ خود ان پڑھ رہے، بالخصوص جبکہ اس کے ذمے نہ صرف لاکھوں انسانوں کی تعلیم و تربیت کا فریضہ ہو بلکہ ایک وسیع و عریض مملکت کا انتظام و انصرام بھی ہو۔

نظامِ مملکت

سابقہ عنوان (غزوات) میں جو کچھ لکھا جاچکا ہے، اس سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آچکی ہے کہ حضور نبی اکرمؐ کی زندگی میں اسلامی مملکت قائم ہوگئی تھی جس کے سربراہ خود رسول اللہ تھے۔ اس مملکت کا قیام محض ایک اتفاقی امر، یا حالات کا پیدا کردہ نہیں تھا۔ اسلام کو ایک زندہ اور عملی حقیقت بنانے کے لیے اپنی آزاد مملکت کا وجود لاینفک ہے۔ اس لیے اس مملکت کا قیام فریضۂ رسالت تھا۔ اسلام، مذہب نہیں دین ہے۔ مذہب میں ہر فرد اپنے طور پر خدا کی پوجا پاٹ، بندگی، پرستش یا "عبادت" کرلیتا ہے اور اس کا نام "خدا سے تعلق پیدا کرلینا" رکھ لیا جاتا ہے۔ لیکن دین ایک اجتماعی نظامِ زندگی کا نام ہے جس میں قوانینِ خداوندی کی اطاعت کی جاتی ہے (اسی کو قرآن کی اصطلاح میں عبادت کہا جاتا ہے)۔ اس اجتماعی نظام کو، عام اصطلاح میں نظامِ مملکت کہا جاتا ہے۔ نبی اکرمؐ کے زمانے میں، اسلامی مملکت قریب دس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی تھی۔ دیکھنا یہ ہے کہ حضورؐ نے اس مملکت کا نظام کس قسم کا قائم کیا تھا۔ نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کا یہ گوشہ جس قدر اہم ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آئے گی کہ اسلامی حکومت کسے کہتے ہیں اور وہ غیر اسلامی (یعنی سیکولر) حکومت سے کس طرح مختلف ہے۔ اس گوشہ کی اسی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اس کے متعلق ہم نے ذرا تفصیل سے گفتگو کرنا ضروری سمجھا ہے۔

اسلامی نظام کی اساس اس اصلِ عظیم پر قائم ہے کہ دنیا میں کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اس کے سوا کسی کی محکومیت جائز نہیں۔ انسانی تصور آج تک زیادہ سے زیادہ یہاں تک پہنچ سکا ہے کہ اگر کسی خاص خطۂ ارض کے انسان اپنی حکومت آپ قائم کریں تو اسے

کا نام آزادی ہوگا لیکن قرآنی تصور، انسان کو اس سے کہیں بلند لے جاتا ہے۔ اس کے نزدیک حکومت ہی ہے خواہ اپنوں کی ہو یا بے گانوں کی۔ اور (RENE GUENON) کے الفاظ میں "یہ دورِ حاضر کا بہت بڑا فریب ہے کہ حاکمیت کا تصور بغیر محکوم کے بھی ممکن ہے۔ حکومت قائم نہیں ہوسکتی جب تک کہ حاکم اور محکوم دونوں عناصر موجود نہ ہوں۔ اور انسان کبھی اپنے آپ کو آزاد نہیں سمجھ سکتا جب تک

حکومت صرف خدا کے لیے ہے

حاکمیت کا اقتدار، انسانوں سے بلند و بالا ہستی کے سپرد نہ کر دیا جائے"۔ قرآن یہی پیغام دنیا میں لایا ہے اور تمام نظامہائے عالم میں واحد نظام ہے جس میں انسان حقیقی معنوں میں حریت اور آزادی کا کامل احساس کر سکتا ہے۔ قرآن کی ساری تعلیم بنیادی طور پر اسی اجمال کی تفصیل اور اسی مرکز کی محیط ہے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (۱۲/۴۰)

حکومت (حاکمیت و فرماں روائی) اللہ ہی کے لیے مخصوص ہے۔ اس کا فرمان یہ ہے کہ صرف اسی کی عبدیت (اطاعت و فرماں پذیری) اختیار کرو۔ اور کسی کی نہ کرو۔ یہی صحیح دین (نظامِ زندگی) ہے مگر اکثر لوگ اس (حقیقت) سے واقف نہیں۔

وہ اپنی حکومت میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔

مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ؗ وَّ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ○ (۱۸/۲۶)

اُس کے سوا کوئی کارساز نہیں۔ اور وہ اپنے حکم (فرماں برداری) میں کسی کو شریک نہیں کرتا ہے!

توحید

اس حقیقتِ کبریٰ پر ایمان لانا کہ اطاعت و محکومیت صرف خدا کی جائز ہے، اس کے سوا کوئی مطاع و حاکم نہیں، توحید ہے۔ اور یہی وہ توحید ہے جس کی دعوت رسول دیتا ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ○ (۷۲/۲۰)

(اے رسولؐ!) تو کہہ دے کہ میں صرف اللہ کو پکارتا ہوں اور اس کی حاکمیت و فرماں روائی میں کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہراتا!

کوئی اور قوت جو یہ دعویٰ کرے کہ اُسے حکومت کا حق حاصل ہے، طاغوتی قوت کہلاتی ہے۔ اس کے دعوے کو تسلیم کرنا شرک ہے۔

وَ لَقَدۡ بَعَثۡنَا فِیۡ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوۡلًا اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَ اجۡتَنِبُوا الطَّاغُوۡتَ ۚ (۱۶/۳۶)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے (دنیا کی) ہر اُمت میں کوئی نہ کوئی رسول بھیجا تاکہ وہ اُس پیامِ حق کا اعلان کر دے کہ اللہ کی عبدیت (اطاعت و فرماں پذیری) اختیار کرو اور غیر خدا حکومت کی دعوے دار قوتوں سے مجتنب رہو۔

ہر رسُول کا یہی پیغام تھا

ہر رسُول کا یہی پیغام تھا۔

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِیۡۤ اِلَیۡهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ ۝ (۲۱/۲۵)

اور (اے پیغمبرِ اسلام!) ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر ایسا نہیں بھیجا جس پر ہم نے اس بات کی وحی نہ بھیجی ہو کہ کوئی معبود (حاکم) نہیں مگر صرف میری ذات۔ پس چاہیئے کہ میری ہی عبدیّت (اطاعتِ محکومیت) اختیار کرو۔

اور یہی دعوت نبی اکرمؐ کی تھی۔

قُلۡ اِنَّمَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ۝ (۲۱/۱۰۸)

(اے پیغمبرِ اسلام!) تو کہہ دے "مجھ پر جو کچھ وحی کیا گیا ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ تمہارا الٰہ (حاکم) ایک ہی (خدا) ہے۔ (اس کے سوا کوئی نہیں) پس بتلاؤ، تم اس کی محکومیت اختیار کرتے ہو یا نہیں؟"

جس نے رسُول کی اس دعوت پر لبیک کہا اور اس حقیقت پر ایمان لے آیا، وہ مومن ہے۔ جس نے اس سے انکار کیا، وہ کافر (نہ ماننے والا)۔ اور جو کسی انسان کا حقِ حکومت تسلیم کرتا ہے، وہ مُشرک۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ یَزۡعُمُوۡنَ اَنَّهُمۡ اٰمَنُوۡا بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡكَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِكَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَحَاكَمُوۡۤا اِلَی الطَّاغُوۡتِ وَقَدۡ اُمِرُوۡۤا اَنۡ یَّكۡفُرُوۡا بِهٖ ؕ وَیُرِیۡدُ الشَّیۡطٰنُ اَنۡ یُّضِلَّهُمۡ ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا ۝ (۴/۶۰)

(اے رسُول!) کیا تو نے ان لوگوں کی حالت پر غور نہیں کیا (یعنی منافقوں کی حالت پر)۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اور جو کچھ تم سے پہلے نازل ہو چکا ہے، وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں لیکن عمل کا حال یہ ہے کہ) چاہتے ہیں کہ اپنے جھگڑے قضیئے غیر خدائی قوتوں کے سامنے لے جائیں۔ حالانکہ انہیں حکم دیا جا چکا ہے کہ اس سے انکار کریں (اور صرف اللہ کی محکومیّت اختیار کریں)۔ اصل یہ ہے کہ ان

کے سرکش جذبات کا تقاضا یہ ہے اُنہیں اس طرح گمراہ کر دیں کہ وہ راہِ راست سے بہت دور جا پڑیں.

خُدا پر ایمان کا مفہوم

خدا کو محض ایک پرستش (پوجا پاٹ) کی شئے مان لینا اس کے نزدیک ایمان نہیں. اس طرح تو بجز چند دُہریوں کے، ساری دُنیا خدا کو مانتی ہے اسی لیے وہ کہتا ہے کہ ان لوگوں سے پوچھو کہ خالقِ ارض و سمٰوٰت کون ہے؟ تو یہ بلا تامّل کہہ دیں گے کہ خدا ہے لیکن اطاعت غیروں کی کریں گے. اس لیے خدا کی ہستی پر اس قسم کا ایمان کچھ معنی نہیں رکھتا. اس لیے کہ خدا پر ایمان لانے سے خدا کا کچھ سنوارنا مقصود نہیں مقصود تو شرفِ انسانیت کی بالیدگی ہے اور وہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان خُدا کے سوا کسی کے حکم کے سامنے سر نہ جھکائے. سورۂ مومنون کی حسبِ ذیل آیات پر غور کیجیے. خدا کے اس قسم کے ایمان کو کس طرح واضح طور پر سامنے لایا گیا ہے. فرمایا.

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ
قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ (۲۳/۸۴-۸۵)

(اے رسولؐ!) ان منکروں سے پوچھو کہ زمین اور وہ تمام مخلوقات جو اس میں ہے، کس کے لیے ہیں؟ وہ فوراً کہیں گے اللہ کے لیے. تو اس کے بعد ان سے کہو کہ جب حقیقت یہ ہے تو تم اس بات پر کیوں غور نہیں کرتے (کہ انسانی دنیا میں حاکمیت بھی اس کے لیے ہے).

پھر کہا:

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ
قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ (۲۳/۸۶-۸۷)

(اے رسولؐ!) تو ان سے پوچھ "وہ کون ہے جو متعدد اجرامِ فلکی کا پروردگار اور (جہاں داری کے) عرشِ عظیم کا مالک ہے"؟ وہ فوراً کہیں گے "یہ سب کچھ اللہ ہی کے لیے ہے". تو کہہ "پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ (شرک اور انکار کے نتیجہ سے) ڈرتے نہیں ہو؟"

بارِ دیگر پوچھا:

قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ
تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ۝ (۲۳/۸۸-۸۹)

(اے رسولؐ!) تو ان سے پوچھ "اگر تم جانتے ہو تو، بتلاؤ، وہ کون ہے جس کے قبضہ میں تمام اشیاء

کی بادشاہی ہے، اور وہ سب کو پناہ دیتا ہے۔ اور کوئی نہیں جو اس سے اُوپر پناہ دینے والا ہو۔"
وہ فوراً کہیں گے، یہ صفتیں تو اللہ ہی کے لیے ہیں۔ اس کے بعد اُن سے کہو کہ پھر تمہاری عقل کو کیا ہوگیا ہے (کہ اپنے معاملات میں خدا کو حاکم نہیں مانتے)۔

اس کے بعد فرمایا کہ خدا کو یہ سب کچھ مان لینے کے باوجود یہ جھوٹے کے جھوٹے ہیں؛ اس لیے کہ اس کی حیثیتِ حاکمیہ سے عملاً انکار کرتے ہیں۔

بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ○ (۲۳/۹۰)

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے سچائی انہیں جتلادی ہے اور یہ اپنے دعوے میں قطعاً جھوٹے ہیں۔

قوانینِ خداوندی

اَب آگے بڑھیئے۔ یہ ظاہر ہے کہ حکومت، احکام کے ذریعہ قائم ہوتی ہے۔ حاکم کے احکام کی اطاعت کا نام محکومیت ہے۔ جب ہم نے یہ تسلیم کر لیا کہ حکومت کا حق خدا کو حاصل ہے اور اس کے سوا کسی کی محکومیت جائز نہیں، تو یہ معلوم کرنا ضروری ہوگیا کہ خدا کے وہ احکام کہاں سے ملیں گے جن کی اطاعت کا نام اس کی محکومیت قرار دیا گیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ خدا ہر انسان سے براہِ راست باتیں نہیں کرتا۔ اس لیے اس کے احکام ہر انسان کو فرداً فرداً نہیں ملتے۔ یہ احکامات بذریعہ وحی انسانوں تک پہنچائے جاتے ہیں۔ پہنچانے والے کو رسُول کہتے ہیں اور ان احکام کے مجموعہ کا نام کتابُ اللہ ہے۔ (کتاب کے معنی ہی قانون ہیں)۔ یہ قوانین اب اپنی اصلی شکل میں قرآنِ کریم کے اندر ہیں۔ لہٰذا یہ کتاب اب حکومتِ خداوندی کا ضابطہ ہے۔ قوانینِ خداوندی بھیجے ہی اس لیے جاتے ہیں کہ وہ انسانوں کے اختلافی امُور میں قولِ فیصل ہوں۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۟ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۠ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ (۲/۲۱۳)

چونکہ نوعِ انسان کے لیے صحیح اندازِ زندگی یہی ہے کہ وہ ایک اُمّت بن کر رہیں، اس لیے اللہ نے نبیوں

کو مبعوث کیا۔ وہ (ایمان و عمل کی برکتوں کی) بشارت دیتے اور (انکار و بدعملی کے نتائج سے) آگاہ کرتے تھے۔ نیز ان کے ساتھ کتابِ الٰہی نازل کی گئی، تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرنے لگے تھے، ان میں وہ فیصلہ کر دینے والی ہو (اور تمام لوگوں کو راہِ حق پر متحد کر دے) اور یہ جو لوگ باہمدگر مختلف ہوئے، تو اس لیے نہیں کہ ہدایت سے محروم اور حقیقت سے بے خبر تھے۔ وحیِ الٰہی کے واضح احکام ان کے سامنے تھے، (اور ان میں تفرقہ و اختلاف کی کوئی گنجائش نہ تھی) مگر پھر بھی آپس کی ضد اور مخالفت سے اختلاف کرنے لگے تھے (اور دین کی ایک راہ پر مجتمع رہنے کی جگہ الگ الگ گروہ بندیوں میں بٹ جاتے تھے) بالآخر اللہ نے ایمان والوں کو (دین کی) وہ حقیقت دکھا دی جس میں لوگ مختلف ہو گئے تھے (اور ایک دوسرے کو جھٹلا رہے تھے) اور جو شخص بھی دین کی سیدھی راہ دیکھنا چاہتا ہے، اللہ اسے وہ راہ دکھا دیتا ہے۔

نزولِ قرآن کی یہی غرض تھی

اسی غرض کے لیے قرآن نازل ہوا۔

إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ أَرٰىكَ اللّٰهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيمًا ۙ (۴/۱۰۵)

(اے رسولؐ!) ہم نے تم پر یہ کتاب سچائی کے ساتھ نازل کر دی ہے، تاکہ جیسا کچھ خدا نے بتلا دیا ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اور خیانت کرنے والوں کی طرف داری مت کرو۔

دوسری جگہ ہے۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللّٰهِ ۚ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّي عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ۝ (۴۲/۱۰)

(اور اے رسولؐ! تم ان لوگوں سے کہہ دو) کہ تمہارے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ اللہ ہی کی طرف سے ہو سکتا ہے۔ یہ اللہ ہی میرا رب ہے۔ میں اُسی پر بھروسا رکھتا ہوں اور اسی کی طرف ان فیصلوں کے لیے رجوع کرتا ہوں؛

یہ ضابطۂ قوانین (یعنی قرآن)، عدل و صداقت کا مکمل مجموعہ ہے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور نہ تحریف۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهِ ۚ وَهُوَ

السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ○ (۶/۱۱۵)

اور (یاد رکھو!) تمہارے پروردگار کی بات سچائی اور انصاف کے ساتھ مکمل ہوگئی۔ اس کے پیغام کا (یعنی اُس کے قوانین کا) کوئی بدلنے والا نہیں۔ وہ (سب کچھ) سننے والا (سب کچھ) جاننے والا ہے۔

رسُول کا فریضہ

رسول کا اوّلین فریضہ یہ ہے کہ جو کچھ خدا کی طرف سے اُس پر وحی کیا جائے۔ اُسے لوگوں تک پہنچائے، یعنی وحیِ خداوندی، صرف رسُول کی اپنی ذات کے لیے ہی وجہ ہدایت نہیں ہوتی بلکہ اس کے ذریعہ دوسرے انسانوں تک پہنچائی جاتی ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ (۵/۶۷)

(اے رسُولؐ!) تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر جو کچھ نازل ہُوا ہے، اُسے دُوسرے انسانوں تک پہنچا دو (اور دشمنوں کی مخالفت کی کچھ پرواہ نہ کرو)۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو، (پھر) خدا کا پیغام نہیں پہنچایا (یعنی ادائے فرضِ رسالت میں کوتاہی کی)۔

رسالت

یہ رسُولؐ کی پہلی حیثیت ہے، یعنی ابلاغِ رسالت، وحیِ خداوندی کا دوسروں تک پہنچانا۔ اس میں اس کو تصرّف یا تبدیلی کا کوئی اختیار نہیں ہوتا (۱۰/۱۵)، نہ ہی وہ اس میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ کر سکتا تھا (۶/۵۰)۔ اگر وہ ایسا کرتا تو فوراً خدا کی گرفت میں آجاتا (۶۹/۴۴-۴۵)۔

رسُولِ خدا اس پیغام پر ایمان لاتا ہے

چونکہ یہ احکامات انسانوں کی اطاعت کے لیے آتے ہیں اور رسول خود بھی ایک انسان ہوتا ہے، اس لیے سب سے پہلے یہ رسول خود ان کی صداقت پر ایمان لاتا اور خدا کی محکومیت تسلیم کرتا ہے۔

قُلْ اِنِّیْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ ۙ وَ اُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ ○ قُلْ اِنِّیْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ○ قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِیْنِیْ ۙ (۳۹/۱۱-۱۴)

(اے رسُولؐ!) تم کہہ دو کہ مجھ کو حکم ہوا ہے کہ میں اللہ کی اطاعت و محکومیت اختیار کروں اور اس محکومیت و اطاعت کو اسی کے لیے خاص رکھوں۔

اور مجھ کو یہ (بھی) حکم ہُوا ہے کہ (اس اُمّت کے لوگوں میں) سب سے پہلا (نظامِ خداوندی کو) ماننے والا میں بنوں۔

تم (یہ بھی) کہہ دو، کہ اگر (بفرضِ محال) میں بھی قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں، تو مجھے بھی ایک بڑے دن کے عذاب (کے اندیشہ) سے ڈرنا ہوگا۔ تم کہہ دو کہ میں تو قوانینِ خداوندی کی اطاعت اس طرح کرتا ہوں کہ اس اطاعت کو اُسی کے لیے خاص رکھتا ہوں۔

وہ اس اطاعت و تسلیم میں ایک چٹان کی طرح ثابت قدم رہتا ہے اور مخالفتوں کا بڑے سے بڑا ہجوم بھی اس کے پائے استقامت میں لغزش پیدا نہیں کرسکتا۔ اگر بفرضِ محال وہ بھی وحی کے مقابلہ میں کسی انسان کی بات مان لے تو خدا کا قانونِ مکافات اس کی بھی کوئی رعایت نہ کرے۔ (۱۷/۷۳-۷۵)

رسول کی دوسری حیثیت

یہاں تک رسول کی حیثیت انفرادی ہوتی ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں حکومت کسی نہ کسی نظام کے ماتحت قائم ہوتی ہے جس کے پیچھے قوتِ نافذہ موجود ہو۔ وہ فیصلے جن پر عمل درآمد کرانے کے لیے قوت موجود نہ ہو، محض فتاوی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ رسول کے ذمّے دوسرا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسا نظام قائم کرے جس میں خدا کے احکام زندہ فیصلوں کی حیثیت اختیار کرسکیں اور دُنیا انسانوں کی غلامی سے نجات پاکر صرف ایک خدا کی محکوم رہ جائے۔ اس نظام کا نام دِین ہے۔

اس نظام میں قوانین وضع کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہوگا۔ اس کا منصب، قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنا ہوگا۔ اس لیے اس نظام میں قدم قدم پر اس کی تاکید ہوگی کہ اطاعت صرف قرآن کی ہوگی اور کسی کی نہیں۔ رسول بھی اسی کی اطاعت کرے گا اور اس کے ساتھ وہ جماعت بھی جو اس نظام کے تابع ہوگی، اسی کی اطاعت کرے گی۔ قرآن میں بار بار یہ تاکید آپ کو نظر آئے گی کہ:

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ (۷/۳)

جو کچھ تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہاری طرف نازل ہوا ہے، اس کی پیروی کرو اور خدا کو چھوڑ کر (اپنے ٹھہرائے ہوئے) اکابر (اولیاء) کے پیچھے نہ چلو (افسوس تم پر!) بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم نصیحت پذیر ہو!

لیکن جب یہ اطاعت ایک حکومت کی شکل اختیار کرے گی تو ظاہر ہے کہ اُس کا کوئی نہ کوئی مرکز بھی ہوگا

منصبِ امارت

جہاں سے یہ احکام نافذ ہوں گے اور جس کے ذمے یہ فریضہ ہوگا کہ وہ اس کی نگرانی کرے کہ ان احکام پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ اس مرکزیت (CENTRAL AUTHORITY) کا نام منصبِ امارت یا امامت ہے۔ یہ امیر یا امام وہ ہوگا جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کا پابند ہوگا (اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ)۔ اور یہ ظاہر ہے کہ رسولؐ کی موجودگی میں اس سے بڑھ کر قوانینِ خداوندی کا فرماں بردار اور کون ہوگا؟ اس لیے اس نظام کا اوّلین امیر اور امام خود رسولؐ ہوگا۔ یہ رسولؐ کی دوسری حیثیت ہے، یعنی مرکزِ نظامِ حکومتِ خداوندی، امیر المؤمنین، امام المسلمین۔ اس امیر کی حیثیت احکامِ خداوندی کو نافذ کرنے والے کی ہوگی۔ یہ اپنی حکومت انسانوں پر نہیں چلائے گا۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں بتلا دیا کہ:

مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَہُ اللّٰہُ الْکِتٰبَ وَ الْحُکْمَ وَ النُّبُوَّۃَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَ لٰکِنْ کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا کُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْکِتٰبَ وَ بِمَا کُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۙ (۳/۷۹)

کسی انسان کو یہ بات سزاوار نہیں کہ اللہ اُسے (انسانوں کی ہدایت کے لیے) کتاب، حکومت اور نبوت عطا فرمائے اور پھر اس کا شیوہ یہ ہو کہ لوگوں سے کہے "خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ" (یعنی خدا کے احکام کی جگہ میرے حکموں کی اطاعت کرو)۔ وہ یہی کہے گا کہ تمہیں چاہیے کہ تم ربّانی انسان (یعنی اللہ کے احکام کی اطاعت کرنے والے) بنو اس لیے کہ تم کتاب اللہ کی تعلیم دیتے رہتے ہو اور اس کا مفہوم و مقصود سمجھنے سمجھانے میں کوشاں رہتے ہو۔

وہ یہی کہے گا کہ اللہ میرا اور تمہارا آقا ہے۔ آؤ، مل جل کر اس کی محکومیت اختیار کریں کہ یہی شرفِ انسانیت کو اس کے منتہٰی تک لے جانے والی سیدھی راہ ہے۔

وَ اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیْ وَ رَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ ؕ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ○ (۱۹/۳۶)

اور بلاشبہ اللہ ہی میرا اور تمہارا سب کا پروردگار ہے۔ بس اُسی کی عبدیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرو۔ یہی (سچائی کا) سیدھا راستہ ہے۔

اس امیر کا سب سے بڑا شرف، جس کی وجہ سے وہ امیر بنا ہے یہی ہے کہ وہ خدا کی عبدیت (محکومیت) میں سب سے سبقت لے گیا ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم میں حضورؐ کو بار بار اسی خطاب (عبدہٗ) سے مخاطب کیا گیا ہے۔ مثلاً،

فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ؕ (۵۳/۱۰)

پس اللہ کو اپنے بندے (محمدؐ) پر جو کچھ وحی نازل کرنی تھی کی۔

اور اس اصل اعظم کو اچھی طرح سے ذہن نشین کرانے کے لیے کہ اس نظام میں امیر کی حیثیت کیا ہے، ہر اس شخص سے جو اس نظام میں داخل ہونا چاہے، سب سے پہلے دو باتوں کا اقرار لینا ضروری سمجھا گیا۔ ایک یہ کہ (۱) اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں جس کے سامنے جھکا جائے۔ اور دوسرے یہ کہ (۲) اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ محمدؐ جو اس نظام میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں، اللہ کے عبد (محکوم) اور اُس کے رسُول ہیں۔ خود رسول سے بار بار اس کا اعلان کرا دیا گیا کہ میں خود وحی کا اتباع کرتا ہوں اور اس وحی کے ذریعے تمہیں غلط روشِ زندگی کے انجام و عواقب سے متنبہ کرتا ہوں۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ۖ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۚ (۳۸/۶۵)

(اے رسولؐ!) تم کہہ دو کہ میں صرف تم کو (غلط زندگی کے انجام و عواقب سے) آگاہ کرنے والا ہوں۔
اور بجز اللہ واحد و غالب کے کوئی لائقِ اطاعت نہیں ہے!

اللہ اور رسُول کی اطاعت

چونکہ نظامِ دین میں، اللہ کے احکام، حکومتِ خداوندی کی طرف سے نافذ ہوتے تھے اور یہ اس حکومت کے احکام کی مرکزی قوتِ نافذہ رسُول کی محسوس شخصیت تھی اس لیے ان مرکزی احکام کی اطاعت کو اللہ اور رسول کی اطاعت قرار دیا گیا، یعنی اس نظامِ خداوندی کی اطاعت جو رسول کے ہاتھوں متشکل ہوا ہے اور جس کی مرکزی اتھارٹی سب سے پہلے خود رسولؐ ہے۔ اسلامی نظام میں یہ بڑا اہم نکتہ ہے جسے اچھی طرح سے سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ اللہ اور رسول کی اطاعت سے دو الگ الگ مطاعوں کی اطاعت متصوّر نہیں۔ اس لیے کہ جیسا ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، یہ تصور قرآن کی بنیادی تعلیم کے منافی ہے کہ اطاعت اللہ کے سوا کسی اور کی بھی ہو سکتی ہے۔ حتّٰی کہ خود رسُول کے متعلق واضح اور غیر مبہم الفاظ میں بتلا دیا گیا کہ اُسے بھی قطعاً یہ حق حاصل نہیں کہ لوگوں سے اپنی اطاعت کرائے۔ لہٰذا اللہ اور رسول سے مراد وہ مرکزِ نظامِ اسلامی (CENTRAL AUTHORITY) ہے جہاں سے قرآنی احکام نافذ ہوں۔ یہ حقیقت کہ اللہ اور رسُول سے مرکزِ ملت مراد ہے، قرآن کریم میں ایسے واضح الفاظ میں اور اس شرح و بسط سے بیان ہوئی ہے کہ ان مقامات کو بغور دیکھ لینے کے بعد اس میں کسی شُبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

جنگِ اُحد میں جب مسلمانوں کی فوج میں خلفشار پیدا ہو گیا اور حضورؐ تنہا رہ گئے تو آپؐ نے ان بکھرے ہوئے پروانوں کو آواز دی۔ اس آواز پر وہ سب پھر اس شمع کے گرد جمع ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ آواز نبئ اکرمؐ نے دی تھی لیکن چونکہ یہ بلاوا حضورؐ کا ذاتی بلاوا نہ تھا، بلکہ آپؐ نے بہ حیثیت مرکزِ ملّت یہ آواز دی تھی۔ اس لیے اس آواز کو خدا اور رسول کی آواز قرار دیا گیا۔

اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ؕ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَ اتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِیْمٌ ۚ (۳/۱۷۲)

جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دیا (اور جنگ کے لیے تیار ہو گئے) باوجودیکہ (اس سے ذرا ہی پہلے وہ) زخم کھا چکے تھے، سو یاد رکھو، ان میں جو لوگ نیک کردار اور متقی ہیں یقیناً اُن کے لیے (اللہ کے حضور) بہت بڑا اجر ہے۔

یہودیوں نے مدینہ میں اس عہد کو توڑا تھا جو انہوں نے نبئ اکرمؐ سے استوار کیا تھا۔ اس عہد شکنی کو "خدا اور رسول" کی مخالفت کہہ کر پکارا گیا ہے، اس لیے کہ یہ مخالفت نظامِ اسلامی کی مخالفت تھی۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ۚ وَ مَنْ یُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝ (۵۹/۴)

یہ اس لیے ہے کہ انہوں نے "اللہ اور اُس کے رسول" کی مخالفت کی ہے اور جو کوئی اللہ (کے حکم) کی مخالفت کرتا ہے تو (یاد رکھو!) اللہ کا قانون (پاداشِ عمل میں) سخت سزا دینے والا ہے۔

نظامِ اسلامی کے خلاف بغاوت کر کے فتنہ و فساد برپا کرنے والوں کے متعلق فرمایا کہ وہ خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ کرتے ہیں۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝ۙ (۵/۳۳)

بلاشبہ ان لوگوں کی جو "اللہ اور اس کے رسول" کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور ملک میں خرابی پھیلانے کے لیے دوڑتے پھرتے ہیں، یہی سزا ہے کہ قتل کر دیئے جائیں۔ یا سُولی پر چڑھا دیئے جائیں۔ یا ان

کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں، یا انہیں جلاوطن کر دیا جائے (یعنی جیسی کچھ سزا ان کے لیے ضروری ہو، انہیں دی جائے) یہ ان کے لیے دُنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لیے عذابِ عظیم ہے۔

جب نظامِ حکومت کے قیام کے بعد، سب سے پہلا اجتماعِ عظیم (حجِ اکبر) ہوا، تو اس میں اس حکومت کی طرف سے کچھ عام اعلانات کیے گئے جن میں بتایا گیا کہ اس حکومت کی پالیسی اور امورِ خارجہ میں مسلک کیا ہوگا۔ اس ضمن میں جو سب سے پہلا اعلان کیا گیا، اس کے الفاظ یہ تھے۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۞ (۹/۱)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) جن مشرکوں کے ساتھ تم نے (صلح و امن کا) معاہدہ کیا تھا، اب ان کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے بری الذمہ ہونے کا اعلان ہے!

پھر تیسری آیت میں ہے۔

وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ۬ وَ رَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ (۹/۳)

اور "اللہ اور اس کے رسول" کی طرف سے حج کے بڑے دن عام منادی کی جاتی ہے کہ اللہ مشرکوں سے بری الذمہ ہے اور اس کا رسول بھی (یعنی ان میں اور نظامِ حکومتِ خداوندی میں اب کوئی معاہدہ باقی نہیں رہا) پس اگر تم (اب بھی ظلم و شرارت سے) باز آجاؤ تو تمہارے لیے اس میں بہتری ہے۔ اور اگر نہ مانو گے تو جان رکھو، تم نظامِ حکومتِ خداوندی کو عاجز نہیں کر سکتے۔ اور (پیغمبرِ اسلام!) جو لوگ کفر کی راہ چل رہے ہیں انہیں عذابِ دردناک کی خوشخبری سُنا دو۔

پھر ساتویں آیت میں ہے۔

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۞ (۹/۷)

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ (ان) مشرکوں کا عہد اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک عہد ہو؟ ہاں جن لوگوں کے ساتھ تم نے مسجدِ حرام کے قریب (حدیبیہ میں) عہد و پیمان باندھا تھا (اور انہوں نے اسے نہیں توڑا، تو ان کا عہد ضرور عہد ہے۔ اور) جب تک وہ تمہارے ساتھ (اپنے عہد پر) قائم رہیں تم بھی ان کے ساتھ اپنے عہد پر قائم رہو۔ اللہ انہیں دوست رکھتا ہے جو (اپنے تمام کاموں میں) متقی ہوتے ہیں۔

"اللہ اور رسول" سے مُراد مرکزِ نظامِ اسلامی ہے

غور کیجئے۔ یہ تمام معاہدات اسلامی حکومت کے ساتھ تھے اور اسی حکومت کے نمائندہ کی طرف سے یہ اعلانات ہو رہے تھے، لیکن انہیں اللہ اور رسولؐ کے منشورات کہا گیا ہے۔ اس تبیانِ حقیقت سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں کی توجہات کو اس نقطۂ ماسکہ کی طرف مرکوز کیا جائے کہ اگرچہ یہ تمام احکام رسولؐ کی طرف سے صادر ہو رہے ہیں، لیکن درحقیقت یہ اللہ کے احکام ہیں، اس لیے کہ یہ نظامِ حکومتِ خداوندی کے مرکز کی طرف سے نافذ ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں دین کے غلبہ و تمکن اور حزب اللہ کی کامیابی و ظفر مندی کے متعلق متعدد مقامات پر وعدے کیے ہیں۔ اس غلبہ و کامیابی کے متعلق فرمایا کہ یہ اللہ اور رسولؐ کی کامیابی ہے۔

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِىْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ قَوِىٌّ عَزِيْزٌ ۝ (۵۸/۲۱)

اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرا رسول ہی غالب رہیں گے۔ بلاشبہ اللہ قوت و غلبہ والا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ غلبہ اور تسلط اسلامی حکومت ہی کا تمکن و تسلط تھا، ورنہ اللہ تو ہر جگہ غالب ہے۔ لہٰذا اللہ اور رسولؐ کے غلبہ سے مراد نظامِ اسلامی کے غلبہ ہی سے ہے۔ جب مسلمانوں کی مملکت قائم ہو گئی (جسے حکومتِ خداوندی یا اسلامی نظام کہا جاتا ہے) تو ظاہر ہے کہ اس حکومت کی جو آمدنی ہوتی تھی وہ مملکت کی آمدنی تھی۔ اسے بھی قرآنِ کریم نے "خدا اور رسول" کی دولت کہہ کر پکارا ہے (۸/۱)۔ مالِ غنیمت کی تقسیم کے سلسلہ میں کہا کہ اس کا خمس (پانچواں حصہ) "اللہ اور رسول" کے لیے الگ کر لو (۸/۴۱)۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد یہی ہے کہ یہ پانچواں حصہ امورِ مملکت کی سرانجام دہی کے لیے صرف کیا جائے گا۔

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ

اب سورۂ نساء کی اس آیت کی طرف آئیے جس میں یہ نظام وضاحت سے بیان ہوا ہے (اور جس کے غلط مفہوم نے بدقسمتی سے ملت کو بہت سے مغالطوں

میں اُلجھا رکھا ہے) ارشاد ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۵۹﴾

اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اللہ کی اطاعت کرو، اللہ کے رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی اطاعت کرو جو تم میں صاحبِ حکم و اختیار ہوں۔ پھر اگر ایسا ہو کہ کسی معاملہ میں باہم جھگڑ پڑو، (یعنی اختلاف و نزاع پیدا ہو جائے) تو چاہیئے کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو (اور جو کچھ وہاں سے فیصلہ ملے اسے تسلیم کر لو) اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان (یقین) رکھتے ہو (تو تمہارے لیے راہِ عمل یہی ہے)۔ اسی میں تمہارے لیے بہتری ہے اور اسی میں انجام کار کی خوبی ہے (کیونکہ اختلاف اور نزاع کے اُبھرنے کا موقع نہیں رہتا اور فتنوں فسادوں کا دروازہ بند ہو جاتا ہے)۔

اس آیت کا صحیح مفہوم کیا ہے، اسے چند سطریں آگے چل کر بیان کیا جائے گا لیکن جو مفہوم ہمارے ہاں عام طور پر لیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ:

(۱) اللہ کی اطاعت سے مراد ہے قرآن کی اطاعت۔

(۲) رسول کی اطاعت سے مراد ہے احادیث کی اطاعت، اور

(۳) اولی الامر کی اطاعت سے مراد ہے حکومت کی اطاعت۔

اور اس کے بعد مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ اگر تمہیں کسی معاملہ میں حکومت سے اختلاف ہو تو اُسے دُور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن اور حدیث کی رُو سے حکومت کے ساتھ مناظرہ کیا جائے۔ اور جو ہار جائے فیصلہ اس کے خلاف ہو جائے۔

اس مفہوم کی رُو سے غور کیجیے کہ (علاوہ دیگر امور) دنیا میں کوئی نظامِ حکومت اس طرح سے قائم بھی رہ سکتا ہے جس میں حالت یہ ہو کہ حکومت ایک قانون نافذ کرے اور جس کا جی چاہے اس کی مخالفت میں کھڑا ہو جائے اور قرآن و حدیث کی کتابیں بغل میں داب کر مناظرہ کا چیلنج دیدے! اس آیتِ مقدسہ کا مفہوم بالکل واضح

ہے۔ اس میں اللہ اور رسولؐ سے مراد مرکزِ ملّت یعنی نظامِ خداوندی کی (CENTRAL AUTHORITY) اور اولوا الامر منہم سے مفہوم ہیں افسرانِ ماتحت۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ اگر کسی مقامی افسر سے کسی معاملہ میں اختلاف ہو جائے، تو بجائے اس کے کہ وہیں مناقشات شروع کر دو، امرِ متنازعہ فیہ کو مرکزی حکومت کے سامنے پیش کر دو (اسے مرکزی حکومت کی طرف (REFER) کر دو)۔ مرکز کا فیصلہ سب کے لیے واجب التّسلیم ہوگا، یعنی اس نظام میں مقامی افسروں کے فیصلوں کے خلاف مرکزی عدالتِ عالیہ میں مرافعہ (اپیل) کی گنجائش باقی رکھی گئی ہے۔ یہ کہ اولوا الامر سے مُراد مقامی حکام ہیں، اسی سورۃ کی ایک دوسری آیت سے واضح ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰۤى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ (۴/۸۳)

اور جب ان لوگوں کے پاس امن یا خوف کی کوئی خبر پہنچ جاتی ہے، تو یہ (فوراً) اسے لوگوں میں پھیلا دیتے ہیں۔ اگر یہ اسے (لوگوں میں پھیلانے کی جگہ) اللہ کے رسول کے سامنے، اور ان لوگوں کے سامنے جو ان میں صاحبِ حکم و اختیار ہیں، پیش کرتے، تو جو بات کی تہ تک پہنچنے والے ہیں، وہ اس کی حقیقت معلوم کر لیتے (اور عوام میں تشویش نہ پھیلتی)۔

یعنی اگر اس قسم کا واقعہ مدینہ میں ظہور پذیر ہو تو اس کی اطلاع رسولؐ اللہ کو دی جائے اور اگر کہیں باہر ہو تو مقامی حکّام کو اس سے مطّلع کیا جائے۔ اس سلسلے میں قرآن کریم سے متعدّد آیات پیش کی جا سکتی ہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ مقصد پیشِ نظر کے لیے اتنی آیات ہی کافی ہیں[1]۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ نظامِ قرآنی میں اطاعت، مرکزِ ملّت کی ہے اور چونکہ یہ مرکز قوانینِ خداوندی کی تنفیذ کرتا ہے اور سب سے پہلا مرکز رسولِ اکرمؐ کی ذاتِ گرامی تھی، اس لیے قرآنِ کریم میں مرکزِ ملّت کو "اللہ اور رسول" کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یاد رکھیے! "مرکزِ ملّت سے مراد مسلمانوں کی ہر حکومت کا سربراہ نہیں۔ اس سے مراد اس حکومت کا سربراہ یا مرکزی اتھارٹی ہے جو قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنے کے لیے قائم ہو۔ اس حکومت کو سب سے پہلے خود نبیٔ اکرمؐ نے قائم فرمایا تھا اور وہی اس کے اوّلین سربراہ تھے۔

---

[1] جو حضرات زیادہ تفصیل چاہتے ہوں، وہ میری کتاب "اسلام کیا ہے؟" کا مطالعہ فرمالیں۔

ہم نے یہ دیکھ لیا کہ رسولؐ کی دوسری حیثیت امامت یا امارت (مرکزِ ملت) کی ہے۔ اس حیثیت سے

جماعت

وہ تمام فرائضِ حکومت انجام دے گا۔ لیکن اس حکومت میں اس کی حیثیت قوانین الٰہیہ کے نافذ کرنے والے کی ہوگی، واضعِ قوانین کی نہیں ہوگی۔ یہ مرکز ہوگا اور اس دائرہ کا محیط، ملتِ اسلامیہ جس کے ذریعے خدا کی حکومت دنیا میں متمکن ہوگی۔ اس لیے کہ کوئی نظام بلا جماعت چل نہیں سکتا۔ قرآنِ کریم نے نظامِ دین کے ان تینوں عناصر کی خود تصریح کر دی ہے۔ سورۃ الانفال میں ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (۸/۶۴)

اے رسولؐ! اللہ تیرے لیے، اور ان مومنوں کے لیے جو تیرے پیچھے چلنے والے ہیں، کفایت کرتا ہے۔

یعنی اقتدارِ اعلیٰ اللہ کا، اس کے احکام صادر کرنے والا رسول بہ حیثیت مرکزِ نظام' اور ان احکامات کی عملی تنفیذ کرنے والی جماعت، ملتِ اسلامیہ۔

نبیٔ اکرمؐ نے اس جماعت کی تعمیر و تشکیل کس طرح سے کی، اس کا ذکر ذرا آگے چل کر آئے گا۔ اس وقت

جماعت کی اہمیت

صرف یہ دیکھنا ہے کہ اس نظام کے اقنومِ ثلاثہ میں سے اس رکن (یعنی جماعت مومنین) کی کیا اہمیت ہے؟ نبیٔ اکرمؐ کی خصوصیتِ کبریٰ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ وہ دُنیا میں معروف (احکامِ خداوندی) کا حکم دے گا اور منکرات (غیر خداوندی قوانین و دساتیر) کو روکے گا۔

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ (۷/۱۵۷)

جو الرّسول کی پیروی کریں گے کہ نبیٔ اُمّی ہوگا اور اس کے ظہور کی خبر اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھی پائیں گے، وہ انہیں معروف کا حکم دے گا منکر سے روکے گا۔

یہی فریضہ جماعتِ مومنین کا ہے۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ (۳/۱۱۰)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) تم تمام اُمتوں میں "بہتر اُمت" ہو جو لوگوں (کی بھلائی) کے لیے ظہور

میں آئی ہے. تم معروف کا حکم دینے والے اور منکر سے روکنے والے ہو۔

سورۃ توبہ میں ہے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (۹/۷۱)

اور جو مرد اور عورتیں مومن ہیں تو وہ سب ایک دوسرے کے کارساز و رفیق ہیں. معروف کا حکم دیتے ہیں، منکر سے روکتے ہیں، صلوٰۃ کا نظام قائم کرتے ہیں اور نوعِ انسانی کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں اور (ہر حال میں) اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں. سو یہی لوگ ہیں جن پر اللہ عنقریب رحمت فرمائے گا. یقیناً اللہ سب پر غالب اور (اپنے تمام کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے۔

غور کیجئے! ان آیات میں معروف کے حکم دینے اور منکرات سے روک دینے کا ارشاد ہے اور یہ ظاہر ہے کہ حکم وہی جماعت دے سکتی ہے جس کے پاس حکومت و قوت ہو. بلاقوت حکم، وعظ رہ جاتا ہے اور بس! اسی لیے دوسری جگہ فرمایا کہ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" "تمکن فی الارض (حکومت) سے ہوگا۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝ (۲۲/۴۱)

یہ (مسلمان) وہ ہیں کہ اگر ہم نے انہیں زمین میں صاحبِ اقتدار کر دیا (یعنی ان کا حکم چلنے لگا) تو وہ نظامِ صلوٰۃ قائم کریں گے، نوعِ انسانی کو نشوونما دینے میں سرگرم ہوں گے، معروف کا حکم دیں گے، منکر سے روکیں گے. اور ان کے تمام معاملات کا فیصلہ آخر الامر قوانینِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔

اسی کا نام استخلاف فی الارض ہے (۲۴/۵۵)۔ اسی کو وراثتِ ارض کہہ کر پکارا گیا ہے، جو صالحین کا حصہ ہے (۲۱/۱۰۵)۔

یہاں تک ہم نے دیکھ لیا کہ الدّین سے مراد ہے ایسا نظامِ زندگی جس میں قوانینِ خداوندی کی اطاعت ہو. اس نظام کے بنیادی عناصر حسب ذیل ہیں۔

(۱) قوانینِ خداوندی کا مجموعہ — قرآنِ کریم جو اس نظام کا ضابطہ ہے۔

(۲) اس نظام کی مرکزی اتھارٹی جو ان قوانین کو عملاً نافذ کرے گی۔ یہ اتھارٹی، سب سے پہلے خود نبئ اکرمؐ تھے۔
(۳) وہ جماعتِ مؤمنین جو اس نظام کے قیام اور استحکام کا موجب ہوگی۔

قرآنی احکام کی تقسیم

جہاں تک قرآنِ کریم کے احکام کا تعلق ہے، ان کی صُورت یہ ہے کہ کہیں آپ کو ایسے احکام ملیں گے جن کی جزئیات تک بھی خدا نے خود ہی متعیّن کر دی ہیں، اور کہیں ایسے جنہیں صرف اصُولی طور پر بیان کیا گیا ہے۔ بے شک قرآن ان تمام اصولوں کو جو سفرِ زندگی میں انسانی راہ نمائی کے لیے ضرُوری ہیں، بیان کرتا ہے۔

وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۝ (۱۶/۸۹)

اور ہم نے تجھ پر الکتاب نازل کی، (دین کی) تمام باتیں بیان کرنے کے لیے اور اس لیے کہ مسلمان کے لیے راہ نمائی ہو اور رحمت اور خوشخبری۔

اور واضح طور پر بیان کرتا ہے۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝ (۵/۱۵)

اللہ کی طرف سے تمہارے پاس (حق کی) روشنی آچکی ہے اور ایسی کتاب آچکی جو (اپنی ہدایتوں میں نہایت) روشن کتاب ہے!

اور ہر بات کو نکھار کر بیان کرتا ہے۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ (۶/۱۱۴)

کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو حَکم تلاش کروں، حالانکہ (اللہ وہ ہے) جس نے تمہاری طرف وہ کتاب نازل کی ہے جو ہر بات کو نکھار کر بیان کرتی ہے۔

ایک اہم بنیادی بحث

لیکن یہ حقیقت بادنیٰ تعمق سمجھ میں آسکتی ہے کہ وہ بجز اُن جزئیات کے جن کی تعیین اس نے خود کر دی ہے، احکام کو اصُولی طور پر بیان کرتا ہے۔ تفصیل و تبیان کے یہ معنی نہیں کہ ہر حکم کی جزئیات و فروعات بھی متعیّن کر دی جائیں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ جو کچھ بیان کیا جائے، کھول کر بیان کیا جائے۔ اصُولی بیان بھی مجمل یا مفصّل اور مبہم یا بیّن ہو سکتا ہے۔ قرآنی اسلوبِ بیان مجمل اور مبہم نہیں مفصّل اور مبین ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے کہ

قرآن میں بعض احکام کی جزئیات تک بھی بیان کر دی گئی ہیں (مثلاً نکاح وطلاق وغیرہ سے متعلق احکام) اور دیگر احکام کے سلسلہ میں صرف اصول بیان کیے گئے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ قرآن تمام نوعِ انسانی کے لیے قیامت تک کے لیے ضابطۂ حیات ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۱/۲۷﴾

یہ (قرآن) تمام اقوامِ عالم کے لیے ضابطہ ہے۔

تمام انسانوں کے لیے:

اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ ﴿۳۹/۴۱﴾

(اے رسولؐ!) بلاشبہ ہم نے تجھ پر الکتاب (جو) حق ہے تمام نوعِ انسان (کی ہدایت و راہ نمائی) کے لیے اتاری ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ انسانی زندگی کے اصولی تقاضے ایسے ہیں جن میں کبھی تغیّر وتبدّل نہیں ہوتا لیکن اس کی تمدّنی زندگی کے ایسے تقاضے بھی ہیں جن میں احوال وظروف کے بدلنے سے تبدیلی آجاتی ہے۔ یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ چودہ سو سال پیشتر کے اہلِ عرب کی مدنیّت کے مسائل اور ہمارے موجودہ زمانہ کے مسائل کی جزئیات میں بیّن فرق آچکا ہے۔ ہمارے زمانہ کے معاشی مسائل بین الاقوامی تعلقات، سیاسی مصالح، عمرانی پیچیدگیاں اور اسی نوع کے دیگر مسائل ایسے ہو چکے ہیں جو اُس زمانہ کے لوگوں کے تصور میں بھی نہیں آسکتے تھے۔ انسان ان مسائل و معاملات کا حل، حق وصداقت اور عدل وانصاف کی رُو سے چاہتا ہے تاکہ انسانی ذات کی صلاحیتوں کو اُبھرنے اور نشوونما پانے کا موقع ملے اور انسانیت اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اپنی معراجِ کمال تک جا پہنچے۔ قرآن ان مسائل کے حل کے لیے اصولی قوانین عطا کرتا ہے جن کی جزئیات اپنے اپنے زمانہ کے مقتضیات کی روشنی میں متعیّن کی جاسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر یُوں سمجھئے کہ وہ فٹ بال کے میدان میں چند حدود وخطوط متعیّن کر کے کھلاڑیوں کو میدان میں چھوڑ دیتا ہے کہ وہ ان حدود وقیود کے اندر رہتے ہوئے اپنی اپنی صوابدید کے مطابق گیند کو اس کی منزلِ مقصود تک لے جائیں۔ زندگی کے "کھیل کے میدان" میں قرآن ان خطوط کو حدود اللہ کہتا ہے۔

وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ﴿۶۵/۱﴾

اور یہ اللہ کی (قائم کردہ) حدیں ہیں۔

فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ (۲/۱۸۷)

بس (اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) چاہیئے کہ ان (حدود) کے قریب نہ ہو جاؤ مبادا ان سے متجاوز ہو جاؤ۔

وہ ان مستقل حدود سے زندگی کا راستہ متعین کر دیتا ہے اور اس راستہ کے اندر انسانوں کو آزاد چھوڑ دیتا ہے کہ وہ وقتی اور ہنگامی حوادث و مسائل کے حل خود دریافت کریں۔ یوں سمجھئے کہ وہ اصولی قوانین وضع کر دیتا ہے تاکہ ان کے اندر رہتے ہوئے انسان اپنے اپنے زمانہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تبعی احکام (BY-LAWS) خود متعین کرتا جائے۔ مثلاً قرآنِ کریم نے ربٰو (سود) کی حرمت کا حکم دیا ہے تو ربٰو کی تمام شکلوں کو گنا کر اس کے حکم کا حصر نہیں کر دیا، بلکہ اسے غیر متعین چھوڑ دیا گیا ہے۔ چنانچہ آج ہمارے زمانہ میں ربٰو کی ایسی ایسی شکلیں پیدا ہو رہی ہیں جو نزولِ قرآن کے زمانہ میں کہیں موجود نہ تھیں۔ یا مثلاً اس نے حکومتِ اسلامیہ کا فریضہ یہ بتایا ہے کہ وہ "زکوٰۃ" کا انتظام کرے گی (زکوٰۃ کے معنی ہیں سامانِ نشوونما مہیا کرنا) لیکن اس نے اس کی تفصیل بیان نہیں کی کیونکہ انسانی نشوونما کے تقاضے اور ان کے پورا کرنے کے اسباب و ذرائع ہر دور میں مختلف ہوتے ہیں۔

قرآنِ کریم نے جن احکام کی جزئیات بھی خود ہی متعین کر دی ہیں، وہ سب غیر متبدل ہیں۔ ان میں کسی کو کچھ اختیار حاصل نہیں ہے۔ اس سے مفہوم یہ ہے کہ وہ جزئیات بھی ایسی ہیں جن میں مرورِ زمانہ سے کسی تغیر و تبدل کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن جن احکام کو صرف اصولاً بیان کیا ہے، اس سے مقصود یہ ہے کہ ان کی جزئیات زمانہ کے تقاضوں کے ماتحت بدلی جا سکتی ہیں۔ اسلامی مملکت کا کام یہ ہے کہ وہ قرآنی احکام اور اس کی متعین فرمودہ جزئیات کو نافذ کرے اور اصولی احکام کی جزئیات اپنے زمانہ کے مقتضیات کی روشنی میں مرتب کرے۔ ان احکامات کی تنفیذ اور تبعی احکام کی ترتیب و تدوین کا کام ملت کے اربابِ فکر و نظر کے مشورہ سے طے پائے گا۔ چنانچہ نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ:

وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ○ (۳/۱۵۹)

اور معاملاتِ حکومت میں ان سے مشورہ کر لیا کرو۔ پھر جب ایسا ہو کہ تم نے کسی بات کا عزم کر لیا، تو چاہیئے کہ خدا پر بھروسا کرو (اور جو کچھ ٹھان لیا ہے اس پر کاربند ہو جاؤ) یقیناً اللہ انہی لوگوں کو

دوست رکھتا ہے جو اس پر بھروسا کرنے والے ہیں۔

دوسری جگہ ہے:

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ص وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ص وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۴۲/۳۸﴾

اور (مومن وہی ہیں) جنہوں نے اپنے پروردگار کی پکار کا جواب دیا اور صلوٰۃ کا نظام قائم کیا اور جن کے امورِ حکومت آپس کے صلاح (مشورہ)[1] سے طے پاتے ہیں اور ہم نے انہیں جو کچھ دے رکھا ہے، اُسے نوعِ انسان کی منفعت کے لیے خرچ کرتے ہیں!

گزشتہ اوراق میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ

(۱) اسلامی نظامِ حکومت میں، حقِ حکومت صرف اللہ کو حاصل ہے۔

(۲) اللہ کی یہ اطاعت، اس کے قوانین کی اطاعت ہے۔

(۳) یہ قوانین قرآن کے دفتین میں محفوظ ہیں۔

(۴) ان قوانین کا انسانوں تک پہنچانا رسُول کے ذمہ تھا۔ یہ اس کی رسالت تھی۔

(۵) اس کے علاوہ ان قوانین کا نفاذ بھی اس کے ذمہ تھا۔ یہ منصبِ امارت تھا۔

(۶) قرآن میں ایسے احکام بھی ہیں جن کی جزئیات قرآن نے خود متعین نہیں کیں۔

---

[1] واضح رہے کہ اس مشاورت اور دورِ حاضرہ کے جمہوری آئین میں بنیادی فرق ہے۔ دورِ حاضر کی جمہوریت میں، قانون بنانے والی اتھارٹی (خواہ وہ نمائندگانِ قوم پر مشتمل پارلیمان ہو یا اس پارلیمان کی مقرر کردہ کوئی اور جماعت) اس بات کا پورا پورا اختیار رکھتی ہے کہ وہ جس قسم کے چاہے قوانین بنائے اور جن قوانین کو چاہے منسوخ کر دے یا ان میں ردّ و بدل کر دے۔ اس کے برعکس، اسلامی جمہوریت میں قانون سازی کا یہ اختیار، بلاحدود و قیود نہیں ہوتا۔ اس میں مجلسِ قانون ساز، قرآن کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی قوانین بنا سکتی ہے۔ وہ نہ ان حدود سے تجاوز کر سکتی ہے، نہ ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل کر سکتی ہے۔

اسلامی نظام میں اس "مشاورت" کا طریقِ کار کیا ہوگا، اسے ملّتِ اسلامیہ، اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، خود طے کر سکتی ہے۔

(۷) یہ جزئیات مرورِ زمانہ سے بدلتی رہیں گی اور مرکزِ ملّت (نظامِ اسلامی) ان کا تعیّن کرتا رہے گا۔

(۸) ان کا تعیّن، اربابِ فکر و نظر کی مشاورت سے ہوگا۔

(۹) ان کا تعیّن سب سے پہلے، نبی اکرمؐ نے بہ حیثیتِ امامِ ملّت، اربابِ ملّت کی مشاورت سے کیا۔

رسولؐ اللہ کے بعد

اب آگے چلئے۔ یہ ظاہر ہے کہ رسولؐ اللہ نے ایک دن اس دنیا سے تشریف لے جانا تھا۔

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ۝ (۳۹/۳۰)

لیکن دین کا نظام، رسولؐ اللہ کی حیاتِ ارضی تک محدود نہیں تھا۔ اسے قیامت تک کے لیے تمام نوعِ انسانی کے واسطے متعیّن کیا گیا تھا۔ اس لیے حضورؐ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد بھی اسے اسی طرح قائم رہنا تھا۔

رسولؐ کے بعد اس نظام کو اس جماعت نے آگے چلانا تھا جسے وراثتِ کتابُ اللہ کے لیے منتخب کیا گیا تھا (۳۵/۳۲)، یعنی اُمّتِ مُسلمہ نے۔ دیکھئے، سورۂ آلِ عمران میں اس حقیقت کو (کہ اس نظام کو رسولؐ اللہ کی وفات کے بعد بھی علیٰ حالہٖ قائم رہنا ہے) کیسے دلنشین انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ؕ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝ (۳/۱۴۳)

(تم اپنے نظام کو شخصیتوں سے وابستہ نہ سمجھو۔ شخصیتیں تو آنی جانی ہوتی ہیں۔ اس باب میں، اور تو اور خود محمدؐ جیسی عظیم شخصیت کا بھی یہ عالم ہے کہ وہ خدا کا پیغام پہنچانے والا ہے۔ اس سے پہلے، اسی طرح، اور بہت سے پیغام پہنچانے والے آئے اور اپنا اپنا فریضہ ادا کر کے چلے گئے۔ لہٰذا، اگر یہ پیغام رساں (محمدؐ) بھی کل کو مر جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم سمجھو گے کہ اس کی موت سے یہ سارا نظام ختم ہو گیا؟ اور اس کے بعد تم اپنی قدیم روش کی طرف پلٹ جاؤ گے۔ یاد رکھو! جو ایسا کرے گا وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑے گا خود اپنا ہی نقصان کرے گا، لیکن جو اس صحیح روش پر قائم رہے گا تو اُسے اس کی کوششوں

کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔

انتخابِ امیر

اِس نظام میں سب سے اہم مقام امیرِ ملّت کا ہوگا۔ رسُولؐ مامور من اللہ تھا، اس لیے اس کی امارت و امامت کبھی لوگوں کے انتخاب کی رہینِ منت نہ تھی۔ وہ بحیثیتِ رسول، امیرِ ملّت اور مرکزِ امّت تھا۔ لیکن اس کے بعد یہ حیثیت تو کسی کو حاصل نہ ہوگی۔ اب اُمّت میں کوئی رسول نہیں ہوگا۔ اس لیے اب ملّت اپنا امام خود منتخب کرے گی اور معیارِ انتخاب تقویٰ ہوگا کہ اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ [۴۹/۱۳] خدا کا مقرر کردہ معیار ہے۔ اب یہ امام رسُول کا جانشین (خلیفۃ الرّسُول) ہوگا اور اس کی اطاعت بمنزلہ "اللہ اور رسول کی اطاعت" کے ہوگی، اس لیے کہ جیسا پہلے بیان ہو چکا ہے "اللہ اور رسُول" سے مراد ہی مرکزِ ملّت ہے۔ اب احکامِ الٰہیہ کی تنفیذ اس کا فریضہ ہوگا اور ان احکام کی اطاعت اس کی وساطت سے ہوگی[1]۔ وہ سب سے پہلے خود مُسلم (ان فیصلوں کو تسلیم کرنے والا) اور عبدِ مومن (خدا کا تابع بندہ) ہونے کی حیثیت

خُدا اور رسُول کی اطاعت

سے ان احکامات پر خود عمل پیرا ہوگا اور اس کے بعد دوسروں سے اس کی پیروی کرائے گا۔ یہ اطاعت جیسا کہ اُوپر کہا گیا ہے بمنزلہ خدا اور رسول کی اطاعت کے ہوگی (کون کہہ سکتا ہے کہ خلیفۃ الرّسول حضرت ابوبکر صدّیقؓ کے احکامات کی اطاعت بمنزلہ خدا اور رسُول کی اطاعت کے نہ تھی) وہ ان احکام کو جن کی جزئیات قرآن نے متعین کر دی ہیں، اسی طرح نافذ کریگا۔ لیکن جن امور کی جزئیات قرآن نے متعین نہیں کیں، وہ اپنے زمانے کے مقتضیات کی روشنی میں قرآن کے اصولی حکم کے ماتحت، ان امُور کے تصفیہ کے لیے تبعی احکام (BY-LAWS) وضع کرے گا۔ اس وضعِ احکام میں وہ ملّت سے مشورہ بھی کرے گا اور پیشرو مراکزِ ملّت (PREDECESSORS) کے فیصلوں سے مستفید بھی ہوگا۔ وہ فیصلے اس کے لیے نظائر (PRECEDENTS) ہوں گے جو اُسے اچھے نمونہ (اسوۂ حسنہ [۳۳/۲۱]) کا کام دیں گے۔ وہ ان نظائر کو سامنے رکھ کر ایسے جزئی احکام وضع کرے گا جو اس کے زمانہ کے تقاضوں پر منطبق

---

[1] واضح رہے کہ "مرکزِ ملّت" کے متعلق یہ ضروری نہیں کہ تمام اختیارات ایک فرد کے سپرد کر دیئے جائیں۔ امّت کے مشورہ سے، یہ اختیارات، ایک فرد کے بجائے، ایک جماعت کے سپرد بھی کیے جا سکتے ہیں۔ یہ انتظامی امور ہیں جن کا فیصلہ ہر زمانے کے مسلمان، اپنی اپنی مصلحتوں کے مطابق خود کر سکتے ہیں۔ اس میں غیر متبدّل شرط یہ ہے کہ اس مرکز کے فیصلے، حدودِ خداوندی سے کسی صورت میں بھی نہ ٹکرائیں، بلکہ وہ حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے کیے جائیں اور جن کے سپرد یہ کام کیے جائیں، وہ خود قوانینِ خداوندی کے سب سے زیادہ پابند ہوں۔

ہو سکیں. اب یہی "شریعتِ اسلامیہ" اور مسلکِ ملّت ہو گا جس سے انحراف جہنم میں لے جائے گا (۱۱۵/۴)۔ چونکہ یہی اسلامی نظام تھا اور یہی دین کا اصل الاصول، اس لیے نبی اکرمؐ نے تمسّک بالجماعت اور اطاعتِ امیر کے لیے

تمسّک بالجماعت

اتنی شدّت سے تاکید فرمائی ہے کہ کتبِ روایات میں متعدد تاکیدی ارشاداتِ گرامی ہمارے سامنے آتے ہیں. التزامِ جماعت کے متعلق حضورؐ نے فرمایا۔

انا امرکم بخمس اللہ امرنی بھن ۔ الجماعۃ ، والسمع ، و الطاعۃ ، والھجرۃ ، و الجھاد فی سبیل اللہ ، فانہ من خرج من الجماعۃ حین شبر فقد خلع ربقۃ الاسلام عن عنقہ الا ان یراجع ۔ ومن دعا بدعوی جاھلیۃ فھو من حثیٔ جھنم قالوا یا رسول اللہ و ان صام و صلی ۔ قال و ان صلی وصام و زعم انہ مسلم۔

(روایت احمد و الحاکم)

(حضورؐ نے فرمایا کہ) میں تم کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا حکم مجھے اللہ تعالےٰ نے دیا ہے. جماعت، سمع، اطاعت، ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ یقین کرو، جو مسلمان ایک بالشت بھر جماعت سے الگ ہو گیا، تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا اور جس نے جاہلیت کی زندگی (یعنی انتشار و لامرکزیت کی زندگی) کی طرف دعوت دی تو اس کا ٹھکانا جہنم ہو گا. لوگوں نے پوچھا، یا رسُول اللہ اگرچہ ایسا شخص روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو. فرمایا، ہاں، اگرچہ وہ نماز بھی پڑھتا ہو اور روزہ بھی رکھتا ہو اور بزعمِ خویش اپنے آپ کو مسلمان بھی سمجھتا ہو.

غور فرمائیے کہ التزامِ جماعت کی کس قدر تاکید کی گئی ہے، اس لیے کہ اسلام کی بُنیاد ہی اس اصل پر قائم ہے. یہ نہ رہے تو دین ہی باقی نہیں رہتا. مسلم کی ایک روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

من خرج من الطاعۃ و فارق الجماعۃ فمات میتۃ الجاھلیۃ

لہ چونکہ یہ روایات منشاء قرآن کے عین مطابق ہیں اس لیے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ نے ایسا ہی فرمایا ہو گا. یہی ہمارے نزدیک کسی روایت کی صحت اور سُقم کا صحیح معیار ہے یعنی جو روایت قرآن کے خلاف نہ ہو اسے صحیح قیاس کیا جا سکتا ہے اور جو قرآن کے خلاف ہو وہ قطعاً غیر صحیح ہے، خواہ اسناد کے لحاظ سے اُسے کیسا ہی درجہ کیوں نہ دیا جائے؛

جو شخص اطاعت سے الگ ہو گیا اور جماعت کو چھوڑ بیٹھا تو وہ (اسلام کی نہیں) جاہلیت (زمانۂ قبل از اسلام) کی موت مر گیا۔

اس لیے کہ اطاعت سے نکل جانا، نظامِ اسلامی کے خلاف علَمِ بغاوت بلند کرنا ہے، جسے قرآن نے "اللہ اور رسولؐ" کے خلاف اعلانِ جنگ قرار دیا ہے اور اس کی سزا اس دنیا میں، سُولی ہے اور عاقبت میں جہنم (تفصیل پہلے گزر چکی ہے)۔ بخاری میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

لیس احدٌ یفارق الجماعة شبرا فیموت الا مات میتتهٗ جاهلیة۔

جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہو جائے گا اُس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔

یعنی صرف یہی نہیں کہ جماعت سے یکسر الگ ہو جائے، بلکہ یہ بھی کہ اگر جماعت کے فیصلوں سے ذرا (بالشت بھر) بھی الگ ہو جائے۔ تو بھی اس کی موت مُسلمان کی موت نہیں، کہ

ید الله علی الجماعة ومن شذّ شذّ فی النّار (ابن ماجہ)

اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے۔ جو جماعت سے الگ ہوا، وہ جہنم میں گرا۔

اِن ارشاداتِ گرامی سے معلوم ہو گیا کہ اسلام نام ہی اجتماعی زندگی (یعنی نظامِ دین کے ماتحت جماعتی زندگی) کا ہے۔ انفرادی زندگی اسلام کی زندگی نہیں، اس لیے کہ انفرادی طور پر "مذہب" تو باقی رہ سکتا ہے، دینؔ قائم نہیں رہ سکتا۔ اور اسلامؔ، دینؔ ہے مذہب نہیں ہے۔ جماعتی زندگی کا نظام، امامؔ (یا امیرؔ) کی وساطت سے قائم ہوتا ہے۔ اس لیے جماعتی زندگی اور اطاعتِ امیر لازم و ملزوم ہیں۔ اس باب میں بھی کُتبِ تاریخ و آثار میں نبیٔ اکرمؐ کے بہت سے ارشادات موجود ہیں۔ مثلاً آپؐ نے فرمایا کہ

من اتاكم وامركم جميع علی رجل واحد يريد ان يشق عصاكم او يفارق جماعتكم فاقتلوه۔ (مسلم)

جو شخص تمہارے پاس آئے دراں حالیکہ تمہارا نظام ایک امیر کے تابع قائم ہو، اور وہ چاہے کہ تمہارے جماعتی نظام میں تشتّت و افتراق پیدا کر دے، تو ایسے شخص کو قتل کر دو۔

کہ ـــــ اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۲/۱۹۱

اگر امیر کا کوئی فیصلہ ایسا بھی ہو جس کی اطاعت تم پر گراں گزرے، تو بھی اس کی اطاعت ضروری ہے اور اس کے فیصلے کے خلاف سرکشی بغاوت۔ اس لیے حضورؐ نے فرمایا کہ

من رائ من امیرہ شیئًا یکرھہٗ فلیصبر فانہٗ لیس یفارق الجماعۃ شبرا فیموت میتۃ جاھلیۃ۔ (بخاری مسلم)

جو شخص اپنے امیر میں کوئی ناپسندیدہ بات پائے تو اُسے اس کو برداشت کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ جو شخص جماعت سے بالشت بھر بھی الگ ہو گیا اور اسی حالت میں مر گیا تو اس کی موت جاہلیّت کی موت ہو گی۔

اسی طرح ایک دُوسری روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

انما لکم ما طابت بہٖ نفس امامہٖ۔

یعنی انسان کے لیے وہی ہے جس سے اس کا امام راضی ہو۔

امام کے فیصلہ کے خلاف تو دل میں کبیدگی تک پیدا ہونا قرآن کی رُو سے جرمِ عظیم ہے۔ اس کی اطاعت نہایت خندہ پیشانی اور بطیبِ خاطر ہونی چاہیئے کہ اس میں استبداد کو کوئی دخل نہیں۔ بخاری میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔

اسمعوا واطیعوا وان استعمل علیکم عبد حبشیٌ[1]۔

یعنی سنو اور اطاعت کرو، اگرچہ تم پر حبشی غلام ہی امیر کیوں نہ مقرر کیا گیا ہو۔

اس لیے کہ

فانما علیھم ما حملوا وعلیکم ما حملتم۔ (مسلم)

اربابِ امارت کے ذمّے وہ چیزیں ہیں جو ان کی ذمّہ داری میں ڈال دی گئی ہیں اور تمہارے ذمّے وہ چیزیں ہیں جو تمہاری ذمّہ داری میں ڈال دی گئی ہیں۔

امیر کا کام ہے کہ وہ احکامِ خداوندی سے صحیح استنباط کرے اور ان احکام کی تنفیذ بطریقِ احسن کرے۔ اس کے لیے وہ اپنے ربّ کے حضور جواب دِہ ہے، جماعت کے ذمّے یہ ہے کہ وہ مرکزِ ملّت کے فیصلوں کی اطاعت

---

[1] دوسری جگہ یوں ہے "ان امر علیکم عبد مجدع اسود" اگر کوئی بینی بریدہ حبشی غلام بھی تم پر امیر مقرر کر دیا جائے تو اس کی اطاعت کرو۔ (مسلم)

کرے۔ ہوسکتا ہے کہ بعض فیصلوں کے متعلق ان کے نتائج وعواقب بتادیں کہ ان میں اجتہادی غلطی تھی۔ اس لیے کہ یہ فیصلے بہرحال انسانی کوششوں کا نتیجہ تھے (اور ایسا خود رسول اللہ کے وقت بھی ہوا۔ تفصیل اس کی آگے چل کر آئے گی)، لیکن اُمّت کے لیے ان کی اطاعت لازمی ہے۔ فیصلہ کی غلطی ظاہر ہونے پر مرکز خود اس سے رجوع کرے گا اور دوسرا فیصلہ نافذ کردے گا۔ جماعتی زندگی اور اطاعتِ امیر کی اہمیت اس قدر ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

لا یحل لثلثة یکونوا بفلاة من الارض الا امروا علیھم احدھم۔ (مسند امام احمد بن حنبل)

یعنی ایسے تین شخصوں کے لیے جو زمین کے کسی گوشے میں بھی زندگی گزارتے ہوں جائز نہیں ہے مگر یہ کہ اپنے ہی میں سے ایک کو امیر بنالیں۔

یہ تمام تفاصیل مجموعی طور پر اُس قول میں آجاتی ہیں جو حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، جس میں آپؓ نے فرمایا کہ

لا اسلام الا بالجماعة۔ ولا جماعة الا بامارة ولا امارة الا بطاعة (جامع ابن عبدالعزیز)

اسلام جماعت کے بغیر کچھ نہیں۔ جماعت کی ہستی امیر کے ساتھ ہے اور امارت کا مدار اطاعت پر ہے۔

اس لیے کہ تفرقہ کی زندگی کو قرآن نے شرک قرار دیا ہے۔

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۙ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۝ ($\frac{30}{31-32}$)

اور (اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) تم شرک کرنے والوں میں سے مت ہوجاؤ، یعنی ان میں سے مت ہوجاؤ جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا اور الگ الگ فرقے بن گئے (اور حالت یہ ہوگئی کہ) ہر فرقہ اپنے طریق کار پر نازاں ہے۔

تفرقہ اندازی شرک ہے

دین میں فرقے پیدا کرنے والوں کے متعلق فرمادیا کہ ان سے رسولؐ کا کچھ سروکار نہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۚ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ○ (۶/۱۵۹)

(اے پیغمبرِ اسلام!) جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور الگ الگ گروہ بن گئے تمہیں ان سے کچھ سروکار نہیں۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے۔ پھر وہی بتلائے گا کہ جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کی حقیقت کیا تھی؟

اب ہم موضوعِ زیرِ نظر کے اہم، اور ساتھ ہی نازک ترین، گوشے کی طرف آرہے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ نبئ اکرمؐ کی ایک حیثیت رسالت کی تھی جس میں حضورؐ کا فریضہ پیغاماتِ الٰہیہ کو لوگوں تک پہنچانا تھا۔ دوسرا منصب

رسُول کی تیسری حیثیت

امارت و امامت (مرکزِ ملت) کا تھا، جس کی رُو سے نظم و نسقِ حکومتِ الٰہیہ کا فریضہ حضورؐ کے سپرد تھا۔ جیسا کہ اُوپر لکھا جا چکا ہے، اس تنظیم و تنسیق کا اہم پہلو ایک ایسی اہم جماعت کی تشکیل تھا جو اس نظام کو آگے چلائے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی جماعت کی تشکیل، تعلیم و تربیت کے بغیر ناممکن ہے۔ لہٰذا رسول کی تیسری حیثیت ایک معلّم و مربّی کی تھی چنانچہ قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر حضورؐ کے اس فریضہ کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ج وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ○ (۳/۱۶۴)

بلاشبہ یہ اللہ کا بڑا ہی احسان تھا کہ اس نے ایک رسول ان میں بھیج دیا، جو انہی میں سے ہے۔ وہ قوانینِ خداوندی کو ان کے سامنے پیش کرتا ہے اور ان کی ذات کی صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ (اس نے ہدایت کی راہ ان پر کھول دی) حالانکہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔

مزید تفصیل کے لیے آیات (۲/۱۲۹)؛ (۲/۱۵۱)؛ (۶۲/۲)؛ (۶۵/۱۱) بھی دیکھیے۔

تعلیم و تربیت سے مقصود

تعلیم و تربیت سے مفہوم یہی ہوتا ہے کہ انسان کی مضمر صلاحیتوں کو اُجاگر کیا جائے۔ اس کے جوہرِ خوابیدہ کو بیدار کر کے انہیں بروئے کار لایا

جائے اور انہیں صحیح نتائج مرتب کرنے کے قابل بنا دیا جائے۔ جو تعلیم ایسی نہیں، وہ نوشت و خواند (پڑھنا لکھنا) تو سکھاتی ہے، انسانی تربیت نہیں کرتی۔ خود تزکیہ کے معنی نشوونما دینا، بالیدگی کی صلاحیت پیدا کرنا، اوپر ابھارنا، آگے بڑھانا ہیں۔ ایک پودے کو کیسے نشوونما دیتے ہیں؟ اس طرح کہ اس کے لیے مساعد ماحول مہیا کیا جائے۔ جو چیزیں اس کی بالیدگی میں ممد و معاون ہو سکتی ہیں، انہیں مہیا کیا جائے اور پھر ان موانع کو دُور کیا جائے جو اس کی بالیدگی کی راہ میں حائل ہوں۔ اس طرح اُس بیج کے اندر جس قدر صلاحیتیں موجود ہیں، اُنھیں سر اُبھارنے کا موقع مل جائے گا اور یہی ننھا سا بیج ایک دن تناور درخت بن جائے گا۔ کَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ [۱۴/۲۴]۔ نفسِ انسانی کی دمیدگی و بالیدگی (تزکیہ) کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اسے صحیح تعلیم دی جائے اور اُن تمام موانع کو دُور کیا جائے جو اُسے اُبھرنے سے روکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ موانع محکومی اور غلامی کے وہ اَغلال و سلاسل ہیں جو انسانی حریتِ فکر اور آزادیٔ عمل کو چاروں طرف سے جکڑے رہتے ہیں اور اس کی فطری صلاحیتوں کو اُبھرنے کا موقع ہی نہیں دیتے۔

از غلامی دِل بمیرد، در بدن
از غلامی رُوح گردد بارِ تن

انسانی تاریخ پر نگاہ ڈالیے، وہ اسی سلسلۂ صید و صیاد کی مسلسل داستان نظر آئے گی۔ مستبد قوتیں اس قسم کا انتظام کر رکھتی ہیں کہ محکوم افراد کی فطری صلاحیتیں اُبھرنے نہ پائیں۔ وہ ان صلاحیتوں کو صرف اسی حد تک نمود و بالیدگی کا موقع دیتی ہیں جس حد تک وہ ان کے نظامِ استبداد کے لیے مفید ثابت ہو سکیں۔ اگر وہ اس سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں تو فوراً پر کاٹ دیئے جاتے ہیں۔

غلامی سے آزادی

فطرت کا قانون ہے کہ جن صلاحیتوں سے کچھ عرصہ تک کام نہ لیا جائے، وہ رفتہ رفتہ معطل ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد محکوم افراد ان صلاحیتوں سے عاری ہو جاتے ہیں اور حاکم قوم کی مشینری کے پُرزے بن کر رہ جاتے ہیں، جن میں نہ اپنا اختیار ہوتا ہے نہ ارادہ، نہ رائے ہوتی ہے نہ فکر۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ [۷/۱۷۹]۔ قرآن اس استبداد کو نوعِ انسانی کے خلاف سب سے بڑا جرم قرار دیتا ہے اور اس کی دعوتِ انقلاب کی غایت یہ ہے کہ دُنیا سے اس ظلمِ عظیم کو مٹا کر ایسا نظام نافذ کیا جائے جس میں ہر انسان کی فطری صلاحیتوں کو اُبھرنے، بڑھنے، پھولنے پھلنے کا پورا پورا موقع ملے۔ اسی کو وہ عدل کہتا ہے۔ چنانچہ وہ نبی اکرمؐ کی بعثت کا مقصد ہی یہ قرار دیتا ہے کہ آپ ان زنجیروں کو توڑیں گے جن میں انسانیت جکڑی ہوئی چلی آ رہی تھی اور ان بوجھوں کو اُتار پھینکیں گے

جن کے نیچے اس کی صلاحیتیں دبی ہوئی تھیں۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ ...... اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۷/۱۵۷)

(ہمارا یہ قانون، سابقہ انبیاء کی وساطت سے بھی ملتا رہا اور اب یہی قانون اس رسول کی معرفت آیا ہے۔ اس لیے اب ہماری ربوبیت اور رحمت ان لوگوں کے حصے میں آئے گی جو نظامِ ربوبیت قائم کرنے کے لیے) اس رسول کے پیچھے پیچھے چلیں گے جو (قرآن ملنے سے پہلے) اُمّی تھا (۲۹/۴۸) جس کی علامات (یہود و نصاریٰ) اپنے ہاں، تورات اور انجیل میں لکھی پاتے ہیں۔ وہ اُن باتوں کا حکم دیتا ہے جسے وحیِ خداوندی صحیح تسلیم کرتی ہے اور اُن امور سے روکتا ہے جو اس وحی کی رُو سے ناپسندیدہ ہیں۔ اسی وحی کی رُو سے، وہ زندگی کی تمام پاکیزہ، خوشگوار چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے اور ان خبائث کو حرام ٹھہراتا ہے (جن کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے ۶/۱۴۶)۔ اور (مذہبی پیشواؤں کے جن خود ساختہ آئین و شرائع اور مستبد حکام کے جور و ستم کے) جس بوجھ کے نیچے انسانیت دبی چلی آرہی تھی، اُس بوجھ کو اُس کے سر سے اُتارتا ہے۔ اور (تقلید و اوہام کی جن زنجیروں میں انسانی قلب و دماغ جکڑا ہوا تھا) ان زنجیروں کو توڑتا ہے (۷/۱۵۷)۔ اور اس طرح انسان کو صحیح آزادی عطا کرتا ہے کہ وہ (حدود اللہ کا پاس رکھتے ہوئے) اپنی سعی و کاوش سے جن بلندیوں تک جانا چاہے، چلا جائے۔ اس کے راستے میں کوئی روک نہ ہو۔

لہٰذا، جو لوگ اس کی نبوّت پر ایمان لے آئیں، اور اس کے پیش کردہ پیغام کے مخالفین کے لیے روک بن کر اُس کی مدافعت کریں، اس نظام کے قیام میں اس کی مدد کریں اور اس مقصد کے لیے اُس روشنی کو اپنے لیے چراغِ راہ بنائیں جسے اس رسول کی طرف نازل کیا گیا ہے، تو یہی لوگ ہوں گے جن کی کھیتیاں پروان چڑھیں گی اور جو کامیاب و کامران زندگی بسر کریں گے۔

ان اطواق و سلاسل کی ایک شکل تو مستبدانہ ملوکیت تھی، لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ گراں نشین و محکم گیر صورت، معتقدانہ برہمنیت (یعنی مذہبی پیشوائیت) تھی۔ ملوکیت کے آہنی شکنجوں کی گرفت انسان کے جسم تک ہوتی ہے۔ اگر وہ چاہے تو اپنی رُوح کو ان سے آزاد رکھ سکتا ہے۔ لیکن رُوحانیت کی غلامی کی جڑیں انسان کے قلب کی گہرائیوں میں جاگزین ہوتی ہیں۔ استبدادی زنجیروں کے لیے اربابِ حکومت کو بڑا اہتمام کرنا پڑتا ہے تاکہ ان کی کڑیاں

کمزور اور گمشدہ نہ ہو جائیں. لیکن مذہبی پیشوائیت کی زنجیروں کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اگر کہیں ان کی ایک کڑی بھی مضمحل ہو جائے تو یہ بندۂ بے دام اِن بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو اپنی مژگانِ عقیدت سے ایک ایک کر کے اٹھاتا اور تقدس کے ہاتھوں سے جوڑ کر پھر سے گلے میں پہن لیتا ہے. جسمانی غلام کو اگر اس کا آقا کہہ دے کہ جاؤ تم آزاد ہو، تو وہ خوشی کے ترانے گاتا اُس کے ہاں سے طرارے بھرتا ہوا نکل جاتا ہے اور پیچھے مڑ کر دیکھنا تک نہیں کہ کوئی واپسی کا اشارہ نہ کر دے لیکن اگر کوئی پیر اپنے مرید سے کہہ دے کہ جاؤ میں تجھے اپنے حلقۂ ارادت سے الگ کرتا ہوں تو اس پر یہ گھڑی قیامت کی ہوتی ہے. وہ روتا ہے، گڑگڑاتا ہے، التجائیں کرتا ہے کہ حضور! مجھے اپنی کفش برداریوں کی سعادت سے محروم نہ کیجیے. مجھے اس سنگِ آستان پر جبّہ سائی کے شرف سے تہی دامن نہ کیجیے. میں کہیں کا نہیں رہوں گا. میری دنیا اور عاقبت خراب ہو جائے گی، میں دونوں جہانوں میں راندۂ درگاہ ہو جاؤں گا. میں ہر جگہ ملعون و مرحوم قرار پا جاؤں گا. میرے آقا! مجھ پر رحم کیجیے! مجھے اپنے حلقۂ غلامی سے آزاد نہ کیجیے. میں تباہ ہو جاؤں گا، برباد ہو جاؤں گا. میرے لیے دنیا میں کوئی آسرا باقی نہیں رہے گا.

برہمنیت

اگر آپ میں احساسِ انسانیت کی کوئی رمق باقی ہے تو مستبد قوتوں کے احکام کی تعمیل آپ بہ جبر و اکراہ کرتے ہیں. آپ کی روح اس سے ابا کر سکتی ہے. آپ کے دل میں بغاوت کے آثار نمودار ہو سکتے ہیں. لیکن "بابِ روحانیت" سے صادر شدہ فیصلوں کے خلاف اگر آپ کے دل کی گہرائیوں میں بھی کہیں ناخوشگواری کا احساس تک پیدا ہو گیا تو آپ ڈرتے ہیں، کپکپاتے ہیں، خوف کھاتے ہیں کہ نہ معلوم حضرت قبلۂ عالمیان کی نگہِ عتاب آلود کیا قیامت برپا کر دے؟ اس لیے کہ آپ کا عقیدہ ہے کہ پیر صاحب دل کے حالات تک سے واقف! دزدیدہ نگاہوں کی لغزشوں تک سے باخبر ہوتے ہیں. اگر اُن کا کوئی حکم دین و دانش اور فراست و بصیرت کے خلاف بھی ہو تو بھی آپ یہ کہہ کر بلا چون و چرا اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں.

کہ سالک بے خبر نبود ز رسم و راہِ منزلہا!

غور کیجیے کہ مستبدانہ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی مملکت میں حریتِ فکر اور آزادیٔ رائے کس طرح باقی رہ سکتی ہے؟ اور ایسا ماحول انسانی صلاحیتوں کو اِذنِ برومندی کس طرح دے سکتا ہے؟ یہی وہ غلامی کی زنجیریں تھیں جنہیں توڑنے کے لیے نبیٔ اکرمؐ کی بعثت ہوئی اور آپ نے دنیا کو قرآن کا پیغامِ انقلاب آفریں دیا.

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ
دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

آپ نبیٔ اکرمؐ کی مختلف حیثیتوں پر غور کیجئے۔ سب سے پہلے آپؐ خدا کے رسول ہیں جن پر ایمان لانا شرطِ اسلام ہے۔ فرمائیے کہ روحانی اقتدار کا اس سے زیادہ بلند مقام بھی کوئی ہو سکتا ہے؟ پھر آپؐ ایک عظیم الشان سلطنت کے "حاکمِ اعلیٰ" بھی ہیں اور حاکم بھی اس انداز کے کہ آپؐ کے فیصلوں سے رُوگردانی تو ایک طرف، ان کے خلاف دل میں کبیدگی تک پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کے ساتھ ہی آپؐ کا فریضہ یہ بھی ہے کہ اپنی جماعت (ملت) میں حریتِ فکر و عمل پیدا کی جائے اور اس انداز سے کہ ان کی تمام انسانی صلاحیتیں نشوونما ارتقا کی انتہائی بلندیوں تک جا پہنچیں۔ غور کیجئے کہ یہ تینوں حیثیتیں (یا کم از کم پہلی دو کے مقابلہ میں یہ تیسرا فریضۂ حیات) کس قدر باہمدگر متخالف و متضاد ہیں۔ انسان موٹر کار (یا اسی قسم کی کوئی اور مشین) نہیں کہ اسے آگے چلایا جائے تو پیچھے کی طرف لے جانے والے تمام پُرزے خود بخود معطل ہو جائیں۔ انسانی شخصیت کے تمام پہلو بیک وقت کام کرتے ہیں۔ آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ ایک اُستاد کے اپنے بچے بالعموم نالائق کیوں رہ جاتے ہیں؟ اور ایک سپہ سالار کی عائلی زندگی کیوں عام طور پر کامیاب نہیں ہوتی؟ اس لیے کہ ایک معلم کا فریضہ جس نظم و ضبط کا متقاضی ہوتا ہے، پدری محبت اُس کے راستے میں حائل ہو جاتی ہے، اور ایک سپہ سالار، گھر میں بھی وہی نظامِ عسکریت رائج کرنا چاہتا ہے جس میں کوئی لچک نہیں ہوتی اور عائلی زندگی کی کامیابی کا راز لچک اور سمائی (ACCOMMODATING SPIRIT) میں ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کے مختلف تقاضوں اور فریضوں میں امتیاز قائم کرنا اور ان فاصل حدود کو عمر بھر اپنی اپنی جگہ پر رکھنا، بڑا دشوار ہے۔ جذبات کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ کر بھی دانش و بینش کے تقاضوں کو نظر انداز نہ ہونے دینا، معمولی بات نہیں۔

باچنیں زورِ جنوں پاسِ گریباں داشتم
در جنوں از خود نرفتن کارِ ہر دیوانہ نیست

رسولؐ کی زندگی کی عظمت کا راز ہی اس میں ہے کہ وہ اتباع و اطاعت کے اتنے بڑے نظام کو قائم رکھے ہوئے انسانی صلاحیتوں اور حریتِ فکر و عمل کی استعدادوں کو کہیں کچلے نہیں جانے دیتا۔ اس لیے کہ اس نظام میں اطاعت و انقیاد کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ہر شخص کو اس اطاعت میں اپنی ذات کے تقاضوں کی تسکین کا سامان نظر آتا ہے۔ جیسے دُھوپ میں چلنے والے مسافر سے کہہ دیا جائے کہ جلدی سے اس درخت کے سائے میں آ بیٹھو تو وہ اس "حکم" کی تعمیل میں کوئی گرانی محسوس نہیں کرے گا، بلکہ اُسے نظر آئے گا کہ اُس کے اپنے دل کی آواز تھی جس پر وہ عمل پیرا ہوا ہے۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ط (۲۲/۷۸)

اس نے تمہارے لیے دین میں کوئی گرانی نہیں رکھی۔

کا یہی مفہوم ہے۔

فاش می خواہی اگر اسرارِ دیں — جز بہ اعماقِ ضمیرِ خود مبیں
گر نہ بینی، دینِ تو مجبوری است — ایں چنیں دیں از خدا مہجوری است

بشریتِ رسول

اس اہم اور نازک فریضہ کی ادائیگی کے لیے سب سے پہلے رسول کی بشریت کو اس درجہ نمایاں طور پر سامنے لایا جاتا ہے کہ وہ جماعت کو محسوس کرا دیتا ہے کہ وہ انہی میں سے ایک ہے، کوئی مافوق البشر ہستی نہیں۔ قرآنِ کریم کی آیات پر غائر نگاہ ڈالیے اور پھر دیکھئے کس قدر عنواناتِ مختلفہ اور اسالیبِ متنوعہ سے اس گوشے کو بار بار سامنے لایا گیا ہے۔ انہیں بتایا جاتا ہے کہ رسول انہی میں سے ایک آدمی ہے۔

أَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا أَنْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ رَجُلٍ مِّنْهُمْ أَنْ أَنذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا أَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِندَ رَبِّهِمْ ط قَالَ الْكَافِرُونَ إِنَّ هَٰذَا لَسَاحِرٌ مُّبِينٌ ۝ (۱۰/۲)

کیا لوگوں کو اس بات پر اچنبھا ہوا کہ انہی میں سے ایک آدمی پر ہم نے وحی کیوں بھیجی؟ اس بات کی وحی کہ لوگوں کو (انکار و بدعملی کے نتائج سے) خبردار کردے اور ایمان والوں کو خوشخبری دے دے کہ پروردگار کے حضور ان کے لیے اچھا مقام ہے؟ کافروں نے کہا، یہ شخص بالکل جھوٹا ہے۔

دوسری جگہ ہے۔

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ع (۱۸/۱۱۰ نیز ۴۱/۶)

(اے پیغمبرِ اسلام! کہہ دے "میں تو اس کے سوا کچھ نہیں ہوں کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہوں۔ البتہ اللہ نے مجھ پر وحی کی ہے کہ تمہارا الٰہ وہی ایک ہے، اس کے سوا کوئی نہیں"۔

یہ رسول عام لوگوں کی طرح رہتا، سہتا، کھاتا، پیتا، چلتا، پھرتا ہے۔ دوسروں کو زمین کی، اور اپنے آپ کو آسمان کی مخلوق نہیں سمجھتا۔

وَقَالُوا مَالِ هَٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ ط لَوْلَا

أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونَ مَعَهُ نَذِيرًا ۙ (۲۵/۷)

اور (یہ منکرینِ حق یوں) کہتے ہیں کہ اس رسول کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ تو ہماری ہی طرح کھانا کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس کے ساتھ کوئی ڈرانے والا فرشتہ بھیج دیا جاتا؟ (تاکہ وہ لوگوں کو ڈراتا دھمکاتا!)۔

عام انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتا ہے اور پھر اپنی مدّتِ حیات ختم کرکے وفات پا جاتا ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ أَفَائِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُونَ ۝ (۲۱/۳۴)

اور (اے پیغمبرِ اسلام!) ہم نے تجھ سے پہلے کسی آدمی کو ہمیشگی نہیں دی (اور نہ تیرے لیے ہمیشہ زندہ رہنا ہے)، پھر اگر تجھے مرنا ہے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہنے والے ہیں؟

نہ اس کی پیدائش میں کوئی چیز خارقِ عادت ہوتی ہے نہ زندگی میں کوئی انوکھا پن اور نہ ہی موت میں کچھ مافوق البشریت۔ نہ اس کے پاس کوئی غیبی خزانے ہوتے ہیں، نہ ہی وہ علمِ غیب رکھتا ہے[1]۔

قُلْ لَّآ أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ ۚ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحٰٓى إِلَيَّ ۖ (۶/۵۰)

(اے رسولؐ! ان لوگوں سے) کہہ دو کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے غیبی خزانے ہیں۔ نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا جاننے والا ہوں۔ نہ میرا یہ کہنا ہے کہ میں (انسانیت سے ماوراء) فرشتہ ہوں۔ میری حیثیت تو فقط یہ ہے کہ اُسی بات پر چلتا ہوں جس کی خدا نے مجھ پر وحی کر دی ہے (اور اسی کی طرف تمھیں بھی بلاتا ہوں)۔

قوانینِ فطرت کے کاروبار میں اُسے کچھ دخل نہیں ہوتا۔ اس لیے اوروں تو اور، وہ اپنے لیے بھی نفع اور نقصان کا کچھ اختیار نہیں رکھتا، بجز اُس اختیار و ارادہ کے جو قانونِ خداوندی کی رُو سے دُوسرے انسانوں کو حاصل ہوتا ہے۔

قُلْ لَّآ أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۖ وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوٓءُ ۚ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَّبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُونَ ۝ (۷/۱۸۸)؛ (۱۰/۴۹)؛ (۷۲/۲۱-۲۲)

---

[1] تفصیل میری کتاب "من و یزداں" میں ملے گی۔

(اے رسولؐ!) تم کہہ دو کہ میرا حال تو یہ ہے کہ خود اپنی جان کا نفع نقصان بھی اپنے قبضہ میں نہیں رکھتا۔ یہ سب خدا کے قانونِ مشیّت کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو ضرور ایسا کرتا کہ بہت سی منفعت بٹور لیتا اور (زندگی میں) کوئی گزند مجھے نہ پہنچتا۔ میں اس کے سوا کیا ہوں کہ ماننے والوں کے لیے خبردار کر دینے والا اور بشارت دینے والا ہوں۔

اس کا کام صرف راستہ دکھا دینا ہے۔ کسی کے دل کو بدل کر اسے رستہ پر لگا دینا بھی اس کے اختیار میں نہیں۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ (۲۸/۵۶)

(اے رسولؐ!) تم اس کی قدرت نہیں رکھتے کہ جس کسی کو ہدایت پر لانا چاہو لا سکو!

یہ سب اس لیے کہ وہ انسان کو اپنا غلام اور محکوم بنانے نہیں آیا، بلکہ خدا کے احکام کی اطاعت کرانے آیا ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۹)

کسی انسان کو یہ بات سزاوار نہیں کہ اللہ اُسے (انسانوں کی ہدایت کے لیے) کتاب اور حکومت اور نبوت عطا فرمائے اور پھر وہ اُلٹا لوگوں سے کہے، خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ (یعنی خدا کے احکام کی جگہ میرے حکموں کی اطاعت کرنے لگ جاؤ)۔ اسے یہی کہنا چاہیئے کہ تم سب ربانی انسان (یعنی قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرنے والے) بنو، اس لیے کہ تم کتابُ اللہ کی تعلیم دیتے ہو اور اس کے مطالب کو سمجھنے سمجھانے میں لگے رہتے ہو۔

(جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) کہ یہ نظام کچھ اس کی زندگی تک ہی محدود نہیں کہ اس کی وفات کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو جائے۔

وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَ مَنْ یَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَیْهِ فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰهَ شَیْـًٔا ؕ وَ سَیَجْزِی اللّٰهُ الشّٰكِرِیْنَ (۳/۱۴۴)

اس آیتِ مقدسہ کو (جس کا ترجمہ صفحہ ۳۰۳ پر لکھا جا چکا ہے) سرسری طور پر دیکھ کر نہ گزر جائیے۔ یہ دین کے بہت بڑے اصول کی حامل ہے۔ غور کیجیے! اس میں کس قدر واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ دین میں شخصیت پرستی

کو کوئی دخل نہیں۔ اور تو اور، خود ذاتِ رسالتمآبؐ کہ جن کے متعلق ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر!

نظامِ دین میں اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کی بھی ذاتی حیثیت (PERSONAL CAPACITY) بجز این نیست کہ وہ خدا کے پیغامبر اور مرکزِ ملت ہیں۔ حضورؐ کی وفات کے بعد، یہ پیغامِ خداوندی (یعنی قرآن کریم) اپنی اصل شکل میں قیامت تک باقی رہے گا (کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لے رکھی ہے) اسی لیے حضورؐ کی رسالت بھی قیامت تک باقی رہے گی۔ باقی رہا منصبِ مرکزِ ملت، سو یہ ملت کی طرف منتقل ہو جائے گا اور سلسلہ بہ سلسلہ آگے چلے گا۔ لہٰذا نظامِ دین کا انحصار کسی شخصیت پر نہیں۔ اس حقیقتِ کبریٰ کو متعلمین بارگاہِ رسالتؐ، یعنی صحابہ کرامؓ نے کس وضاحت سے سمجھ لیا تھا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے جو حضورؐ کی وفات کے وقت پیش آیا۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ کی وفات نے اس زمرۂ عشاق میں محشر بپا کر دیا ہوگا لیکن عین اس حشر بداماں سانحہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ منبر پر تشریف لائے اور لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔

ایہا الناس من کان یعبد محمداً فانہ قد مات ومن کان یعبد اللہ فانہ حیّ لا یموت۔

اے لوگو! جو شخص محمدؐ کی عبودیت اختیار کیے ہوئے تھا وہ جان لے کہ اس کا معبود مر گیا ہے لیکن جو اللہ کی عبودیت اختیار کیے ہوئے تھا تو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ زندہ ہے، اسے کبھی موت نہیں آئے گی۔

اس کے بعد آپؓ نے وہ آیت پڑھی جو اوپر درج کی جا چکی ہے (مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ)۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اسلامی نظام کی ماہیت، حضورؐ کی صحیح صحیح پوزیشن، اور اس تعلیم و تربیت کے نتائج کا اندازہ کرنے کے لیے، جو حضورؐ نے اپنی جماعت کو دی، اربابِ بصیرت کے لیے صرف یہ ایک واقعہ ہی کافی ہے۔

حضورؐ کا ذاتی اجتہاد

پھر قرآن کریم نے یہ بھی بتا دیا کہ جن معاملات میں حضورؐ اپنے اجتہاد سے فیصلہ کیا کرتے تھے، اُن فیصلوں میں غلطی کا بھی امکان تھا۔ چنانچہ کئی ایک ایسے مواقع پر قرآن میں تادیب بھی آئی ہے۔ مثلاً جنگِ بدر کے قیدیوں کے متعلق حضورؐ کے فیصلہ پر حکم آیا کہ

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ ؕ (۸/۶۷)

نبی کے لیے سزاوار نہیں کہ اُس کے قبضہ میں قیدی ہوں جب تک کہ ملک میں غلبہ حاصل نہ کرے۔
جنگِ تبوک میں جن لوگوں کی درخواست پر حضورؐ نے اُنھیں عدم شمولیت کی اجازت دے دی تھی، اُن کے متعلق ارشاد ہوا کہ

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ تَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ○ (۹/۴۳)

(اے رسولؐ!) اللہ تجھے معاف کرے! تو نے ایسا کیوں کیا کہ (ان کی منافقانہ عُذر داریوں پر) انھیں (پیچھے رہ جانے کی) رخصت دے دی؟ اُس وقت تک رخصت نہ دی ہوتی کہ تجھ پر کُھل جاتا کہ کون سچے ہیں؟ اور تو معلوم کر لیتا کہ کون جھوٹے ہیں؟

آپؐ نے ایک مرتبہ کسی خاص چیز کے نہ کھانے کا عہد کیا تو اس پر حکم آیا کہ

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ (۶۶/۱)

اے رسولؐ! جو چیز اللہ نے تم پر حلال کر رکھی ہے اُس کو (قسم کھا کر) خود پر کیوں حرام کرتے ہو؟
ان واقعات کا قرآن نے اس لیے ذکر کیا ہے کہ حضورؐ کی بشریت نکھر کر سامنے آجائے۔

یہ قرآنی احکام تھے جن کی عملی تفسیر نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کے ایک ایک گوشے میں ملتی ہے، شروع سے

اس کی عملی تائید

اخیر تک، ہر مرحلہ اور ہر منزل میں۔ جب اور جہاں کبھی اتفاق سے کوئی ایسی بات واقع ہو جاتی جس سے لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ آپؐ فوق البشر قوتوں کے مالک ہیں، آپؐ فوراً اس خیال کا ازالہ فرما دیتے۔ مثلاً حضورؐ کے صاحبزادہ (ابراہیم) نے جس روز انتقال کیا، اتفاق سے اسی روز سورج کو گرہن لگ گیا۔ وہ تو خیر پھر بھی عرب کا ملک تھا اور آج سے چودہ سو سال پہلے کا زمانہ۔ اس قسم کا واقعہ اگر آج بھی کسی روحانی پیشوا کے متعلق رونما ہو جائے تو لوگ فوراً دستِ عقیدت آگے بڑھا دیں اور اس کی عام شہرت ہو جائے۔ لوگوں نے اس قسم کا خیال ظاہر کیا کہ آپؐ کے غم میں اجرامِ سماوی نے سیاہ کپڑے پہن لیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ روحانی تسلط جمانے کے لیے اس قسم کے واقعہ سے نہایت عمدہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ لیکن حضورؐ نے لوگوں کو جمع کیا اور نہایت واضح الفاظ میں کہا کہ سُورج

توہم پرستی کا استیصال

اور چاند گرہن، فطرت کے قوانین کے تابع لگتا ہے۔ اُسے کسی کی زندگی اور موت سے کچھ واسطہ نہیں۔ توہم پرستی کو مذہب

کا جزو سا سمجھا جاتا ہے۔ دُنیا کے کسی مذہب کو لیجئے۔ اس میں اوہام پرستی کا کوئی نہ کوئی شائبہ ضرور ملے گا اور اسے مذہبی تقدس حاصل ہوگا۔ لیکن قرآن نے جو دین پیش کیا، اس کی دعوت علیٰ وجہ البصیرت تھی (دیکھیے ۱۲/۱۰۸)۔ اس لیے اس میں توہّم پرستی کی کہیں کوئی گنجائش نہ تھی۔ توہّم پرستی، انسانی عقل و دانش میں تعطّل اور فہم و بصیرت میں جمود پیدا کر دیتی ہے اس لیے نبی اکرمؐ نے ہر قسم کی توہّم پرستی کا استیصال کر دیا اور اس ملک اور قوم سے اس کا استیصال کرایا جن کے رگ و ریشہ میں اوہام پرستی سرایت کر چکی تھی۔ عرب میں غیب دانی کے مدعی کاہن قدم قدم پر دامِ تزویر بچھائے رہتے تھے۔ آپؐ نے تاکیداً ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص کاہنوں کے پاس نہ جایا کرے۔ عالم الغیب صرف خدا کی ذات ہے (حتیٰ کہ رسولؐ کو بھی غیب کا علم نہیں ہوتا)۔ کہانت کے علاوہ، وہاں فال لینے کا بھی بڑا رواج تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ فال لینا وہم ہے۔ فال لے کر انسان کو اپنے ارادہ سے باز نہیں رہنا چاہیئے۔ غور فرمائیے! انسانی اختیار اور ارادے کی اہمیت کو کس قدر واضح کیا گیا ہے۔ اسی طرح (ابو داؤد کی ایک روایت کے مطابق)

غیر امتیازی وضع زندگی

حضورؐ نے فرمایا کہ جھاڑ، پھونک، گنڈا، تعویذ شرک ہیں۔ آپؐ نے اپنی زندگی اس قدر سادہ رکھی تھی کہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی بھی آپؐ کو اپنے میں سے محسوس کرتا تھا۔ تراش خراش، وضع قطع، لباس، خوراک، کسی چیز میں بھی کوئی امتیازی خصوصیت اختیار نہیں فرمائی۔ وہی اپنے زمانہ کی معاشرت، انہی عربوں کی سی زندگی جن میں آپؐ پیدا ہوئے۔ نہ روحانی تقدس کا کوئی امتیازی نشان، نہ بادشاہت، نہ حکومت کی کوئی مابہ الامتیاز خصوصیت۔ ہمارے یہاں فرقِ مناصب و مدارج کی کوئی نہ کوئی امتیازی علامت ضرور دکھائی دے گی جو صاحبِ منصب کو اور انسانوں سے الگ کر کے دکھلائے۔ یہ تو دنیاوی وجاہت کا حال ہے۔ روحانی قیادت میں اس سے بھی بڑھ کر امتیازات کی دُنیا قائم ہے۔ وہاں لباس، تراش خراش، وضع قطع، چال ڈھال، نشست و برخاست، ہر رنگ اور ہر ڈھنگ میں ایک خصوصیت پیدا کی جاتی ہے، تاکہ یہ لوگ کسی اور دنیا کی مخلوق دکھائی دیں۔ اربابِ شریعت کو دیکھئے تو عام انسانوں سے بالکل الگ تھلگ دکھائی دیں گے۔ عمائدِ طریقت کے طائفۂ مقدسہ پر نگاہ ڈالیے تو وہاں ایک نرالی دُنیا نظر آئے گی۔ کسی شیخِ طریقت کی مجلس میں جائیے، حضرت صاحب کی کیفیت یہ ہوگی کہ بُت بنے بیٹھے ہیں۔ اپنے بدن سے مکھّی تک بھی آپ نہیں اُڑاتے۔ اس کے لیے بھی ایک خادم مورچھل بردار کھڑا ہوگا۔ اگر اُٹھتے ہیں تو کوئی بیس خدام حلقہ بگیر ہوں گے۔ کوئی جوتا پہنا رہا ہے، کوئی عصا تھما رہا ہے کوئی راستہ صاف کر رہا ہے، کچھ سر جھکائے دائیں بائیں جلو میں جا رہے ہیں۔ باقی پیچھے پیچھے خاموش چل رہے ہیں۔ انہوں نے ذرا گردن ایک

طرف کو موڑی تو دس خدّامِ سمعِ ارشاد کے لیے آگے بڑھ گئے۔ لیکن ایک اور مجلس ہمارے سامنے آتی ہے کہ جس میں "روحانی قیادت" کی یہ کیفیت ہے کہ قیامت تک کے مسلمان اس پہ ایمان لانے کے لیے مکلف ہیں۔ دنیوی حکومت کا یہ عالم ہے کہ وسیع و عریض سلطنت کے سربراہ ہیں لیکن سادگی کا یہ عالم ہے کہ اپنا جوتہ آپ مرمّت کر رہے ہیں۔ ایک صحابیؓ عرض کرتے ہیں کہ حضورؐ! لائیے میں ٹانک دوں، تو فرماتے ہیں کہ یہ خود پسندی ہے جو مجھے پسند نہیں۔ گھر میں اپنے کام کاج خود کرتے ہیں۔ مسجدِ قبا اور مسجدِ نبویؐ کی تعمیر، اور خندق کے کھودنے میں عام مزدوروں کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔ دوستوں کی مجلس میں دعوت کا سامان تھا سب نے کام بانٹ لیے۔ آپؐ نے فرمایا کہ جنگل سے لکڑیاں میں لاؤں گا صحابہؓ نے تامّل کیا تو فرمایا کہ میں امتیاز پسند نہیں کرتا۔ غزوۂ بدر میں سواریاں کم تھیں، اس لیے باری باری سے اونٹوں پر چڑھتے اُترتے تھے۔ حضورؐ بھی، دوسروں کی طرح، ایک اونٹ کے ساتھ دو آدمیوں میں شریک تھے۔ جاں نثار ہمراہی اپنی باری حضورؐ کی خدمت میں پیش کرتے تو آپؐ فرماتے کہ نہ تم مجھ سے زیادہ پیدل چل سکتے ہو اور نہ میں تم سے کم ثواب کا محتاج ہوں۔ غزوۂ خیبر میں جب آپؐ کا داخلہ ہوا تو آپؐ ایک عام خچر پر سوار تھے، جس میں لگام کی جگہ کھجور کی چھال بندھی تھی۔ جناب ابنِ ارتؓ ایک صحابیؓ تھے جنھیں حضورؐ نے کسی غزوہ پر بھیجا۔ ان کے گھر میں پیچھے کوئی مرد نہ تھا اور عورتوں کو دودھ دوہنا نہیں آتا تھا۔ آپؐ ہر روز اُن کے گھر جاتے اور دودھ دوہ آیا کرتے۔ برابر کے صحابیؓ تو ایک طرف، مدینہ کی لونڈیاں آپؐ کی خدمت میں آتیں اور جو کام کہتیں حضورؐ اُٹھ کر کر دیتے۔ مدینہ کی بیوائیں اور مساکین سب اطمینان سے رہتے تھے کہ ان کے کام حضورؐ نے اپنے ذمّے لے رکھے تھے۔ مجلس میں اپنے لیے کوئی امتیازی مقام متعین نہیں فرمایا تھا۔ ایک مرتبہ صحابہؓ نے اس خیال سے کہ باہر سے آنے والوں (بالخصوص دوسری سلطنت کے سفیروں) کو حضورؐ کے پہچاننے میں دقت ہوتی ہے، آپؐ کے بیٹھنے کے لیے ذرا سی اونچی نشست بنا دی تو حضورؐ سخت برافروختہ ہوئے اور اسے فوراً گرا دیا۔ مزدلفہ میں قریشی دوسروں سے ممتاز جگہوں پہ بیٹھتے تھے۔ صحابہؓ نے چاہا کہ آپؐ کے لیے ایک طرف چھوٹا سا چھپر ڈال دیا جائے۔ آپؐ نے اس سے منع فرما دیا اور کہا کہ کسی مقام پر کسی کا خاص حق نہیں۔ جو جہاں پہلے پہنچ جائے وہ اسی کی جگہ ہے۔ تخاطب میں بھی کوئی امتیازی لقب پسند نہ فرماتے تھے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے آپؐ کو مخاطب کرکے سیدنا کہہ دیا۔ آپؐ نے کہا کہ تقوی کی راہ اختیار کرو شیطان تمہیں تمہارے مقام سے گرا نہ دے۔ میں عبداللہ کا بیٹا محمدؐ ہوں، خدا کا بندہ اور اُس کا رسولؐ۔ ایک مرتبہ حضورؐ تشریف لائے تو صحابہؓ تعظیماً کھڑے

ہو گئے۔ فرمایا کہ یہ عجمیوں کا دستور ہے' ایسا نہ کیا کرو۔ حضرت قیس بن سعدؓ نے ایک مرتبہ حضورؐ سے کہا کہ میں نے حیرہ والوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے رئیسوں کو تعظیماً سجدہ کرتے ہیں آپؐ اس کے زیادہ مستحق ہیں۔ اس پر آپؐ نے اس کی سخت ممانعت فرمائی۔ جو ذاتِ گرامیؐ اپنی تعظیم کے لیے دوسروں کا کھڑا ہونا پسند نہ کرے، وہ خدا بن کر لوگوں سے سجدے کس طرح کرا سکتی تھی؟ البتہ اظہارِ محبت کے لیے آپؐ اُٹھ کھڑے ہو جاتے تھے۔ حضرت فاطمہؓ تشریف لائیں تو آپ کھڑے ہو جاتے اور جوشِ محبت میں بیٹی کا ہاتھ چوم لیتے۔ یہ بظاہر چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں لیکن انسانی سیرت کا صحیح اندازہ تو چھوٹے چھوٹے واقعات سے ہی لگا کرتا ہے۔ بڑے بڑے واقعات میں تو تصنع کا بھی امکان ہوتا ہے۔ انسان کی صحیح زندگی کی جھلک روزمرہ کے کام کاج میں نظر آیا کرتی ہے۔ یہ سادگی اور عدم تمیز و افضلیت اس تعلیم کا جزو تھی جس سے آپ اپنی جماعت کے دلوں سے "تمیز بندہ و آقا" کا طاغوتی خوف دُور کر کے ان میں صحیح جذبہ حریت و روحِ آزادی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شخص خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہوا تو نبوت کے رعب سے کانپنے لگا۔ آپؐ نے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں، میں فرشتہ نہیں ہوں، کوئی مافوق الفطرت ہستی نہیں ہوں۔ ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت پکا کر کھایا کرتی تھی۔

واضح رہے کہ حضورؐ کی یہ سادگی اور فروتنی مفلسی کے ادبار یا مذہبی تقشّف کی بنا پر نہیں تھی۔ آپؐ ایک سلطنت کے سربراہ تھے، اس لیے افلاس کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا، نہ ہی یہ رہبانیت تھی۔ اس لیے کہ حضورؐ رہبانیت کو مٹانے آئے تھے۔ مفلسی جس میں انسان اپنی ضروریات کے لیے دوسروں کا دست نگر ہو جائے، خدا کا عذاب ہے اور حضورؐ کے ارشاد کے مطابق سواد الوجہ فی الدارین (دنیا اور آخرت میں رُوسیاہی کا موجب) ہے۔ اسی لیے جن باتوں پر حضورؐ بیعت لیتے تھے' ان میں ایک یہ بھی تھا کہ لَا تَسْئَلُوا النَّاسَ شَیْئًا (لوگوں سے سوال مت کرنا) کہ سوال کرنے سے انسان کی غیرت مٹی میں مل جاتی ہے اور وہ شرفِ انسانیت کے رفیع و وقیع مقام سے ضعفِ خودی کی پستیوں میں گر جاتا ہے۔ ایک دفعہ ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کچھ سوال کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ تمہارے پاس کچھ ہے۔ اس نے کہا کہ ایک بچھونا ہے اور ایک پانی پینے کا پیالہ۔ آپؐ نے دونوں چیزیں منگالیں اور دو درہم میں فروخت کر دیں۔ ایک درہم کا کھانا اس کے گھر بھیج دیا اور ایک درہم کی رسّی منگا کر اسے دے دی کہ جاؤ جنگل سے لکڑیاں لا کر شہر میں بیچا کرو۔ کچھ دنوں کے بعد وہ آیا تو اس کے پاس دس درہم جمع ہو گئے تھے۔ آپؐ اس سے بہت خوش ہوئے۔

پھر، جیسا کہ اُوپر لکھا جا چکا ہے حضورؐ کی یہ سادگی اور بے نیازی، رہبانیت اور تقشّف کی بنا پر نہیں تھی۔

ایک دفعہ دو صحابیؓ خدمت میں آئے اور کہا کہ ہم میں سے ایک نے ترکِ حیوانات کا عزم کر رکھا ہے اور دوسرے نے

نہ ہی مذہبی تقشّف

ترکِ نکاح کا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں تو دونوں سے متمتع ہوتا ہوں۔ اس پر انہوں نے بھی اپنا عہد ترک کر دیا۔ قبیلہ باہلہ کا ایک شخص کوئی سال بھر کے بعد حاضرِ خدمت ہُوا۔ اس کی صُورت ایسی بدل چکی تھی کہ آپؐ پہچان نہ سکے۔ اس نے اپنا نام بتایا تو حضورؐ نے فرمایا کہ تم تو نہایت خوش چہرہ تھے۔ تمہاری صُورت کیوں بگڑ گئی۔ اُس نے کہا کہ جب سے آپؐ سے رخصت ہُوا ہوں متّصل روزے رکھ رہا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اپنی جان کو عذاب میں کیوں ڈال رہے ہو؟ کسی سفر میں ایک صحابیؓ کا گزر ایک غار پر سے ہُوا جس میں پانی تھا اور آس پاس کچھ بُوٹیاں تھیں۔ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے تو عرض کیا کہ حضورؐ مجھے ایک ایسا اچھا غار مل گیا ہے جس میں ضرورت کی سب چیزیں موجود ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ وہاں گوشہ گزین ہو جاؤں حضورؐ نے فرمایا کہ میں یہودیت اور نصرانیت لے کر دُنیا میں نہیں آیا۔ میں آسان اور سہل دینِ ابراہیمی لے کر آیا ہوں۔

تقدّس کی بارگاہوں میں دیکھیے۔ جہاں کسی مخدوم کا پاؤں پڑ جائے، اس خاک کو آنکھوں کا سُرمہ بنایا جاتا ہے۔ یہ وہی شخصیت پرستی ہے جو شرک کی طرف مُنجر ہوتی ہے۔ حضورؐ اس کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے کہ آپؐ کے ساتھ بھی ایسا ہی نہ ہونے لگ جائے۔ ایک مرتبہ آپؐ وضو کر رہے تھے۔ جو پانی گرا بعض لوگوں نے اسے تبرّکاً اپنے بدن پر مل لیا۔ آپؐ نے پوچھا کہ یہ کیوں کر رہے ہو؟ عرض کیا کہ خدا اور خدا کے رسولؐ کی محبت میں۔ فرمایا کہ خدا اور خدا کے رسولؐ کی محبت حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جب بات کرے تو سچ بولے، امین بنایا جائے تو امانت ادا کرے، اور کسی کا پڑوسی ہو تو ہمسائیگی کو اچھی طرح نباہے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہوئے تو اثنائے گفتگو میں کہا کہ "جو خدا چاہے اور جو آپؐ چاہیں"۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم نے یہ کیا کہہ دیا؟ تم نے مجھے خدا کا شریک و ہمسر ٹھہرا دیا۔ ایک دفعہ ایک شادی کے موقع پر آپؐ تشریف فرما تھے۔ انصار کی لڑکیاں گیت گا رہی تھیں۔ گاتے گاتے انہوں نے یہ گانا شروع کیا فینا رسول یعلم ما فی غدٍ؛ ہم میں ایک ایسا پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے! آپؐ نے منع فرمایا کہ یہ نہ کہو۔ وہی گائے جاؤ جو پہلے گاتی تھیں۔ بخاری میں روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ میں ایک انسان ہوں میرے سامنے مقدّمات آتے ہیں تو ایک فریق دوسرے فریق سے اپنے مدّعا کو بہتر طریقہ پر ادا کرنے والا ہوتا ہے جس سے گمان ہو جاتا

فیصلوں میں غلطی کا امکان

ہے کہ وہ سچا ہے اور میں اس کے حق میں فیصلہ دے دیتا ہوں۔ لہٰذا، اگر کسی شخص کو اس فیصلہ کے مطابق اپنا حصّہ

(فٹ نوٹ لے صفحہ ۳۵۰ پر)

نہیں بلکہ دوسرے بھائی کا حصہ ملتا ہے تو وہ سمجھ لے کہ وہ آگ کا ٹکڑا ہے۔ اب خواہ (قانونی استحقاق کے مطابق) اسے لے لے خواہ (بنا بر تقویٰ) اسے چھوڑ دے۔

ان روایات کو دیکھئے اور پھر غور کیجئے کہ حضورؐ نے اپنی بشریت اور رسالت کی حیثیت کو کس طرح نمایاں طور پر الگ الگ کر کے بتا دیا ہے۔ حضورؐ کی تربیت یافتہ جماعتِ صحابہؓ کی نگاہوں میں یہ تفریق اس قدر

بشریت و رسالت کا فرق

واضح تھی کہ جس معاملہ میں انہیں آپؐ سے اختلافِ رائے ہوتا، وہ فوراً دریافت کر لیتے کہ یہ وحی کا فیصلہ ہے یا حضورؐ کی ذاتی رائے۔ وحی کے فیصلے کے بعد کسی کو حقِ بحث و تمحیص باقی نہیں رہتا تھا، حتّٰی کہ خود رسول اللہؐ کو بھی نہیں لیکن اگر وہ حضورؐ کی اپنی رائے ہوتی، تو حضورؐ کی تعلیم اس قدر جرأت آفریں اور حریت آموز تھی کہ صحابہؓ بلا جھجک مزید استفسارات بھی کرتے اور پھر اپنی بے باکانہ رائے بھی دیتے اور (اگر وہ امارت کا فیصلہ نہ ہوتا) تو اپنی رائے پر عمل بھی کرتے۔ چنانچہ اس قسم کے اکثر واقعات کتبِ روایات میں موجود ہیں۔ غزوۂ بدر میں آپؐ نے میدان کا انتخاب کر کے ڈیرے ڈال دینے کا حکم دیا۔ جب حضرت خبابؓ کو معلوم ہوا تو خدمتِ اقدسؐ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یہ فیصلہ وحی کی رُو سے کیا گیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ نہیں' یہ میری اپنی رائے ہے۔ تو انہوں نے عرض کیا کہ پھر اس حکم کو بدل دیجئے۔ فلاں مقام اس مقام سے بہتر ہے۔ چنانچہ آپؐ نے ان کی رائے کو بہتر پایا اور لشکر کو اس طرف جانے کا حکم دے دیا۔

غزوۂ احزاب میں جب آپؐ نے غطفان سے صلح کرنا چاہی، تو انصار نے عرض کیا کہ یہ فیصلہ اگر خدا کا حکم ہے تو مجالِ انکار نہیں، لیکن اگر حضورؐ کی رائے ہے تو پھر ہماری رائے اس کے خلاف ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے ان کے عزم و استقلال کے پیشِ نظر اپنی رائے میں تبدیلی فرمالی۔ صحابہؓ تو ایک طرف مدینہ کی عورتوں (حتّٰی کہ لونڈیوں) تک کو یہ جرأت حاصل ہو گئی تھی کہ وہ حضورؐ کے ارشادات پر استفسار کر لیا کرتی تھیں۔ بریرہ ایک لونڈی تھی جو بوجہ آزادی اپنے شوہر (مغیث) سے الگ ہو گئی تھی۔ حضورؐ نے اس سے مغیث کی زوجیت میں رہنے کی سفارش کی تو بریرہ نے عرض کیا کہ کیا آپؐ حکم دے رہے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا، نہیں حکم تو نہیں۔ تو اُس نے کہا

لہ (فٹ نوٹ صفحہ ۳۴۹) پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اجتہاداتِ نبویؐ میں غلطی کا امکان ہوتا تھا اُس لیے کہ حضورؐ غیب کا علم نہیں رکھتے تھے، گرد و پیش کے احوال و ظروف پر نگاہ رکھ کر استنباطِ نتائج کرتے تھے اس لیے ان میں غلطی بھی ہو سکتی تھی۔

کہ پھر معاف فرمائیے۔ مجھے مغیث کی حاجت نہیں (بہ روایت بخاری) خود قرآن کریم کی سورۃ مجادلہ میں ایک عورت (خویلہ بنتِ ثعلبہ) کا ذکر موجود ہے جو اپنے خاوند کی قسمِ ظہار کے متعلق جھگڑا کر رہی تھی۔

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَ تَشْتَكِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ﳓ وَ اللّٰهُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ ۝ (۵۸:۱)

بے شک اللہ نے اس عورت کی بات سُن لی جو اپنے شوہر کے بارے میں تجھ سے جھگڑ رہی تھی اور (غم و غصہ میں) اللہ سے شکایت بھی کرتی جاتی تھی اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ بلاشبہ اللہ (سب کچھ) سننے والا (سب کچھ) دیکھنے والا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ مرد تو مرد، وہاں عورتوں کو بھی کس قدر آزادیٔ رائے حاصل تھی۔

جب مہاجرین مدینہ آئے تو انصار نے اپنے درخت انہیں دے دیئے تھے جو اُن کے لیے وجہ کفاف بنے۔ حضرت انسؓ کی والدہ (اُمِّ سلیم) نے حضورؐ کو کچھ درخت دیئے تھے جو آپؐ نے اُمِّ ایمن کو دے دیئے۔ بعد میں مہاجرین کی معاشی حالت درست ہو گئی تو تمام درخت انصار کو واپس کر دیئے گئے۔ حضورؐ نے بھی چاہا کہ اُمِّ سلیم کے درخت انہیں واپس دے دیئے جائیں، اس لیے اُمِّ ایمن سے درختوں کی بازیابی کا مطالبہ کیا۔ لیکن اُمِّ ایمن نے درخت واپس دینے سے انکار کر دیا کیونکہ انہیں واپسی کی شرط پر نہیں دیئے گئے تھے۔ رسول اللہ اس امانت کو اُمِّ سلیم کو واپس دینا چاہتے تھے۔ لیکن اُمِّ ایمن سے زبردستی درخت واپس نہیں لے سکتے تھے۔ چنانچہ انہیں ایک ایک کے بدلے دس دس درخت دے کر وہ درخت واپس لیے۔

کسی شخص کی کچھ کھجوریں آپؐ کے ذمّے قرض تھیں۔ چند روز کے بعد وہ تقاضے کے لیے آیا۔ آپؐ نے ایک انصار سے کھجوریں لے کر اُسے واپس دے دیں۔ اُس نے لینے سے انکار کر دیا کہ یہ کھجوریں میری کھجوروں سے ناقص ہیں۔ انصار نے اس سے کہا کہ یہ کیا ظلم کرتے ہو؟ رسول اللہ کی عطا فرمودہ کھجوریں واپس کر رہے ہو؟ اس نے کہا، ہاں! اگر رسولؐ اللہ ہی عدل نہ کریں گے تو اور کس سے عدل کی توقع کی جائے گی؟ حضورؐ نے سُنا تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور فرمایا کہ ہاں! یہ سچ کہتا ہے۔

اللہ اکبر! عدل مانگنے میں کتنی آزادی تھی! اسی کا نام صحیح تربیت ہے۔

قرآن کریم کی رُو سے مومنین کا جان اور مال خدا کے پاس فروخت شدہ ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ اُس پر قبضہ مرکزِ ملت ہی کا ہونا ہے تا کہ وہ دین کے تحفظ میں کام آئے۔ اس لیے جو کچھ جماعت کے پاس ہو، وہ سب کچھ

امیر کا ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے نبی کا حق سب سے اولیٰ قرار دیا ہے۔ لیکن اس باب میں بھی حضورؐ اپنی مرکزی حیثیت اور بشریت کی حیثیت کو اس قدر نمایاں طور پر متمیز رکھتے تھے کہ اس سے حضورؐ کی بلندیٔ سیرت جھلمل جھلمل کرتی سامنے آجاتی ہے۔ صحابہؓ تو جاں نثاروں کی جماعت تھی۔ انہیں ہر وقت انتظار رہتا تھا کہ کوئی ایسا موقع ہو جو وہ حضورؐ کی کوئی خدمت کر سکیں۔ ان کے املاک و اموال حضورؐ پر تصدق تھے۔ لیکن حضورؐ ذاتی تصرف اور ملّی تصرّف کی حدِ فاصل ہر وقت ملحوظ رکھتے تھے۔ حضرت علیؓ حضورؐ کے مکان ہی میں رہتے تھے۔ جب ان کی شادی حضرت فاطمہؓ سے ہو گئی تو ان کے لیے ایک الگ مکان کی ضرورت پڑی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مدینہ میں انصار نے اپنے مکانات اور زمینیں مہاجرین کو دے رکھی تھیں۔ حضرت حارثؓ بن نعمان نے اپنے بہت سے مکانات اس ضمن میں حضورؐ کی تفویض میں دے رکھے تھے۔ حضرت فاطمہؓ نے عرض کیا کہ حارثؓ سے ایک مکان مجھے بھی دلا دیجئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اُن سے کہاں تک کہوں۔ مجھے اب کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ حضرت حارثؓ نے سُنا تو دوڑتے ہوئے آئے اور عرض کیا کہ حضورؐ پر میرے ماں باپ تصدق! یہ جو کچھ ہے سب حضورؐ ہی کا ہے۔ اس میں تأمل و توقف کیسا؟ غرض انہوں نے ایک مکان حضرت سیّدہ کے لیے خالی کر دیا۔

ان معاملات میں حضورؐ اس قدر محتاط تھے کہ ایک مرتبہ ایک صحابیؓ نے حضورؐ کی دعوت معہ چار دیگر صحابہؓ کے کی۔ راستہ میں ایک شخص اور ساتھ شامل ہو گیا۔ آپؐ نے میزبان سے کہا کہ یہ شخص بلا دعوت ساتھ ہو گیا ہے۔ اگر اجازت دو تو اسے ساتھ رہنے دوں، ورنہ اسے جواب دے دوں۔ اُنہوں نے اجازت دے دی تب حضورؐ اُسے ساتھ لے کر گئے۔

محفلِ نبویؐ میں ترتیب یہ ہوتی تھی کہ اگر کوئی چیز حضورؐ کے سامنے پیش ہوتی تو آپؐ دائیں طرف سے اس کی تقسیم شروع کرتے۔ ایک مرتبہ کہیں سے دُودھ آیا۔ دائیں طرف حضرت عبداللہ بن عباسؓ بیٹھے تھے جو ابھی بچے تھے۔ بائیں جانب بڑے بڑے معمر صحابہؓ تھے۔ آپؐ نے چاہا کہ دودھ کی تقسیم معمر صحابہؓ کی طرف سے شروع کی جائے۔ لیکن اس سے اصُولِ ترتیب ٹوٹتا تھا۔ بات کچھ نہ تھی۔ اپنا ہی مقرر کیا ہوا قاعدہ تھا، آپ ہی اسے توڑ رہے تھے لیکن یہ بات ہمارے لیے معمولی بات ہو سکتی ہے، اس معلّمِ اُمت کے نزدیک معمولی نہ تھی۔ آپؐ نے اُس بچے (عبداللہ بن عباسؓ) سے کہا کہ اگر اجازت دو تو دُودھ بائیں طرف والوں کو دے دوں۔ آپ سوچئے کہ رسولؐ اللہ کے ارشاد میں تأمل کیسے ہو سکتا تھا؟ لیکن جو یہ جانتے تھے کہ یہ اجازت طلبی یونہی تکلفاً نہ رکھ رکھاؤ نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہے' وہ اپنے حق کو بھی اچھی طرح سمجھتے تھے۔ حضرت عبداللہؓ نے عرض کیا کہ معاف فرمائیے میں (آپؐ کے عطیہ میں) ایثار نہیں کر سکتا۔

چنانچہ دُودھ دائیں جانب سے ہی دیا گیا۔

شگفتگی و حُسنِ ذوق

مجلسِ نبویؐ سنجیدگی و متانت کا تمثیلی پیکر ہوا کرتی تھی اور اسے ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے تھا۔ لیکن متانت اور افسردگی میں جو لطیف سا فرق ہے اُسے وہاں بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا تھا۔ شگفتگی اور حُسنِ ذوق انسان کے جوہرِ لطیفہ ہیں جن سے زندگی کی شاخ میں نمی آتی ہے۔ ہمارے ہاں زہد و تقدّس کا نقشہ کچھ اس انداز سے مرتب کر لیا گیا ہے کہ زاہد و عابد کے لیے حار و یابس قسم کا انسان ہونا ضروری ہے۔ جس کے ماتھے پر ہزار ہزار شِکن پڑتی ہو، نگاہوں پر خفگی، لبوں پر اُداسی، چہرے پر پژمردگی اس انداز سے چھائی ہو کہ وہ دُور سے ہی "عبوساً قمطریرا" کی تصویر نظر آجائے۔ جس کی انتہائی آرزو یہ ہو کہ

آئے مجھے ہنسی بھی تو میں رو دیا کروں!

لیکن نبیٔ اکرمؐ کی محفل، بایں ہمہ متانت و سنجیدگی اور تعظیم و تقدّس، اس قسم کی یابس و بارد انجمن نہیں ہوتی تھی جہاں شگفتگی و بشاشت شجرِ ممنوعہ کا حکم رکھے۔ چنانچہ سنجیدہ اور لطیف مزاح کے کئی واقعات کتبِ آثار و تاریخ میں مرقوم ہیں۔ ایک مرتبہ ایک محفل میں حضورؐ کھجوریں کھا رہے تھے۔ پاس ہی حضرت علیؓ بیٹھے تھے۔ حضرت علیؓ کھجوریں کھاتے جاتے اور اُن کی گُٹھلیاں حضورؐ کی گٹھلیوں میں ملاتے جاتے۔ اخیر میں حضرت علیؓ نے کہا کہ بعض لوگ دُگنی دُگنی کھجوریں کھا جاتے ہیں۔ دیکھیئے کتنی گٹھلیاں دھری ہیں! حضورؐ نے فرمایا کہ بعض وہ بھی ہیں جو گٹھلیوں سمیت کھا جاتے ہیں۔ اُن کے سامنے ایک گٹھلی بھی نہیں ہوتی۔

جن معاملات میں صحابہؓ سے مشورہ لیا جاتا تھا وہ بہرحال مشورہ ہی ہوتا تھا۔ لیکن اس میں جہاں حضورؐ کا کوئی ذاتی معاملہ آجاتا، اس مشورہ کو بھی فیصلہ کی سی حیثیت دے دی جاتی۔ مثلاً جب اسیرانِ بدر کا زرِ فدیہ جمع ہوا، تو حضورؐ کی صاحبزادی (حضرت زینبؓ) نے اپنے شوہر (ابوالعاص) کے فدیہ میں حضرت خدیجہؓ کا ہار بھیج دیا جس نے حضورؐ کے قلبِ مطہر کے نرم ترین گوشوں تک کو متاثر کر دیا۔ آپؐ چاہتے تھے کہ ہار بیٹی کو واپس کر دیا جائے لیکن (جیسا کہ جنگِ بدر کے سلسلہ میں لکھا جا چکا ہے) اس کے لیے جماعت سے اجازت چاہی گئی اور ان کی اجازت کے بعد اُسے واپس کیا۔ غور کیجیئے کہ واقعات کے ان چھوٹے چھوٹے نگینوں میں کس طرح حقائق و عبر کی بڑی بڑی دُنیائیں جھلک رہی ہیں۔

امیرِ مملکت کی زندگی میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جہاں اپنے ذاتی جذبات اور فرائضِ امارت میں فرق

کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، بالخصوص جب معاملہ ذاتی انتقام کا ہو لیکن اس باب میں بھی نبیؐ اکرمؐ نے ایسی عظیم مثالیں قائم کی ہیں جو ہر آنے والے کے لیے چراغِ راہ بنتی ہیں۔ مثلاً اہلِ مکہ کی تمام ایذا رسانیوں کا جواب فتح مکہ کے دن یہ تھا کہ جاؤ تم سب آزاد ہو۔ طائف والوں کی سختیوں کا جواب ان کے تمام قیدیوں کو بلا معاوضہ چھوڑ دینا تھا۔ ہبار بن اسود وہ شخص تھا جس نے ہجرت کے زمانہ میں حضورؐ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کو برچھی سے زخمی کیا تھا جس سے ان کا حمل ساقط ہو گیا تھا۔ اس صدمہ کا داغ حضورؐ کے سینہ پر تھا۔ فتح مکہ کے بعد ہبار اِدھر اُدھر چھپتا رہا۔ صحابہؓ اس کی تلاش میں تھے۔ بالآخر تنگ آکر اُس نے ایک جائے پناہ ڈھونڈھ ہی لی۔ اور وہ جائے پناہ معلوم ہے کون سی تھی! خود ذاتِ رسالتمآبؐ کا عفوِ کریمانہ۔ خدمتِ اقدسؐ میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ حضورؐ! میں گناہگار تھا، قصوروار تھا۔ اللہ نے مجھے ہدایت دی اور میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ آپؐ کے خلاف مجھ سے بڑی زیادتیاں ہوئیں۔ شرمندہ ہوں، معذرت خواہ ہوں اور آپؐ جو سلوک کرنا چاہیں اُس کا سزاوار ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جاؤ میں نے معاف کر دیا۔

ذاتی انتقام نہیں

حضورؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کا قاتل وحشی خدمتِ اقدسؐ میں آکر مسلمان ہوا۔ آپؐ نے اُسے چھوڑ دیا۔

یہ عفو تھا اُن جرائم کی پاداش کے متعلق جو آپؐ کی ذات کے خلاف سرزد ہوئے تھے۔ اس کے مقابلہ میں دینی جرائم کی سزا میں پورے عدل سے کام لیا جاتا تھا اور ذرا نرمی نہیں برتی جاتی تھی۔ بنی مخزوم کے ایک نہایت معزز خاندان کی ایک عورت نے چوری کی۔ آپؐ نے حکم دیا کہ اسے سزا دی جائے۔ اس قوم میں اس سے بڑا اضطراب پیدا ہوا۔ سب نے حضرت اُسامہؓ بن زید کو آمادہ کیا کہ وہ رسول اللہؐ سے سفارش کر دیں کہ اُسے سزا نہ دی جائے۔ جب حضرت اُسامہؓ نے اس باب میں حضورؐ سے گفتگو کی تو آپؐ کا چہرہ غصہ سے لال ہو گیا اور فرمایا کہ اے اسامہ! تو حدود اللہ کے خلاف سفارش کرتا ہے؟ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے اگر فاطمہؓ بنتِ محمدؐ بھی چوری کرتی تو ہم اسے بھی سزا دیتے۔ یہ اس لیے کہ قرآن میں ہے کہ

دینی معاملات میں کوئی نرمی نہ تھی

وَّلَا تَاۡخُذۡكُمۡ بِهِمَا رَاۡفَةٌ فِىۡ دِيۡنِ اللّٰهِ (۲۴/۲)

اور (اے رسولؐ!) مجرمین کے معاملہ میں قانونِ خداوندی کے مطابق سزا دہی میں شمہ برابر نرمی نہ برتی جائے۔

اور یہ سخت گیری کی تاکید اس ذاتِ گرامیؐ سے کی جاتی ہے جس کی طبعاً نرم خوئی کا ذکر خود قرآن میں موجود ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ص (۳/۱۵۹)

اے رسولؐ! یہ خدا کی بڑی ہی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے اس قدر نرم مزاج واقع ہوئے۔ اگر سخت مزاج اور سنگ دل ہوتے تو لوگ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے۔

طبعاً رقیق القلب اور نرم خُو لیکن جب عدل و انصاف کا معاملہ سامنے آئے تو نہایت سخت گیر۔ غور کیجئے! کس قدر متناقض جذبات کو یکجا کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک مکتوب (بنام گرامی مرحوم) میں بھی ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ ایک شخص کو کسی جرم میں قتل کیا گیا۔ اس کی بیٹی نے جب باپ کے قتل کی خبر سُنی تو نوحہ اور فریاد کرتی اور باپ کی جدائی میں درد انگیز اشعار پڑھتی ہوئی دربارِ نبویؐ میں حاضر ہوئی۔ اشعار سُنے تو حضورؐ اس قدر متأثر ہوئے کہ اس لڑکی کے ساتھ مل کر رونے لگے، اور جوشِ ہمدردی نے، اُس، سب سے زیادہ ضبط کرنے والے انسان کے سینے سے بھی ایک آہِ سرد نکلوا دی۔ پھر تڑپتی ہوئی لاش کی طرف اشارہ کرکے فرمایا، یہ فعل محمدؐ رسول اللہ کا ہے اور اپنی روتی ہوئی آنکھ پر انگلی رکھ کر کہا، یہ فعل محمدؐ ابن عبد اللہ کا ہے۔

"محمدٌ رسول اللہ" اور "محمد ابنِ عبد اللہ" میں فرق ملحوظ رکھنا ہر شخص کا کام نہیں اس کے لیے بڑی پختہ سیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہی وہ فرق ہے جس سے باوصفِ اطاعت و انقیادِ متبعین کے جوہرِ خودی کی پرورش اور جذباتِ حریّت کی تربیت ہوتی ہے۔

اب اس باب میں اس واقعۂ عظیمہ پر نگاہ ڈالیے جو اس موضوع پر گویا حرفِ آخریں اور قولِ فیصل ہے اور جسے اس کی اہمیت کے پیشِ نظر قرآن کریم نے اپنے آغوش میں محفوظ کر رکھا ہے۔ سارے قرآن میں کسی صحابی کا نام آیا ہے، تو وہ حضرت زیدؓ ہیں۔ اور یہ نام جس واقعہ کے ضمن میں آیا ہے، وہ قابلِ غور ہے۔ پہلے

حضرت زیدؓ کا واقعہ

تو یہ دیکھئے کہ حضرت زیدؓ اور نبی اکرمؐ کے تعلقات کیا تھے۔ سب سے پہلے رسول اور مومن کا تعلق جس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی تعلق

لہ علامہ اقبالؒ نے اس کا نام نضر لکھا ہے لیکن غالباً وہ شخص حویرث ابنِ نقید بن وہب تھا۔ علامہ اقبالؒ نے جو واقعہ لکھا ہے مجھے اس کی سند نہیں مل سکی۔ لیکن قرآنِ کریم کی جو آیات اُوپر متن میں درج کی گئی ہیں اُن کے پیشِ نظر واقعہ کچھ مستبعد دکھائی نہیں دیتا۔

نہیں ہو سکتا۔ پھر امیر اور متّبع کا تعلق، کہ جس میں حضورؐ کے فیصلوں کے خلاف دل میں کبیدگی بھی پیدا نہیں ہونی چاہیئے۔ اب آگے بڑھیئے۔ حضرت زیدؓ حضورؐ کے غلام تھے، اس لیے آقا اور غلام کا تعلق۔ حضورؐ نے انہیں آزاد کیا، اس لیے محسن اور شکر گزار کا تعلق۔ آزاد ہی نہیں کیا بلکہ اپنا بیٹا بنا لیا، اس لیے ایک گونہ باپ اور بیٹے کا تعلق۔ حضورؐ نے اپنے گھر میں رکھا اور وہیں ان کی پرورش کی، اس لیے مربّی اور مربوب کا تعلق۔ پھر خاندانِ بنو ہاشم کی ممتاز خاتون، اپنی پھوپھی زاد بہن سے اُن کی شادی کی۔ یہ رفعتِ منصب اُن کے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ ان تعلقات کو پیشِ نظر رکھیئے اور پھر اس واقعہ پر غور کرنے کے لیے آگے بڑھیئے۔ آپؐ نے حضرت زیدؓ کی شادی، سارے عرب کے دستور و آئین کے خلاف کی۔ ایک غلام کی شادی بنو ہاشم کی خاتون کے ساتھ؟ دُنیائے عرب میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی شادی تھی۔ اس لیے آپؐ چاہتے تھے کہ یہ عقد کامیاب رہے۔ اس نازک صُورتِ حال کو بھی سامنے رکھیئے۔ شادی کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ میاں بیوی میں ناچاقی ہو گئی اور نوبت بایں جا رسید کہ حضرت زیدؓ اپنی بیوی (حضرت زینبؓ) کو طلاق دینے پر آمادہ ہو گئے۔ آپ خیال کیجئے کہ اس خبر سے حضورؐ کے دل پر کیا گزری ہوگی؟ آپؐ گئے اور حضرت زیدؓ سے کہا کہ:

أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ (۳۳/۳۷)

اپنی بیوی کو طلاق مت دو۔

غور فرمایئے کہ یہ کہنے والا کون ہے اور کہا کس سے جا رہا ہے؟

تو اس پر حضرت زیدؓ نے کیا کیا؟

بیوی کو طلاق دے دی۔

پھر کیا ہوا؟ ذرا سوچیئے کہ اگر کسی پیر کا مُرید، کسی حاکم کا محکوم، کسی باپ کا بیٹا، کسی مُحسن کا احسان مند، کسی بڑے کا چھوٹا، اس درخواست کے باوجود، ایسا کچھ کر دیتا تو کیا قیامت نہ برپا ہو جاتی؟ لیکن وہاں کیا ہُوا؟ نہ ماتھے پر شکن آیا، نہ زید پر کوئی عتاب نازل ہُوا، نہ اُسے گھر سے نکالا، نہ باہمی تعلقات میں ذرا سا بھی فرق پڑا۔ وہی زید اور وہی نبیٔ اکرمؐ۔

اس لیے کہ وہاں تو سکھانا ہی یہ تھا کہ جن معاملات میں اللہ نے انسان کو اختیار دیا ہے ان میں کسی دُوسرے کا اثر ان اختیارات کو سلب نہیں کر سکتا۔ ہر شخص کو ان اختیارات کے جائز استعمال میں پوری پوری آزادی ہونی چاہیئے خواہ اس کا اثر بڑے سے بڑے انسان پر ہی کیوں نہ پڑے۔

کہیئے کہ تاریخ کے اوراق اس آزادی و حریت اور اس وسعتِ ظرف کی کوئی اور مثال بھی پیش کر سکتے ہیں؟

پھر اس بات کو بھی پیشِ نظر رکھیئے کہ حضرت زیدؓ نے رسول اللہؐ کے اس "حکم" کی خلاف ورزی کی۔ لیکن اسے نہ "معصیتِ رسولؐ" قرار دیا گیا، نہ امیر کے فیصلہ سے سرتابی۔ اس لیے کہ یہ حکم، نہ رسول کی حیثیت سے دیا گیا تھا نہ امیرِ ملت کی حیثیت سے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ "حکم" تھا ہی نہیں محض ایک ذاتی مشورہ تھا۔ یہ تھا حضورؐ کی مختلف حیثیتوں میں فرق، جسے تعلیمِ نبویؐ نے صحابہؓ کی نگاہوں میں نکھار اور اُبھار کر پیش کر رکھا تھا۔

نگہِ بازگشت

یہ تھا اسلامی نظام۔ بہتر ہو کہ آگے بڑھنے سے پیشتر، ایک بار پھر اس کے اجزائے ترکیبی پر نگہِ بازگشت ڈال لی جائے۔

(۱) اطاعت صرف خدا کی ہو سکتی ہے کسی انسان کی نہیں۔ حتیٰ کہ رسول بھی اپنی اطاعت کسی سے نہیں کرا سکتا۔

(۲) خدا کی اطاعت اس ضابطۂ قوانین کی رُو سے ہوتی ہے جو قرآن میں محفوظ ہے۔

(۳) یہ اطاعت ایک نظام کے ماتحت ہوتی ہے (انفرادی طور پر نہیں ہوتی) جس کا مرکزِ اوّل خود رسول ہوتا ہے۔ اس مرکز کی اطاعت کو خدا اور رسول کی اطاعت کہتے ہیں۔ یہی خدا کی حکومت کہلاتی ہے۔

(۴) جن احکام کی جزئیات تک قرآن نے متعین کر دی ہیں، اُن میں اس مرکز کو بھی ردّ و بدل کا اختیار نہیں ہوتا لیکن جو احکام قرآن میں اصولی طور پر بیان ہوئے ہیں اُس سے مقصد ہی یہ ہے کہ اُن کی جزئیات میں، اپنے اپنے زمانہ کے مطابق، ردّ و بدل ہو سکتا ہے۔ احکام کی تنفیذ اور جزئیات کی تشکیل میں مرکزِ ملت اپنی جماعت سے مشورہ لیتا ہے۔

(۵) رسول اللہؐ کے بعد، خلیفۃ الرسول، رسول اللہ کی جگہ لے لیتا ہے اور اب خدا اور رسول کی اطاعت سے مُراد اسی جدید مرکزِ ملت کی اطاعت ہوتی ہے۔

حضورؐ کے بعد

رسول اللہؐ نے یہی نظام قائم کیا اور لوگوں کو دکھلا دیا کہ دین سے یہ مفہوم ہے۔ حضورؐ کے بعد یہ سلسلہ اسی طرح آگے بڑھا لیکن کچھ عرصہ بعد، اس میں خرابیاں آنی شروع ہو گئیں اور

رفتہ رفتہ خلافت، حکومت میں بدل گئی، یعنی خدا کی حکومت واطاعت کی جگہ پھر سے انسانوں کی حکومت قائم ہوگئی جواب تک تمام اسلامی ممالک میں جاری ہے۔

یہ کس طرح ہوا اور کیوں ہوا، اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوا، اس سے دین کس طرح مذہب میں بدل گیا اب اس سے نکلنے کی صورت کیا ہے، ان سوالات کے جوابات کا یہ مقام نہیں[1]۔ یہاں تو ہم صرف یہ بتانا چاہتے تھے کہ حضور نبی اکرمؐ نے قرآن کے پیش کردہ نظامِ دین کو کس طرح ایک اسلامی مملکت کی شکل میں قائم کیا اور اپنی سیرتِ طیبہ سے بتا دیا کہ اسلامی مملکت کے سربراہ کی پوزیشن اور اس کے فرائض کیا ہوتے ہیں۔ انہی فرائض کا ایک گوشہ (یعنی ان کی معاشی ذمہ داریاں) اگلے باب میں سامنے آئے گا۔

---

[1] اس کے لیے میری کتاب "اسباب زوالِ امت" ملاحظہ فرمائیے۔

معاشی زندگی

سابقہ عنوان کے ضمن میں یہ حقیقت ہمارے سامنے آچکی ہے کہ اسلامی حکومت، دنیا میں قوانین و احکامِ خداوندی کے نافذ کرنے کی ایجنسی ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو وہ گویا عالمِ انسانیت میں خدا کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس نمائندگی کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ خدا نے جو ذمّہ داریاں، انسانوں کے سلسلہ میں اپنے اُوپر لی ہیں، یہ نظام ان ذمّہ داریوں کو پورا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم (سورۃ فاتحہ) کی پہلی آیت میں اپنی جس عظیم ذمّہ داری کا اعلان کیا ہے، وہ ہے رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، یعنی تمام نوعِ انسانی کو وہ سامان بہم پہنچانا جن سے ان کی پرورش اس انداز سے ہوتی جائے کہ جو کچھ بننے کی صلاحیت اُن میں ہے، وہ، وہ کچھ بن جائیں (اسے ربُوبیّت کہتے ہیں)۔

اس ربوبیّت میں، انسانوں کی طبیعی نشوونما بھی شامل ہے اور انسانی صلاحیتوں کی نشوونما بھی۔ طبیعی نشوونما کے لیے جو طریقِ کار اختیار کیا جائے، اُسے معاشی نظام کہتے ہیں۔ عنوان زیرِ نظر میں ہم یہ دیکھیں گے کہ نبیٔ اکرمؐ نے اپنے حسنِ عمل سے اپنی اس عظیم ذمّہ داری کو کس طرح پُورا کیا[1]۔

اِسلامی حکومت کا بُنیادی اصُول

اسلامی حکومت کا ایک بنیادی اصُول یہ ہے کہ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶) "رُوئے زمین پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمّہ داری خدا پر نہ ہو"۔ اسلامی حکومت جو خدا کے نام

---

[1] اسلام کے معاشی نظام کے موضوع پر میری مستقل تصنیف "نظامِ ربوبیّت" اس اجمال کی تفصیل ہے۔ نیز میں نے اپنی ایک تقریر "اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمّہ داریاں" میں بھی اس موضوع پر اجمالی گفتگو کی تھی۔ مندرجہ بالا عنوان اسی تقریر پر متفرع ہے۔

پر لوگوں سے اطاعت لیتی ہے، خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا عہد کرتی ہے۔ اس لیے وہ افرادِ مملکت سے اعلانیہ کہتی ہے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ (۶/۱۵۱) ہم تمہاری ضروریاتِ زندگی کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کی ضروریات کے بھی۔ وہ ان میں سے ہر فرد کو اس بات کی ضمانت دیتی ہے کہ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ لَا تَعْرٰى ۝ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ۝ (۲۰/۱۱۸-۱۱۹) ہم ایسا جنتی معاشرہ متشکل کریں گے جس میں تمہیں نہ بھوک کی پریشانی ہوگی نہ لباس، نہ پیاس کی تکلیف ہوگی نہ سردی گرمی سے بچنے کی۔ اس میں روٹی، کپڑا، مکان وغیرہ تمام افراد کو میسر ہوگا۔ اس کی ذمہ داری ہمارے سر پر ہوگی۔

آپ غور کیجئے۔ یہ کتنی عظیم ذمہ داری ہے جسے یہ مملکت اپنے سر پر لیتی ہے۔ اب آپ یہ دیکھئے کہ اس گراں بار ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لیے اس مملکت کا سربراہ اپنی زندگی کس قسم کی بسر کرتا ہے۔ اس مملکت کے سب

حضورؐ کی مکی زندگی

سے پہلے سربراہ خود نبی اکرمؐ تھے۔ آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے دو حصے ہیں: ایک مکی زندگی دوسری مدنی زندگی۔ مکہ کی زندگی میں یہ مملکت قائم نہیں ہوئی تھی لیکن حضورؐ اس جماعت کی تشکیل و تربیت میں مصروف تھے جن کی رفاقت سے یہ مملکت قائم ہوئی تھی۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ آپؐ کی مکی زندگی بڑی عسرت اور تنگ دستی کی تھی، لیکن یہ درست نہیں قرآن کریم حضورؐ کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَاَغْنٰى ۝ (۹۳/۸) ہم نے تجھے تنگ دست پایا تو غنی کر دیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضورؐ کی وہ زندگی ایک غنی کی زندگی تھی۔ یعنی ایسی زندگی جس میں آپؐ کو اپنی ضروریات کے لیے کسی کا محتاج نہیں ہونا پڑتا تھا لیکن وہاں جماعت کے افراد کی ذمہ داریاں بہت زیادہ تھیں۔ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے سلسلے میں اس وقت حضورؐ کا اسلوب کیا تھا، اس کا اندازہ صحیحین کی اس روایت سے لگ سکتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

> حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ اشعر قبیلہ والوں کے ہاں دستور یہ تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے ہاں کھانا تھوڑا رہ جاتا، یا ان کے ہاں بال بچوں پر ویسے فاقہ کی نوبت آجاتی، تو یہ لوگ اپنے اپنے کھانے کی چیزوں کو ایک جگہ جمع کر لیتے اور ایک برتن میں برابر حصے لگا کر آپس میں تقسیم کر لیتے۔
>
> رسول اللہؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان میں سے ہوں۔

اس سے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں حضورؐ اور جماعتِ مومنین کا اندازِ زیست ایسا تھا کہ اپنے اپنے کھانے

کی چیزوں کو سب اکٹھا کر لیتے اور پھر اس میں سے حصّہ رسدی کھا لیتے۔ چونکہ اس وقت جماعت میں اکثریت محتاجوں اور ناداروں کی تھی، اس لیے ظاہر ہے کہ اس مساوانی تقسیم میں ہر ایک کے حصے میں کس قدر آتا ہوگا جو کچھ دُوسرں کے حصے میں آتا ہوگا وہی حضورؐ کے حصے میں آتا ہوگا، بلکہ اس سے بھی کم۔ اس لیے کہ قرآن نے مؤمنین کا اندازِ زلیست یہ بھی تو بتایا ہے کہ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ‌ؕ (۹/۵۹) وہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے ہیں خواہ انہیں خود تنگی میں ہی گزارہ کرنا پڑے۔

مدنی زندگی

حضورؐ کی مدنی زندگی میں ایک مملکت وجود میں آگئی تھی۔ آپؐ، قریب دس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی مملکت کے سربراہ تھے۔ مولانا شبلیؒ کے الفاظ میں۔

> یہ وہ زمانہ تھا جب تمام عرب، حدودِ شام سے لے کر عدن تک فتح ہو چکا تھا اور مدینہ کی سرزمین میں زر و سیم کا سیلاب آ چکا تھا۔ (سیرۃ النبیؐ جلد اوّل، صفحہ ۵۲-۳۴۹)

لیکن اس کے باوجود، آپؐ نے جس انداز کی زندگی بسر کی اس کے متعلق کتبِ تاریخ و سِیَر میں ہے کہ۔

> حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ کا کوئی کپڑا تہ کر کے نہیں رکھا گیا۔ صرف ایک جوڑا ہوتا تھا۔ دوسرا نہیں ہوتا تھا جو تہ کر کے رکھا جاتا۔ جن کپڑوں میں آپؐ نے وفات پائی ان میں اُوپر تلے پیوند لگے ہوئے تھے۔
> گھر میں اکثر فاقہ رہتا تھا اور رات کو اکثر آپؐ اور سارا گھر بھوکا رہتا تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مدینہ کے قیام سے وفات تک، آپؐ نے کبھی دو وقت سیر ہو کر روٹی نہیں کھائی۔ (ایضاً)

اس پر لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قدر وسیع علاقہ آپؐ کے زیرِ نگین تھا۔ اتنی بڑی سلطنت کے آپؐ سربراہ تھے۔

عُسرت کی زندگی کیوں؟

مدینہ میں زر و سیم کا سیلاب آ چکا تھا تو پھر آپؐ اس قدر عُسرت کی زندگی کیوں بسر کرتے تھے۔ اس کا جواب بالعموم یہ دیا جاتا ہے کہ خدا نے حضورؐ کے سامنے دنیا اور آخرت دونوں کو پیش کیا تھا۔ آپؐ نے آخرت کو ترجیح دی اور سب کچھ میسّر ہونے کے باوجود آپؐ نے نہایت تنگ دستی اور عُسرت کی زندگی بسر فرمائی۔ لیکن یہ توجیہہ صحیح نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ یہ قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ دنیاوی آسائش و لذائذ کو قابلِ نفرت سمجھ کر ترک کر دینا، رہبانیت ہے، جسے قرآن، عیسائی راہبوں کا خود ساختہ مسلک قرار دیتا ہے جب کہتا ہے کہ وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ (۵۷/۲۷) اس مسلکِ رہبانیت کو انہوں نے خود وضع کر لیا تھا۔ اسے ہم نے ان پر واجب نہیں ٹھہرایا تھا۔ اس کے برعکس،

قرآن دنیاوی آرائش وزیبائش کی چیزوں کو وجہ جاذبیت قرار دیتا ہے اور پوری تحدی سے کہتا ہے کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (۷/۳۲) ان سے کہو کہ وہ کون ہے جو زیب وزینت کی ان چیزوں کو جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کیا ہے اور خوشگوار سامانِ زیست کو حرام قرار دیتا ہے؟ اور نبیٔ اکرمؐ سے تو خاص طور پر کہا گیا کہ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ...... (۶۶/۱) اے نبیؐ! جس چیز کو خدا نے تیرے لیے حلال قرار دیا ہے، تو اُسے حرام کیوں کرتا ہے؟ ان تصریحات سے واضح ہے کہ نبیٔ اکرمؐ اس لیے تنگ دستی اور عُسرت کی زندگی بسر نہیں کرتے تھے کہ آپؐ نے دنیاوی زیبائش وآرائش کی چیزوں کو قابلِ نفرت قرار دے کر ترک کر دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مملکت کے وجود میں آجانے سے حضورؐ کی ذمہ داریوں میں بے حد اضافہ ہو گیا تھا۔ ملک میں خوشحال

اکثریت غریبوں کی تھی

لوگوں کی تعداد بہت کم تھی، باقی سب مفلوک الحال، ضرورتمند، مفلس اور نادار تھے جن کی کفالت، مملکت کے ذمے تھی۔ ناداری کا یہ عالم تھا کہ لوگوں کے پاس جہاد میں شریک ہونے کے لیے سواری تک نہیں ہوتی تھی۔ یہی وہ حالت تھی جس کا نقشہ سورۂ توبہ میں الفاظ میں کھینچا گیا ہے کہ

وَّ لَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۪ تَوَلَّوْا وَّ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ؕ (۹/۹۲)

نہ ہی ان لوگوں پر جہاد میں عدم شرکت کی وجہ سے کوئی الزام ہے جن کی حالت یہ ہے کہ وہ تیرے پاس درخواست لے کر آئے کہ ان کے پاس سواریاں نہیں۔ تم سواری کا کچھ انتظام کر دو۔ تو تم نے کہا کہ سواری کا تو میرے پاس بھی کوئی انتظام نہیں۔ چنانچہ وہ بصد حسرت ویاس واپس چلے گئے، اس حالت میں کہ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور دل اس غم میں ڈوبا جا رہا تھا کہ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں جس سے ہم سواری کا انتظام کر لیتے اور جہاد میں شریک ہو سکتے۔

یہ تھی افرادِ مملکت کی عام حالت۔ ان حالات میں آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس مملکت کے سربراہ کو جس کی ذمہ داریوں کا وہ عالم ہو جس کا ذکر اُوپر کیا جا چکا ہے، کس قسم کی زندگی بسر کرنی پڑتی تھی۔ دُنیا کی عام مملکتوں میں رئیسِ مملکت یا دیگر اربابِ حکومت کے اخراجات کے لیے سب سے پہلے روپیہ الگ کر لیا جاتا ہے اور جو باقی بچتا ہے، اس میں

سے دیگر مدات پر صرف کیا جاتا ہے لیکن اسلامی مملکت میں صورت اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ اس میں

سربراہ سب سے پیچھے

سربراہِ مملکت اپنی ضروریات کو سب سے مؤخر رکھتا ہے۔ وہ اس وقت کھاتا ہے جب سب کھا چکتے ہیں۔ وہ اُس وقت پہنتا ہے جب سب پہن چکتے ہیں۔

ابو داؤد کی روایت ہے کہ:

حضورؐ نے فرمایا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنا دے اور وہ لوگوں کی ضروریات اور احتیاجات سے لاپرواہی برتے تو اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات اور احتیاجات کی طرف سے لاپرواہی برتے گا۔ (ابوداؤد، کتابُ الخراج)

یہی روایت ترمذی میں ان الفاظ میں آئی ہے۔

حضورؐ نے فرمایا کہ جو امام ضرورت مندوں، محتاجوں اور مسکینوں پر اپنے دروازے بند کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات اور احتیاجات کے لیے آسمان کے دروازے بند کر دیتا ہے۔

(ترمذی، کتابُ الاحکام)

اسی تفصیل کو حضورؐ نے چند الفاظ میں سمٹا کر یوں بیان فرمایا کہ:

جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا، اس بستی سے اللہ تعالیٰ کی نگرانی اور حفاظت کا ذمہ ختم ہو گیا۔ (مُسندِ امام احمد)

کوئی فرد تنہا نہ رہنے پائے

مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ کسی فرد کو محسوس تک نہ ہونے دے کہ وہ تنہا یا لاوارث ہے۔ اس لیے حضورؐ نے فرمایا کہ:

جس کا کوئی سرپرست نہ ہو، اُس کا سرپرست اللہ اور اُس کا رسول ہے۔

(ترمذی، بابُ الفرائض)

حتّٰی کہ اگر کوئی شخص ایسی حالت میں وفات پا جائے کہ اس پر کسی کا قرض ہو، تو اُس کے قرض کی ادائیگی بھی مملکت کے ذمہ ہو گی۔ حضورؐ نے یہ اعلان فرمایا تھا کہ:

میں مسلمانوں سے ان کے اپنے افراد کی نسبت زیادہ قریب ہوں۔ سو ان میں سے جو مقروض وفات پا جائے تو اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمہ ہے۔ (ابو عبید، کتاب الاموال)

مقروض کا قرض بھی مملکت ادا کرے گی اور اگر وہ اپنے اہل و عیال کو بے سہارا چھوڑ جائے گا تو اُن کی ذمہ داری

بھی مملکت کے سر پر ہوگی۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت ہے کہ:

حضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص کچھ چھوڑ جائے تو وہ اس کے گھر والوں کے لیے ہے لیکن جو کسی کو بے سہارا چھوڑ جائے تو اس کی ذمہ داری میرے سر ہوگی۔ (ترمذی، بابُ الفرائض)

نبیٔ اکرمؐ کا ذریعۂ معاش کیا تھا، اس کے متعلق تاریخ اتنا تو بتاتی ہے کہ دعویٰ نبوت سے پہلے حضورؐ نے عرب کے عام معمول کے مطابق بکریاں بھی چرائی تھیں اور تجارت بھی کی تھی لیکن دعویٰ نبوت کے بعد آپ کا ذریعۂ معاش کیا تھا، اس کے متعلق نہ قرآنِ کریم سے کوئی اشارہ ملتا ہے نہ ہی تاریخ کی کوئی تصریح ہماری نظر سے گزری ہے۔ مکّی زندگی میں اپنی مملکت قائم نہیں ہوئی تھی اس لیے مسلمانوں کی زندگی ابتدائی جماعت کی زندگی تھی لیکن اس میں ایک عظیم دعوت اور عالمگیر انقلاب کے داعی کے اوقات جس قدر مصروف ہو سکتے ہیں اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایسے مصروف کہ خود خدا کو یہ تنبیہ کرنا پڑی کہ دن بھر کی بے پناہ مصروفیتوں کے بعد آپ جو رات رات بھر اس نظام کی تشکیل و تعمیر کے سلسلہ میں مصروفِ فکر و عمل رہتے ہیں تو اس میں کمی کرنی چاہیئے (۷۳/۱-۳)۔ اس سے واضح ہے کہ اس زمانہ میں حضورؐ کو حصولِ معاش کی تگ و تاز کے لیے وقت ہی نہیں مل سکتا تھا۔ اس لیے نظامِ معیشت وہی اجتماعی ہو سکتا تھا جس کی طرف حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت میں اشارہ کیا گیا تھا، یعنی جماعت کا مشترکہ نظامِ زیست۔ مدنی زندگی کے ابتدائی مراحل میں بھی (جبکہ ہنوز فتوحات کے دروازے نہیں کھلے تھے) اندازِ معیشت اسی قسم کا رہا تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت انسؓ بن مالک کی ایک روایت میں ہے کہ کان الرّجل یجعل للنّبی النخلات (بخاری) لوگ (یعنی رفقائے جماعت) کھجوروں کے کچھ درخت رسول اللہؐ کے لیے مختص کر دیتے تھے۔ فتوحات کے بعد باغِ فدک کا مختصر سا قطعہ آپ کی معاشی ضروریات کی کفالت کرتا تھا لیکن اس میں بھی صورت یہ تھی کہ جن حاجت مندوں کی ضرورت اور کہیں پوری نہیں ہوتی تھی، انہیں بھی بابِ عالی سے سہارا ملتا تھا جس کی وجہ سے حضورؐ اور آپ کے اہلِ خانہ کو خود فاقے کاٹنے پڑتے تھے اور یہ قرآنِ کریم کے اس ارشاد کی عملی تفسیر تھی کہ اس جماعتِ مومنین کے افراد کی کیفیت یہ ہے کہ:

یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹)

وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں خواہ انہیں خود تنگی میں ہی گزارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔

اور ظاہر ہے کہ ایک اسلامی مملکت کے سربراہ کو اس کا بہترین نمونہ ہونا چاہیئے۔

معاشی نظام کے متعلق قرآنِ کریم نے کیا اصول دیئے ہیں اور حضورؐ نے انہیں کس طرح عملی طور پر متشکل فرمایا تھا، یہ الگ موضوع ہے جس کا تعلق سیرت سے نہیں بلکہ اسلام کے نظامِ معیشت سے ہے (اس موضوع پر میں شرح و بسط سے الگ لکھ چکا ہوں)۔ ان اصولوں میں ایک اصول یہ ہے کہ یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۬ۙ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (۲/۲۱۹) "یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی کمائی میں سے کس قدر دوسروں کی ضروریات کے لیے اسلامی نظام کو دے دیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زاید ہے سب کا سب"۔

اس ارشادِ خداوندی کی تفسیر میں حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ:

> ہم رسولؐ اللہ کے ساتھ سفر میں تھے۔ ایک شخص آیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ آپؐ نے فرمایا کہ جس کے پاس سواری ضرورت سے زاید ہو وہ اس آدمی کو دے دے جسے اس کی ضرورت ہو۔ جس کے پاس زادِ راہ زیادہ ہو وہ اسے دے دے جس کے پاس زادِ راہ نہ ہو۔ اسی طرح آپؐ نے بہت سی چیزوں کا ذکر فرمایا۔ حتیٰ کہ ہم نے سمجھ لیا کہ ہم میں سے کسی کو بھی ضرورت سے زائد کوئی چیز رکھنے کا حق نہیں۔ (مسلم)

مسلم ہی کی ایک اور روایت ہے۔

> حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ بندہ میرا مال، میرا مال کہتا رہتا ہے حالانکہ مال میں اس کا حصہ صرف تین چیزیں ہوتی ہیں۔ (۱) جو کچھ وہ کھا کر ہضم کر لیتا ہے۔ (۲) جسے وہ پہن کر پرانا کر دیتا ہے۔ اور (۳) جو کچھ دوسروں کی پرورش کے لیے دے کر اپنے لیے ذخیرۂ آخرت کر لیتا ہے۔ ان تین چیزوں کے علاوہ جو کچھ بھی ہوتا ہے، وہ یا تو چلا جاتا ہے یا وہ دوسروں کے لیے چھوڑ کر مر جاتا ہے۔

اسی طرح:

> حضرت بلالؓ سے مروی ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ جو رزق تجھے ملا ہے، اسے چھپا کر نہ رکھ اور جو کچھ تجھ سے مانگا جائے اس میں بخل نہ کر۔ میں نے کہا، یا رسولؐ اللہ! یہ کیسے ہو سکے گا؟ آپؐ نے فرمایا کہ یا تو یہ روش اختیار کرنی ہوگی یا جہنم کا ایندھن بننا پڑے گا۔ (الطبرانی)

ان حالات میں خود سربراہِ مملکت (حضورؐ نبیٔ اکرمؐ) کے اپنے گھر کا جو نقشہ اور جو مالی حالت ہو سکتی ہے، وہ واضح ہے۔ اور جس شخص کی زندگی میں اس کی مالی حالت اس قسم کی ہو، اس کی وفات کے بعد اس کے گھر سے جو کچھ نکلے گا، اُس

کے متعلق بھی کسی تشریح کی ضرورت نہیں۔ اس سلسلہ میں بہت سی روایات ہمارے سامنے آتی ہیں، مثلاً حضورؐ نے فرمایا کہ؛

میرے ورثا میں ایک دینار بھی بطور ترکہ تقسیم نہیں ہوگا۔ میری بیویوں کی ضروریات اور منتظم کی ضروریات کے بعد جو کچھ بھی بچے، صدقہ ہوگا۔ (بخاری)

اسی سلسلہ کی اگلی کڑی وہ روایت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

مرض الموت کے ایّام میں حضورؐ کے پاس سات دینار تھے اور حضورؐ فرماتے تھے کہ انہیں صدقہ کر دو۔ لیکن اس کے بعد حضورؐ پر غشی طاری ہوگئی اور سب لوگ آپؐ کی تیمار داری میں مصروف ہو گئے۔ آپؐ کو ہوش آیا تو فرمایا، وہ دینار لے آؤ۔ دینار کو حضورؐ نے اپنے ہاتھ پر رکھ کر کہا کہ محمدؐ کا اپنے رب پر کیا گمان ہوگا، جبکہ وہ اپنے رب سے ملے اور اس کے پاس یہ ہوں۔ پھر حضورؐ نے انہیں خود صدقہ کر دیا۔

مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ

آنحضرتؐ نے نہ درہم چھوڑا نہ دینار، نہ بکری نہ اونٹ اور نہ کسی چیز کی وصیّت کی۔

اسی طرح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ

رسول اللہؐ نے اپنی وفات کے وقت نہ دینار چھوڑا نہ درہم، نہ غلام نہ لونڈی اور نہ کوئی اور چیز سوائے اپنے ایک خچر کے اور اپنے ہتھیار کے اور اس زمین کے جسے آپؐ نے صدقہ کر دیا تھا۔

مولانا شبلی نے "سیرت النبی" میں "متروکات" کے عنوان کا آغاز ہی ان الفاظ سے کیا ہے۔

آنحضرتؐ نے جب انتقال فرمایا تو اپنے متروکات اور جائیداد میں سے کیا کیا چیزیں ترکہ میں چھوڑیں؟ اس سوال کا اصل جواب تو یہ ہے کہ آپؐ اپنی زندگی میں اپنے پاس رکھتے کیا تھے جو مرنے کے بعد چھوڑ جاتے۔ اگر کچھ تھا بھی تو اس کے متعلّق عام اعلان فرما چکے تھے کہ لَا نُوْرِثُ مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ ہمارا کوئی وارث نہیں۔ جو چھوڑا وہ عام مسلمانوں کا حق ہے۔

صدقہ کے معنی

"صدقہ" کا لفظ ہمارے ہاں تو خیرات کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ (جب دین، اجتماعی نظام کے بجائے انفرادی رہ جائے ___ جسے "مذہب" کہتے ہیں تو اس میں "خیرات" سے بلند تصور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن دین میں اس اصطلاح سے مفہوم یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی کی ذاتی ملکیت نہ رہے بلکہ

ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کا ذریعہ بن جائے)۔ ہم نے بخاری کی روایت میں (اوپر) دیکھا ہے کہ حضورؐ کے پاس وفات کے وقت کچھ زمین بھی تھی جس کے متعلّق آپؐ نے فرمایا کہ وہ بھی صدقہ ہے۔ قرآنی نظام میں زمین کی یہی پوزیشن ہوتی ہے۔ جن چیزوں پر نوعِ انسانی کی زندگی کا بنیادی طور پر دارومدار ہے وہ اللہ کی طرف سے بلامزد و معاوضہ مفت عطا ہوئی ہیں، مثلاً ہَوا، پانی، روشنی وغیرہ۔ ان پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔ یہی پوزیشن زمین کی ہے۔ یہ تمام نوعِ انسان کی پرورش کا ذریعہ ہے اور خدا کی طرف سے مفت ملی ہے۔ وَ

زمین کی پوزیشن

الْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۙ (۵۵ : ۱۰) اور ہم نے زمین کو تمام مخلوق کے فائدے کے لیے پیدا کیا ہے، اس لیے اسے سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ۝ (۴۱ : ۱۰) رہنا چاہیئے، یعنی تمام ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے یکساں طور پر کھلی (AVAILABLE)۔ حضورؐ نے دین کا جو نظام قائم کیا اور جس کی عملی تکمیل رفتہ رفتہ حضورؐ کے سچے جانشینوں کے دور میں ہوئی اس میں رزق کے اس اوّلین سرچشمہ کی یہی پوزیشن تھی۔ "زمینداری" کا رواج دنیا میں بہت قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے۔ یعنی زمین کو ذاتی ملکیت سمجھنا اور اسے کاشتکاروں کو کرائے پر دے دینا۔ عربوں کی بنیادی معیشت زراعت نہیں تھی لیکن جہاں جہاں یہ کیفیت تھی وہاں زمینداری کا بھی رواج تھا۔ حضورؐ نے اس سے منع فرما دیا۔ چنانچہ مسلم کی ایک روایت میں ہے۔

> حضرت رافع بن خدیجؓ کہتے ہیں کہ ہم رسولؐ اللہ کے زمانے میں زراعت کے لیے تہائی، چوتھائی یا غلّہ کی کوئی خاص مقدار متعیّن کرکے زمینیں بٹائی پر دیتے تھے۔ ایک روز میرے ایک چچا میرے پاس آئے اور کہا کہ رسولؐ اللہ نے ہمیں ایک ایسے کام سے روکا ہے جو ہمارے لیے نفع بخش تھا۔ مگر اللہ اور اس کے رسولؐ کی فرماں برداری زیادہ نفع بخش ہے۔ حضورؐ نے ہمیں اس بات سے منع فرمایا ہے کہ ہم زمینوں میں مزارعت کا معاملہ کریں، یعنی تہائی، چوتھائی یا مقرّرہ مقدار کے غلّہ کے عوض زمین کو کرایہ پر دے دیں۔ آپؐ نے حکم دیا ہے کہ مالکِ زمین خود کاشت کرے یا کسی دوسرے بھائی کو کاشت پر دے دے اور آپؐ نے زمین کے کرائے کو اور اس کے علاوہ دوسری صورتوں کو ناپسند فرمایا ہے۔

یہ عملی حکم اس اصول کی تشریح تھا جسے حضورؐ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا تھا کہ

> زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے ہیں۔ اس لیے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لیے رہنی چاہیئے۔ (ابوداؤد)

اور جب آپؐ نے اس قطعۂ زمین کے متعلق جو آپؐ کے ذاتی اخراجات کے لیے آپؐ کی تحویل میں تھا، فرمایا کہ وہ صدقہ ہے تو وہ بھی اسی اصول کی عملی تفسیر تھی۔ اس لیے کہ رسول سب سے پہلے خود احکامِ خداوندی پر عمل کرتا ہے اور اس طرح اس کا عمل دوسروں کے لیے نمونہ بنتا ہے۔ یہی حیثیت اسلامی مملکت کے ہر سربراہ کی ہوتی ہے۔ وہ خود اُن قوانین پر عمل کر کے دوسروں کے لیے مثال بنتا ہے۔ حضورؐ کی ذاتِ گرامی میں چونکہ یہ دونوں حیثیتیں یک جا تھیں اس لیے حضورؐ نے دُنیا کو دکھا دیا کہ قرآن کا پیش کردہ نظام کس طرح قابلِ عمل ہے اور اسلامی مملکت کے سربراہ کی زندگی کس قسم کی ہونی چاہیئے۔

ہم نے اس مقام پر اس انقلابِ عظیم کا ذکر نہیں کیا جو حضورؐ نے نوعِ انسانی کے معاشی نظام میں برپا کیا۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے اور اسے کتابِ سیرت میں ضمناً بیان نہیں کیا جا سکتا[1]۔ اس سلسلہ میں صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ اس زمانہ میں صنعت کاری (انڈسٹری) ذریعۂ معیشت نہیں تھی۔ معیشت کا مدار بالعموم تجارت اور زراعت پر تھا۔ جہاں تک زراعت کا تعلق ہے، قرآنِ کریم کی رُو سے (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) زمین جیسے ذریعۂ پیداوار پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ انسانوں کے لیے سامانِ زیست حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ زمین پر انفرادی ملکیت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص، بے حد و نہایت قطعۂ اراضی پر قابض ہو جاتا ہے۔ دوسرے لوگ (مزارع) اسے کاشت کرتے ہیں اور زمین کا "مالک" نصف پیداوار یا ٹھیکہ کے روپے مفت میں اینٹھ لیتا ہے۔ نبئ اکرمؐ نے زمین کو ٹھیکہ یا بٹائی پر دینے کو ممنوع قرار دے کر، پیداوار کا مالک، کاشتکار کو بنا دیا اور اس طرح یہ عظیم معاشی اصول ثبت کر دیا کہ معاوضہ محنت کا ہے، سرمایہ کا نہیں۔ چنانچہ ابو داؤد میں حضرت رافعؓ بن خدیج کی یہ روایت موجود ہے کہ

> وہ کھیت میں پانی دے رہے تھے کہ نبئ اکرمؐ کا اُدھر سے گزر ہوا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ زمین کس کی ہے اور اس پر کاشت کون کرتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں اس پر کاشت کرتا ہوں، بیج بھی ڈالتا ہوں اور محنت بھی کرتا ہوں۔ پیداوار کا ایک حصہ میرا ہوتا ہے اور ایک حصہ فلاں (مالکِ اراضی) کا۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم دونوں سودی کاروبار کرتے ہو۔ زمین کو اس کے مالک کی طرف لوٹا دو اور جو کچھ تم نے خرچ کیا ہے، اس سے لے لو۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت کے مطابق، اس قسم کی مزارعت کو حضورؐ نے اسی طرح "خدا اور رسولؐ کے

---

[1] اس موضوع پر میری مستقل تصنیف (نظامِ ربوبیت) اور متفرق مضامین موجود ہیں۔

خلاف اعلانِ جنگ" سے تعبیر فرمایا جس طرح قرآنِ کریم میں ربٰو کو اعلانِ جنگ کہا گیا ہے (ابوداؤد)۔ ربٰو کہتے ہی سرمایہ پر بیٹھی (بڑھوتی) کو ہیں خواہ اس کی شکل کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اس اصول کے مطابق، جو فیصلہ مزارعت کے متعلق ہے وہی تجارت میں مضاربت (یعنی محض روپیہ لگا کر نفع میں شریک ہونے) کے متعلق ہے یعنی اسلام میں اس کی بھی اجازت نہیں۔ قریش جو حضورؐ کی دعوت کی اس قدر شدید مخالفت کرتے تھے تو اس کی وجہ یہی تھی کہ ان کی معیشت کا دارومدار اس قسم کی تجارت پر تھا۔ اور جس نظام کی دعوت حضورؐ دیتے تھے اس میں انہیں خود محنت کر کے روٹی کھانی پڑتی تھی۔ یہی حالت وہاں کے یہودیوں کی تھی جو روپیہ (سرمایہ) کے زور پر دوسروں کی کمائی کی دولت سمیٹتے چلے جاتے تھے۔ مدینہ میں ان کی طرف سے شدید مخالفت کی وجہ بھی یہی تھی لیکن حضورؐ نے، زندگی بھر کے جہادِ مسلسل سے اس غلط معاشی نظام کو مٹا کر اس کی جگہ اس نظام کو قائم کر کے دکھا دیا جس میں نہ کوئی فرد، اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم رہتا تھا اور نہ ہی کوئی کسی دوسرے کی محنت پر عیش کی زندگی بسر کر سکتا تھا۔ اور اس نظام کی سب سے پہلی عملی مثال خود حضورؐ کی اپنی حیاتِ طیبّہ تھی کہ اتنے وسیع و عریض وسائلِ دولت کی موجودگی میں، آپؐ نے ایک "مزدور" کی سی زندگی بسر فرمائی۔ دنیا میں صحیح نظام اسی طرح سے قائم ہُوا کرتے ہیں۔

درُونِ خانہ

عائلی اور معاشرتی زندگی

مغربی فکر نے جہاں روح اور مادّہ، دین اور دنیا، مذہب اور سیاست کو الگ الگ کر دیا، اس کے ساتھ ہی انسان کی پرائیویٹ اور پبلک لائف کو بھی ایک دوسرے سے علٰحدہ علٰحدہ قرار دے دیا یعنی اگر ایک شخص اچھا مدبّر ہے اور امورِ مملکت کو بطریقِ احسن سرانجام دیتا ہے تو وہ ہمارا لیڈر ہے، قوم کا ہیرو ہے ہمیں اس سے کچھ واسطہ نہیں ہونا چاہیئے کہ اس کا پرائیویٹ کیریکٹر کیسا ہے۔ انسانی زندگی کی یہی وہ ثنویّت ہے جس کی وجہ سے یورپ میں مادّی ترقی کی اس قدر بلندیوں کے ساتھ انسانیت اس قدر پستیوں میں گر چکی ہے قرآن انسان کو تماماً وکمالاً دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک جس طرح یہ تصوّر باطل ہے کہ کائنات میں رُوح اور مادّہ اور حیات

زندگی ناقابلِ تقسیم ہے

اجتماعیہ میں مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے ہیں، اسی طرح یہ عقیدہ بھی غلط ہے کہ انسانی سیرت پرائیویٹ اور پبلک شعبوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے جس طرح چندن کا ہر ذرّہ چندن اور شہد کا ہر قطرہ شہد ہوتا ہے اسی طرح ایک بلند سیرت انسان کی زندگی کا ہر پہلو بلند ہوتا ہے۔ قرآن انسانی سیرت کی تماماً تعمیر کرتا اور اس کا کمالاً ارتقاء چاہتا ہے۔ اس کے کسی ایک گوشے کو باقی زندگی سے الگ کر کے نہیں لیتا۔ نبیٔ اکرمؐ نے جب مخالفینِ عرب کے سامنے اپنے دعوے کی صداقت میں یہ ثبوت پیش کیا کہ

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ٥ (۱۰/۱۶)

کہ میں نے تمہارے اندر اپنی زندگی بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ایسی زندگی ایک جھوٹے انسان کی ہو سکتی ہے یا سچے کی؟

تو اس سے آپ نے صرف اپنی پبلک لائف ہی کو بطورِ حجت پیش نہیں کیا تھا، اس میں پرائیویٹ لائف بھی شامل تھی کہ (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) اسلام میں ان دونوں میں کوئی فرق اور تمیز ہی نہیں۔ انسان کی عائلی اور عام معاشرتی زندگی اس کے کیریکٹر کے پرکھنے کی سب سے بڑی کسوٹی ہوتی ہے۔

حضرت خدیجہؓ سے شادی

نبیٔ اکرمؐ پچیس برس کے تھے کہ آپؐ کی شادی حضرت خدیجہؓ سے ہوئی جن کی عمر (روایات کے مطابق) اس وقت چالیس سال کی تھی اور جن کے دو شوہر اس سے پیشتر فوت ہو چکے تھے اور ان کے اولاد بھی تھی۔ ۶۵ برس کی عمر تک وہ آپ کی شریکِ زندگی رہیں۔ بظاہر یہ جوڑ کس قدر انمل نظر آتا ہے لیکن ایسا ایک واقعہ بھی سامنے نہیں آتا جس میں اس جوڑے کی ازدواجی زندگی کے کسی معاملہ میں بھی ناخوشگوار تعلقات کی ذرا سی بھی خلش پائی جاتی ہو۔ میاں بیوی کے تعلقات کو قرآنِ کریم نے هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ[1] کے لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ یعنی وہ تمہارے اسرار و بطون سے واقف، تم ان کے سرائر و محجوبات سے باخبر۔ انسان کی پرائیویٹ زندگی سے متعلق اس کی بیوی سے زیادہ کون باخبر ہو سکتا ہے؟ اور یہی وجہ ہے کہ یورپ میں بڑے بڑے مشاہیرِ قوم کی خانگی زندگی اکثر تلخ و ناکام رہتی ہے۔ حضرت خدیجہؓ حضورؐ کی پرائیویٹ لائف سے آپؐ کے متعلق کس نتیجہ پر پہنچی تھیں، اس کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ جب آپؐ نے اپنی پہلی وحی کے بعد حضرت خدیجہؓ سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے بلا تامل کہہ دیا کہ آپؐ خدا کے رسول ہیں میں آپ کی رسالت پر ایمان لاتی ہوں۔ حضرت خدیجہؓ صاحبِ مال و متاع تھیں لیکن وہ سب کچھ تبلیغِ اسلام کی نذر ہو گیا اور آپ نے اُن مشکلات و صعوبات اور مصائب و شدائد میں حضورؐ کا ساتھ دیا جو مخالفین کی طرف سے حضورؐ پر یورش کر کے آئیں۔ دعوتِ اسلام کی ابتدائی زندگی کی اندوہناکیاں گزشتہ صفحات میں ہماری نگاہوں سے گزر چکی ہیں۔ حضرت خدیجہؓ نے ان سب کو بہ سکونِ قلب جھیلا اور ایک سچی رفیقۂ حیات کی طرح سفرِ زندگی میں اپنی رفاقت کا ثبوت دیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان میاں بیوی کے تعلقات کس قدر خوشگوار و استوار تھے۔ اس قدر خوشگوار کہ اُن کی یاد عمر بھر نبیٔ اکرمؐ کے لیے وجہ نشاطِ خاطر رہی۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد بھی حضورؐ کا یہ معمول تھا کہ اگر گھر میں کوئی جانور ذبح ہوتا ہے تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر حضرت خدیجہؓ کی ہم نشین عورتوں کے ہاں گوشت

[1] تم ان کے لیے بمنزلہ لباس کے ہو اور وہ تمہارے لیے بمنزلہ لباس کے۔

بھجواتے۔ ایک دفعہ ایک بڑھیا آئی جس کی حضورؐ نے بڑے التفات سے خیریت پوچھی، اس کے حالات دریافت فرماتے رہے جب وہ چلی گئی تو حضرت عائشہؓ نے پوچھا کہ یہ کون تھی؟ حضورؐ نے فرمایا کہ خدیجہؓ کے زمانہ میں یہ ہمارے ہاں آیا کرتی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے حسنِ تعلقات کی یاد حضورؐ کے قلبِ منورؐ کے کس قدر نرم گوشے میں تھی۔

ذاتی ملازم

ذاتی ملازم بھی انسان کی پرائیویٹ زندگی کے بڑے راز داں ہوتے ہیں حضرت زیدؓ بن حارث غلام تھے (یوں سمجھئے کہ گھر کے ملازم) حضورؐ نے انہیں آزاد کر دیا۔ ان کے والد نے سُنا تو بیٹے کو لینے کے لیے آئے۔ غور کیجئے کہ ایک غلام لڑکے کے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کا موقع اور کیا ہو سکتا ہے کہ اُسے آزاد کر دیا جائے اور اُسے اُس کے گھر لے جانے کے لیے اُس کا باپ آجائے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جاؤ بیٹا تم آزاد ہو۔ اپنے باپ کے ساتھ گھر جاؤ۔ زیدؓ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور عرض کیا کہ حضورؐ! میں باپ کے ساتھ نہیں جانا چاہتا، آپؐ ہی کے پاس رہنا چاہتا ہوں۔ اللہ اکبر! یہ حُسنِ سلوک اور یہ پاکیزگی زندگی کہ غلام لڑکا یہ کہتا ہو کہ میں آزاد ہو کر ماں باپ کے پاس نہیں جانا چاہتا، یہیں رہنا چاہتا ہوں!

تو نخلِ خوش ثمرے کیستی کہ باغ و چمن
ہمہ ز خویش بریدند و با تو پیوستند!

تعدّدِ ازدواج

حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد نبی اکرمؐ نے متعدّد شادیاں کیں۔ وہ معاندینِ اسلام جو نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ کو ہمیشہ تعصب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اس تعدّدِ ازدواج پر شدّت سے اعتراض کرتے رہتے ہیں۔ یہ اعتراضات زیادہ تر عیسائی مشنریوں (یا اُن کی دیکھا دیکھی ہندو متعصّبین) کی طرف سے کیے جاتے ہیں۔ لیکن اگر آپ بغور دیکھیں گے تو آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اکثر و بیشتر ان کے اعتراضات کے جوابات انہی لوگوں کے ہاں سے انہیں مل جاتے رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ان اعتراضات کو خود ان کے ہاں بھی زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ ہم تو اس چیز کو سمجھ ہی نہیں سکے کہ عیسائی مشنری یا ہندو پرچارک اس باب میں کس طرح اعتراض کر سکتے ہیں جبکہ خود ان کے مذہبی راہ نماؤں (عیسائیوں کے پیغمبروں اور ہندوؤں کے اوتاروں) کے ہاں تعدّدِ ازدواج کی مثالیں موجود ہیں۔ تورات میں (جو انجیل کا عہد نامہ عتیق ہے) حضرت داؤدؑ کی نو بیویوں اور دس حرموں کا ذکر موجود ہے (دیکھیئے کتاب سیموئیل ۱۵ و ۱۶) حضرت

سلیمانؑ کے متعلق سلاطین ۱ باب (۱۱/۳) میں ہے کہ آپ کی سات سو بیویاں اور تین سو حرم تھیں۔ لونڈیوں کو بیوی بنانے کا حکم بھی تورات میں موجود ہے جہاں حضرت موسیٰؑ کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے :

جب تو لڑائی کے لیے اپنے دشمنوں پر خروج کرے اور خداوند تیرا خدا اُن کو تیرے ہاتھوں سے گرفتار کرے اور تو اُنہیں اسیر کر لائے اور ان اسیران میں خوبصورت عورت دیکھے اور تیرا جی اسے چاہے کہ تو اسے اپنی جورو بنائے تو تُو اسے اپنے گھر میں لا۔ اُس کا سر مُنڈا اور ناخن کٹا۔ تو وہ اپنا اسیری کا لباس اُتارے اور تیرے گھر میں رہے اور ایک مہینہ بھر اپنے باپ اور ماں کے سوگ میں بیٹھے۔ بعد اس کے تُو اُس سے خلوت کر اور اس کا خصم بن اور وہ تیری جورو بنے۔

(استثنا ، ۲۱/۱۰-۱۳)

ہندوؤں کے ہاں شری رام چندر جی مہاراج کے والد مہاراج دسرتھ کی تین بیویوں کا ذکر رامائن میں موجود ہے۔ لالہ لاجپت رائے نے اپنی کتاب "کرشن چرتر" میں شری کرشن جی کی کم از کم آٹھ رانیاں تسلیم کی ہیں۔ ان امور کا ذکر ہم نے محض یہ بتانے کے لیے کیا ہے کہ جن لوگوں کے اپنے مذہبی راہنماؤں کے ہاں بیویوں کی تعداد کا یہ عالم ہو، انہیں حق نہیں پہنچتا کہ وہ نبیٔ اکرمؐ کی تعددِ ازواج پر انگلی اٹھائیں۔

اس کے بعد ہم تعددِ ازواج کے اصل مسئلہ کی طرف آتے ہیں۔ قرآنِ کریم ایک وقت میں ایک بیوی (MONOGAMY) کو اصول قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نکاح کا مقصد باہمی محبت، مودت، سکون اور

قرآنی راہنمائی

رحمت ہے (۳۰/۲۱) وہ ایسے گھر کو جنت سے تعبیر کرتا ہے (۲/۳۵) اس مقصد کے لئے وہ کہتا ہے کہ نکاح اچھی طرح دیکھ بھال کر کرو۔ لیکن اس کے باوجود وہ اسے بھی تسلیم کرتا ہے کہ ایسی صورت پیدا ہو سکتی ہے کہ نکاح کے بعد متاہل زندگی کا تجربہ بتائے کہ انتخاب صحیح نہیں ہوا۔ ایسی صورت میں تم اس معاہدے کو قاعدے کے مطابق فسخ کر کے اس بیوی کی جگہ دوسری بیوی سے نکاح کر سکتے ہو۔ وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ (۴/۲۰) "اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی بدلنا چاہو تو اس کے لیے یوں کرو۔" یہ آیت اس حقیقت پر دلالت کرتی ہے کہ قرآن کا اصول ایک وقت میں ایک بیوی کا ہے۔ لیکن

ہنگامی حالات

قرآنِ کریم اسے بھی تسلیم کرتا ہے کہ بعض اوقات ایسے ہنگامی حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن کے پیشِ نظر اس اصولی قانون میں استثناء کی ضرورت لاحق ہو جائے۔

اس قسم کے حالات اسلام کے ابتدائی دور میں مدینہ کی زندگی میں پیدا ہو گئے تھے۔ اس وقت کیفیت یہ تھی کہ:

(۱) مسلمانوں کی ایک محدُودسی جماعت تھی۔ (جنگِ بدر میں 'جو ۲ھ ہجری میں ہوئی تھی' مسلمان مجاہدین کی تعداد صرف ۳۱۳ تھی۔

(۲) مسلسل لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو رسول اللہ کی پوری مدنی زندگی میں جاری رہا۔

(۳) ان لڑائیوں کی وجہ سے، اس مختصر سی جماعت میں نوجوان افراد کی کمی ہوتی چلی گئی اور بیوائیں اور یتیم بچے دن بدن زیادہ ہوتے گئے۔ ان کے علاوہ مسلمان عورتیں مکہ میں اپنے غیر مسلم خاوندوں کو چھوڑ کر مدینہ کی طرف آنا شروع ہو گئیں۔

(۴) مسلمان عورتیں صرف مسلمان مردوں سے شادی کر سکتی تھیں کسی غیر مسلم سے نہیں کر سکتی تھیں حتٰی کہ اہلِ کتاب (یہود و نصارٰی) سے بھی نہیں۔

(۵) لہٰذا، اُس وقت صُورت یہ پیدا ہو گئی کہ بیواؤں کی اور شادی کے قابل لڑکیوں کی تعداد، مردوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہو گئی۔ بیواؤں کے ساتھ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے یتیم اور لاوارث رہ گئے۔

(۶) ان ہنگامی حالات میں اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ "ایک بیوی" کے اصولی قانون میں استثناء (EXCEPTION) کر دی جائے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر قرآن نے کہا کہ

وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً ..... (۴/۳)

اس آیت کے تین حصّے ہیں اور تینوں کا ترجمہ اور مفہوم حسبِ ذیل ہے۔

(۱) وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی .....

اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتامٰی کے ساتھ انصاف نہیں کر سکو گے۔

عربی زبان میں "یتٰمٰی" یتیم بچّوں کو بھی کہتے ہیں اور ان عورتوں کو بھی جن کے شوہر نہ ہوں (خود قرآنِ کریم میں یَتَامَی النِّسَآءِ انہی معنوں میں آیا ہے ۴/۱۲۷)۔ لہٰذا آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں جن میں تم دیکھو کہ یتیم بچے اور بے شوہر عورتیں معاشرہ میں زیادہ ہو گئیں ہیں اور "ایک مرد۔ ایک عورت" کے اصول کے مطابق، ان کے مسئلہ کا منصفانہ حل نہیں مل سکتا تو کیا کرو؟

(۲) فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ

ان عورتوں میں سے اپنی پسند کے مطابق نکاح کرلو۔ دو دو، تین تین، چار چار تک (جیسا کہ ضرورت کا تقاضا ہو)۔

(۳) اس کے لیے بھی ایک شرط ہے۔ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً لیکن اگر تمہیں خدشہ ہو کہ تم عدل نہیں کرسکو گے تو پھر وہی "ایک بیوی کا اصُول" برقرار رہے گا۔

بات بالکل صاف ہے "عدل" کے متعلق قرآنِ کریم نے آگے چل کر کہہ دیا کہ جہاں تک جذبات کا تعلق ہے، ان میں یکسانیت کا سلوک تو ناممکن ہے۔ اتنی احتیاط رکھو کہ ایک بیوی کی طرف اتنا نہ جُھک جاؤ کہ دوسری اُدھر لٹکی رہ جائے (۴/۱۲۹)۔

قرآنِ کریم میں ایک بیوی کی موجودگی میں، دوسری بیوی کے سلسلے میں یہی ایک آیت ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور آیت نہیں۔ اس کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ اگر معاشرہ میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ان عورتوں اور جوان لڑکیوں کی تعداد بہت بڑھ جائے جو شادی کے قابل ہوں لیکن انہیں شوہر میسر نہ آسکیں تو اس صورت میں، اس اجتماعی مشکل کا یہ حل تجویز کیا گیا ہے۔ عام حالات میں اس کی اجازت نہیں۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، مکہ کی زندگی میں (جب اس قسم کے ہنگامی حالات پیدا نہیں ہوئے تھے) حضورؐ نے "ایک وقت میں ایک بیوی" (MONOGAMY) کے اصُول کی پابندی کی لیکن مدینہ میں آکر جب وہ ہنگامی حالات پیدا ہو گئے جن کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے، اس اہم اجتماعی مسئلہ کے حل کے لیے ایک سے زیادہ بیویوں کی ضرورت لاحق ہوئی۔ قرآنِ کریم نے یہ تو نہیں بتایا کہ حرمِ نبویؐ میں، ایک وقت میں ازواجِ مطہراتؓ کی تعداد کتنی تھی لیکن کُتبِ سِیَر و تاریخ میں، جن ازواجِ مطہراتؓ کا ذکر آیا ہے، اس سے واضح ہے کہ وہ (ایک کے سوا) ایسی خواتین تھیں جو لاوارث رہ گئی تھیں اور ان کے لیے "حفاظت اور باعزت چھت" مہیا کرنا نہایت ضروری تھا۔ ان میں سے بعض نہایت بلند خاندانوں کی خواتین تھیں۔ انہیں، ان کی عزت و احترام کے پیشِ نظر حضورؐ نے خود اپنے دامنِ عاطفت میں پناہ دی۔ یہ ظاہر ہے کہ ان معزز خواتین اور ان کے یتیم بچوں کو اس قسم کی باعزت پناہ اسی صورت میں مل سکتی تھی کہ انہیں جزوِ خاندان بنا لیا جاتا۔ اگر ان کی پوزیشن آستانِ اُفتادہ لاوارثوں کی سی رہتی تو اس سے جو نفسیاتی خرابیاں اُبھرتیں، وہ بالکل واضح ہیں۔ ان ازواجِ مطہرات کے جو کوائف کُتبِ روایات میں ملتے ہیں، مختصر الفاظ میں حسبِ ذیل ہیں۔

حضرت سُودہؓ | یہ سکران بن عمر کی زوجیت میں تھیں۔ میاں بیوی دونوں نے اسلام قبول کرلیا اور مکہ کے

صعوبت انگیز حالات میں حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ وہاں اُن کے خاوند نے انتقال کیا اور یہ مسلم خاتون دیارِ غیر میں کس مپرسی کے عالم میں رہ گئیں۔ نبئ اکرمؐ نے انہیں اپنی زوجیت میں لے کر ان کے لیے سکون و دل جمعی کا سامان مہیّا کر دیا۔

حضرت حفصہؓ حضرت حفصہؓ حضرت عمرؓ کی صاحبزادی خنیسؓ بن حذافہ کے گھر میں تھیں۔ انہوں نے بھی حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ ہجرت سے واپسی پر حضرت خنیسؓ بدر و اُحد کے غزوات میں شریک ہوئے۔ جنگِ اُحد میں زخمی ہو کر مدینہ میں وفات پائی۔ حضرت عمرؓ کو اپنی بیوہ بیٹی کا بڑا صدمہ تھا۔ انہوں نے پہلے حضرت ابوبکرؓ سے اس کا ذکر کیا۔ پھر حضرت عثمانؓ سے، لیکن ان دونوں میں سے ایک نے بھی نکاح پر آمادگی ظاہر نہ کی۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ مسلمان اُس وقت کن معاشرتی مشکلات میں تھے۔ حضرت عمرؓ کی حیثیت اور وجاہت، کیا بہ زمانۂ جاہلیت اور کیا بہ زمانۂ عہدِ اسلام، کچھ کم نہ تھی۔ یہ دقّت انہیں خود اپنی لڑکی کے متعلق پیش آ رہی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس مشکل کا ذکر رسول اللہؐ سے کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ گھبرانے کی بات نہیں حفصہؓ کی شادی اُس شخص سے ہو جائے گی جو عثمانؓ سے بھی بہتر ہے۔ اس طرح حضرت حفصہؓ سے آپؐ کی شادی ہوئی۔

حضرت زینبؓ اس کے بعد اُمّ المومنین حضرت زینبؓ کو لیجئے۔ ان کا پہلا نکاح طفیل سے اور دوسرا عبیدہ سے ہوا۔ ان کے بعد تیسرا نکاح عبداللہ بن جحشؓ سے ہوا۔ یہ جنگِ اُحد میں شہید ہو گئے۔ ان حالات میں رسول اللہؐ نے اُن سے نکاح کیا۔ وہ نکاح کے بعد صرف دو یا تین مہینے زندہ رہیں۔

حضرت اُمِّ سلمہؓ حضرت اُمِّ سلمہؓ حضرت ابوسلمہؓ کے نکاح میں تھیں۔ انہوں نے اپنے خاوند کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ وہاں سے واپس آ کر حضرت ابوسلمہؓ جنگِ بدر میں شریک ہوئے اور جنگِ اُحد میں زخمی ہو کر شہید ہو گئے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے اور حضرت اُمِّ سلمہؓ کی تمام عمر اسلام کی خاطر اندوہ و مصائب میں گزری تھی۔ ان حالات کے پیشِ نظر حضورؐ نے اس کنبہ کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔

حضرت زینبؓ حضرت زینبؓ آپؐ کی پھوپھی زاد بہن تھیں جن کی شادی حضورؐ نے اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ سے کی تھی اور انہوں نے انہیں طلاق دے دی تھی۔ ایک تو بنو ہاشم کی ممتاز ترین خاتون کی شادی ایک غلام کے ساتھ، پھر اس کے بعد طلاق۔ اس طلاق کا اثر حضرت زینبؓ اور ان کے خاندان پر کیا پڑا ہو گا اور خود نبئ اکرمؐ کے دل پر کتنا بڑا صدمہ ہو گا؟ اس کی تلافی اسی صورت میں ممکن تھی

کہ حضرت زینبؓ کو وہ جگہ دے دی جاتی جو اس زمانہ میں ایک عورت کا بلند ترین مقام سمجھا جاتا تھا یعنی اُمّ المومنین ہونے کا شرف۔ سورۂ احزاب کی آیت (۳۳/۴۸) میں اس واقعہ کا ذکر آیا ہے۔

حضرت اُمِّ حبیبہؓ

اُمّ المومنین حضرت اُمِّ حبیبہؓ مکّہ کے سردار ابوسفیان کی بیٹی، عبداللہ بن جحش کی بیوی، خاوند کے ساتھ حبش کو ہجرت کی۔ عبداللہ دائم الخمر تھا۔ حبشہ میں جاکر عیسائی ہوگیا لیکن حضرت اُمِّ حبیبہؓ مسلمان رہیں۔ باپ مسلمانوں کا سخت ترین دشمن، خویش و اقارب تمام غیر مسلم۔ ایک خاوند کا سہارا تھا وہ اس طرح ختم ہوگیا۔ پردیس کا معاملہ، بکیسر کس مپرسی کا عالم! رسول اللہ کو ان کی حفاظت کا اتنا خیال ہوا کہ وہیں ایک پیغامبر کی زبانی شاہ حبش کی وساطت سے شادی کا پیغام بھیج دیا۔ حضرت اُمِّ حبیبہؓ اس پیغام سے اس قدر خوش ہوئیں کہ بادشاہ کی جس لونڈی نے جاکر یہ مژدہ سنایا، اپنا زیور اُتار کر اسے دے دیا۔ غور فرمائیے کہ نبیٔ اکرمؐ کو ان مشکل ایّام میں کن کن معاملات پر نگاہ رکھنی پڑتی تھی اور انہیں کس کس طرح سلجھانا پڑتا تھا۔ یہی حضرت اُمِّ حبیبہؓ ہیں کہ جب ان کا باپ (ابوسفیان) ملنے کے لیے آیا ہے تو انہوں نے بستر لپیٹ کر ایک طرف کر دیا کہ اس پر نہ بیٹھے۔ اس نے کہا کہ بیٹی! مجھ سے بستر الگ رکھتی ہو؟ فرمایا کہ یہ بستر وہ ہے جس پر رسول اللہ استراحت فرماتے ہیں، ایک مشرک اسے نہیں چھو سکتا۔

حضرت میمونہؓ

حضرت میمونہؓ پہلے مسعود کے نکاح میں تھیں۔ اُس نے طلاق دے دی تو عبد العزیٰ کے نکاح میں آئیں۔ جب نبیٔ اکرمؐ نے ۷ھ میں عمرہ فرمایا ہے تو اُس وقت آپ بیوہ ہوچکی تھیں۔ مکّہ میں اُس وقت مسلمانوں کی جو حالت تھی وہ ظاہر ہے۔ حضرت عبّاسؓ نے نبیٔ اکرمؐ سے ان کی شادی کی تحریک کی اور آپؐ نے اُسے قبول فرما لیا۔ یہ نبیٔ اکرمؐ کی آخری شادی تھی۔

حضرت سودہؓ سے نکاح کس وقت ہوا تھا اس کے متعلق یقینی طور پر معلوم نہیں۔ ان کے علاوہ باقی تمام مندرجہ بالا شادیاں ۳ھ سے ۷ھ تک کے زمانہ میں ہوئیں۔ جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے، یہ زمانہ مسلمانوں پر انتہائی مصائب و صعوبات کا دور تھا۔ مخالفین نے اس تمام زمانہ میں ایک دن بھی آرام سے نہیں بیٹھنے دیا۔ مدینہ میں نئی نئی آبادی، معاش کی تنگی، اسباب و ذرائع کی کمی، تمام قبائل سے جنگ، ان حالات میں جبکہ ملّت کے افراد کا سب خود پریشانیوں میں مبتلا تھے، بیوگان اور یتامیٰ کا خاطر خواہ انتظام کیا سوچا جاسکتا تھا؟ زیادہ سے زیادہ یہی ممکن تھا کہ جو لوگ صاحبِ استطاعت و مقدرت ہوں وہ ان کس مپرس اور بے یار و مددگار کنبوں کو (جن کی تعداد لڑائیوں کی وجہ سے غیر معمولی طور پر بڑھ گئی تھی) اپنی حفاظت میں لے لیں اور یہ ظاہر ہے کہ ایک بیوہ

اور اس کے بچّوں کی حفاظت اور باعزت کفالت کا بہترین انتظام یہی ہوسکتا تھا کہ اس کی کہیں شادی کر دی جائے۔ ان شادیوں کو درحقیقت "پناہ گزینی اور پناہ دہی" کہنا چاہیے۔ اس فریضہ کی سرانجام دہی میں باقی افرادِ امّت کے ساتھ خود رسولؐ اللہ بھی شریک تھے۔

۸ھ میں مکہ فتح ہوگیا تو حالات نے پلٹا کھایا۔ بیرونی مخالفت کم ہوگئی۔ خوش حالی کا زمانہ آگیا۔ مساعدتِ وقت نے اکثر و بیشتر مشکلات کا حل خود تجویز کر دیا۔ اس کے بعد نبیٔ اکرمؐ نے کوئی اور شادی نہیں کی حالانکہ اگر نفس پرستی کی خاطر شادی کرنی ہوتی تو اس کے لیے بہترین زمانہ اب ہی آیا تھا جب ہر طرف سے فراغت تھی اور حضورؐ کی حیثیت ایک رئیسِ مملکت کی ہوچکی تھی۔

اب بقایا تین شادیوں کو لیجیے۔ مشکلات کے اس ہجوم میں جس کا ذکر اُوپر کیا جاچکا ہے سب سے بڑی ضرورت اس امر کی تھی کہ جن قبائل سے بھی ممکن ہو خوشگوار تعلّقات وابستہ ہوجائیں۔ اصول کو ہاتھ سے دے کر تعلّقات کی وابستگی تو کسی صورت میں بھی قابلِ قبول نہیں ہوسکتی تھی۔ اگر ایسا ہی کرنا ہوتا تو مخالفت ہی کیوں مول لی جاتی۔؟ دوسری صورت یہی تھی کہ جن قبائل سے ممکن ہو رشتہ داریوں کے تعلّقات قائم کر لیے جائیں۔

حضرت جویریہؓ نبیٔ اکرمؐ کی دو شادیاں اسی مصلحت کے تحت عمل میں آئیں۔ حضرت جویریہؓ قبیلہ بنی مصطلق کے سردار حارث بن ضرار کی بیٹی تھیں۔ ان کا شوہر غزوۂ مریسیع میں قتل ہوگیا اور یہ خود اسیر ہوگئیں۔ انہوں نے رسولؐ اللہ سے کہا کہ میں مسلمان ہوں اور ان مصائب کا شکار۔ حضورؐ نے انہیں آزاد کر دیا۔ اس وقت اس قبیلہ کے قریب سات سو جنگی قیدی مسلمانوں کے پاس تھے۔ حضرت جویریہؓ قبیلہ کے رئیس کی بیٹی تھیں اور بیوہ۔ ان تمام الجھنوں کا نہایت عمدہ اور خوشگوار حل یہ تھا کہ اس قبیلہ سے حضورؐ کے تعلّقاتِ مصاہرت پیدا ہوجائیں۔ حضرت جویریہؓ حضورؐ کے ساتھ عقد پر رضامند ہوگئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام جنگی قیدی رہا ہو گئے اور اس قبیلہ سے خوشگوار تعلّقات وابستہ ہوگئے۔

حضرت صفیہؓ جنگِ خیبر کا حال پہلے گزر چکا ہے۔ یہ یہودیوں کی سازشوں کا نتیجہ تھی۔ اس جنگ کے قیدیوں میں حضرت صفیہؓ بھی تھیں۔ باپ بنی نضیر کا رئیس اور ماں بنو قریظہ کے رئیس کی بیٹی۔ یہی یہودیوں کے ممتاز ترین قبائل تھے جن سے جنگ تھی۔ حضرت صفیہؓ کا پہلا خاوند سلام بن مشکم تھا۔ اس نے طلاق دے دی تو دوسرا نکاح کنانہ سے ہوا۔ اس جنگ میں کنانہ اور حضرت صفیہؓ کے باپ اور بھائی سب مارے گئے۔ اتنی بڑی ممتاز خاتون کے لیے ان حالات میں کاشانۂ نبویؐ سے بڑھ کر اور کون سا

مقامِ رفیع و منیع ہو سکتا تھا۔ اس رشتہ سے یہودیوں اور مسلمانوں میں باہمی رابطہ کی ایک راہ نکل آئی۔

حضرت عائشہؓ اب رہ گئیں حضرت عائشہؓ۔ حضرت خدیجہؓ نے ۱۰ نبوی میں وفات پائی۔ عام حالات میں بھی بیوی کی وفات گھر کے لیے کچھ کم ویرانی کا باعث نہیں ہوتی۔ جن نامساعد حالات میں اس زمانہ میں رسول اللہ گھرے ہوئے تھے، ان میں یہ حادثہ بڑی پریشانی کا موجب تھا اور صحابہؓ کو اس کا خاص خیال تھا۔ حضرت عائشہؓ حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی تھیں اور حضرت ابوبکرؓ کے جو قلبی تعلقات رسول اللہ کے ساتھ تھے، ان کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ ان حالات کے ماتحت یہ شادی ہوئی تھی۔ واضح رہے کہ یہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے (اور بدقسمتی سے ہماری معتبر ترین کتبِ روایات، بخاری وغیرہ میں بھی یہی لکھا ملتا ہے) کہ حضرت عائشہؓ کی عمر نکاح کے وقت چھ سال اور رخصتی کے وقت نو سال کی تھی، یہ بالکل غلط ہے۔ تاریخی شہادات سے ثابت ہے کہ ان کی عمر شادی کے وقت اُنیس ۱۹ برس کی تھی۔ اسے ہم نے اپنی کتاب (طاہرہ کے نام خطوط) میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ ان میں سے ایک تاریخی شہادت یہاں بھی درج کی جاتی ہے۔ حضرت اسماءؓ (بنتِ حضرت ابوبکرؓ) حضرت عائشہؓ کی بڑی (علاتی) بہن تھیں۔ ان کے متعلق، صاحبِ مشکوٰۃ شریف شیخ ولی الدین ابی عبداللہ محمد بن عبداللہ خطیب اپنی کتاب "اکمال فی اسماء الرجال" میں لکھتے ہیں۔

> حضرت اسماءؓ، حضرت عائشہؓ سے دس سال بڑی تھیں۔ انہوں نے ایک سو سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اس وقت ۷۳ھ تھا۔

یعنی —

(i) حضرت اسماءؓ کی عمر ۷۳ھ میں سو سال کی تھی۔

(ii) لہٰذا ہجرت کے وقت ان کی عمر (۲۷) سال کی تھی۔ (۱۰۰ - ۷۳ = ۲۷)

(iii) حضرت عائشہؓ ان سے دس سال چھوٹی تھیں۔

(iv) اس لیے ہجرت کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر (۱۷) سال کی تھی۔

(v) اور چونکہ حضرت عائشہؓ کی شادی ۲ھ میں ہوئی تھی، اس لیے شادی کے وقت ان کی عمر (۱۹) سال کی تھی — نہ کہ (۹) سال کی۔

یہ تھے وہ امیال و عواطف اور مصالح و مقتضیات جن کے ماتحت نبیٔ اکرمؐ نے متعدد نکاح کیے۔ آپ نے غور فرمایا کہ ان کے پیشِ نظر کون سی بات محلِ اعتراض ہو سکتی ہے۔ چنانچہ وہ غیر مسلم مؤرخ جنہوں نے احوال و ظروف

کا خالی الذہن ہوکر مطالعہ کیا ہے، وہ خود معترف ہیں کہ ان متعدد ازواج سے رسولؐ اللہ کے خلاف نفس پرستی کا الزام کسی صورت میں بھی جائز نہیں قرار پا سکتا۔ چنانچہ (BOSWORTH SMITH) اپنی کتاب (MOHAMMAD AND MOHAMMADANISM) میں لکھتا ہے:

محمدؐ کی شادیوں کی توجیہہ جس طرح اور مقاصد کے ماتحت کی جا سکتی ہے اسی طرح اس مقصد کے ماتحت بھی کہ اس سے کس مپرس بے نوا افراد کے حالات پر ترس کھانا مقصود تھا۔ یہ شادیاں اُن عورتوں سے ہوئیں جو قریب قریب سب کی سب بیوہ تھیں اور نہ اپنے حسن و جمال اور نہ مال و دولت کی بناء پر کوئی شہرت رکھتی تھیں بلکہ صورتِ حال اس کے بالکل برعکس تھی۔

کارلائل اس باب میں رقمطراز ہے۔

ہوس پرستی!

محمدؐ کے متعلق سب کچھ کہہ چکنے کے بعد بھی یہ حقیقت اپنی جگہ رہتی ہے کہ وہ نفس پرست انسان نہ تھا۔ یہ بہت بڑی گمراہی ہوگی اگر ہم اس شخص کو ایک عام بندۂ ہوس تصور کریں جو اپنے آپ کو لذائذ میں مشغول رکھے۔ نہیں! یہ شخص حظ و کیف پر گرنے والا نہ تھا۔ اس کے گھر کا ساز و سامان نہایت غریبانہ تھا۔ اس کی خوراک جَو کا آٹا اور پانی۔ اور اکثر اوقات ایسا بھی ہوا کہ مہینوں تک اس کے گھر آگ نہیں جلی۔ وہ اپنے جوتے آپ گانٹھ لیتا تھا، اپنے کپڑوں میں خود پیوند لگاتا تھا۔ ایک غریب، محنتی، مستغنی انسان، ان تمام رجحانات سے بے نیاز جن کی خاطر عام سطح کے انسان مرتے رہتے ہیں۔ اس قسم کا انسان ہوس پرست نہیں ہو سکتا۔ اس کے جذبات ہوس سے بلند ہوتے ہیں۔ اگر وہ ایسا ہوتا تو وہ وحشی عرب جو تیئیس سال تک اس کے اشاروں پر جان پر کھیلتے رہے اور عمر بھر اسے اتنا قریب سے دیکھتے رہے کبھی اس کی تعظیم نہ کرتے۔ وہ بات بات پر کٹ مرنے والے تھے، منافقت سے دُور۔ ایسے لوگوں سے اپنی اطاعت کرانا کسی عام انسان کا کام نہ تھا۔ وہ اسے رسول کہتے تھے اس لیے کہ اس کی ساری زندگی اُن کے سامنے بے نقاب تھی۔ اس میں کوئی راز نہ تھا، سیدھی سادی زندگی۔ کبھی وہ ان کے ساتھ جنگ میں شریک ہے، کبھی مجلسِ مشاورت میں، کہیں ان میں کھڑا ان سے احکامات کی اطاعت کرا رہا ہے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ وہ کس قسم کا انسان ہے۔ اسی لیے وہ اس کو پیغمبر کہتے تھے (وہ یونہی

پیغمبر مان لینے والے لوگ نہ تھے) کوئی شہنشاہ اپنی خلعتِ فاخرہ میں ملبوس لوگوں سے اس قسم کی اطاعت نہیں کرا سکتا تھا جس قسم کی اطاعت اس انسان نے کرائی جو اپنے کپڑوں میں آپ پیوند لگایا کرتا تھا اور یہ سب کچھ تیئس ۲۳ سال کی عملی جانچ اور پرکھ کے بعد ہوا۔ (P. 62)

بیویوں کو اجازت

جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے، یہ شادیاں سنہ ۵ھ تک ہو چکی تھیں۔ اس کے بعد مسلمانوں پر فراغت اور مرفہ الحالی کا زمانہ آگیا۔ لیکن اس دور میں وہ گھر جسے سب سے زیادہ امیر ہونا چاہیئے تھا، سب سے زیادہ غریب تھا۔ اور وہ گھر تھا خود صدرِ مملکت نبیٔ اکرمؐ کا کاشانۂ مبارک۔ اس لیے کہ حضورؐ نے اپنے مصارف سب سے قلیل رکھے تھے۔ اس تبدیلیٔ احوال پر ازواجِ مطہرات کو اجازت دے دی گئی کہ چونکہ وہ مجبوری کا زمانہ گزر چکا ہے، اس لیے ان میں سے جو نبیٔ اکرمؐ کے گھر کے معیارِ زندگی پر مطمئن ہوں وہ حضورؐ کے ساتھ رہیں اور جو اس سے بہتر معیارِ زیست چاہیں تو اُن کے لیے رخصت ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ٥ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ٥ (۳۳/۲۸-۲۹)

اے رسولؐ! تم اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر دنیوی زندگانی (کا عیش) اور اس کی خوش نمائی چاہتی ہو تو، آؤ میں تم کو کچھ (دنیوی) ساز و سامان دیدوں اور تمہیں خوبی کے ساتھ رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کو چاہتی ہو اور عالمِ آخرت (کی بھلائیوں کو اپنے لیے پسند کرتی ہو)، تو (جان رکھو کہ) اللہ نے تم میں سے نیک کرداروں کے لیے بہت بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے!

یہ اِذنِ خداوندی ازواجِ مطہرات تک پہنچا لیکن ان میں سے کسی ایک نے بھی کاشانۂ نبویؐ سے علیحدگی کا خیال تک نہ کیا۔ اس ایک واقعہ سے ظاہر ہے کہ

(i) یہ شادیاں کن حالات میں عمل میں آئی تھیں۔

(ii) حضورؐ کا حسنِ سلوک کس انداز کا تھا۔ اور

(iii) حالات کی تبدیلی کے بعد قرآنِ کریم نے انہیں خود اجازت دے دی کہ وہ چاہیں تو کسی اور مسکن میں چلی جائیں لیکن ان میں سے کسی نے بھی جانا نہ چاہا، نہ ہی کوئی گئی۔

اس کے بعد نبئ اکرمؐ سے کہہ دیا گیا کہ اب آپؐ نہ اور کوئی نکاح کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان بیویوں کی جگہ اور بیویاں لا سکتے ہیں (۳۳/۵۲)۔

مرکزِ تعلیم و تبلیغ نبئ اکرمؐ کا گھر تبلیغ کا مرکز تھا اس لیے ازواجِ مطہرات بھی اس تعلیم کی مبلّغ تھیں۔ لہٰذا، ان سے کہہ دیا گیا کہ وہ عام عورتوں کی طرح نہیں ہیں۔ ان کی زندگی کا عکس دوسری عورتوں پر پڑتا ہے۔ اس لیے انہیں اپنے مقامِ بلند سے ہر وقت باخبر رہنا چاہیئے اس لیے فرمایا۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝ وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ۝ (۳۳/۳۰-۳۱)

اے نبی کی بیویو! جو کوئی بھی تم میں سے صریح بیہودگی اختیار کرے گی اس کو (مکافاتِ عمل میں) دوہری سزا دی جائے گی۔ اور یہ بات اللہ کے لیے بہت آسان ہے! اور تم میں سے جو کوئی اللہ اور اس کے رسول سے فرماں برداری اور نیک عملی کی راہ اختیار کرے گی (تو سن رکھو) ہم اُس کو (جزائے عمل کے طور پر ہر نیک کام کا) ثواب بھی دوگنا کر کے دیں گے اور ہم نے اس کے لیے عمدہ ترین روزی تیار کی ہوئی ہے!

اُن سے تاکیداً کہا گیا کہ

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ۝ (۳۳/۳۴)

تم کو چاہیئے کہ اللہ کے اُن قوانین اور حکمت کی باتوں کو پیشِ نظر رکھو، جن کا چرچا دن رات تمہارے گھر میں رہتا ہے۔ بلاشبہ اللہ (پورا پورا) رازداں اور خبردار ہے۔

یہ ازواجِ مطہرات مسلمانوں کے لیے بمنزلہ ماں کے تھیں۔

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ (۳۳/۶)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جان رکھو!) نبئ اکرمؐ مومنوں کے لیے اُن کی اپنی ذات سے زیادہ عزیز تر

ہیں اور ان کی ازواجِ مطہرات اُن کے لیے (بمنزلہ) ماں کے ہیں۔

حقیقی ماؤں کی طرح مائیں۔

وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ؕ (۳۳/۵۳)

اور دیکھو، آپ کی ازواج سے آپ کے بعد تم ہرگز نکاح نہ کرنا۔

حالانکہ حضورؐ کا اپنا بیٹا کوئی زندہ نہ تھا لیکن یہ سب اُمت کی مائیں تھیں۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۠ (۳۳/۴۰)

محمد رسول اللہ تو مَردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر اللہ کے رسول اور آخری نبی ہیں اور اللہ ہر شے کو خوب جانتا ہے۔

واقعۂ افک

سورۂ نور کی آیات (۲۴/۱۱-۲۲) میں ایک واقعہ کا ذکر ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بعض لوگوں نے ایک پاکباز خاتون پر بے جا تہمت لگائی اور اس کا چرچا عام ہو گیا۔ ہماری کُتبِ روایات میں ہے کہ یہ تہمت حضرت عائشہؓ کے خلاف لگائی گئی تھی۔ اس کے بعد ان کتابوں میں اس واقعہ کی ایسی تفاصیل بیان کی گئی ہیں جن کے تذکرہ سے انسان کے دل میں عجیب عجیب خیالات اُبھرتے ہیں۔

قرآن کریم میں نہ تہمت لگانے والوں میں سے کسی کا نام لیا گیا ہے اور نہ ہی اس خاتون کا نام جس کے خلاف تہمت لگائی گئی تھی۔ جب صورتِ حال یہ ہے تو پھر محض ان روایات کی بنا پر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ تہمت اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے خلاف لگائی گئی تھی جبکہ یہ معلوم ہے کہ ہماری ان کُتبِ روایات میں بہت سی وضعی روایات بھی داخل ہو گئی ہیں۔ واقعۂ افک (جس انداز سے کُتبِ روایات میں بیان ہوا ہے) پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ افسانہ ایک خاص مقصد کے ماتحت وضع کیا گیا تھا۔ یہ بات قطعاً باعثِ حیرت نہیں۔ لیکن باعثِ حیرت یہ امر ہے کہ ہم ان روایات کو بالکل سچا اور صحیح تسلیم کرتے چلے آ رہے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ اس سے ہم کتنی بڑی سازش کے شکار ہو رہے ہیں۔

نبی اکرمؐ کا اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ کس قسم کا حُسنِ سلوک تھا، اس کا اندازہ حضورؐ کے اس ارشادِ گرامی سے لگایا جا سکتا ہے جس میں آپؐ نے فرمایا تھا کہ

خیرکم خیرکم باھلہٖ وانا خیرکم باھلی۔

تم میں سے سب لوگوں میں اچھا وہ ہے جو اپنے اہلِ خانہ سے اچھا سلوک کرتا ہے اور میں تم سب سے بڑھ کر اپنے اہلِ خانہ سے حسنِ سلوک سے پیش آتا ہوں۔

اور یہ حسنِ سلوک اپنے اہلِ خانہ تک ہی محدود نہیں تھا، اس کی وسعت، اپنے اور غیر کی حدود سے نا آشنا تھی۔

حُسنِ سلوک

سننِ ابی داؤد میں ہے کہ حضورؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ کیا میں تم کو ایسی بات بتاؤں جو نماز اور روزہ سے بھی بڑھ کر ہو صحابہؓ نے عرض کیا حضورؐ ارشاد فرمایئے! فرمایا کہ "باہمی تعلقات کا خوشگوار رکھنا" اس حسنِ معاشرت میں سب سے مقدم حق ہمسایہ کا ہوتا ہے۔ ہمسایہ کے حق کے متعلق آپؐ نے یہاں تک تاکید فرمائی کہ وہ شخص صاحبِ ایمان نہیں جس کی برائیوں سے اس کا ہمسایہ امن میں نہ ہو۔ (بخاری، مسلم)

ہمسایہ کے حقوق

اس حکم کو آگے پھیلایئے اور پھر دیکھئے کہ ہمسایہ در ہمسایہ کا یہ سلسلہ کس طرح عالمگیر ہو جاتا ہے۔ ہمسایوں میں مُسلم وغیر مُسلم کی تمیز نہیں ہوتی حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے ایک دفعہ بکری ذبح کی تو گھر والوں سے دریافت کیا کہ انہوں نے ہمسایہ کو (جو یہودی تھا) گوشت بھیجا ہے یا نہیں کیونکہ حضورؐ نے ہمسایوں سے حُسنِ سلوک کی تاکید فرمائی تھی (بحوالہ ابو داؤد)۔ بیماروں سے شفقت کا یہ عالم تھا کہ آپؐ دُور دُور تک اُن کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے تھے اور اس میں بھی مُسلم و غیر مُسلم کی تفریق نہ تھی (بحوالہ بخاری)۔ حسنِ اخلاق (کیریکٹر کی عمدگی) درحقیقت ایمان و اعمالِ صالح کی اصل ہے۔ یا یوں کہیئے کہ اس شجرِ مقدس کا یہی پھل ہے جس سے یہ پہچانا جاتا ہے۔ اسی لیے نبیٔ اکرمؐ نے فرمایا۔

اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُھُمْ خُلُقًا۔ (بحوالہ ترمذی)

مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے جس کا اخلاق (کیریکٹر) سب سے اچھا ہے۔

بلندیٔ کیریکٹر

اس عمدگیٔ اخلاق اور بلندیٔ کیریکٹر کے متعلق آپؐ نے ایک ایسا اصول ارشاد فرمایا ہے کہ اگر اس سلسلہ کو پھیلا دیا جائے تو ہر شخص اپنی اپنی ذمہ داریوں کی کڑیوں میں جکڑا چلا جاتا ہے۔ کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہٖ "تم میں سے ہر شخص کچھ نہ کچھ لوگوں کی ذمہ داریاں اپنے اُوپر رکھتا ہے۔ اس سے ان ذمہ داریوں کی نسبت بازپرس ہوگی"۔ حسنِ اخلاق (کیریکٹر) سے انسان کے اندر بلند حوصلگی اور کشادہ نگہی آجاتی ہے اور یہ شرفِ انسانیت کے بہترین جوہر ہیں۔ اس لیے حضورؐ نے فرمایا کہ ان اللہ یحب معالی الامور و یبغض سفسافھا "یقیناً اللہ بلند امور کو

پسند کرتا ہے اور دنایت کی پست ذہنیت کو ناپسند رکھتا ہے۔"

جسُور و غیوُر و کلاں گیئر زی

اس باب میں آپؐ کی نگہ، باریک بین نے حسنِ اخلاق کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اس لیے کہ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) انسانی کیریکٹر کی جھلک روزمرہ کی معمولی حرکات و سکنات میں غیر شعوری طور پر اُبھر آتی ہے۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا کہ تبسمك فی وجہ اخیك صدقة تمہارا کسی بھائی کو دیکھ کر متبسّم ہونا بھی خیرات ہے۔ یہ تبسّم اور خندہ پیشانی (بشرطیکہ یہ خلوص پر مبنی ہو اور آجکل کی پالوتر بننے کی اسکیم کا منافقانہ جزو نہ ہو) اخلاص و محبت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ حُسنِ اخلاق (بلندیٔ کیریکٹر) کی یہ تاکید اس لیے تھی کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

بعثت لاتمم حسن الاخلاق (موطا)

میری بعثت کی غرض ہی اخلاق (کیریکٹر) کی تکمیل ہے۔

جب تک انسان خود اپنے کیریکٹر کی تکمیل نہ کرے، دوسروں کے کیریکٹر کی اصلاح کیا کرے گا؟ اسی لیے قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں فرما دیا۔

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (۶۸/۴)

یقیناً آپ انسانی اخلاق کی انتہائی بلندیوں پر ہیں۔

کانَ خُلُقُہ القرآن

یہ کیریکٹر کیا تھا؟ اس کے متعلق حضرت عائشہؓ نے ایک چھوٹے سے فقرے میں تمام تفاصیل و اطناب کو یوں سمیٹ کر رکھ دیا ہے جس طرح آنکھ کے تِل میں آسمان معہ اپنی تمام محفلِ انجم و مہر و ماہ کے جلوہ فگن ہو کان خلقہ قرآن! (ابوداؤد) حضورؐ کا کیریکٹر کیا تھا؟ قرآن! قرآن حرُوف و نقوش کی صورت میں شرفِ انسانیت کی انتہائی بلندیوں کا ترجمان اور سیرتِ محمدیہؐ ان ہی بلندیوں کا چلتا پھرتا حسین پیکر۔ خاک کے ذرّے اپنی ارتقائی منازل طے کر کے پیکرِ انسانی میں متشکّل ہو گئے۔ اب پیکرِ انسانی کا منتہائے کمال یہ ہے کہ وہ سیرتِ محمدیہؐ کے قالب میں ڈھل جائے کہ وہ سیرت دنیا میں قرآن کی تفسیرِ ناطق ہے اور قرآن ہی کے اندر محفوظ[1]۔

---

[1] لہٰذا حضورؐ کی سیرت نگاری میں بنیادی اصول یہ ہے کہ حضورؐ کی طرف کسی ایسے واقعہ کو منسوب نہ کیا جائے جو قرآن کے خلاف جاتا ہو۔ اس لیے کہ یہ ناممکن تھا کہ حضورؐ کا کوئی عمل یا قول قرآنی تعلیم کے خلاف ہو۔ تاریخِ سیرت (روایات) کی صحت و سُقم کا یہی معیار ہمارے نزدیک سچی میزان ہے۔

یہ ہیں مختصر سے کوائف حیات ایک ایسے انسان کی درونِ خانہ زندگی کے جس نے اپنے آپ کو کبھی عام انسانوں سے الگ نہیں سمجھا۔ آپ اس داستانِ زندگی کے ایک ایک ٹکڑے پر غور کیجیے اور پھر دیکھیے کہ اس پیکر میں پہنچ کر انسانیت کس قدر بلند ہو گئی تھی۔ انسانیت جب اپنی پوری قامت اختیار کر لیتی ہے تو وہ زندگی کے ہر شعبہ میں جھلکتی ہے، کسی ایک گوشہ میں منعکس نہیں ہوتی۔ آئینہ کے ہر ٹکڑے میں وہی کچھ نظر آتا ہے جو پورے آئینہ میں دکھائی دیتا ہے۔ مغرب کی میکیاولی سیاست نے اخلاقیات (MORALITY) کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک پبلک (باہر کی دنیا کے معاملات سے متعلق) اور ایک پرائیویٹ (نجی معاملات سے متعلق) اور ان کا "عقیدہ" یہ ہو چکا ہے کہ "پبلک معاملات" "پرائیویٹ" اخلاق" کے اصولوں کے ماتحت کبھی کامیابی سے طے نہیں پا سکتے۔ (LORD GREY) کے الفاظ ہیں۔

> میں اخلاقیات کا مدّاح ہوں، پبلک بھی اور پرائیویٹ بھی۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ قوموں کے معاملات اس قانون کے مطابق کبھی حل نہیں ہو سکتے۔

اس لیے کہ بقول (WAL POLE)

> نیک انسان آج تک کبھی کسی قوم کو بچا نہیں سکے۔ اس لیے کہ نیک انسان (اپنی اخلاقی پابندیوں کی بنا پر) کبھی اس حد تک نہیں جا سکتے جس حد تک جانا امورِ سیاست میں ضروری ہو جاتا ہے۔

(QUOTED IN IDEAS AND ILLUSIONS)

مغرب کے اخلاق و سیاسیات کے ائمہ کے نزدیک یہ ناممکن ہے کہ ایک انسان جس طرح اپنی پرائیویٹ زندگی میں نیک کردار ہوتا ہے، امورِ سیاست میں بھی ایسا ہی با اصول رہے۔ اس لیے انہوں نے فیصلہ کر دیا کہ اخلاق (MORALITY) کی دو قسمیں ہیں: ایک پرائیویٹ اور ایک پبلک۔ لیکن ہمارے سامنے ایک ایسے انسان کی زندگی ہے جس نے عملاً بتا دیا کہ جسے تم ناممکن کہتے ہو وہ اس طرح ممکن ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیرتِ محمدیہ ہمیں بتاتی ہی یہ ہے کہ انسانی ممکنات کی آخری حدیں کون سی ہیں۔ اس حیاتِ طیبہ میں انسانیت اپنے معراج تک پہنچ گئی اور اسی لیے تمام نوعِ انسانی کے لیے نصب العین حیات قرار پا گئی۔

قُلْ يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا ۝ (۷/۱۵۸)

اے رسولؐ! تم تمام نوعِ انسان سے پکار کر کہہ دو کہ میں تم سب کی طرف خدا کا رسول ہوں۔

تکمیلِ کار

طُولِیِ العُمر و حُسنُ ماٰب (۱۳۱)

اب ہم سنہ ۱۱ ہجری میں آپہنچے ہیں۔ حیاتِ نبویؐ کی کتابِ مقدس کے تیئس اوراق پیچھے کو اُلٹیئے اور ایک طائرانہ نگہِ بازگشت ڈالیے ان تمام احوال وظروف اور کوائف وحوادث پر جو اس داستانِ اطہر واقدس کے اجزاءِ عناصر ہیں۔ دیکھیے اور غور کیجیے کہ اس پوری داستانِ حیات میں کس طرح زندگی اپنی انتہائی تابناکیوں اور ضَوفشانیوں، سرگرمیوں اور حرارت آمیزیوں، جمال آفرینیوں اور جلال انگیزیوں، سیرابیوں اور شادابیوں، کامرانیوں اور کامجوئیوں، ناپیداکنار وسعتوں اور بے پایاں گہرائیوں کے ساتھ مصروفِ عمل نظر آتی ہے۔ زندگی کیا ہے، ایک کاروانِ ذوق وشوق ہے، جو یقینِ کامل اور ایمانِ محکم، حُسنِ عمل اور جوششِ کردار، تطہیرِ فکر اور پاکیزگیٔ نگاہ، کشادہ ظرفی اور بلند نگہی، سوز وساز اور تپش وخلش کی ایک دنیا اپنے جلو میں لیے انتہائی جذب انہماک کے ساتھ ایں وآں کی دامن کشیوں سے بے خبر اور گرد وپیش کی عناں گیریوں سے بے نیاز، اپنی متعین منزل کی طرف مستانہ وار بڑھے چلا جارہا ہے۔ نہ راستہ کے خطرات اس کے دل میں خوف وہراس پیدا کرتے ہیں، نہ سفر کی صعوبات اس کے پائے استقامت میں لغزش کے آثار نمودار کرتی ہیں۔ گوئٹے کے الفاظ میں، یہ زندگی نہیں، ایک جُوئے رواں ہے کہ نامساعد حالات ونامواقفتِ زمانہ کی ہر چٹان اس کی رفتار میں اور تیزی اور اس کی موجوں میں مزید خوش خرامگی پیدا کر دیتی ہے۔

بنگر کہ جُوئے آب چہ مستانہ می رود ۔۔۔ مانندِ کہکشاں بگریبانِ مرغزار
در خوابِ ناز بُود بہ گہوارۂ سحاب ۔۔۔ وا کرد چشمِ شوق بآغوشِ کوہسار

از سنگ ریزہ نغمہ کشاید خرامِ او   سیمائے او چو آئینہ بے رنگ و بے غبار

زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود

در خود یگانہ از ہمہ بے گانہ می رود

یہ جوئے رواں نہ صرف ہجومِ تزاحم اور انبوہِ تصادم کی سنگلاخ زمینوں ہی سے مستانہ وار گزرتی آئی ہے بلکہ کشش و جاذبیت کی ہر وادئ رنگ و تعطر اور امیال و عواطف کے ہر دامنِ کیف و نکہت پر ایک تبسم آلود نگاہ ڈالتی کج کلاہانہ انداز سے آگے بڑھتی چلی آئی ہے۔

در راہِ او بہار پری خانہ آفرید   نرگس دمید و لالہ دمید و سمن دمید

گل عشوہ داد و گفت یکے پیشِ ما بایست   خندید غنچہ و سرِ دامانِ او کشید

ناآشنائے جلوہ فروشانِ سبز پوش   صحرا برید و سینۂ کوہ و کمر درید

زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود

در خود یگانہ از ہمہ بے گانہ می رود

غور کیجیے۔ ایک یتیم، غریب، اَن پڑھ انسان، روزمرہ کے کاروبارِ حیات میں مشغول دکھائی دیتا ہے کہ یکایک حقیقت اپنا نقاب اُلٹ کر بے حجابانہ اُس کے سامنے نمودار ہو جاتی ہے۔ اس کی زندگی میں بس اتنا حصہ مافوق الفطرت ہے۔ وہ نیرِ حقیقت کی روشنی میں جب اپنے گرد و پیش پر غور کرتا ہے تو کائناتِ انسانیت کی کوئی شے اسے اپنی صحیح حالت پر نظر نہیں آتی۔ وہ سمجھ لیتا ہے کہ حقیقت کی اس پردہ کشائی سے مقصود یہ ہے کہ وہ اس بگڑی ہوئی دنیا کی ہر شے کو اس کے صحیح مقام پر لے آئے۔ وہ اسے اپنی زندگی کا مقصد قرار دے لیتا ہے۔ چونکہ وہ دُنیائے انسانیت کے ہر شعبہ میں انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہے، اس لیے ساری دنیا اس کی مخالف ہو جاتی ہے۔ وہ اس وسیع و عریض دُنیا میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے۔ کوئی اُس کا شریکِ فکر نہیں، کوئی ہمنوا اور محرمِ راز نہیں۔ وہ اپنی آواز بلند کرتا ہے تو دُنیا بھر کا شور چاروں طرف سے اُمنڈ کر آجاتا ہے کہ اُس کی یہ دعوت کسی باہوش کان تک نہ پہنچنے پائے۔ لیکن وہ اپنی پکار کو برابر جاری رکھتا ہے۔ اُس کے پاس کچھ ساز و سامان نہیں، کوئی وسائل و ذرائع نہیں لیکن اسے اپنے نصب العین کی صداقت پر ایسا محکم یقین ہے کہ بے سروسامانی کا ہر حوصلہ شکن مرحلہ اس کے لیے وجۂ ہزار ساز و یراق بن جاتا ہے اور وہ انتہائی مایوسیوں میں گھرے ہوئے ہونے کے باوجود نہایت عزم و استقلال سے پکار کر کہتا ہے کہ ؎

بدست و پا نیم کہ ہنوز از وفورِ شوق
سودا ست در سرم کہ بہ ساماں برابر است

سعید رُوحیں اس کی اس دعوت میں حق وصداقت کی جھلک پاتی ہیں اور اس طرح وہ ایک سے دو، اور دو سے چار ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ کامل تئیس برس اسی تگ و تاز اور اسی جدّ وجہد میں گزر جاتے ہیں۔ اس تمام عرصہ میں اس مدعیٔ حق وصداقت کی زندگی، دامنِ صحرا کی طرح، ہر رہ نوردِ منزلِ ہستی کے سامنے کھلی ہوئی رہتی ہے۔ کوئی خفیہ سازش نہیں، کوئی راز نہیں، کوئی سِر مستور نہیں، کوئی مافوق العادت عنصر نہیں لیکن میل جول، بُود وماند سب اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی طرح۔ دشمن سے لڑائی ہے تو اس کے لیے پوری پوری تیاری کی جاتی ہے۔ شمشیر وسناں، تیر وتفنگ، آلات واسلحہ سب مہیا کیے جاتے ہیں۔ جنگ کے میدانوں میں کامیابیاں بھی ہوتی ہیں اور ناکامیاں بھی، کامیابیاں مستقل لیکن ناکامی عارضی۔ اس لیے کہ ایک ناکامی سے اس کے اسباب و وجوہات پر غور کر کے آئندہ کے لیے اس کی تکرار کے امکانات کو زائل کر دیا جاتا ہے۔ اپنی جماعت کی تنظیم بھی ہو رہی ہے اور اس تنظیم کے ساتھ ان کی تعلیم وتربیت بھی۔ اسی تعلیم وتربیت سے ان کی سیرت کو بلند اور کیریکٹر کو پختہ کیا جاتا ہے۔ مخالفین کی قوت ٹوٹتی جاتی ہے اور موافقین کی جمعیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ بتدریج رفتہ رفتہ حق وصداقت کا نظام، روشنی کی طرح بڑھتا اور باطل کا ہر آئین سائے کی طرح سمٹتا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ وہ وقت آگیا کہ باطل کی ہر قوت سرنگوں ہوگئی اور حق کا ہر سمت غلبہ ہوگیا۔ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت، سرمایہ داری، غلامی، شخصیت پرستی، نسبی تفریق، قبائلی تقسیم کے ہر نظامِ کہن کی بساط اُلٹ گئی۔ قزاقی، غارت گری، درندگی، خونخواری، قماربازی، شراب خوری، تعصب، جہالت، کینہ توزی، ظلم واستبداد کی ہر روش مٹ گئی۔

دریائے پُرخروش ! ز بند وشکن گزشت
از تنگنائے وادی و کوہ ودمن گزشت

یکساں چو سیل کردہ نشیب وفراز را
از کاخ شاہ وبارہ وکشت وچمن گزشت

بیتاب وتند وتیز وجگرسوز وبے قرار
در ہر زماں بتازہ رسید از کہن گزشت

زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

یہ زندگی ہمیں بتا رہی ہے کہ ایک انسان کا ایمانِ محکم اور عزمِ راسخ دنیا میں کیا انقلاب برپا کرسکتا ہے تئیس سال کی مسلسل جدّوجہد اور پیہم سعی وعمل کے بعد اب وہ وقت آگیا کہ اس مقصدِ عظیم کی تکمیل کا اعلان کر دیا جائے جس کا آغاز اس بے سروسامانی کے عالم میں ہوا تھا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یہ اعلان اس محطۂ نشر الصّوت

(BROADCASTING STATION) سے ہونا چاہیے تھا جو نظامِ شرفِ انسانیت کا مرکز تھا۔ اس مقصد

مکہ کی طرف روانگی

کے لیے حضورؐ نے حج کا ارادہ فرمایا۔ اس خبر کا عام ہونا تھا کہ سارا عرب ہمرکابی کی سعادت حاصل کرنے کے لیے اُمنڈ آیا۔ ذیقعدہ کی چھبیسویں تاریخ حضورؐ مدینہ منورہ سے جانبِ مکہ روانہ ہوئے۔ مدینہ سے باہر چھ میل کے فاصلہ پر قیام فرمایا۔ دوسری صبح حضورؐ نے احرام باندھا اور بلند آواز سے فرمایا کہ

لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ ط لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ ط اِنَّ الْحَمْدَ وَ النِّعْمَۃَ لَکَ وَ الْمُلْکَ ط لَا شَرِیْکَ لَکَ۔

ہم حاضر ہیں، اے خدائے بزرگ و برتر! تیرے بندے تیرے حضور میں حاضر ہیں۔ حمد و ستائش کی مرکز تیری ہی ذات ہے۔ اس میں کوئی اور شریک نہیں۔ حکومت صرف تیرے لیے ہے۔ اس میں کسی اور کا حصہ نہیں۔

لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ حضورؐ نے یہ کلمات بلند کیے اور سُننے والوں نے سُنا کہ لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ کی صدائے بازگشت سے تمام دشت و جبل گونج اُٹھے کہ یہ کاروانِ عشق و ذوق دامنِ صحرا پر ریت کے چمکتے ہوئے ذرّوں کی طرح تا حدِ نظر پھیلا ہوا تھا۔ تقدیس و تحمید کی ان زمزمہ باریوں سے یہ قافلۂ نور و نکہت منزل بمنزل آگے بڑھتا گیا۔ سینوں میں تڑپتے ہوئے دل، آنکھوں میں چمکتی ہوئی فراست، پیشانیوں میں مچلتے ہوئے سجدے، ذوقِ عبودیّت کی متاعِ گراں بہا در آغوش، حسنِ عمل کی کامرانیوں اور سعیِ پیہم کی شادکامیوں کی ایک جنّت اپنے جلوؤں میں لیے، یہ زبدۂ کائنات گروہ، یہ عصارۂ روزگار جماعت، یہ جیشِ خُدامست، یہ عسکرِ خود آگاہ، یہ حرّیت و مساوات کے علمبردار، یہ احترامِ انسانیت کے پیغامبر، یہ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ کے زندہ پیکر،

مکہ میں داخلہ

ذی الحجہ کی چار تاریخ کو، صبح کے سُہانے وقت، تاروں کی خنک اور حسین چھاؤں میں مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ جب کعبہ پر نگاہ پڑی تو حضورؐ نے وجد و مسرت کے الہانہ انداز میں فرمایا کہ

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وحدہٗ لا شریک لہٗ، لہُ الملک ولہ الحمد یحیی ویمیت وھو علٰی کلّ شیءٍ قدیر۔ لا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہُ وحدہٗ انجز وعدہٗ نصر عبدہٗ وھزم الاحزاب وحدہٗ۔

(ہاں! آج اس حقیقتِ کبریٰ کا عملی اعلان ہو رہا ہے کہ) خدا کے سوا کوئی حاکم اور آقا نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں، سروری اور ستائش سب اس کے لیے زیبا ہے۔ وہی ہے جو زندگی عطا کرتا ہے اور وہی ہے جو موت دیتا ہے، ہر شے پر اسی کا کنٹرول ہے۔ اس خدائے واحد کے سوا کوئی حاکم نہیں۔ (میرا سرِ نیاز اس کی بارگاہِ صمدیت میں جھکا ہوا ہے جس نے) اپنا وعدہ (یوں) پورا کیا۔ اس نے اپنے (بے سرو سامان) بندے کی مدد کی اور باطل کے تمام جیوش وعساکر کو شکست دے دی (اور حق کی اس طرح فتح ہوئی)۔

نویں ذی الحجہ کو جمعہ کے روز، یہ جمعیتِ اسلامیہ، یہ اُمّتِ قانتہ، یہ ملّتِ مُسلمہ، یہ قدوسیوں کی جماعت، عرفات کے میدان میں جمع ہوگئی کہ اپنے امام و مقتدا سے تاسیسِ حکومتِ الٰہیہ کا اعلانِ عظیم اپنے کانوں سے سُن لیں اور اس کے بعد اسے کامل حتم و یقین کے ساتھ دنیا کے کونے کونے تک پہنچا دیں۔ دوپہر ڈھل گئی تو کمبل کے خیمے سے

خُطبہ حجۃ الوداع

وہ ذاتِ گرامی جلوہ بار ہوئی جس کے ایمان و عمل کے درخشندہ نتائج اس وقت یوں سامنے ضَوفشاں تھے۔ حضورؐ ناقہ پر سوار ہوئے تو تکبیر کے غلغلہ انگیز نعروں سے فضا مرتعش ہوگئی۔ آپؐ نے ناقہ کے اُوپر ہی سے وہ خطبہ ارشاد فرمایا جو قیامِ نوعِ انسانی کے لیے منشورِ بالغہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔

الا کل شیءٍ من امر الجاھلیۃ تحت قدمی موضوع۔

ہاں! جاہلیت کے تاریک زمانہ کے تمام آئین و دستور میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔

اللہ اکبر! یہ اعلان اس کی طرف سے ہو رہا ہے جسے اس مقام سے آج سے دس سال قبل، ان ہی آئین و دساتیر کے علمبرداروں نے چاروں طرف سے یورش کرکے نکالا تھا۔

اس کے بعد فرمایا۔

ایھا النّاس۔ الا اِنّ ربّکم واحد۔ و انّ اباکم واحد۔ الا لافضل لعربی علیٰ عجمی ولا لعجمی علیٰ عربی۔ ولا لاحمر علیٰ اسود ولا لاسود علیٰ احمر۔ الّا بالتّقویٰ۔

اے نوعِ انسانی (سن رکھو کہ) تمہارا سب کا ربّ ایک ہے اور تم تمام ایک ہی اصل کی شاخیں ہو۔ اس لیے عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب۔

غور کیجئے۔ شرفِ انسانیت کی نمو و بالیدگی اور تکریمِ آدمیت کے عروج و ارتقاء کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹیں

انسانوں کی جغرافیائی تقسیم (وطنیت) اور نسبی تفوّق (نسل پرستی) کی حدود و قیود ہیں۔ اس لیے اس منشورِ حریّت اور مساواتِ انسانیہ میں سب سے پہلے باطل کے ان ہی انسانیت سوز معیاروں پر خطِ تنسیخ کھینچا گیا۔ اس طرح تمام نوعِ انسانی کو ایک عالمگیر برادری قرار دے کر صرف شرفِ انسانیت کو باعثِ تکریم اور وجہ تعظیم بتا دیا گیا جو اتباعِ قوانینِ الٰہیہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس فطری تقسیم کی طرف اشارہ کیا گیا جس کی رُو سے انسان دو جماعتوں میں منقسم ہو جاتے ہیں یعنی ایک وہ جماعت جو ہر ایک کی محکومیت سے انکار کر کے صرف ایک خدا کی حکومت کو جائز تسلیم کرے اور دوسری وہ جماعت جو انسانوں کے خود ساختہ قوانین و دساتیر کے سامنے اپنی گردن جھکا دے، خواہ وہ قوانین خود اپنے وضع کردہ ہوں یا دوسرے انسانوں کے مسلّط کردہ۔ اوّل الذکر جماعت (امّتِ مسلمہ) اس یک نگہی اور ہم رنگی، اشتراکِ نصب العین اور وحدتِ مقصد کی بنا پر باہمد گر بھائی بھائی اور اس حقیقتِ کبریٰ سے انکار کرنے والے تمام انسان ایک دوسری سوسائٹی کے افراد۔ اس لیے فرمایا کہ

ان کلّ مسلم اخو مسلم و ان المسلمین اخوۃ۔

یاد رکھو! ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور اس طرح تمام رُوئے زمین کے مسلمان رشتۂ اخوّت میں منسلک اور سلکِ مودّت سے منوط ہیں۔

اور یہ رشتۂ اخوّت و ناطۂ مودّت محض ایک نظری عقیدہ نہیں بلکہ یاد رکھو کہ

ان دماءکم و اموالکم و اعراضکم علیکم حرام کحرمۃ یومکم هٰذا الٰی یوم تلقون ربّکم۔

تمہارا خون اور تمہارا مال اور تمہاری آبرو قیامت تک کے لیے ایک دوسرے کے نزدیک اسی طرح قابلِ احترام ہونی چاہیے جس طرح یہ دن اس مہینہ میں اور اس شہر میں وجہ احترام ہے۔

یاد رکھو!

لا ترجعوا بعدی ضلالا یضرب بعضکم رقاب بعض وستلقون ربّکم فیسئلکم عن اعمالکم۔

کہیں میرے بعد (ائتلاف و مرکزیت کی صراطِ مستقیم چھوڑ کر تشتّت و افتراق کی) گمراہی نہ اختیار کر لینا کہ خود ایک دوسرے کے گلے کاٹنے لگ جاؤ۔ یاد رکھو کہ تمہیں خدا کے سامنے حاضر ہونا پڑے گا اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس کرے گا۔

یہ وحدت و یک نگہی صرف تمہارے نظام سے قائم رہ سکے گی۔ اس نظام کی بنیاد قرآن پر ہے۔ اور یہی قرآن ہے جسے میں اپنے بعد تمہارے لیے چھوڑ جاؤں گا۔

وانی قد ترکت فیکم مالن تضلوا بعدہٗ، ان اعتصم بہٖ کتاب اللّٰہ۔

میں تم میں ایک چیز چھوڑے جاتا ہوں۔ اگر تم نے اسے مضبوطی سے تھامے رکھا تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ وہ چیز کیا ہے؟ کتابُ اللہ!

یہ ہے تمہارے نظام کا ضابطۂ قانون اور اس قانون کو نافذ کرنے والا تمہارا امیر جس کی اطاعت خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے مرادف ہوگی۔

ان امرکم علیکم عبد مجدع اسود یقودکم بکتاب اللّٰہ۔ فاسمعوا لہٗ واطیعوا۔

اگر کوئی حبشی بینی بُریدہ غلام بھی تمہارا امیر ہو اور وہ تمہیں قرآن کے مطابق لے چلے تو اس کی اطاعت اور فرماں برداری کرو۔

اس نظامِ دینی میں ہر رکن کو اس کی اپنی جگہ پر رکھو، اس کے مقام سے اونچا نہ لے جاؤ کہ قوموں کی ہلاکت اور بربادی اسی غُلُوّ سے ہوتی ہے۔

ایاکم والغلو فی الدین۔ فانما اھلک قبلکم الغلو فی الدین۔

دین میں غُلُوّ مت کرو کہ تم سے پہلی قومیں اسی غُلُوّ سے برباد ہوئیں۔

پھر فرمایا کہ یاد رکھو! قوموں کی تباہی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے نوعِ انسان کے آدھے حصے یعنی عورتوں کو حقارت کی نظروں سے دیکھا اور انہیں ذلیل و خوار سمجھا۔ تم اپنے نظامِ مدنیت میں عورتوں کی صحیح پوزیشن کو نظر انداز نہ کر دینا۔

فاتقوا اللّٰہ فی النسآء ان لکم علی نسائکم حقا ولھن علیکم حقا۔

عورتوں کے معاملہ میں (بھی) قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ یاد رکھو تمہارے عورتوں پر اور عورتوں کے تم پر حقوق ہیں (ان حقوق کو نظر انداز مت کرو)۔

یہ فرما کر آپ نے مجمع پر ایک غائر نگاہ ڈالی۔ قریب ایک لاکھ پروانوں کا ہجوم، شمعِ نبوت کے گرد تھا۔ وہ گروہِ عظیمؓ کہ جس کی گردنیں دنیا کی کسی طاغوتی قوت کے سامنے نہیں جھک سکتی تھیں، اپنے خدا کے حضور سر جھکائے کھڑا

تھا، اس سعادتِ عظمیٰ کی فراوانی پر شاداں و نازاں جو انہیں مجاہدانہ سعی و عمل کے نتیجہ میں بارگاہِ رب العزت سے اس طرح عطا ہوئی تھی، اور ان ذمہ داریوں کے بارِ گراں کے احساس سے لرزاں و ترساں جو نوعِ انسانی کی ربوبیت کے سلسلہ میں ان پر عاید ہو رہی تھیں، حضورؐ نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا کہ

انتم مسئولون عنّی فما انتم قائلون۔

تم سے خدا کے ہاں میری بابت پوچھا جائے گا۔ کہو تم کیا جواب دو گے!

لاکھوں زبانیں ایک ہی وقت پکار اٹھیں کہ ہم کہیں گے کہ آپؐ نے خدا کا پیغام پہنچا دیا اور اپنا فرض ادا کر دیا۔

کتنی عظیم الشان ہے یہ شہادت جو کسی انسان کو اپنے فرائض کی تکمیل کے بعد میسّر آجائے۔ آپؐ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور تین بار فرمایا۔

اَللّٰھُمَّ اَشْھَدْ

اے خدا تو گواہ رہنا۔

خطبہ سے فارغ ہو کر حضورؐ جانبِ منٰی روانہ ہوئے۔ اس "شاہانہ جلوس" کا انداز یہ تھا کہ ایک حبشی "غلام" (حضرت بلالؓ) ناقہ کی مہار پکڑے ہوئے تھے اور ایک "غلام ابنِ غلام" (حضرت اسامہؓ بن زید) شریکِ سواری، کپڑا تان کر فرقِ مبارک پر سایہ کیے ہوئے تھے۔ اونٹنی پر ایک پالان تھا جس کی قیمت ایک روپے سے زاید نہ تھی۔ خدا کی طرف سے تکمیلِ دین کا اعلان ہو چکا تھا اور یہ دین اپنی عملی شکل میں خدا کی زمین پر نافذ یعنی نظامِ انسانیت خدا کے مقرر کردہ خطوط پر متشکل۔ وہ نظام جس پر چلنے کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا تھا لیکن جس میں انسان کے خود ساختہ قوانین و دساتیر کی آمیزش نے اس کی ہیئت بدل ڈالی تھی۔ آج اس کی تمام کثافتیں اور آلودگیاں کیسر دور ہو گئیں اور وہ نظام اسی حالت پر آگیا جس پر اسے خلّاقِ فطرت نے مرتّب کیا تھا۔ اس لیے آپؐ نے فرمایا کہ

زمانہ اپنے مرکزِ اصلی پر

ان الزمان قد استدار کھیئۃ یوم خلق اللہ السمٰوٰت و الارض۔

زمانہ پھر پھرا کر آج پھر اسی نقطہ پر آگیا جس پر اللہ نے اسے تخلیقِ ارض و سمٰوٰت کے وقت متعیّن کیا تھا۔

یہی مقصودِ خداوندی تھا، یہی انسانی تگ و تاز کا منتہیٰ تھا۔ یہی اس کاروانِ رشد و ہدایت کی آخری منزل تھی جو کبھی جُودی کی چوٹیوں پر ٹھہرا، اور شام کے سبزہ زاروں میں رکا، کبھی نیل کی وادیوں میں گھوما اور سینا کے پہاڑوں سے

گزرا. کہیں یروشلم کے میدانوں میں اترا اور پھر بطحا کے صحراؤں میں فرکش ہوا یہی وہ جنت تھی جو جنت سے نکلے ہوئے آدم کو اس کے اعمال کے بدلے میں ملنی تھی اور مل کر پھر نہ چھننی تھی۔

اس اعلانِ عظیم کے بعد حضورؐ نے پھر مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا کہ

الا ھل بلغت

کیوں؟ میں نے پیغامِ خداوندی تم تک پہنچا دیا؟

سب بول اُٹھے، ہاں پہنچا دیا. آپؐ نے پھر فرمایا.

اَللّٰھُمَّ اَشْھَدْ .

اے خدا تو گواہ رہنا.

پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ

فلیبلغ الشاھد الغائب

جو لوگ اس وقت موجود ہیں وہ اس پیغام کو ان تک پہنچا دیں جو موجود نہیں۔.

اور اس طرح اس پیغامِ خداوندی کی وسعتوں کو ابدیت سے ہمکنار کر دیا.

مدینہ کو واپسی تکمیلِ دین کے اس عظیم فریضے سے فارغ ہو کر یہ کاروانِ سعادت و رحمت مراجعت فرمائے مدینہ ہوا. نواحِ مدینہ پر نگاہ پڑی تو فرمایا.

الله اکبر لآ الٰـه الاّ الله وحدهٗ لا شریك لهٗ له الملك وله الحمد وهو علٰی کلّ شیءٍ قدیر. آئبون. تائبون. عابدون ساجدون. لربنا حامدون صدق الله وحدهٗ ونصر عبدهٗ وھزم الاحزاب وحدهٗ.

کبریائی و جبروت سب خدا کے لیے ہے. اس کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں جس کے سامنے جھکا جائے. وحدهٗ لا شریك حکومت صرف اسی کے لیے ہے اور ستائش و نیائش کی مرکز اسی کی ذات. اس نے ہر شے کے پیمانے مقرر کر دیئے ہیں جن پر اسے پورا پورا کنٹرول ہے. لوٹے آرہے ہیں اس کے بندے ساری دنیا سے منہ موڑ کر صرف اسی آستانہ کی طرف رُخ کیے ہوئے (تائبون) تمام طاغوتی قوتوں کی سرکشیوں کو پامال کر کے صرف اسی کی محکومیت کا قلادہ زیبِ گلو کیے ہوئے (عابدون) ساری دُنیا کے سامنے

غیوّرانہ اُٹھنے والی پیشانیاں اس کے سنگِ آستاں پر سجدہ ریز (ساجدون)، تمام دُنیا سے خراج تحسین وصول کرنے والے اس مرجعِ حُسن وخوبی کی حمد وستائش میں زمزمہ بار، کہ اس نے اپنا وعدہ سچّا کیا، اپنے بندے کی مدد کی اور تمام مخالف قوّتوں کو تنہا شکست دی۔ آرہے ہیں خدا کے بندے لوٹ کر۔

استقبالِ خسروانہ نظامِ انسانیت کی امامتِ کبریٰ کا یہ مرکزِ اولین تکمیلِ دین واتمامِ نعمت کی ہزار جنّتیں اپنے جلو میں لیے بہ کمالِ حُسن ورعنائی آرہا ہے اور مدینہ کی گلیوں کا ذرّہ ذرّہ اُبھر کر کہہ رہا ہے کہ

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
اے زمیں از بارگاہت ارجمند آسماں از بوسۂ بامت بلند
از تو بالا پایۂ ایں کائنات فقرِ تو سرمایۂ ایں کائنات
در جہانِ ذکر وفکرِ انس وجاں تو صلوٰتِ صُبح، تو بانگِ اذاں

سجدہ ہائے طفلک وبرنا وپیر
از جبینِ شرمسارِ ما بگیر

سکانِ ارضی، حمد وستائش میں اس طرح نغمہ سنج وزمزمہ بار تھے اور آسمان سے خدا اور اس کے فرشتے اس تکمیلِ کار اور حُسنِ مآب پر یہ کہہ کر تبریک وتہنیت کے پھول برسا رہے تھے کہ

اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۳۳/۵۶

کس قدر مبارک ہے وہ آغاز جس کا انجام اس قدر حسین ہو اور کیسی پُربہار ہے وہ شاہراہِ زندگی جو اس آغاز وانجام کے نقاط سے مربوط ہو۔

فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ حَمْدًا كَثِيْرًا ۔

وفات دین کی تکمیل ہوگئی۔ شرفِ انسانیت کی نشو وارتقاء کے لیے جس قدر اصُولی قوانین کی ضرورت تھی وہ قرآن کی دفتین میں محفوظ کر دیئے گئے۔ ان اصُولی قوانین کی عملی تشکیل سے اس زمین پر آسمان کی بادشاہت متمکن کر دی گئی۔ انسان کی نگہِ بصیرت نے اس صراطِ مستقیم کو واضح طور پر دیکھ لیا جس پر گامزن ہونے سے وہ اپنے شرف ومجد کے نقطۂ آخریں تک پہنچ سکتا ہے۔ اُن اربابِ قلب ونظر

کی ایک جماعت تیار ہوگئی جو خود اس شاہراہِ زندگی پر جادہ پیما ہوں اور دوسروں کے لیے دلیل راہ بنیں اور اس طرح وارث کتاب الٰہی بن کر اس نظامِ اجتماعیۂ انسانیہ کو آگے چلائیں۔ رسول اپنا فریضہ ادا کر چکا تھا۔
ہر انسان کی طبیعی زندگی کے لیے خاتمہ یقینی ہے۔ رسول بھی ایک انسان ہوتا ہے اس لیے اس کی حیاتِ ارضی کے لیے خاتمہ کا دن ضروری ہے۔ گزشتہ اوراق میں جہاں نبیٔ اکرمؐ کی بشریت کے متعلق بحث آئی ہے، آپ نے دیکھ لیا ہے کہ آپؐ کے متعلق واضح الفاظ میں بتادیا کہ انّك میّت وانّھم میّتون ہر پیدا ہونے والے کے لیے مرنا ہے۔ لیکن خوشا بخت ہے وہ موت جو مقصدِ حیات کی تکمیل کے بعد آئے۔ یہی وہ موت ہے جس پر نفس شماری کی ہزاروں زندگیاں تصدّق کی جاسکتی ہیں۔ اسی موت میں حیاتِ ابدی کا راز پوشیدہ ہے۔ کسی انسان کی زندگی کی کامیابی اور ناکامی ملنے کا اہم پیمانہ یہ ہے کہ جس وقت وہ دنیا میں آیا اور جس وقت اُس نے دُنیا کو چھوڑا، ان دونوں حالتوں میں اس نے کیا تغیّر پیدا کیا۔ اگر اُس نے دُنیا کو اسی حالت میں چھوڑا جس میں پایا تھا تو یہ زندگی، انسانی زندگی نہیں ہے، خواب خور کی حیوانی زندگی ہے۔ اور اگر اُس نے اس میں صحیح خطوط پر تغیّر و تبدّل کیا تو اس کی عظمت اسی تغیّر و تبدّل کی نسبت سے متعیّن کی جائے گی۔ لہٰذا کس قدر عظیم المرتبت ہے وہ حیاتِ بلند جس نے دُنیائے انسانیت میں ایسا انقلاب پیدا کیا جس کی وسعتیں دنیا کے آخری انسان کی زندگی تک کو محیط ہیں۔ یہی انقلاب مقصودِ خداوندی تھا جس نے انسانی ممکنات کے لیے ایک نئی دُنیا کا راستہ کھول دیا۔ ایسے انسان کی موت، محسودِ صد حیات ہے۔
تکمیلِ دین کا اعلان ذی الحجہ ۱۰ھ میں ہوا۔ ۱۸ یا ۱۹ صفر ۱۱ ہجری کو نبیٔ اکرمؐ کا مزاج ناساز ہوا۔ قریب تیرہ روز علالت رہی۔ زمانۂ علالت میں حضورؐ اپنے فرائض کی سر انجام دہی میں اسی جذب انہماک سے مصروف رہے اور دین کے ان اساسی اصولوں کو بار بار سامنے لاتے رہے جن میں تبدیلی پیدا کر دینے سے اس کی رفیع الشّان عمارت اپنی بنیادوں سے ہل جاتی ہے۔ دین کا نقطۂ ماسکہ اور عُروۃ الوُثقیٰ یہ اصلِ عظیم ہے کہ انسانوں کے لیے قانون متعین کرنے کا حق صرف ذاتِ خداوندی کو ہے، کسی انسان کو نہیں اور مکافاتِ عمل کا قانونِ خداوندی اٹل ہے۔ اس لیے ہر انسان کو اپنی نگاہ کی ہر جنبش اور قلب کی ہر حرکت کے لیے جوابدہ ہونا پڑے گا۔
اپنے آخری خطبہ میں ان ہی مہماتِ اصول کی طرف توجّہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ

> حلال اور حرام کی نسبت میری طرف نہ کرنا۔ میں نے وہی چیز حلال کی ہے جسے خدا نے اپنی کتاب میں حلال کیا ہے اور وہی چیز حرام کی ہے جو خدا نے حرام کی ہے۔

پھر فرمایا:

اے پیغمبرِ خدا کی بیٹی فاطمہؓ اور اے پیغمبرِ خدا کی پھوپھی صفیہؓ! خدا کے ہاں کے لیے کچھ کر لو۔ میں تمہیں خدا سے نہیں بچا سکتا۔

علالت کے تیرھویں روز دوشنبہ یکم ربیع الاول ۱۱ھ، ۶ مئی ۶۳۲ء صبح کے وقت طبیعت میں کچھ سکون تھا لیکن نقاہت زیادہ تھی۔ اس لیے آپؐ نے حجرۂ مبارک سے لیٹے لیٹے پردہ اٹھا کر مسجد کی طرف دیکھا تو لوگ نماز میں مشغول تھے۔ اللہ کے بندوں کو اپنے اللہ کے سامنے سجدہ ریز دیکھ کر فرطِ مسرت سے چہرہ بشاش ہو گیا۔ جھکی ہوئی نگاہوں سے درگاہِ ربّ العزت میں تشکّر و امتنان کے سجدے ادا کیے۔ جوں جوں دن چڑھتا گیا مرض کی شدت بڑھتی گئی۔ نقاہت سے بار بار غشی طاری ہو جاتی تھی لیکن جب ہوش آتا تھا تو زبانِ مبارک پر یہ الفاظ ہوتے تھے کہ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ "ان سعادت مند رُوحوں کی معیت جنہیں اللہ نے اپنے انعامات سے نوازا" اور کبھی یہ الفاظ کہ اَللّٰهُمَّ فِي الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى سب سے بڑی رفاقت خدائے بزرگ و برتر کی ہے۔ سہ پہر کے قریب تین مرتبہ فرمایا بَلِ الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى[1] قلب کا سکون و اطمینان ایک ہلکے سے تبسم جاں نواز کی

رفیقِ اعلیٰ

صورت میں چہرہ پر نکہت پاش و نور افشاں ہوا مگر فطرت کو یہ معصومانہ انداز ایسا خوش آیا کہ اس نے اسے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا۔ اور اس طرح اس پُربہار زندگی کی جوئے رواں دامنِ صحرا سے صحنِ گلستاں میں داخل ہو گئی اور آنسوئے افلاک سے ندائے جمال یہ کہتی ہوئی استقبال کے لیے آگے بڑھی کہ

---

[1] نبی اکرمؐ کے یہ آخری الفاظ دنیائے انسانیت میں فی الحقیقت حرفِ آخر (LAST WORD) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خدا اور بندے کا باہمی تعلق کیا ہے؟ یہ ہے وہ سوال! — جس کا جواب دنیائے مذاہب کے تمام دساتیر اور جہانِ فلسفہ کے جملہ دفاتر ہیں۔ اگر ان افسانہ ہائے عہدِ کہن کو چھوڑ بھی دیا جائے جنہیں ذہنِ انسانی نے اپنے بچپن کے زمانہ میں وضع کیا اور جن کی یاد آج بھی مختلف منادر و صوامع میں پتھر کی مورتیوں کی شکل میں ملتی ہے تو بھی آپ دیکھیں گے کہ مختلف مذاہب میں خدا کا تصوّر ایک پرستش کی شے (OBJECT OF WORSHIP) یا حاکمِ مستبد سے آگے نہیں بڑھتا جو کائنات سے الگ تھلگ شخصی طور پر اپنے احکام نافذ کر رہا ہے اور انسان کے لیے اس کی پرستش کرنا یا طوعاً و کرہاً اس کے احکام کا ماننا ضروری ہیں۔ لیکن قرآن، خدا اور انسان کے باہمی تعلق کا ایک جداگانہ اور عجیب و غریب تصوّر پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا نے اس خارجی کائنات کو خام مسالہ کی شکل میں پیدا کیا اور پھر اس میں انسان کو بسایا۔ انسان میں ایسی صلاحیتیں

(باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

يَآ أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۝ وَادْخُلِي جَنَّتِي ۝ (۸۹/۲۷-۳۰)

اے ذات کہ جسے کامل اطمینان نصیب ہے، اپنے رب کی طرف آجا۔ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی ہو۔ میرے بندوں میں داخل ہو جا۔ میری جنت میں داخل ہو جا۔

سحرہا در گریبانِ شبِ اُوست — دو گیتی را فروغ از کوکبِ اُوست
نشانِ مردِ حق دیگر چہ گویم — چو مرگ آید تبسم بر لبِ اُوست

شمعِ نبوت کے پروانوں کے لیے محبوبِ دل نواز کی یہ جُدائی قیامتِ صغریٰ سے کم نہ تھی۔ ان کے دلوں کی بستیوں میں حشر برپا ہو گیا۔ دردِ فراق سے سینے شق ہو رہے تھے۔ دل کا خون آنکھوں میں کھنچا آ رہا تھا۔ دُنیا ان کی آنکھوں میں اندھیر ہو رہی تھی۔ بزمِ کائنات انہیں بے کیف نظر آتی تھی اور بہارِ زندگی افسردہ و پژمردہ۔ لیکن غم و الم کے اس ہوش رُبا عالم میں ایک ایسا پیکرِ ضبط و سکون بھی تھا جسے تربیتِ نبویؐ نے جبر میں اختیار اور بے قراری میں قرار کا سلیقہ سکھایا تھا۔ وہ جسے غار کی یاس انگیز تنہائیوں میں لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا کی تعلیم ایمان افروز و استقامت بخش سے نا امیدیوں کے ہجوم میں امیدوں کا روشن مستقبل دیکھنے کا انداز بتایا تھا، وہ پیکرِ ضبط و استقامت؛ وہ یارِ غارِ نبویؐ، وہ جس کے کندھوں پر جانشینیٔ رسولؐ کا بارِ عظیم آنے والا تھا،

ایک عظیم القدر اعلان

غم و اندوہ کے اس تلاطم میں، روشنی کے بلند مینار کی طرح اُٹھا اور دو جملوں میں مجمع کے سامنے اس حقیقتِ کبریٰ کو بے نقاب کر گیا کہ اسلام

(گزشتہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) رکھ دیں جن کی رُو سے وہ ان قوانین کا علم حاصل کر سکے جن کے مطابق کائنات کے مختلف عناصر سرگرمِ عمل ہیں۔ جب انسان ان قوانین کا علم حاصل کر لے تو وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر سکتا ہے۔ خدا نے انسان سے کہہ دیا کہ وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے خارجی کائنات اور خود انسانی زندگی کے حسن میں اضافہ کرتا چلا جائے اور اس طرح اس پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے میں خدا کا دست و بازو بن جائے جسے مشیتِ خداوندی نے متعین کیا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو خدا اور انسان کا باہمی تعلق رفاقت کا قرار پاتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ سارا پروگرام خدا کا متعین کردہ ہے اور انسانی صلاحیتیں بھی اسی کی عطا فرمودہ، اس لیے اس رفاقت میں خدا کا مقام "رفیقِ اعلیٰ" کا ہوتا ہے۔ یہی وہ "رفاقتِ اعلیٰ" کا تصور ہے جس کی طرف نبی اکرمؐ نے اپنے آخری الفاظ میں اس حسن و خوبی سے اشارہ فرمایا اور جو خدا اور بندے کے تعلق کے باب میں فی الحقیقت حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔

کا نظامِ حق وصداقت اپنی داخلی قوتوں کے زور پر آگے چلنے کے لیے وجود میں آیا ہے۔ شخصیتوں کا وابستۂ دامن نہیں ہے کہ کسی ایک کی وفات سے سارے نظام کا خاتمہ ہو جائے۔ آپ (حضرت ابوبکر صدیقؓ) منبر پر تشریف لائے اور مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا۔

ایھا الناس! من کان یعبد محمداً فانہٗ قد مات ومن کان یعبد اللّٰہ فانہ حی لایموت۔

لوگو! جو شخص محمدؐ کو اپنا معبود سمجھتا تھا وہ جان لے کہ اس کا معبود یقیناً مر گیا۔ لیکن جو اللہ کی عبودیت اختیار کیے ہوئے ہے اسے سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ ہمیشہ کے لیے زندہ ہے۔ اسے کبھی موت نہیں۔

اور اس کی سند میں فرمایا کہ:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ.... ۳/۱۴۴

حضورؐ کی تجہیز و تکفین کا کام بہت ضروری تھا۔ لیکن اس سے بھی مقدم ایک اور کام تھا۔ دین کی یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آ چکی تھی کہ ملت ایک ثانیہ کے لیے بھی بے امام نہیں رہ سکتی۔ نظام کی مرکزیت ہر وقت موجود رہنی چاہیے۔ اس لیے انہوں نے سب سے پہلے انتخابِ امام کا اہم ترین فریضہ ادا کیا۔ اس طرح اس نظام کو بلا انقطاع آگے بڑھا دیا جسے خدا نے ترتیب دیا اور اس کے رسولؐ نے متشکل کیا تھا اور جسے اسی طرح سلسلہ بہ سلسلہ آگے بڑھتے چلے جانا چاہیے تھا۔ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۹۷/۵

یہ سلسلۃ الذہب کہاں تک آگے بڑھا اور پھر رُکا کیوں؟ یہ قصہ اس داستان سے الگ ہے۔ فلہٰذا، ہمارے پیشِ نظر موضوع سے خارج۔

جہانِ نَو

نوعِ انسانی خشک نَیستاں کی طرح ایک شرارہ کے انتظار میں تھی۔ وہ بجلی کا شرارہ اِس بطلِ جلیل کے پیکر میں آسمان سے آیا اور تمام نوعِ انسانی کو شعلہ صفت بنا گیا۔

(کارلائل)

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، کسی انسان کی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کے ماپنے کا پیمانہ یہ ہے کہ جب وہ دنیا میں آیا تو اس نے دُنیا کو کیسے پایا اور جب وہ یہاں سے گیا تو دنیا کو کس حالت میں چھوڑا۔ اگر اس نے دُنیا کو حق و صداقت کے لیے ناسازگار اور عدل و انصاف کے لیے نامساعد پایا تو دیکھنا یہ ہوگا کہ اس نے اس ناسازگاری کو سازگاری اور نامساعدت کو مساعدت میں بدلنے کے لیے کیا کچھ کیا اور اس کی اِس تگ و تاز و سعی و کاوش کا نتیجہ کیا نکلا۔

مردِ خُود دارے کہ باشد پُختہ کار　　　با مزاجِ اُو بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاجِ اُو جہاں　　　می شود جنگ آزما با آسماں
بر کَند بنیادِ موجودات را　　　می دہد ترکیبِ نَو ذرّات را
می کُند از قوّتِ خود آشکار　　　روزگارِ نَو کہ باشد سازگار

ظہورِ نبوّت کے وقت دُنیا کی حالت

جس حیاتِ طیّبہ کے تذکارِ جلیلہ و کوائفِ جمیلہ ہمارے لیے وجۂ شادابیٔ قلب و نگاہ اور باعثِ افزائش ایمان و بصیرت ہوتے ہیں، اس نے جب مسکنِ انسانی میں چشمِ نبوّت وَا کی تو اُسے جس عالَم میں پایا، اس کا

اجمالی تذکرہ پہلے آچکا ہے اس لیے اسے دُہرانا تحصیلِ حاصل ہوگا۔ البتہ تجدیدِ یادداشت کے لیے اس کے ایک اقتباس کو دوبارہ سامنے لانا ضروری سمجھا گیا ہے جس میں عصرِ حاضر کے ایک نامور مؤرخِ تہذیب نے بتایا ہے کہ اُس وقت دُنیائے تہذیب و تمدن کی کیا حالت ہو چکی تھی۔ وہ لکھتا ہے۔

"اُس وقت ایسا دکھائی دیتا تھا کہ تہذیب کا وہ قصرِ مشید جس کی تعمیر میں چار ہزار سال صرف ہوئے مُنہدم ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا اور نوعِ انسانی پھر اسی بربریت کی طرف لوٹ جانے والی تھی جہاں ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے خون کا پیاسا تھا اور آئین و ضوابط کو کوئی جانتا تک نہ تھا۔ قدیم قبائلی آئین و مسالک اپنی قوت و احترام کو کھو چکے تھے اس لیے اب ملوکیت کے پُرانے طرق و انداز کا سکّہ دنیا میں نہیں چل سکتا تھا۔ عیسائیت نے جن قواعد و ضوابط کو رائج کیا تھا وہ نظم و ضبط اور وحدت و یک جہتی کے بجائے تشتّت و افتراق اور بربادی و ہلاکت کا موجب بن رہے تھے۔ غرضیکہ وہ وقت آچکا تھا جب کہ ہر طرف فساد ہی فساد نظر آتا تھا۔ تہذیب کا وہ بلند و بالا درخت جس کی سرسبز و شاداب شاخیں کبھی ساری دنیا پر سایہ فگن تھیں اور آرٹ، سائنس اور لٹریچر کے سنہری پھلوں سے لدی ہوئی تھیں اب لڑکھڑا رہا تھا۔ عقیدت و احترام کی زندگی بخش نمی اس کے تنے سے خشک ہو چکی تھی اور وہ اندر تک سے بوسیدہ اور کھوکھلا ہو چکا تھا۔ جنگ و جدال کے طوفان نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے جو صرف پُرانی رسموں کے بندھن سے یکجا کھڑے تھے اور جن کے متعلق ہر وقت خطرہ تھا کہ اب گرے یا اب۔ کیا (ان حالات میں) کوئی ایسا جذباتی کلچر پیدا کیا جا سکتا تھا جو نوعِ انسانی کو ایک مرتبہ پھر ایک نقطہ پر جمع کر دے اور اس طرح تہذیب کو مٹنے سے بچا لے! اس کلچر کو بالکل نئے انداز کا ہونا چاہیئے تھا اس لیے کہ پُرانی رسومات و آئین سب مُردہ ہو چکے تھے اور ان ہی جیسے اور قوانین مرتّب کرنا صدیوں کا کام تھا۔" (EMOTION AS THE BASIS OF CIVILISATION BY DENISON)

انقلاب کے نتائج

یہ تھی وہ حالت جس میں اُس داعیٔ انقلاب نے دنیا کو پایا جو دُنیا کو ایک "طرحِ نو" سے آشنا کرانے کے لیے آیا تھا۔ کیا اُس نے دُنیائے تہذیب و تمدن کے ان تقاضوں کو پُورا کیا جس کی طرف اُوپر کے اقتباس میں اشارہ کیا گیا ہے؟ اس کا جواب ہم سے نہیں خود اس اقتباس کے مصنّف کی زبان سے سنیئے جو کہتا ہے کہ

یہ امر موجبِ حیرت و استعجاب ہے کہ اس قسم کا نیا کلچر عرب کی سرزمین سے پیدا ہوا جبکہ

اس کی اشد ضرورت تھی۔

یہ حیرت انگیز کلچر اسی ذاتِ گرامیؐ کی عدیم النظیر تعلیم اور فقید المثال عمل کا درخشندہ نتیجہ تھا جس کی تعلیم و عمل نے دُنیا کو بتا دیا کہ ایک انسان دنیا میں کیا کچھ کر سکتا ہے۔ اس کی شہادت ایک غیر مُسلم کی زبان سے سنیئے جو لکھتا ہے کہ :

> ہم میں سے اُن لوگوں کے لیے جن کے نزدیک انسانؔ ہی سب کچھ ہے، ماحول کچھ نہیں محمدؐ اس حقیقت کی عظیم الشّان مثال ہے کہ ایک انسان کیا کچھ کر سکتا ہے لیکن وہ لوگ بھی جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ تاریخ کے انقلابات کسی ایک فرد کی کوششوں سے کہیں زیادہ ماحول کی خصوصیات اور قلب انسان کی استعداد قبولیت کے رہینِ منت ہیں، اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ اگر تاریخ میں ایسا انقلاب آنا ہی تھا (جو عرب میں آیا) تو محمدؐ کے بغیر یہ انقلاب ایک غیر متعین عرصہ تک معرضِ التوا میں رہتا۔
>
> (PRINGLE KENNEDY - ARABIAN SOCIETY AT THE TIME OF MOHAMMAD)

یہ انقلاب کیا تھا؟

عربوں کے لیے یہ انقلاب ایک نئی زندگی تھی جو انہیں تاریکی سے نُور کی طرف لے آئی تھی۔ عرب اس کے ذریعے پہلی دفعہ زندہ ہوا۔ ایک ایسی قوم جو ابتدائے آفرینش سے گمنامی کے عالم میں ریوڑ چراتی پھرتی تھی، ان کی طرف ایک رسول آیا جو اپنے ساتھ ایک ایسا پیغام لایا جس پر وہ قوم ایمان لے آئی۔ وہ دیکھو! وہی گمنام چرواہے دنیا کی ممتاز ترین قوم بن گئے۔ وہ حقیر قوم ایک عظیم الشّان ملّت میں تبدیل ہو گئی۔ ایک صدی کے اندر اندر عرب ایک طرف غرناطہ اور دوسری طرف دہلی تک چھا گئے۔ اس کے بعد سیکڑوں برس ہو چلے ہیں کہ یہ اسی شان و شوکت اور درخشندگی و تابندگی سے کرّۂ ارض کے ایک حصّے پر مسلط ہیں (یہ سب ایمان کی حرارت سے ہوا)۔ ایمان بہت بڑی چیز ہے۔ ایمان ہی سے زندگی ملتی ہے۔ جونہی کسی قوم میں ایمان پیدا ہوا، اس قوم کی تاریخ، اعمال میں نتائج اور رُوح میں بالیدگی پیدا کرنے والی بن گئی۔

—— وہ عرب —— یہ محمدؐ —— اور ایک سو سال کا عرصہ ——

کیا یہ انقلاب ایسا ہی نہیں جیسے ریت کے کسی سیاہ گمنام ٹیلے پر آسمان سے بجلی کی لہر آ گرے

اور وہ ریت کا تودہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک آتش گیر مادّہ میں تبدیل ہو کر اس طرح بھک سے اُڑ جائے کہ دہلی سے غرناطہ تک اس کے شعلوں کی لپیٹ میں آجائے؟

نوعِ انسانی خشک نیستاں کی طرح ایک شرارہ کے انتظار میں تھی۔ وہ بجلی کا شرارہ اس رجلِ جلیل کی صورت میں آسمان سے آیا اور تمام نوعِ انسانی کو شعلہ صفت بنا گیا۔

(THOMAS CARLYLE -- HEROES AND HERO WORSHIP -- P.66)

اُس نے کیا کیا؟

محمدؐ کے اثر سے عربوں کی قبائلی عصبیت کا خاتمہ ہو گیا اور وہ ایک ایسے رشتہ میں منسلک ہو گئے جس سے وہ اس سے پیشتر ناآشنا تھے۔ یہ رشتہ، توحید کا عقیدہ تھا جو انہیں ایک مرکز پر لے آیا اور ان کی فتوحات کو ان کے لیے ممکن بنا دیا۔

(THE ECLIPSE OF CHRISTIANITY IN ISLAM

by L.E. BROWNE -- P.24-28)

تاریخِ عرب کے مصنّف (HITTI) کے الفاظ میں۔

یہ عرب کی تاریخ میں پہلی کوشش تھی کہ انہیں خون کے بجائے مذہب کے نام پر ایک مرکز پر جمع کیا جا رہا تھا۔ اللہ اس سلطنت کا حاکمِ اعلیٰ تھا، اس کا رسولؐ اپنی زندگی بھر اس کا نائب اور ملک کا فرماں روا بنا رہا۔ محمدؐ اپنے روحانی فرائض کے علاوہ ایسے فرائض بھی سرانجام دیتے تھے جیسے سلطنتوں کے احکام۔ اس کی ملّت میں سب کے سب قبائلی رشتوں اور پرانے علاقات سے یکسر منقطع ہو کر اصولاً بھائی بھائی بن چکے تھے۔

(HITTI-HISTORY OF THE ARABS -- P.120)

اور (REV.STEPHENSON) کے الفاظ میں۔

سب سے پہلے اس حقیقت کا بلاتکلّف اعتراف کر لینا چاہیئے کہ اپنی قوم کے لیے محمدؐ کی ذات بڑے احسانات کی موجب تھی۔ وہ اس ملک میں پیدا ہوئے جہاں سیاسی تنظیم معقول عقاید اور پاکیزہ اخلاق

سے کوئی شناسا نہ تھا۔ انہوں نے یہ تینوں چیزیں پیدا کردیں۔ انہوں نے اپنی پختہ فطانت سے بیک وقت سیاسی حالت، مذہبی عقائد اور ضابطۂ اخلاق سب کی اصلاح کر دی۔ انہوں نے مختلف قبائل کی جگہ انہیں ایک قوم بنا دیا۔ مختلف دیوتاؤں اور آقاؤں کی جگہ ایک خدا پر ایمان کی تعلیم دی اور بڑی بڑی معیوب اور قبیح رسومات کو بیخ و بُن سے اکھیڑ دیا۔ جوں جوں اسلام اپنے قدم عرب کی سرزمین سے باہر رکھتا گیا، کئی وحشی قومیں جنہیں اُس نے اپنے آغوش میں لیا، نعمائے اسلام کی وارث بنتی چلی گئیں۔ ..... اسلام (نوعِ انسانی کے لیے) برکات کا موجب، تاریکی سے نور اور شیطان سے خدا کی طرف رجعت کا باعث ہے۔

نیز باسورتھ سمتھ کے الفاظ میں۔

ایک ایسی خوش بختی کی بنا پر جو تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتی، محمدؐ تین عناصر کا بانی ہے؛ ایک قوم، ایک سلطنت اور ایک مذہب۔ تینوں کا بانی خود اَن پڑھ[1] تھا لیکن اس نے دنیا کو ایک ایسی کتاب دی جو شعر و نغمہ بھی اپنے اندر رکھتی ہے اور آئین و قانون بھی۔ محمدؐ کا یہی معجزہ ہے، مستقل معجزہ، فی الحقیقت معجزہ۔

(REV. BOSWORTH SMITH)

ہر قسم کی توہم پرستی کا استیصال۔

ہمیں بلا تأمل اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہیئے کہ (تعلیم نبویؐ نے) ان تاریک توہمات کو ہمیشہ کے لیے جزیرہ نمائے عرب سے باہر نکال دیا جو صدیوں سے اس ملک پر چھا رہے تھے۔ بُت پرستی خارج البلد ہو گئی۔ توحید اور خدا کی لامحدود رحمت کا تصور، محمدؐ کے متبعین کے دلوں کی گہرائیوں اور زندگی کے اعماق میں جاگزین ہو گیا۔ ..... معاشرتی اصلاحات کی بھی کوئی کمی نہ رہی۔ ایمان کے دائرہ میں برادرانہ محبت، یتیموں کی پرورش، غلاموں سے احسان، حرمتِ خمر، سب جوہر نمودار ہو گئے۔ امتناعِ شراب میں جو کامیابی اسلام نے حاصل کی کسی اور مذہب کو نصیب نہیں ہوئی۔

(SIR WILLIAM MUIR -- LIFE OF MOHAMMAD)

[1] نبوت ملنے سے پہلے

ہر عقیدۂ باطل کی اصلاح۔

اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ محمدؐ کے مذہب نے ہر اُس عقیدہ کی اصلاح کر دی جو اِس سے قبل وہاں رائج تھا۔ اُس نے متفارق و متخالف قبائل کو باہم ملا دیا اور اس طرح اس قوم کو دنیا کی بڑی سے بڑی قوتوں سے بھی آگے کھڑا کر دیا۔

(DR.MARCUS DODS — MOHAMMAD, BUDHA AND CHRIST.)

محض "مذہبی ریفارمر" ہی نہیں، ایک عدیم النظیر طرزِ حکومت کے طرح انداز بھی۔

محمدؐ ایک مذہب کے بانی نہ تھے ایک سلطنت کے بھی تھے۔ لیکن ایک ایسی سلطنت کے جو شروع ہی سے دینی سلطنت تھی یعنی جس میں دنیا اور آخرت دونوں کا امتزاج تھا۔ اسلام کے پیشِ نظر یہ تھا کہ تمام انسانوں کے امتیازات مٹا کر انہیں ایک جماعت بنا دیا جائے جس کا مسلک قانونِ خداوندی اور اس کے رسول کی اطاعت ہو اور اس طرح حق کو ساری دنیا پر پھیلا دیا جائے۔ محمدؐ دنیا میں "خدا کی مرضی" کی تنفیذ و اشاعت کے لیے سب سے بڑے ایگزیکٹو آفیسر تھے۔ انہوں نے اپنے پیش رو انبیاء کی طرح محسوس کر لیا تھا کہ تمام نوعِ انسانی ایک دن ایک ملّتِ واحدہ بن کر رہے گی، ایک خدا کے ماتحت ایک حکومت۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۚ ۲/۱۱۵

(SPALDING -- CIVILISATION IN EAST AND WEST -- P.164)

اور (GEORGE RIVORIE) کے الفاظ میں۔

اسلام، اُس دنیا کے لیے پیغامِ نجات و سعادت تھا جو جسمانی اور ذہنی مصائب میں مبتلا تھی اور دوسروں کی غلامی نے اسے چکنا چور کر رکھا تھا۔ اس نے عدل و انصاف کے عصرِ جدید کا اعلان کیا جس عالمگیر حکومت کی طرح اسلام نے رکھی اس میں نہ نسلی امتیاز کو کوئی دخل تھا نہ معاشرتی حدود کو۔ اس کا ایک ہی قانون تھا، سب کے لیے یکساں عدل اور محبت۔

اس حقیقتِ کبریٰ کو جتنی مرتبہ دہرایئے کم ہے کہ محمدؐ نہ صرف ایک ایسے عظیم القدر مذہب کا پیغمبر تھا

جس نے اس دُنیا کی روحانی تسکین کا سامان فراہم کر دیا جو خالص توحید کے لیے پیاسی تھی۔ بلکہ وہ ایک ایسے معاشرتی اور بین الاقوامی انقلاب کا علمبردار تھا جس کی نظیر تاریخ نے کبھی نہ دیکھی تھی۔

(VISAGES DE L' ISLAM)

ایک ایسی حکومت جس میں جبر سے اختیار پیدا ہوا اور جس کی مثال دنیا نے نہ دیکھی ہو۔

انسان کے تمام فرائضِ حیات کو ایک لفظ میں سمیٹ کر رکھ دیا گیا ہے اور وہ لفظ ہے اِسلام یعنی اپنے جذبات اور ارادوں کو مشیتِ ایزدی کے تابع رکھنا۔ یہ تسلیم و رضا اس اطاعت و انقیاد سے یکسر مختلف ہے جو مادّی ریاست میں حکومت کی طرف سے مطلوب ہوتی ہے۔ کسی مسولینی کے سامنے جھکنے اور خدا کے سامنے جھکنے میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ جو خدا کے سامنے جھک کر مسلم بن جاتا ہے اس کے ذمہ اس دُنیا اور اگلی دنیا دونوں کے فرائض عاید ہو جاتے ہیں، یعنی اخلاقی بھی اور روحانی بھی، خدا کی مرضی کا معلوم کرنا اور اس کی تعمیل کرانا۔ اس طرح مُسلم بیک وقت ایک راہب اور سپاہی بن جاتا ہے۔ نمازی بھی بنتا ہے اور میدانِ جنگ میں جانے کے لیے بھی ہر وقت تیار رہتا ہے لیکن صرف اس جنگ کے لیے جو دنیا سے شر کے استیصال کے لیے کی جاتی ہے۔

(SPALDING -- P.16)

اور (RAYMOND LEROUGE) کے الفاظ میں۔

نبیٔ عربی اس معاشرتی اور بین الاقوامی انقلاب کے بانی ہیں جس کا سُراغ اس سے قبل تاریخ میں نہیں ملتا۔ انہوں نے ایک ایسی سیاسی حکومت کی بنیاد رکھی جسے تمام کرۂ ارض پر پھیلنا تھا اور جس میں سوائے عدل اور احسان کے اور کسی قانون کو رائج نہیں ہونا تھا۔ ان کی تعلیم تمام انسانوں کی مساوات، باہمی تعاون اور عالمگیر اخوت تھی۔

(LIFE DE MOHAMET -- PP.18-19)

انسانی مساوات کی ایسی دُنیا جس کی نظیر کہیں اور نہیں مل سکتی۔

محمّدؐ کے مذہب نے اس حقیقی اور اوّلین جمہوریت کا اعلان کیا جو کسی انسان کے ذہن میں نہ آسکی تھی۔

اس کا خدا اتنی بلند و بالا کبریائی کا مالک تھا کہ اس کی نگاہ میں دُنیا کے تمام انتظامات ہیچ اور رنگ و نسل کی تمام گہری خلیجیں ناپید تھیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ دوسروں کی مانند معاشرتی طبقات مسلمانوں میں بھی موجود ہیں لیکن بنیادی طور پر تمام مسلمان برابر ہیں اور یہ بنیادی مساوات عیسائیوں کی مساوات کی طرح محض افسانہ نہیں بلکہ ایک مسلمہ حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے ... یہ صرف مسلمانوں کی ہی خصوصیت ہے کہ وہ اسوَد و احمر کے ظاہری امتیاز کے باوجود، ہر جگہ بطور بھائی بھائی کے تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اور اس جذبۂ اخوت کی بنیاد رنگ و نسل نہیں بلکہ ان کا عقیدہ ہوتی ہے۔

(DR. MAWDE ROYDEN -- THE PROBLEM OF PALESTINE -- P.37)

"دُنیائے مذہب" میں ایک نئے باب کا اضافہ۔

اسلام مذہبی زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے۔ یہ معتقدات و رسُومات کا مجموعہ نہیں۔ یہ تو ایک رُوحانی توانائی ہے۔ ایک تخم صالح اور زندہ — یہ اپنی زندگی میں بالیدگی پیدا کرتا ہے اور دوسری روحانی زندگیوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ یہ سب کچھ ایک ایسے آئینی ضابطہ کی رُو سے کرتا ہے جس کا صحیح مفہوم اسی صورت میں سمجھ میں آسکتا ہے جب اسے وسیع پیمانہ پر عمل میں لایا جائے۔

(TOR ANDRE – MOHAMMED, THE MAN AND HIS FAITH – P.11)

کھلا کھلا دین، آیاتِ بیّنات، واضح تعلیم۔

اسلام کوئی ناممکن الحصول نصب العین متعین نہیں کرتا۔ کوئی الٰہیاتی پیچیدگیاں نہیں، کوئی باطنی رموز و اسرار نہیں، کوئی برہمنیت کی دراشت نہیں۔

(HITTI -- P.129)

ایک مکمل تہذیب۔

اسلام ایک ضابطۂ الٰہیات سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ ایک مکمل تہذیب ہے۔

(GIBB -- WHITHER ISLAM -- P.12)

ابدی حقائق کی بنیادوں پر قائم۔

محمدؐ کا مذہب شک ابہام سے بالکل مبرا ہے اور قرآن، خدا کی توحید کی درخشندہ شہادت۔ نبی عربیؐ نے بتوں، انسانوں اور اجرامِ سماوی کی پرستش کو اس بصیرت افروز دلیل کی بنا پر رد کر دیا کہ جو طلوع ہوتا ہے وہ غروب بھی ہوتا ہے، جو پیدا ہوتا ہے وہ مرتا بھی ہے جس کی بنیاد میں فساد ہے اس کا مآل ہلاکت اور تباہی ہے۔ آپ کے دینی جوش اور ولولہ نے جو یکسر مبنی علی البصیرت تھا، خالقِ کائنات کی صورت میں، اُس لا انتہا ذاتِ سرمدی کا اقرار کر کے اسے مرکزِ حمد و ستائش قرار دے دیا، جو صورت اور مکان کی جہت سے بلند اور اولاد اور مثیل کی نسبتوں سے بالا تھی، وہ ذات جو ہمارے پوشیدہ خیالات تک میں موجود اور خود اپنی ذات سے قائم ہے اور جس کے سرچشمہ سے عقل و اخلاق کے جوہروں کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہ مسلکِ توحید اس قدر بلند ہے کہ ہماری موجود استعداد کی وہاں تک رسائی نہیں ہو سکتی۔

جو چیز ہمارے لیے سب سے زیادہ وجہِ حیرت ہے وہ اسلام کی اس قدر جلد اشاعت نہیں بلکہ یہ کہ اس کی تعلیم کس قدر ابدی حقائق پر مبنی ہے۔ وہی سادہ لیکن مکمل نقش جو محمدِ عربیؐ نے مکہ اور مدینہ میں انسانی قلوب پر سکوک کیا اور جو ان بارہ صدیوں کے انقلاب کے باوجود ہندوستان سے افریقہ تک قرآن کے متبعین کے ہاں محفوظ چلا آتا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے مذہب اور عقیدہ کے مقصود کو عام انسانی حواس و تخیل کی سطح پر اُترنے نہیں دیا۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ اسلام کا نہایت سادہ اور غیر متبدل عقیدہ ہے۔ ان کا خدائی تصور بھی کبھی مرئی ہستیوں کا شرمندہ نہیں ہو سکا۔ رسول اللہؐ کا درجہ کبھی بشریت کی حد سے تجاوز نہیں کر سکا۔ اس کی زندہ تعلیمات نے اس کے متبعین کے جذباتِ عقیدت کو دین و دانش کے حدود سے باہر نہیں جانے دیا۔ یہ ہے اسلام کی سادہ اور ابدی تعلیم۔

(GIBBON -- DECLINE AND FALL OF ROMAN EMPIRE -- P.287 & 352)

دُنیا کی مقدس کتابوں میں قرآن ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔ اگرچہ یہ اپنی نوع کے لٹریچر میں سب سے کم سن واقع ہُوا ہے لیکن اس اثر کے اعتبار سے جو اس نے نوعِ انسانی کے دلوں پر کیا ہے، کوئی اس پر غالب نہیں آسکتا۔ اس نے انسانیت کو ایک نئے فکر سے روشناس کرایا ہے اور اسے ایک جدید انداز کی سیرت عطا کی ہے۔ اس نے جو محیّر العقول اصلاحات کیں اور تعجب انگیز کامیابیاں حاصل کیں، وہ محض عہدِ کہن کی داستانیں نہ تھیں۔ وہ آج بھی یہی کچھ کر رہا ہے۔

(MARGOLIOUTH)

زندگی کے ہر شعبہ میں خضرِ راہ۔

(اسلام میں) قرآن، وسیع ترین مفہوم میں، ضابطۂ حیات تھا جو ایک فرد کی زندگی کی انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں کو محیط تھا اور اس کی ہر شعبہ میں ہدایت کرتا تھا۔ آج تک مسلمانوں کی ہر جماعت کے لیے قرآنِ کریم ایک ناقابلِ تغیّر اصولِ زندگی ہے۔ یہ الٰہیات، شعائر و مناسک، دیوانی و فوجداری قوانین اور اخلاقی ضوابط سب کا مجموعہ ہے۔

(RELIGION IN SCIENCE AND CIVILISATION

by SIR RICHARD GREGORY -- P.80)

مستقل انقلاب

ایک وقتی اور ہنگامی انقلاب نہیں کہ جو بگولے کی طرح اُٹھے اور حباب کی طرح بیٹھ جائے، بلکہ ایک ایسا انقلاب جس نے پوری نوعِ انسانی کو متاثر کر دیا۔ جس نے انسانی ضمیر کی گہرائیوں میں جگہ پکڑی۔ جس نے دنیا کی نگاہوں کا زاویہ بدل دیا۔ وہ انقلاب جس نے جہالت کی تاریکیوں کو علم کی روشنی سے بدل دیا۔ جس نے "مذہب" جیسی خالصتہً جذباتی چیز کی بنیاد بصیرت پر رکھ دی اور عقل و دانش کی بے کیف و بے رنگ دنیا کو عشق کی مستیوں اور رنگینیوں سے معمور کر دیا، جس نے ایاز کو آئینِ غزنوی اور غزنوی کو آدابِ ایازی سکھا دیئے۔ وہ بانگِ درا جس نے انسانیت کے راہ گم کردہ قافلہ کو صحیح راستہ پر لگا دیا۔ جس نے علم و عقل سے راستہ کے چراغ روشن اور ایمان و ایقان سے منزل کے نشان متعین کیئے۔ غرضیکہ وہ انقلاب جس نے دنیا کو وہ سب کچھ دیا جس پر آج دنیا اس طرح فخر کر رہی ہے۔ اگر تاریخ انسانیت

میں یہ انقلاب نہ آتا تو دُنیا آج مٹی کے گھروندے سے زیادہ کچھ نہ ہوتی اور انسان ابھی تک اپنے ارتقار کی ابتدائی منازل میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا۔ سنیئے کہ خود یورپ کے اربابِ علم وفکر اس حقیقت کا اعتراف کیسے واضح الفاظ میں کرتے ہیں۔

> اس (عہدِ ظلمت کے بعد) ازمنۂ متوسطہ میں جو جو ترقیاں ہوئیں وہ عربوں کے اثر کا نتیجہ تھیں۔ عیسائیت اور اسلام صلیبی جنگوں کے سلسلہ میں ایک دوسرے کے قریب آئے جس طرح بلعم بنی اسرائیل پر لعنت بھیجنے کے لیے آیا لیکن ان کے لیے برکت کا موجب بن گیا۔ اسی طرح مسیحی دنیا مسلمانوں کے خلاف صلیبی لڑائی لڑنے کے لیے آئی لیکن مسلمانوں کے قدموں میں بیٹھ گئی تاکہ ان سے تحصیلِ علم کرے۔ صلیب کے نیم وحشی سپاہیوں نے دیکھا کہ یہ "کفار" (یعنی مسلمان) اگرچہ مذہبی طور پر (ان کے نزدیک) قابلِ ہلاکت ہیں لیکن وہ ایک ایسی تہذیب کے مالک ہیں جو اُن کی اپنی تہذیب سے بدرجہا فائق ہے۔ مسلم ثقافت کا یہی وہ اثر تھا جس نے ازمنۂ متوسطہ کی تاریکیوں کا خاتمہ کرکے عہدِ حاضر کی روشنی کا آفتاب طلوع کیا۔

(THE SCIENCE OF HISTORY by F.J.C. HEARUSHAW)

اسی انقلاب سے یورپ کی زندگی کی ابتداء ہوئی۔

> مسلمانوں نے صرف ملکوں کو فتح نہیں کیا، انہوں نے اپنی مفتوحہ زمینوں میں اسلام کی تخم ریزی کی۔ اس تخم سے مساجد کا وجود منصۂ شہود پر آیا۔ ہر مسجد کا اپنا مکتب تھا۔ علم کے متلاشی سیاسی مدبّرین سے بھی زیادہ عزّت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ایک قافلۂ تجارت جہاں ریشم اور سُوتی کپڑے لاد کر لاتا تھا اُس کے ساتھ ہی اس کے اونٹوں پر ہندوستان اور بازنطین کی کتابوں کے مسودے اور اقصائے عالم سے معدنیات اور نباتیات کے نمونے بھی لدے ہوتے تھے...... کتب خانے اور رصدگاہیں زندگی کا جزو بن چکی تھیں...... یہ انسانی ذوق کا ایک نیا کھیل تھا جسے نہایت جوش وانہماک سے کھیلا گیا...... اس کھیل کو یونانیوں نے بھی اس حسن وخوبی سے نہیں کھیلا...... انہی عربوں کے ہاتھوں یورپ نے زندگی کی ابتدا پائی اور انہی سے اس نے فلکیات، نباتیات، کیمیا، قانون، ریاضی، طب اور فلسفہ

کا پہلا سبق لیا۔ (DORSEY -- CIVILISATION -- PP.644-45)

اسی سے ساری دنیا حیاتِ نو سے رُوشناس ہوئی۔

یورپ کی نشاۃِ ثانیہ پندرہویں صدی میں نہیں ہوئی بلکہ اُس وقت ہوئی جب یورپ عربوں کے کلچر سے متاثر ہُوا۔ یورپ کی خلقتِ جدیدہ کا گہوارہ اٹلی نہیں بلکہ اُندلس ہے۔ اُدھر روما کی تہذیب گرتے گرتے بربریت کی حد تک پہنچ چکی تھی اور اِدھر دُنیائے اسلام (بغداد، قرطبہ، قاہرہ) تہذیب و ذہنی تحریکات کے مرکز بن رہے تھے۔ ان ہی شہروں میں وہ نئی زندگی نمودار ہوئی جسے انسانی ارتقاء میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنا تھا جس وقت نئی تہذیب محسوس طور پر سامنے آئی، دنیا حیاتِ نو سے شناسا ہوئی..... اگر عرب نہ ہوتے تو یورپ کی تہذیب کا وجود عمل میں نہ آتا۔ ان کے بغیر یہ یقیناً اس خصوصیت کو حاصل نہ کر سکتا تھا جس نے اسے ارتقائی مراحل میں بلند ترین سطح پر لاکھڑا کیا ہے۔ مغربی کلچر میں کوئی ایسا شعبہ نہیں جس میں عربی ثقافت کا رنگ نہ جھلکتا ہو لیکن ایک شعبہ تو ایسا ہے جس میں یہ اثر بالکل نکھر کر سامنے آجاتا ہے اور یہی وہ شعبہ ہے جو درحقیقت عصرِ حاضر کی حقیقی قوت کا باعث اور اس کی فتوحات کا ذریعہ ہے، یعنی علم الاشیاء — سائنس کی رُوح! ہماری سائنس صرف اسی حد تک عربوں کی رہینِ منت نہیں کہ انہوں نے ہمیں عجیب و غریب نظریات و انکشافات سے روشناس کرایا ہے نہیں! بلکہ ہماری سائنس کا وجود ہی ان کا شرمندۂ احسان ہے۔ اسلام سے پہلے کی دُنیا، درحقیقت زمانہ قبل از سائنس (PRE SCIENTIFIC) ہے۔ پندرھویں صدی تک یورپ ان ہی علوم و فنون کو اپناتا رہا جو اسے مسلمانوں نے دیئے تھے۔ اس پر کوئی اضافہ نہ کر سکا..... جب اندلس میں تہذیب و ثقافت نے پھر تاریکیوں کی چادر اوڑھ لی تو یورپ میں وہ "جن" نمودار ہوا جسے اندلس کی سرزمین نے پیدا کیا تھا۔ یورپ کو زندگی (صرف) سائنس نے دی۔ اسلام کے گوناگوں اثرات اس کی حرارت کا موجب بنے۔ (BRIFFAULT -- MAKING OF HUMANITY)

اور یہ سب قرآن کی بدولت تھا۔

تحقیقِ جدید نے ہمیں اس نتیجہ پر پہنچایا ہے کہ یورپ کے علماء (نشاۃِ ثانیہ سے پہلے) یونانی فلسفہ، ریاضی،

فلکیات اور دیگر علوم کے متعلق جو کچھ جانتے تھے ان کا منبع لاطینی کتابیں تھیں اور ان کا سرچشمہ عربی علوم تھے اور جس قوت نے عربوں کے دل میں ان علوم کا شوق پیدا کیا وہ قرآن تھا. (نہ صرف فنی علوم ہی بلکہ) لسانیات، شاعری اور ادب کی دوسری شاخیں بھی قرآن کی اشاعت کے ساتھ ہی نمودار ہوئیں اور اس طرح جس ادبی تحریک کی ابتداء ہوئی اس سے علم وہنر اور ذہانت و فطانت کے شاندار ثمرات ظہور میں آئے۔ (MARGOLIOUTH)

پھر جس طرح اس انقلابِ عظیم نے دنیا کو وہ سب کچھ دیا جس پہ دنیا آج فخر کر رہی ہے اسی طرح یہ دُنیا کو وہ سب کچھ بھی دے سکتا ہے جس کی تلاش میں دنیا آج اس طرح مضطرب و پریشان ماری ماری پھر رہی ہے. اس حقیقت کا اعتراف برنارڈشا کی زبان سے سنئیے۔ وہ کہتا ہے۔

میں نے محمدؐ کے مذہب کو اس کی توانائی کی بناء پر ہمیشہ بنگاہِ احترام دیکھا ہے. میرے نزدیک دنیا میں تنہا یہی مذہب ہے جس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دے سکے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا پیغام ہر زمانہ کے لوگوں کو اپیل کر سکتا ہے. میں نے اس حیرت انگیز شخصیت کی سیرت کا مطالعہ کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ مسیحؑ کا نقیض ہونے کے بجائے، بجا طور پر نوعِ انسانی کا نجات دہندہ کہلا سکتا ہے. میرا یقین ہے، اگر آج اس جیسا کوئی انسان دُنیا کی آمریت سنبھال لے تو وہ اس کے مسائل کا اس خوبی سے حل پیدا کر سکتا ہے کہ یہ دُنیا پھر سے اُس امن و مسرت کی زندگی کو پالے جس کی آج اشد ضرورت ہے. میں نے یہ پیش گوئی کی ہے کہ جس طرح آج کا یورپ اس مذہب کو قبول کرنے پہ آمادہ ہو رہا ہے اسی طرح کل کا یورپ بھی اس مذہب کو قبول کرے گا۔

پوچھئے تاریخ کی رصدگاہوں سے کہ دنیا میں اس قسم کی کامیاب زندگی کسی اور کے حصہ میں بھی آئی ہے؟ اور یہ تمام کامیابی، نہایت سادگی اور متانت کے ساتھ۔

آج جبکہ خود ہمارے عہد کے انسانوں نے ان تمام تفاصیل کو بے نقاب کر دیا ہے جو اس انقلاب آفریں شخصیت کی زندگی سے متعلق ہیں، اس کی ابتدائی اور آخری، ہر دو ادوارِ حیات سے متعلق، اس حقیقت کا کماحقہٗ سمجھنا پھر بھی آسان نہیں ہوا کہ اس عظیم القدر ہستی کا کردار کس قدر بلند اور

اس کی محیّر العقول کامیابی کا راز کیا تھا۔ اس نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اسے خدائی قوتیں حاصل ہیں۔ اس نے اپنے آپ کو ایک عام انسان اور خدا کے پیغامبر سے زیادہ حیثیت کبھی نہیں دی۔ بایں ہمہ، اس نے اپنی قوم کے ممتاز ترین افراد کو اپنا حلقہ بگوش بنالیا اور ان پر اپنے کردار کا ایسا گہرا اثر ڈالا کہ نہ اُس زمانہ میں جبکہ اُسے چاروں طرف سے مصائب افلاس نے گھیر رکھا تھا اور نہ اُس وقت جب وہ ایک عظیم الشان سلطنت کا مالک تھا، اُسے اپنی جماعت کے کسی ایک فرد کے خلاف غداری کی شکایت ہوئی۔ اسے اپنی ذات پر اعتماد اور نصرتِ خداوندی پر یقینِ محکم، شکست اور مایوسی کی حالت میں اس سے بھی کہیں اور زیادہ ہوتا تھا جب وہ فتح وظفر کے عالم میں دشمنوں سے اپنی شرائط منواتا تھا۔ (اُس نے اسی طرح زندگی بسر کی اور اس کے بعد) اپنے دورِ اوّل کے متبعین، عقیدت مندان اور احباب کے حلقہ میں (نہایت سکون سے) آنکھیں بند کرلیں۔ نہ اس کی زندگی کا کوئی گوشہ زیرِ نقاب رہا، نہ اس کی موت کسی رازداری کی موت ہوئی۔

(M.H. HYNDMAN -- THE AWAKENING OF ASIA -- P.9)

یہی وہ حقائق ہیں جن کے پیشِ نظر انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہوگیا کہ:

تمام پیغمبروں اور مذہبی شخصیتوں میں محمدؐ سب سے زیادہ کامیاب ہیں۔

اور جب حقیقت یہ ہے تو پھر وہ اور کون سی شخصیت ہوسکتی ہے جسے مقامِ محمودیّت[1] پر جلوہ فرما

مقامِ محمودیّت

ہونے کا حق پہنچ سکتا ہے۔ اس میں کسی جذباتی عقیدت کو دخل نہیں بلکہ یہ ایک واقعہ نفس الامری کا اظہار ہے کہ دُنیائے انسانیّت میں آج جو کچھ قابلِ حمد وستائش اور درخورِ تحسین وتبریک نظر آتا ہے وہ اسی وجہ سے ہے کہ وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ ایک نسبت رکھتا ہے ذاتِ محمدٌ رسول اللہ سے اور جو انسان چاہتا ہے کہ وہ درخورِ حمد وستائش ہوجائے، وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی کوشش میں ہے کہ اس راستہ پر چل نکلے جو سیرتِ محمدیہ نے دنیا میں متعیّن کرکے دکھایا۔

---

[1] عَسٰۤی اَنۡ یَّبۡعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا۔ (۱۷/۷۹) وہ مقام جو حمد وستائش کے ہر عنوان کا مرجع ہو۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو آں کہ از خاکش بروید آرزُو
یا ز نورِ مصطفیٰ اُو را بہاست یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

آج محفلِ کائنات میں کوئی شمع جلوہ فگن نہیں جو اس سراجِ منیر سے کسبِ ضیاء نہ کر رہی ہو۔ اس تیرہ سو برس کی تاریخ پر نگاہ ڈالیے اور پھر دیکھیے کہ دنیا آہستہ آہستہ اُسی نظام کی طرف آرہی ہے یا نہیں جو مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ نے اس دنیا میں متشکل کر کے دکھایا تھا۔ دیکھیے کہ اس عرصہ میں جس قدر انقلابات دنیا میں آئے اور جنہیں دنیا نے نوعِ انسانی کے لیے موجبِ خیر و برکت قرار دیا، ان کا سرچشمہ کہاں تھا؟ دنیا نے ملوکیت

دنیا کس طرف جا رہی ہے؟

کو لعنت قرار دیا اور نوعِ انسانی کی حرّیت اور آزادی کو باعثِ شرفِ انسانیت سمجھا لیکن غور کیجیے کہ دنیا میں سب سے پہلے ملوکیت کو نظامِ انسانیت کے لیے فسادِ عظیم کس نے قرار دیا اور کس نے انسانیت کو صحیح حرّیتِ فکر و عمل کا پیغام دیا؟

دنیا نے دینی پیشوائی (PRIEST-HOOD) کو انسانی استبداد کا مقدّس نقاب بتایا لیکن دیکھیے کہ سب سے پہلے کس نے اس نقاب کی دھجیاں فضائے عالم میں بکھیریں؟ اور کس نے واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی دُوسری قوت حائل نہیں ہوسکتی۔

دنیا نے غلامی کو جسدِ انسانیت کے لیے جذام قرار دیا۔ لیکن سوچیے کہ سب سے پہلے کس نے غلامی کو جرمِ عظیم قرار دیا اور ان تمام راہوں کو بند کر دیا جن سے یہ جراثیم داخل ہُوا کرتے تھے؟ آج دنیا ذات پات کی تمیز کو انسانیت کی ترقی کی راہ میں سنگِ گراں محسوس کر رہی ہے اور ہندوستان میں ویدوں اور شاستروں کی تعلیم کے علی الرغم اس کے استیصال کی کوششیں جاری ہیں لیکن غور کیجیے کہ دنیا میں سب سے پہلے کس نے یہ اعلان کیا کہ تمام نوعِ انسانی کی تخلیق نفسِ واحدہ سے ہوئی ہے اور پیدائش کے اعتبار سے کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر کوئی فوقیت یا افضلیت حاصل نہیں۔ عزت و تکریم کا معیار انسانی سیرت کی بلندی ہے نسلی تفوّق نہیں۔

آج دنیا انسانوں کی جغرافیائی اور نسلی یا لسانی تقسیم (وطنیت نیشنلزم) کے جہنم کی آگ میں جُھلس رہی ہے لیکن دیکھیے کہ وہ کون تھا جس نے سب سے پہلے حبش کے غلام اور قریشِ مکّہ کے نجیب الطرفین سردار کو ایک قوم کے افراد بنا کر عملاً ان غیر انسانی حدود و قیود کو مٹایا۔

آج دنیا نوعِ انسانی کی امن و سلامتی کا خواب تمام انسانوں کے لیے ایک نظامِ واحد کی شکل میں دیکھ رہی

ہے لیکن سوچیے کہ وہ کون تھا جس نے سب سے پہلے آواز دی کہ تمام نوعِ انسانی ایک امتِ واحدہ ہے اس لیے اسے ایک ہی نظام کے رشتہ میں منسلک ہونا چاہیئے۔

آج دنیا سرمایہ داری کے نظامِ معیشت کو موجودہ عالمگیر مصائب و نوائب کا بنیادی سبب قرار دے رہی ہے لیکن دیکھئے کہ تاریخ انسانیت میں سب سے پہلے اس مردود نظام کے خلاف کس نے صدائے احتجاج بلند کی۔ وہ کون تھا جس نے احتکار و اکتناز کو بہت بڑا جرم قرار دیا، زمین پر انفرادی ملکیت کو ناجائز ٹھہرایا، دولت کو اُمراء کے طبقہ میں گردش کرتے رہنے سے روکا اور انسان کی جائز ضروریات کے بعد جو کچھ باقی بچے اسے نظامِ اجتماعیہ کی امانت قرار دیا اور اس نظام کو تمام انسانوں کی بنیادی ضروریات بہم پہنچانے کا ذمّہ دار ٹھہرایا۔

آج دنیا میں قیامِ امن کا واحد ذریعہ یہی سوچا جا رہا ہے کہ کوئی ایسی جماعت موجود ہونی چاہیئے۔ جو اقوامِ عالم کے متنازعہ فیہ معاملات میں حکم کا کام دے اور جس کے فیصلوں سے سرتابی کی مجال کسی کو نہ ہو لیکن تاریخ انسانی سے پوچھئے کہ وہ کون تھا جس نے سب سے پہلے یہ تخیل دنیا کو دیا اور ایک "امتِ وسطیٰ" کو نوعِ انسانی کیلیے امن و مسرّت کا ضامن ٹھہرایا۔

آج استقرائی علم کو نوعِ انسانی کے لیے احسانِ عظیم تصور کیا جاتا ہے کیونکہ سائنس کے یہ تمام انکشافات و اختراعات اور علومِ انسان کے دیگر شعبوں میں سب فروغ و ارتقاع اسی کا رہینِ کرم ہے لیکن پوچھئے اربابِ علم و فن سے کہ ذہنِ انسانی کو سب سے پہلے استقرائی علم سے کس نے روشناس کرایا اور کس نے اسے عملاً رائج کیا؟

عائلی زندگی میں آج طبقۂ نسواں کے حقوق و واجبات پر اس قدر زور دیا جا رہا ہے۔ لیکن سوچئے کہ وہ کون تھا جس نے سب سے پہلے ان کے حقوق و واجبات کی طرف دنیا کو متوجہ کیا اور انہیں صفِ زندگی میں مرد کے دوش بدوش لا کھڑا کیا لیکن اس کے ساتھ ہی ان ہر دو اصناف کے فطری وظائفِ حیات کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیا۔

آپ ان سوالات کو ایک ایک کر کے سامنے لاتے جائیے اور پھر عقیدت مندانہ نگاہ سے نہیں بلکہ غیر جانبدارانہ انداز سے خالی الذہن ہو کر تاریخ کا مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ انسان کی داخلی اور خارجی دنیا میں جس قدر ایسے انقلابات آئے ہیں جن کے نتائج تعمیرِ انسانیت کے لیے ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں کیا

ان کا سرچشمہ وہی تعلیم نہیں جو مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہ نے تیرہ سو سال پہلے دنیا کو دی تھی اور جو آج تک دنیا میں محفوظ چلی آرہی ہے! یہ ایک خالص علمی سوال ہے علمی انداز سے اس کا جواب مرتب کیجئے اور پھر دیکھئے کہ آپ کس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ آپ جب اس نگاہ سے رسالتِ محمدیہ کا مطالعہ کریں گے تو آپ پر یہ حقیقت بے نقاب ہوجائے گی کہ یہ رسالت نوعِ انسانی کی تاریخ میں ایک حدِ فاصل ہے جو اپنے سے پہلے اور بعد کے زمانہ میں نمایاں امتیاز قائم کرنے کے لیے کھڑی ہے۔ اس رسالت سے نوعِ انسانی کو ایک نیا پیغام ملا جس نے شرفِ انسانیت کی تمام راہوں کو ایک ایک کر کے کھول دیا۔ اور جس کی کیفیت یہ ہے کہ

حدِ فاصل

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اُوست عصرہا پیچیدہ در آناتِ اُوست
بندۂ مومن زِ آیاتِ خداست ہر جہاں اندر برِ اُو چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش! می دہد قرآں جہانے دیگرش

اب دنیا کو نہ کسی نئے آئین کی ضرورت ہے نہ کسی دوسرے آئین لانے والے (رسول) کی حاجت۔ نوعِ انسانی کی تمام مشکلات کا حل اسی آئین کے اتباع میں ہے کہ سفرِ زندگی میں یہ آئین اس راہ کی طرف راہ نمائی کرتا ہے جو سب سے سیدھی اور محکم راہ ہے۔ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ ۔ ۹/۱۷

گوئٹے کے الفاظ میں:

> اسلام کی تعلیم کسی مقام پر بھی ناکام ثابت نہیں ہوسکتی۔ ہم اپنے تمام نظامہائے تمدن کے باوجود اس کی حدود سے آگے نہیں جاسکتے اور حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی انسان بھی اس سے آگے نہیں جاسکتا۔

(GOETHE TO ECKERMANN)

اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ

جس ذاتِ گرامی کی سیرتِ طیبہ کو صفحۂ قرطاس پر پیش کرنے کے لیے ہم نے قلم اٹھایا تھا، اس کی عظمتِ سیرت و رفعتِ کردار کی شہادت آپ نے (اپنوں سے نہیں بلکہ) غیروں کی زبان سے سن لیں۔ اور ان شہادات سے زیادہ قابلِ اعتماد کون سی ہو سکتی ہیں جنہیں خود غیر پیش کریں۔ ان شہادات کی روشنی میں آپ تاریخِ انسانیت پر غور کریں اور دیکھیں کہ کیا یہاں سے وہاں تک آپ کو کوئی اور شخصیت ایسی نظر آتی ہے جو بیک وقت ان تمام صلاحیتوں کی حامل، ان خوبیوں کی مظہر اور ان عظمتوں کی پیکر ہو جو اس ذاتِ گرامیؐ میں جھلمل جھلمل کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ پھر، یہ عظمتیں اور صلاحیتیں زندگی کے کسی ایک شعبہ میں جلوہ بار نہیں، ہر گوشۂ حیات کو "دامانِ باغبان و کفِ گل فروش" بنا رہی ہیں — ایک یکہ و تنہا، بے یار و مددگار، داعیٔ حق سے لے کر اتنی وسیع و عریض مملکت کی سربراہی تک، زندگی کی کون سی روش ہے جو آپ کے حسنِ سیرت سے آئینہ پوش وضیا بار نہیں۔ ہم بربنائے عقیدت ایسا نہیں سمجھتے، تاریخی نوشتے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ

حسنِ یوسفؑ ، دمِ عیسیٰؑ ، یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

لیکن ان تمام عظمتوں اور رفعتوں سے بڑھ کر جو ہمارے لیے اس وقت تک وجۂ فروغِ دیدہ و باعثِ نشاطِ روح ہوئی ہیں، ایک عظمت اور بھی ہے جس کا تذکرہ ابھی تک سامنے نہیں آیا۔

آپ دنیا کے کسی زعیم انسان کو دیکھئے، زندگی کے جس گوشے میں وہ شہرت یاب ہو گا (کم از کم) اس

میں وہ اپنے آپ کو دوسرے انسانوں سے بڑا سمجھے گا لیکن اس ذاتِ گرامیؐ کی کیفیت یہ ہے کہ دُنیا بھر کی عظمتوں اور رفعتوں کے مقامِ بلند پر فائز ہونے کے باوجود یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ

اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۱۸/۱۱۰

"میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں"۔ مجھے خدا کی طرف سے حقیقت کا علم ملتا ہے (یُوْحٰٓى اِلَیَّ) تو وہ خالصتہً موہبتِ خداوندی ہے جس میں میری فکر و کاوش اور سعی و ہُنر کا کوئی دخل نہیں جب میں اس وحی کے علم کو (قرآنِ کریم کی شکل میں) تم تک پہنچا دیتا ہوں تو پھر میں اور تم، سب انسان، ایک سطحِ بشریت پر آجاتے ہیں۔ پھر میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوتا ہوں۔ میں اگر تم سے کہتا ہوں کہ تم وحی کی بیان کردہ صداقتوں پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان لاؤ، تو میں خود سب سے پہلے ان پر ایمان لاتا ہوں (اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ۔ ۲/۲۸۵)۔ میں اگر تم سے کہتا ہوں کہ تم ان قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرو، تو میں خود سب سے پہلے ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔ (۶/۱۶۴) میں تمہیں ان قوانین کی خلاف ورزی کے تباہ کُن فطری نتائج سے آگاہ کرتا ہوں تو اس سے اپنے آپ کو بھی مستثنیٰ قرار نہیں دیتا۔

اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝ (۶/۱۵)

اگر میں اپنے ربّ کے قوانین کی خلاف ورزی کروں تو میں بھی اس کے الم انگیز نتائج و عواقب سے ڈرتا ہوں۔

میں بھی اُن سے نہیں بچ سکتا کہ ——— اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ——— میں بھی تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔

ذہنِ انسانی کا عہدِ طفولیّت

ذہنِ انسانی اپنے عہدِ طفولیّت میں ہر غیر عادی واقعہ یا غیر معمولی چیز سے بے حد متاثر ہوتا تھا۔ بہت اونچا پہاڑ، بہت چوڑا دریا، کوئی بہت بڑا درخت، سب اس کے نزدیک فوق الفطرت کیفیات کے حامل تھے۔ خاموش فضاؤں میں گرج، سیاہ بادلوں میں چمک، ہوا سے پانی کا نزول، سب عجائب و غرائب کے مظاہر تھے۔ جب اس نے دو پتھروں کی رگڑ سے پہلے پہل آگ پیدا ہوتے دیکھی تو فرطِ حیرت سے سجدہ ریز ہو گیا کہ اس کی کرشمہ زائیاں اس کی سمجھ سے باہر تھیں۔ اپنے سے بڑی قوت والا انسان اس کے نزدیک انسان نہیں، دیوتا تھا۔ اپنے سے زیادہ سمجھ والا، اس کے ذہن میں بشر نہیں، خُدا کا اوتار تھا۔ اگر کوئی دو چار بوٹیوں کے خواص معلوم کر کے تپ اُتار دیتا یا

درد دور کر دیتا تو اس کی پرستش شروع ہو جاتی۔ اور اگر کوئی اپنی قوتِ ارادی کے ارتکاز (CONCENTRATION) سے ہسٹریا کے جنونی دوروں کا دفعیہ کر دیتا تو پھر اس کی خدائی کا تو پوچھنا ہی کیا؟ قدیم مصری اور یونانی اصنامی افسانے اور چین و ہندوستان کے دیوی دیوتا اور اوتار، سب اسی زمانہ کی ذہنی کیفیات کی تخلیق ہیں۔ اس زمانہ کے عرب اس سے مستثنیٰ نہیں تھے، بلکہ وہ تو اور بھی زیادہ توہم پرست تھے۔ اس لیے یہ بات ان کے نزدیک قابلِ پذیرائی ہی نہیں تھی کہ ایک شخص کا دعویٰ یہ ہو کہ اُسے خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے، اس پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور پھر وہ عام انسانوں جیسا ایک انسان ہو اور یہی چیز اُن کے لیے، اس مدعیٔ نبوت کے دعوے کو صحیح ماننے کے راستے میں حائل ہوتی تھی۔ وہ کہتے کہ اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا (۶۴/۶) کیا ہمارے ہی جیسا ایک انسان ہمارا راہ نما بننے کا دعویٰ کرتا ہے؟ اس کا یہ دعویٰ کس طرح قابلِ قبول ہو سکتا ہے؟ وہ اس کے دعوے پر غور و خوض کرنے کے لیے خفیہ مشورے کرتے (وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۝ ۲۱/۳) اور پھر یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوتے کہ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ (۲۱/۳) یہ تو تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہے اس لیے یہ خدا کا فرستادہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ لوگوں سے کہتے کہ تم دیکھتے نہیں کہ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ۝ (۲۳/۳۳) یہ تمہاری ہی طرح کھاتا پیتا ہے۔ پھر یہ خدا کا رسول کس طرح ہو سکتا ہے۔ ہماری طرح کھاتا پیتا ہی نہیں بلکہ۔ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۝ (۲۵/۷) یہ عام انسانوں کی طرح بازاروں میں لگا پھرتا ہے۔ ہماری ہی طرح اس کے بیوی بچے بھی ہیں (۱۳/۳۸)۔ غرضیکہ اس میں کوئی بات بھی تو فوق الفطرت نہیں۔ پھر ہم اس کے اس دعویٰ کو کس طرح تسلیم کر لیں۔ وہ یہی اعتراض خود اس کے سامنے پیش کرتے وہ اسے نہایت خاموشی سے سنتا اور پھر واضح الفاظ میں ان سے کہتا کہ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ (۱۷/۹۳)، ہاں! ٹھیک ہے کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی خدا کا رسول بھی ہوں۔ میرا دعویٰ اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اب رہا یہ کہ جو کچھ میں کہتا ہوں، اس کی صداقت کی دلیل کیا ہے، تو یہ بات بالکل صاف اور واضح ہے۔ تم اس پر عقل و بینش اور علم و بصیرت کی رُو سے غور کرو اور پھر دیکھو کہ تم کس نتیجے پر پہنچتے ہو؟

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ[1] ۭ
وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (۱۲/۱۰۸)

---

[1] اس آیت میں ’مَنِ اتَّبَعَنِيْ‘ کا ٹکڑا قابلِ غور ہے۔ یعنی خود رسول اللہؐ نے بھی اس دعوت کو علم و بصیرت کی رُو سے پیش کیا اور حضورؐ کے بعد آپ کی اُمت بھی اسے علم و بینش کی روشنی میں آگے چلائے گی، عجائبات و کرامات کی رُو سے نہیں۔

اے رسولؐ! تم کہہ دو کہ میری راہ تو یہ ہے کہ میں اللہ کی طرف علیٰ وجہ البصیرت بلاتا ہوں اور (اس راہ میں) جن لوگوں نے میرے پیچھے قدم اُٹھایا ہے وہ بھی (اسی طرح) بلائیں گے۔ اللہ اس سے بلند ہے کہ اس کی طرف دعوت جہالت اور توہمات کی بنا پر دی جائے۔ میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

آپؐ نے کہہ دیا کہ میں خدا کی طرف سے ایک کھلی ہوئی دلیل (یعنی قرآن) لایا ہوں اور تم اس کی تکذیب کرتے ہو۔

قُلْ اِنِّىْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّىْ وَ كَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ (۶/۵۷)

اے رسولؐ! تم کہو کہ بلاشبہ میں اپنے پروردگار کی طرف سے واضح راستے پر ہوں (یعنی اُس نے حقیقت و یقین کی راہ ہمیں دکھا دی ہے) اور تم اسے جھٹلاتے ہو۔

تم اس کی تکذیب کرتے ہو تو اس کے لیے کوئی دلیل لاؤ۔

هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (۲/۱۱۱ نیز ۲۱/۲۴، ۲۷/۶۴)

اگر تم (اپنے انکار میں) سچے ہو تو اس کے لیے اپنی دلیل پیش کرو۔

اس لیے کہ میں جو کچھ پیش کر رہا ہوں وہ خود ایک بُرہان (دلیل) ہے۔ دلیل کے مقابلہ میں دلیل آنی چاہیئے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ۝ (۴/۱۷۴)

اے افرادِ نسلِ انسانی! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے بُرہان (یعنی دلیل و حجت) آ گئی اور ہم نے تمہاری طرف واضح و آشکار روشنی بھیج دی۔

یہی تقاضائے علم ہے۔ اس لیے اگر تمہارے پاس علم ہے تو اسے پیش کرو۔ یونہی ظن و قیاس سے تو علمی حقائق کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ۝ (۶/۱۴۹)

اے رسولؐ! تم ان لوگوں سے کہو کہ کیا تمہارے پاس (اس بارے میں) کوئی علم و یقین ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکتے ہو؟ (اگر ہے تو پیش کرو) اصل یہ ہے کہ محض وہم و گمان کے پیچھے لگ رہے ہو اور یونہی بے سمجھے بُوجھے باتیں بناتے ہو۔

میرا پیش کردہ پیغامِ خدا کی طرف سے ایک دلیلِ قاطع اور حُجّتِ بالغہ ہے۔ تمہارے پاس اپنے دعوے کی

صداقت کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ (۲۳/۱۱۷)

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ (۶/۱۵۰)

تم کہہ دو کہ اللہ ہی کے لیے کامل اور پکّی دلیل ہے (جو اس نے سمجھ بوجھ رکھنے والوں پر واضح کر دی ہے)۔

اس لیے تمہارا انجام ہلاکت وتباہی ہے کہ جو قوم اپنا مسلکِ حیات، ظن وتخمین اور جہالت وتقلید کی بنیادوں پر رکھتی ہے، اور علم وبرہان کی روشنی میں راستہ کی خطرناک گھاٹیوں سے آگاہ ہونا نہیں چاہتی، وہ کبھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔ اب وہ زمانہ آچکا ہے کہ جسے زندہ رہنا ہوگا، دلیل وبرہان کی بنا پر زندہ رہ سکے گا اور جسے تباہ ہونا ہوگا وہ بھی دلیل وحجت کی بنا پر تباہ ہوگا۔

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ۗ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ (۸/۴۲)

جسے ہلاک ہونا ہے دلیل وبرہان کی رُو سے ہلاک ہو، اور جو زندہ رہنے والا ہے، دلیل وبرہان کی رُو سے زندہ رہے، اور بلاشبہ اللہ سب کی سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔

اس لیے کہ اندھا اور بہرہ اور سمیع وبصیر برابر نہیں ہو سکتے۔

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ۭ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۧ (۱۱/۲۴)

ان دو فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا بہرہ اور ایک دیکھنے سننے والا۔ پھر بتلاؤ کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور وفکر نہیں کرتے؟

عقل وبصیرت سے کام نہ لینے والوں کا انجام ہلاکت ہے۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ښ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝ (۷/۱۷۹)

اور کتنے ہی وحشی اور مہذب انسان ہیں جن کا بالآخر ٹھکانا جہنم ہے۔ اس لیے کہ ان کے پاس عقل ہے مگر اُس سے سمجھ بوجھ کا کام نہیں لیتے، آنکھیں ہیں مگر اُن سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے، کان ہیں مگر ان

سے سُننے کا کام نہیں لیتے۔ وہ (عقل و حواس کا استعمال کھو کر) جانوروں کی طرح ہو گئے ہیں، بلکہ اُن سے بھی زیادہ کھوئے ہوئے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو یک قلم غفلت میں ڈوب گئے ہیں۔

معجزہ طلبی مخالفین کہتے کہ اگر آپ خدا کی طرف سے رسُول ہیں تو کوئی معجزہ دکھائیے، اس کے بغیر ہم کیسے مان لیں کہ آپ مامور من اللہ ہیں۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ڮ (۱۳/۲۷)

یہ انکار کرنے والے کہتے ہیں کہ ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس شخص پر اس کے پروردگار کی طرف سے کوئی (عجیب و غریب) نشانی اُترتی؟ اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ عجیب و غریب نشانیاں (معجزات) دکھا کر، حقیقت کو منوانے کا سوال ہی نہیں۔ اس کے لیے خدا کا قانون یہ ہے کہ جو شخص عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتا، اسے صحیح راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ جو علم و بصیرت کی رُو سے اُس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس کے سامنے راستہ نکھر کر آجاتا ہے۔

سورہ بنی اسرائیل میں اُن کے مطالبات کی وضاحت ان الفاظ میں آئی ہے۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۙ ....

...... قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۧ (۱۷/۹۰-۹۳)

اور یہ کہتے ہیں کہ ہم تو اُس وقت تک تجھے ماننے والے نہیں جب تک کہ تو اِس قسم کی باتیں کر کے نہ دکھا دے۔ (مثلاً) ایسا ہو کہ تو حکم کرے تو زمین سے ایک چشمہ پھُوٹ نکلے۔ یا تیرے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو اور اس کے درمیان بہت سی نہریں رواں کر کے دکھا دے۔ یا جیسا کہ تو کہتا ہے (کہ ہم پر تباہی آئے گی تو اس کے لیے) آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہم پر آگرے۔ یا اللہ اور اس کے فرشتے ہمارے سامنے آکھڑے ہوں۔ یا ہم دیکھیں کہ سونے کا ایک محل تیرے لیے مہیّا ہو گیا ہے۔ ایسا ہو کہ تو آسمان پر چڑھ جائے اور اگر تو آسمان پر چڑھ بھی گیا تو ہم یہ بات ماننے والے نہیں جب تک تو ایک (لکھی لکھائی) کتاب ہم پر نہ اُتار لائے اور ہم خود پڑھ کر اُسے جانچ نہ لیں۔ (اے رسولؐ!) ان لوگوں سے کہہ دے ”سبحان اللہ! (میں نے کچھ خدائی کا دعویٰ تو کیا نہیں)، میں اس کے سوا کیا ہوں کہ ایک انسان ہوں جو تم تک حق کی بات پہنچاتا ہوں۔

قرآنِ کریم میں اس قسم کی متعدد آیات ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ وہ لوگ بار بار معجزات کے لیے تقاضے کرتے تھے اور خدا کی طرف سے ہر بار اس کا انکار ہوتا تھا اور نہایت شدت سے انکار۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خدا کی طرف سے علم و حقائق عطا کیے جانے کے لیے (وحی کا) فوق الفطرت طریق اختیار کیا گیا تو پھر اس وحی کو منوانے کے لیے کوئی خارقِ عادت اعجوبہ کیوں نہ دکھایا گیا، بالخصوص جب مخالفین کی طرف سے اس کے لیے اس قدر تقاضا کیا جاتا تھا۔ یہ سوال غور طلب ہے اور اس کا جواب حقیقت کشا۔

انسانوں کی راہ نمائی کے لیے وحی کا طریق اسی لیے اختیار کیا گیا کہ ابدی حقائق اور مستقل اقدار کا تخلیق یا دریافت کر لینا عقلِ انسانی کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ اس کے دائرۂ عمل سے باہر کی چیز ہے (وحی کی کنہ وحقیقت اور عقلِ انسانی کے دائرۂ عمل و حیطۂ ممکنات کے متعلق تفصیلی گفتگو کرنے کا یہ مقام نہیں۔ اس لیے ہم یہاں انہی اشارات پر اکتفا کرتے ہیں)۔ ان حقائق کو رسول پر منکشف کر کے اس سے کہہ دیا کہ انہیں لوگوں کے سامنے پیش کر دو اور ان سے کہہ دو کہ تم عقل و فکر کی رُو سے ان پر غور کرو۔ اس کے بعد اگر تم اس نتیجہ پر پہنچو کہ یہ واقعی صداقت پر مبنی ہیں تو انہیں بطیبِ خاطر، اپنی زندگی کا ضابطہ بنالو۔

آپ نظامِ کائنات پر غور کریں۔ اللہ تعالیٰ نے تمام اشیائے کائنات کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ وہ ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں جو ان کے لیے خدا کی طرف سے وضع کیے گئے ہیں لیکن انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ اگر انسان کے اس اختیار کو کسی طرح بھی سلب کر لیا جائے تو یہ اپنی بات کو بہ جبر و اکراہ منوانے کے مرادف ہوگا جس کی دین میں قطعاً اجازت نہیں (لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۲/۲۵۶ قرآن کا واضح ارشاد ہے)۔ اکراہ کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک اکراہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کے سر پر تلوار لے کر کھڑا ہو جائے اور اس سے زبردستی اپنی بات منوالے لیکن اس سے کہیں زیادہ اکراہ کی شکل یہ ہے کہ انسان کی (مثلاً نشہ پلا کر اس کی) قوتِ ارادی کو ماؤف کر دیا جائے اور اس طرح اس سے کوئی بات منوا لی جائے۔ انسانی عقل و فکر کو ماؤف کرنے کی ایک صورت اور بھی ہے۔ (مثلاً) ایک شخص آپ سے کوئی بات منوانا چاہتا ہے اور آپ اسے نہیں مانتے۔ اس پر وہ سُرخ آنکھیں نکال کر گرجتا ہے اور اپنے بالوں کو نچوڑتا ہے تو ان میں سے دودھ کے قطرے ٹپکنے لگ جاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر آپ پر رعشہ طاری ہو جاتا ہے۔ آپ کے ہوش و حواس گم ہو جاتے ہیں۔ اس حالت میں وہ آپ سے کہتا ہے کہ بتاؤ! میری بات مانتے ہو یا نہیں۔ اور آپ ہاں کہنے پر

مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ عقل و فکر کو ماؤف کر کے بات منوانے کا ایسا طریق ہے جس کے مظاہرے ہمارے سامنے آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس طرح اپنی بات منوانا نہیں چاہتا۔ وہ انسانی عقل و فکر کو ماؤف کر کے اور اس طرح اس کا اختیار و ارادہ سلب کر کے، اس کا سر اپنے سامنے جھکانا نہیں چاہتا۔ وہ کہتا ہے کہ نظامِ کائنات غیر متبدل قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہے۔ انسانی زندگی کے لیے بھی کچھ قوانین مقرر ہیں جو رسول نے تمہارے سامنے پیش کر دیئے ہیں۔ اگر تم ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرو گے تو تمہیں خوشحالیاں اور سرفرازیاں نصیب ہوں گی۔ اگر ان کی خلاف ورزی کرو گے تو نقصان اٹھاؤ گے۔ اب یہ تمہاری اپنی مرضی ہے کہ تم ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہو یا ان کے خلاف جانا چاہتے ہو۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ..... (۱۸/۲۹)

ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے سامنے آگیا۔ اب جس کا جی چاہے اسے تسلیم کرے جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔

اس میں جبر و اکراہ کا سوال ہی نہیں۔ اگر لوگوں کو زبردستی ایک راہ پر چلانا مقصود ہوتا تو ہمارے لیے یہ کیا مشکل تھا کہ ہم انسانوں کو بھی (دیگر اشیائے کائنات کی طرح) اس طرح پیدا کر دیتے کہ وہ سر جھکائے مجبوراً ایک ہی راہ پر چلے جاتے۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَن فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا ۚ أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ○ (۱۰/۹۹)

اور (رسولؐ!) اگر تیرا پروردگار چاہتا تو انسانوں کو پیدا ہی اس طرح کر دیتا کہ یہ سب کے سب ایمان لے آتے (اور دنیا میں کفر اور شرک باقی ہی نہ رہتا۔ لیکن اللہ نے ایسا نہیں چاہا۔ اس کی مشیت یہی ہوئی کہ لوگ اپنے اختیار و ارادہ سے راستہ اختیار کریں)، تو کیا تو اُن پر جبر کرے گا کہ جب تک ایمان نہ لائیں چھوڑنے والا نہیں۔

لہٰذا اس قرآن سے دلوں کے بدلنے کا کام لیا جائے گا، پتھروں کے تیرانے اور پہاڑوں کے چلانے کا کام نہیں کہ جس سے ذہن مفلوج ہو جائیں تو ہو جائیں، دل اپنی جگہ سے نہ ہلیں۔

وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ أَوْ كُلِّمَ

بِهِ الْمَوْتٰى ؕ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ (۱۳/۳۱)

اور (دیکھو) اگر ایسا ہو سکتا کہ کسی قرآن سے پہاڑ چلنے لگتے یا زمین کی (بڑی بڑی) مسافتیں طے ہو جاتیں یا مُردے بول اُٹھتے (تو ضرور اس قرآن سے بھی ایسا ہی ہوتا) مگر نہیں (خدا کی یہ سنّت نہیں کہ وہ ایسا کرے، وہ قوانین ہدایت کے لیے نازل کرتا ہے نہ کہ عجائب آفرینیوں کے لیے) پھر جو لوگ ایمان لائے ہیں کیا انہیں یہ بات معلوم نہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو تمام انسانوں کو (ایک ہی) راہ پر چلاتا۔ مگر اس نے ایسا نہیں چاہا۔ اس کی حکمت کا فیصلہ یہی ہوا کہ انسان جو راستہ چاہے اپنے اختیار و ارادہ سے اختیار کرے۔ اس پر کسی قسم کی زبردستی نہ ہو۔

لہٰذا ان سے کہئے کہ کسی خلافِ عادت واقعہ سے حقیقت تک نہیں پہنچا جاتا۔ اس سے ذہن مفلوج ہو جاتا ہے۔ حقیقت تک پہنچنے کا طریق یہ ہے کہ جو واقعات تمہاری آنکھوں کے سامنے گزرتے ہیں اور تم ان سے خوگر ہونے کی وجہ سے ان پر غور نہیں کرتے اور انہیں معمولی سمجھ لیتے ہو، انہیں دل اور دماغ کی آنکھوں سے دیکھو، ان میں غور و فکر کرو۔ تمہیں کائنات کے ایک ایک ذرّے میں آیت (خدا کی نشانی) نظر آئے گی جو ان معجزات سے کہیں بڑی ہو گی جن کا تم مطالبہ کرتے ہو۔ ذرا اپنے گرد و پیش نظر ڈالو اور سوچو کہ کائنات کے اس محیر العقول سلسلہ میں عقل و فکر والوں کے لیے کس قدر معجزات بکھرے پڑے ہیں۔

کائنات کے معجزات کو کیوں نہیں دیکھتے

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ......

...... لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ (۲/۱۶۴)

بلاشبہ آسمانوں و زمین کے پیدا کرنے میں اور رات دن کے، ایک کے بعد ایک آتے رہنے میں اور کشتی میں جو انسان کی کاربراریوں کے لیے سمندر میں چلتی ہے اور بارش میں جسے اللہ آسمان سے برساتا ہے اور اس (کی آبپاشی) سے زمین مرنے کے بعد پھر جی اٹھتی ہے اور اس بات میں کہ ہر قسم کے جانور زمین کی وسعت میں پھیلے ہوئے ہیں اور ہواؤں کے (مختلف رُخ) پھرنے میں اور بادلوں میں جو آسمان و زمین کے درمیان مسخر ہیں، ان لوگوں کے لیے جو عقل و بینش رکھنے والے ہیں، بڑی ہی نشانیاں ہیں۔

اپنے نخلستانوں کو دیکھو، ان کے چشموں پر غور کرو، پھر زمین سے نظر اٹھا کر ذرا اجرامِ فلکی پر نگاہ ڈالو، تنویرِ شمس و قمر اور تسخیرِ نجوم و کواکب کو بنظرِ تعمق دیکھو اور سوچو کہ ان میں کتنی کتنی بڑی نشانیاں مضمر ہیں۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً لَّكُمْ .... اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۝ (۱۶: ۱۰-۱۳)

خدا وہ ہے جو بادلوں سے پانی برساتا ہے۔ اس میں سے کچھ تو تمہارے پینے کے کام آتا ہے، کچھ زمین کو سیراب کرتا ہے، اس سے درختوں کے جنگل پیدا ہو جاتے ہیں اور تم اپنے مویشی ان میں چراتے ہو۔ اسی پانی سے وہ تمہارے لیے (ہر طرح کے غلہ کی) کھیتیاں بھی پیدا کرتا ہے، نیز زیتون، کھجور، انگور اور ہر طرح کے پھل۔ یقیناً اس بات میں اُن لوگوں کے لیے ایک بڑی نشانی ہے جو غور و فکر کرنے والے ہیں۔ اور دیکھو اس نے تمہارے لیے رات اور دن اور سورج اور چاند مسخر کر دیئے (جو تمہاری کاربراریوں کے لیے کام کر رہے ہیں)، اور اسی طرح ستارے بھی اسی کے حکم سے تمہارے لیے مسخر ہو گئے ہیں۔ یقیناً اس بات میں ان لوگوں کے لیے بڑی ہی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں: اور زمین کی سطح پر طرح طرح کے رنگوں کی پیداوار جو تمہارے لیے پیدا کر دی ہے (اس پر غور و فکر کرو)، بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے ایک نشانی ہے جو سمجھنے سوچنے والے ہیں۔

تم عجائبات و نوادرات کے تقاضے کر رہے ہو۔ ذرا چشمِ بصیرت سے دیکھو کہ تمہارے دائیں، بائیں اور اُوپر نیچے کس قدر نوادرات پھیلے ہوئے ہیں۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاۗءً .... لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ ۝ (۱۰: ۵-۶)

خدا وہ ہے جس نے سورج کو چمکتا ہوا بنایا اور چاند کو روشن اور پھر چاند کی منزلوں کا اندازہ ٹھہرا دیا تاکہ تم برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کر لیا کرو۔ اللہ نے یہ سب کچھ حکمت و مصلحت کے ساتھ بنایا ہے اور اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں، وہ (اپنی قدرت و حکمت کی) دلیلیں کھول کھول کر بیان کر دیتا ہے۔ بلاشبہ اس بات میں کہ رات کے پیچھے دن اور دن کے پیچھے رات آتی ہے اور نیز اُن تمام چیزوں میں جو اللہ نے آسمانوں میں اور زمینوں میں پیدا کی ہیں، اُن لوگوں کے لیے (قدرت و حکمت کی) نشانیاں ہیں جو قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں۔

تم ان اجرامِ فلکی پر غور نہیں کرتے کہ کتنے کتنے بڑے عظیم الجثّہ اور ثقیل الہیئت کرّے ہیں جو بغیر کسی سہارے

اور آسرے کے فضا کی پہنائیوں میں اپنی اپنی جولانگاہ (فلک) میں تیر رہے ہیں۔ کیا ان سے بڑھ کر کوئی اور معجزہ بھی ہوسکتا ہے؟

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ...... اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝ (۱۳/۲-۴)

یہ اللہ ہی ہے جس نے اجرامِ فلکی کو بلند کر دیا اور تم دیکھ رہے ہو کہ کوئی ستون انہیں تھامے ہوئے نہیں ہے اور ساری کائنات کا مرکزی کنٹرول اسی کے ہاتھ میں ہے اور سورج اور چاند کو کام پر لگا دیا کہ ہر ایک اپنی ٹھہرائی ہوئی میعاد تک (اپنی اپنی راہ) چلا جا رہا ہے۔ وہی (اس تمام کارخانۂ خلقت کا) انتظام کر رہا ہے اور (اپنی قدرت و حکمت کی) نشانیاں الگ الگ کر کے بیان کر دیتا ہے تاکہ تمہیں اس کے قانونِ مکافاتِ عمل کا یقین ہو جائے اور دیکھو وہی ہے جس نے زمین کی سطح پھیلا دی، اس میں پہاڑ بنا دیئے، نہریں جاری کر دیں اور ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے دو دو قسموں کے اگا دیئے۔ اس نے رات اور دن کے بتدریج ظاہر ہونے کا ایسا قاعدہ بنا دیا کہ دن کی روشنی کو رات کی تاریکی ڈھانپ لیا کرتی ہے۔ یقیناً اس بات میں ان لوگوں کے لیے کتنی ہی نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرنے والے ہیں۔ اور دیکھو، زمین میں طرح طرح کے قطعات ہیں ایک دوسرے سے ملے ہوئے۔ ان میں انگور کے باغ ہیں، غلّہ کی کھیتیاں ہیں، کھجور کے درخت ہیں، باہمدگر ملتے جلتے ہوئے اور بعض ایسے کہ ملتے جلتے نہیں ہیں سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں مگر ہم بعض پھلوں کو بعض پر برتری دیتے ہیں۔ یقیناً اس بات میں ان لوگوں کے لیے بڑی ہی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

اگر طائرِ نگاہ کو فضا کی بسیط پہنائیوں میں اِذنِ بال کشائی نہیں دینا چاہتے تو اپنے مویشیوں پر اور ان کی چراگاہوں پر ہی غور کرو۔ کیا یہ ندرت و غرابت کی علامات (نشانیاں) نہیں ہیں۔

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا .... اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰى ۝ (۲۰/۵۳-۵۴)

وہ پروردگار جس نے تمہارے لیے زمین بچھونے کی طرح بچھا دی، نقل و حرکت کے لیے اس میں راہیں نکال دیں، آسمان سے پانی برسایا، اس کی آبپاشی سے ہر طرح کی نباتات کے جوڑے پیدا

کر دیئے کہ خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشی بھی چراؤ۔ اس بات میں عقل والوں کے لیے کیسی کھلی نشانیاں ہیں!
اور اگر اتنی بھی تکلیف گوارا نہیں کرنا چاہتے تو اپنی اپنی خلوت گاہوں میں بیٹھے خود اپنے آپ پر غور کرو کیا تمہارا وجود، اس کی تخلیق اور اس کا نظام کچھ کم معجزہ ہے؟

وَمِنۡ اٰیٰتِہٖۤ اَنۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنۡتُمۡ بَشَرٌ تَنۡتَشِرُوۡنَ ۝ وَمِنۡ اٰیٰتِہٖۤ اَنۡ خَلَقَ لَکُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ اَزۡوَاجًا لِّتَسۡکُنُوۡۤا اِلَیۡہَا وَجَعَلَ بَیۡنَکُمۡ مَّوَدَّۃً وَّرَحۡمَۃً ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ۝ (۳۰/۲۰-۲۱)

اور اُس کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے ایک (نشانی) یہ ہے کہ تمہاری تخلیق کی ابتدا مٹی سے کی۔ تم (اس قابل ہو گئے کہ) آدمی بن کر چلتے پھرتے (نظر آتے) ہو۔ اور اُسی کی نشانیوں میں ایک یہ ہے کہ اُس نے تمہارے (فائدہ کے) لیے تمہاری ہی جنس میں سے تمہارے جوڑے بنائے تاکہ تم اُن سے آرام پاؤ اور تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی پیدا کر دی گئی۔ اس بات میں اُن لوگوں کے لیے (بڑی بڑی) نشانیاں ہیں جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔

غرضیکہ کون کون سی چیز گنائی جائے۔ اس حیرت کدۂ ارض و سماوات میں تو جس گوشے پر نگاہ ڈالو

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

ان آیاتِ الٰہیہ[1]، ان معجزاتِ خداوندی سے تم آنکھیں بند کر کے گزر جاتے ہو اور ان سے کہیں کمتر درجے کے معجزات کی فرمائش کرتے ہو!

وَکَاَیِّنۡ مِّنۡ اٰیَۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ یَمُرُّوۡنَ عَلَیۡہَا وَہُمۡ عَنۡہَا مُعۡرِضُوۡنَ ۝ (۱۲/۱۰۵)

اور (دیکھو) آسمان و زمین میں (اللہ کی قدرت و حکمت کی) کتنی ہی نشانیاں ہیں، جن پر سے لوگ (آنکھیں بند کر کے) گزر جاتے ہیں اور نظر اٹھا کر دیکھتے بھی نہیں۔

بصیرت کی آنکھیں کھولو تو یہاں ہر "معمولی" چیز "غیر معمولی" اور ہر "عادی" واقعہ "غیر عادی" دکھائی دے گا۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا ۔۔۔ یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

---

[1] آیاتِ الٰہیہ کے متعلق قرآن کریم کی مختلف آیات کا استقصاء مقصود نہیں۔ اس مقام پر صرف دو چار آیات لکھ دی گئی ہیں۔

یہ ہیں وہ آیات (معجزات) جن پر غور و فکر سے انسان پر انکشافِ حقیقت ہوگا اور جوں جوں اس کے سامنے حقیقت بے نقاب ہوتی جائے گی وہ علیٰ وجہ البصیرت دیکھ لے گا کہ قرآن کا ایک ایک لفظ صداقت پر مبنی ہے۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝ (۴۱/۵۳)

ہم عنقریب اپنی (قدرت کی) نشانیاں ان کو آفاق میں (پھیلی ہوئی) بھی دکھائیں گے اور خود اُن کی ذات میں بھی، تا آنکہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ (قرآن) حق ہے۔ کیا تیرے پروردگار کی یہ بات (اس امر کی صداقت کی شہادت کے لیے) کافی نہیں کہ وہ ہر چیز کا شاہد ہے۔

عالمِ انفس و آفاق کی یہ آیات، قوانینِ خداوندی پر یقین رکھنے سے بے حجاب سامنے آئیں گی۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۝ وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝ (۵۱/۲۰-۲۱)

اور یقین رکھنے والوں کے لیے زمین (کی کائنات) میں بہت سی نشانیاں موجود ہیں اور خود تمہاری اپنی ذات میں۔ کیا تم کو پھر بھی بصیرت حاصل نہیں ہوتی؟

اور اگر انفس و آفاق کی ان آیات کی زبان ابھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتی تو کم از کم ان اقوامِ گزشتہ و مللِ سابقہ کے احوال و کوائف پر نگاہ ڈالو، جن کی داستانیں، ہر رات سونے سے پہلے، تمہیں خیموں سے نکال کر الاؤ کے گرد جمع کر لیتی ہیں۔ کیا ان کے انجام و عواقب تمہارے لیے اس دعوت کی صداقت کی نشانیاں نہیں ہیں؟

أَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّنَ الْقُرُونِ يَمْشُونَ فِي مَسَاكِنِهِمْ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّأُولِي النُّهَىٰ ۝ (۲۰/۱۲۸)

کیا ان لوگوں کو اس بات سے بھی ہدایت نہ ملی کہ ان سے پہلے قوموں کے کتنے ہی دور گزر چکے ہیں جنہیں (ان کے اعمال کے نتیجہ کے طور پر) ہلاک کر چکے؟ یہ ان کی بستیوں میں چلتے پھرتے ہیں (اُن کے کھنڈرات اُن کی نگاہوں کے سامنے ہیں!) جو لوگ دانش مند ہیں ان کے لیے اسی ایک بات

میں (تذکیر و عبرت) کی کتنی نشانیاں ہیں؟

اقوامِ سابقہ کے احوال و کوائف

وہ قومیں جن کی اُجڑی ہوئی بستیوں اور ویران کاشانوں سے تم صبح و شام گزرتے ہو لیکن ان ٹھیکریوں کو بنظرِ عمیق نہیں دیکھتے جن پر اُن کی مٹی ہوئی عظمتوں اور مٹی ہوئی سلطنتوں کی یادداشتیں لکھی ہوئی ہیں۔

فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ .... وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ○ (۲۲/۴۵-۴۶)

پھر دیکھو، کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ہم نے انہیں ہلاک کر دیا اور وہ ظلم کرنے والی تھیں۔ وہ ایسی اُجڑیں کہ اپنی چھتوں پر گر کر رہ گئیں۔ کنوئیں ناکارہ ہو گئے۔ سربفلک محل کھنڈر بن گئے۔ کیا یہ لوگ ملکوں میں چلے پھرے نہیں کہ عبرت حاصل کرتے؟ ان کے پاس دل ہوتے اور سمجھتے بوجھتے، کان ہوتے اور سنتے اور پاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی اندھے پن میں پڑتا ہے تو وہ آنکھیں اندھی نہیں ہو جایا کرتیں (جو سروں میں ہیں)، دل اندھے ہو جایا کرتے ہیں جو سینوں کے اندر پوشیدہ ہیں۔

غور کرو کہ یہ رسولِ آخر تم سے کہتا کیا ہے؟ یہی نا کہ زندگی کی جن غلط شاہراہوں پر تم چلے جا رہے ہو، تمہیں بربادی اور ہلاکت کے عمیق غاروں کی طرف لیے جا رہی ہیں تم اس بات کا یقین نہیں کرتے۔ یہ کہتا ہے کہ تمہارے ہاتھ میں سنکھیے کی ڈلی ہے، اسے کھاؤ گے تو ہلاک ہو جاؤ گے۔ تم کہتے ہو کہ ہم جب مانیں گے کہ سنکھیا مہلک ہوتا ہے اگر تم اس پتھر کو پانی پر تیرا دو۔ یہ کہتا ہے کہ نادانو! میرے دعوے اور تمہارے مطالبہ میں ربط کیا ہے؟ میرے دعویٰ کی دلیل چاہتے ہو تو ان سامنے کی قبروں کو دیکھو اور ان کے سرہانے گڑھی ہوئی الواح کو پڑھو جن پر لکھا ہے کہ انہوں نے سنکھیا کھایا اور ان کا یہ انجام ہوا۔ یہ ہے میرے دعویٰ کی دلیل، نہ وہ جس کا تم مطالبہ کر رہے ہو۔ یہ فطرت کا اٹل قاعدہ ہے جو نہ پہلوں کی خاطر بدلا نہ تمہاری خاطر بدلے گا۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ○ (۳۳/۶۲)

خدا کا (اٹل) قانون ان لوگوں میں بھی یہی (جاری) رہا جو پہلے گزر چکے ہیں (اور آئندہ بھی اسی طرح رہے گا چنانچہ، تم خدا کے قانون (محکم) میں کسی قسم کی تبدیلی نہ پاؤ گے!

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن نے یہاں کس عظیم حقیقت کی طرف راہ نمائی کی ہے۔ قرآن کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ خدا

نے خارجی کائنات کے لیے قوانینِ فطرت مقرر کر دیئے ہیں جو اٹل ہیں اور ان میں کسی قسم کا تغیّر و تبدل نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس نے انسانوں کی دنیا کے لیے بھی اٹل قوانین مقرر کر دیئے ہیں (جو قرآن کے اندر محفوظ ہیں)۔ جو قوم ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے گی، اسے خوش حالیاں اور سرفرازیاں نصیب ہو جائیں گی۔ جو ان کے خلاف چلے گی، وہ تباہ و برباد ہو جائے گی۔ یہ قانون وہ ہے جسے نہ کبھی پہلے بدلا گیا ہے نہ اب بدلا جائے گا — ہر بات اپنے مقرر کردہ قانون کے مطابق کرنے والا خدا — یہ ہے قرآن کی تعلیم کا اصل الاصول۔

سورۂ حجر میں ہے۔

لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ۝ (۱۵/۷-۸، نیز ۲۵/۲۱، ۱۶/۳۳)

(یہ کہتے ہیں کہ) اگر تو اپنے دعوے میں سچا ہے تو ایسا کیوں نہیں کرتا کہ فرشتے اتار کر ہمیں دکھا دے۔ (ان سے کہہ دو کہ فرشتے بیکار کو نہیں اُتارا کرتا۔ جبھی اتارتا ہے جب فیصلہ کا وقت آتا ہے۔ اور (جب فرشتے اُتریں گے تو اُس وقت انہیں مہلتِ عمل نہیں ملے گی (وہ تو فیصلۂ عمل کا دن ہوگا)۔

قرآنی معجزات

تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآنِ کریم حسّی معجزات کے بجائے کس قسم کی آیات (نشانیاں) غور و فکر کے لیے سامنے لاتا ہے۔ کارلائل کے الفاظ میں،

محمدؐ نے کوئی معجزات نہیں دکھلائے۔ (معجزات کا مطالبہ کرنے والوں کو) وہ بلا توقّف جواب دیتا کہ میں معجزات نہیں دکھا سکتا۔ میں تو صرف ایک مبلّغ ہوں اور میرا فریضہ یہ ہے کہ خدا کی مخلوق تک اس کا پیغام پہنچا دوں۔ اس کے نزدیک یہ کائنات خود ایک عظیم الشّان معجزہ تھی۔ وہ کہتا کہ ذرا اس دنیا پر غور کرو۔ اگر تمہاری آنکھیں کھلی ہوں تو یہ بہت بڑی آیتِ الٰہی ہے۔ یہ زمین جسے خدا نے تمہارے لیے بنایا اور اس میں راستے متعیّن کیے۔ تم اس میں رہائش رکھتے ہو، اس میں چلتے پھرتے ہو۔ پھر ان بادلوں کو دیکھو جو خشک زمین کو سیراب کرتے ہیں۔ سوچو کہ یہ کہاں سے آتے ہیں اور کس طرح ہوا میں معلّق رہتے ہیں اور پھر زمینِ مُردہ کو حیاتِ نو بخشتے ہیں۔ اس خاکِ تفتہ سے سبزۂ نورستہ اُگتا ہے اور کھجوروں کے فلک بوس درخت خوشوں سے لدے ہوئے جھومتے دکھائی دیتے ہیں۔ کیا یہ آیتِ خداوندی نہیں؟ اور تمہارے مویشی! اللہ نے انہیں تمہاری خدمت گزاری کے لیے

پیدا کیا۔ دیکھو کہ گھاس ان کے اندر پہنچ کر کس طرح دُودھ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ انہی سے تم اپنے ملبُوسات تیار کرتے ہو۔ کیسی فرماں بردار مخلوق ہے جو ہر شام سر جھکائے ہوئے تمہارے مکانوں کی طرف خود بخود آجاتے ہیں ...... تم معجزات دیکھنا چاہتے ہو؟ کیا تم خود معجزہ نہیں ہو؟ (ذرا ان جوابات پر غور کرو) پاکیزہ فکر اور حقیقت اشیاء پر کیسی گہری نظر ہے! اس ذاتِ گرامیؐ میں خود دارِ صداقت کی والہانہ فطانت صاف جھلکتی نظر آتی ہے؛ ایک ایسی پُرزور ذہانت جو کسی معلّم کی رہینِ منّت نہیں۔ نگاہوں میں بصیرت، قلب میں گہرائی، ایک پُرشکوہ فرزندِ حوّا، ایک انسان جس قسم کا بطلِ جلیل چاہے بن سکتا ہے شاعر، سلطان یا مبلّغ؛ وہ انسان جس کی نگاہوں کے سامنے یہ حقیقت بے نقاب ہو چکی تھی کہ یہ ساری کائنات ایک عظیم القدر معجزہ ہے۔

(HEROES AND HERO WORSHIP -- P.59-60)

لیکنؔ اس کے بعد یہ لوگ کہیں گے کہ اگر تم (اے رسولؐ) عام انسان ہی ہو اور کوئی غیر معمولی اور مافوق الفطرت قوّت اپنے اندر نہیں رکھتے تو پھر ہمارے لیے کیا ضروری ہے کہ ہم تمہاری ہی بات مانیں۔ ہم میں سے جو عقلمند سیانے ہیں ہم ان ہی کی باتوں کو کیوں نہ خضرِ راہ بنائیں؟ ان سے کہو کہ یہ اس لیے ضروری ہے

قرآن معجزہ ہے

کہ جو کچھ میں تمہیں دیتا ہوں وہ کوئی دوسرا نہیں دے سکتا۔ یہ کسی انسان کی بتائی ہوئی باتیں نہیں ہیں۔ یہ خدا کا پیغام ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ تم اور تمام دنیا جہان کے انسان مل کر بھی چاہو تو اس کی مثل پیغامِ ہدایت اور ضابطۂ قوانین مرتّب نہیں کر سکتے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾

اور (دیکھو) اگر تمہیں اس (کلام) کی سچّائی میں شک ہے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے (اور تم خیال کرتے ہو کہ یہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے یا تمہیں رسالت اور وحی سے انکار ہے) تو (اس کا فیصلہ بہت آسان ہے۔ اگر یہ محض ایک انسانی دماغ کی بناوٹ ہے تو تم بھی انسان ہو) اگر تم (اپنے انکار میں) سچّے ہو تو (زیادہ نہیں — اس جیسی) ایک سُورت ہی بنا لاؤ اور

لہ اندازِ بیان میں قرآنی مفہوم کو سامنے رکھا گیا ہے۔

اللہ کے سوا جن طاقتوں کو تم نے اپنا حمایتی سمجھ رکھا ہے، ان سب کو اپنی مدد کے لیے بلا لو!
یہ ٹھیک ہے کہ تمہیں دھوکا دینے والے یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم چاہیں تو اس کی مثل بنا سکتے ہیں۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ (۸/۳۱)

اور جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں ہم نے سن لیا۔ اگر چاہیں تو ہم بھی اس طرح کی باتیں کہہ لیں۔ یہ اس کے سوا کیا ہے کہ جو پہلے گزر چکے ہیں، اُن کی لکھی ہوئی داستانیں ہیں۔

لیکن اس کا فیصلہ نہ میرے دعوے سے کرو، نہ ان کی باتوں سے (لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَ لَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ (۴/۱۲۳)) بلکہ اس میزان کے مطابق کرو جو اُوپر واضح کر دی گئی ہے یعنی اس کی مثل[1] بنا کر دکھاؤ۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

(۱۰/۳۸؛ ۱۱/۱۳؛ ۱۷/۸۸؛ ۵۲/۳۴)

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اللہ کے نام پر افترا کیا ہے؟ تم کہو، اگر تم اپنے اس قول میں سچے ہو (اور ایک آدمی اپنے جی سے گھڑ کر ایسا ضابطۂ قوانین بنا سکتا ہے) تو قرآن کی مانند ایک سورت بنا کر پیش کر دو اور خدا کے سوا جن ہستیوں کو اپنی مدد کے لیے بلا سکتے ہو (تمہیں پوری طرح اجازت ہے) بلا لو۔

یہ چیلنج سارے عرب کے سامنے تیئیس برس تک رہا۔ انہوں نے اس پیغامِ انقلاب کی مخالفت و مزاحمت میں اپنی جانیں تک دے دیں لیکن اس چیلنج کا جواب کوئی نہ دے سکا۔ اس سے بڑا معجزہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ اس میں کوئی ابہام نہ تھا، نہ ڈھکی چھپی بات تھی۔ کھلے بندوں، لاکھوں انسانوں کے سامنے مستقل طور پر ایک چیلنج تھا جس کا جواب دینے سے سب عاجز رہ گئے۔ اور پھر یہ معجزہ انہی کے لیے نہ تھا، قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے یکساں طور پر معجزہ ہے۔ تیرہ سو برس سے قرآن ساری دنیا کے سامنے ہے،

---

[1] قرآنِ کریم نے ۲۴/۹ میں اس کی وضاحت کر دی ہے کہ قرآن ضابطۂ ہدایت ہونے کی جہت سے بے مثل ہے۔

مخالفین نے اسلام کے خلاف ہر طرح کا زہر اُگلا۔ اس نورِ خدا کو بجھانے کے لیے طرح طرح کے حربے ایجاد کیے، ہزاروں کتابیں لکھیں، لاکھوں لیکچر دیئے، لیکن قرآن کی اس تحدّی کا جواب کسی سے بھی بن نہ پڑا۔ اور ایسا ہو بھی کس طرح سکتا تھا؟ یہ عقلِ انسانی کے بس کی بات ہی نہیں۔ رسول اللہ کا معجزہ قرآن ہے جو ہنگامی نہیں ابدی معجزہ ہے اور جس رسولؐ کی رسالت ابد سے ہمکنار رہنے والی تھی اس کا معجزہ بھی ابدیت در آغوش ہونا چاہیئے تھا۔

ایک اور معجزہ

لیکن ٹھہریئے! ابھی ایک اور معجزے کا ذکر باقی ہے ـــــ ایسا معجزہ جس کے بعد کسی معجزہ طلبی کی ضرورت باقی نہیں رہ سکتی۔ آپؐ نے اپنے مخالفین سے کہا کہ تم کہتے ہو کہ میں اپنے دعوائے نبوت میں جھوٹا ہوں۔ میں افترا باندھتا ہوں۔ اس کے جواب میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (۱۰/۱۶)

میں نے اس سے پہلے تمہارے اندر اپنی عمر بسر کی ہے۔ کیا تم اتنی عقل بھی نہیں رکھتے جو اس سے اندازہ کر سکو کہ ایسی زندگی کسی جھوٹے کی ہوتی ہے یا سچے کی۔

میں کہیں باہر سے نہیں آ گیا۔ میں یہیں پیدا ہوا، یہیں بڑھا، پھولا پھلا۔ یہیں میں نے اپنی زندگی کے چالیس سال پورے کیے۔ میری کتابِ زندگی کا ایک ایک صفحہ تمہارے سامنے کھلا ہے۔ کیا اس میں ایک حرف بھی ایسا ہے جس پر تم انگلی رکھ سکو؟ پھر سوچو کہ کیا ایسی بے لوث اور جبینِ سحر کی طرح بے داغ اور پاکیزہ زندگی کسی ایسے فریب کار کی زندگی ہو سکتی ہے جو خدا پر افترا باندھنے سے بھی نہ چوکے؟ اس دعوے سے قبل میری چالیس سال کی زندگی تمہارے سامنے ہے۔ تم نے از خود مجھے امین کہہ کر پکارا، اپنی عزیز ترین امانتوں کا متعمد علیہ گردانا، اپنے متنازعہ معاملات میں مجھے حکم ٹھہرایا، کیا میری وہ زندگی میری صداقت کی شہادت نہیں؟

قرآن کی تحدّی (چیلنج) کی طرح، صاحبِ قرآن کی یہ تحدّی بھی ان مخالفین کے سامنے رہی۔ انہوں نے جوشِ مخالفت میں، آپؐ کے خلاف سب کچھ کیا، کئی لڑائیاں بھی لڑیں لیکن آپؐ کی سیرت کے خلاف ایک لفظ زبان تک نہ لا سکے۔ آپؐ کے سامنے ہی نہیں، بلکہ آپؐ کی عدم موجودگی میں (ہرقل اور نجاشی کے دربار تک میں جہاں یہ لوگ آپؐ کے خلاف محاذ قائم کرنے کے لیے مدد مانگنے کے لیے گئے تھے)

آپؐ کے کیریکٹر کے خلاف ایک لفظ تک نہ کہہ سکے۔ اور یہ بات اُس زمانے کے مخاطبین تک ہی محدود نہیں، ان کے بعد بھی آج تک جن لوگوں نے آپؐ کی سیرتِ مقدسہ کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا ہے، وہ اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (۶۸/۴) بے شک آپؐ اخلاقِ انسانیت کے بلند ترین مقام پر فائز ہیں۔

اس مقام پر ہماری نگاہیں فرطِ ندامت سے جھک جاتی ہیں جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری کُتبِ سِیَر و تاریخ (بلکہ احادیث تک) میں ایسی روایات داخل ہو چکی ہیں جن سے حضورؐ کی سیرتِ طیبہ (معاذ اللہ) داغدار ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ روایتیں منافقین کی سازش کا نتیجہ ہیں، لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم انہیں سینے سے لگائے پھرتے ہیں اور انہیں ان کتابوں سے الگ کر دینے کی ہمت نہیں کرتے۔ حضورؐ کی سیرت کا صحیح ترین ریکارڈ خود قرآنِ کریم کے اوراق ہیں اور یہی ریکارڈ ہماری کُتبِ تاریخ و روایات کے پرکھنے کا صحیح معیار ہو سکتا ہے۔ جو روایت بھی اس کے خلاف جائے، ہمیں بلا تأمل کہہ دینا چاہیئے کہ وہ وضعی ہے۔ اس سے کسی غیر مسلم متعصب کو بھی جرأت نہیں ہو گی کہ وہ آپؐ کی سیرت پر کسی قسم کا حملہ کر سکے، کہ ان حملوں کی بنیاد خود ہماری اپنی کُتبِ تاریخ و سِیَر کی وضعی روایات ہوتی ہیں۔

حضورؐ کی صحیح عظمت

بہرحال، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ حضورؐ کی سیرت آئینہ کی طرح دنیا کے سامنے ہے اور آپؐ نے جس قدر محیّر العقول کامیابی حاصل کی وہ ایک انسان کی حیثیت سے حاصل کی۔ اس میں کسی فوق الفطرت عنصر کا دخل نہیں تھا۔ یہ نکتہ ذرا وضاحت طلب ہے۔

وحی کے متعلق ہم نے بتایا ہے کہ یہ خالصتہً وہبی ہوتی ہے جس میں نبی کی اپنی فکر و کاوش کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ وجہ ہے کہ وحی کا (CREDIT) رسول خود نہیں لیتا۔ اب اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ رسول کی ساری زندگی ــــ اُس کی ہر نقل و حرکت، اُس کے فیصلے، اُس کے تمام اقدامات، اُس کا نظم و نسقِ مملکت، معاملات کے سُلجھانے میں اُس کا تدبّر، جنگوں میں اُس کی فتوحات، لوگوں کے ساتھ معاملات میں اس کا حُسنِ اخلاق، اُس کی نشست و برخاست، سب وحی کی رُو سے ہوتی تھی تو اس میں رسول (معاذ اللہ) ایک کل کا پُرزہ ــــ (AUTOMATION) بن کر رہ جاتا ہے جس میں اس کی اپنی سیرت کی عظمت باقی نہیں رہتی۔ رسول کی پوزیشن یہ نہیں ہوتی تھی۔ وہ خدا سے وحی پانے کے بعد اسے دوسروں تک پہنچاتا تھا اور خود اس کے مطابق عمل کرتا تھا۔ اس کا یہ عمل اس کے اپنے اختیار و ارادہ کا نتیجہ اور اس کی ذاتی صلاحیتوں کا آئینہ دار ہوتا تھا۔

اس میں کوئی مافوق الفطرت مؤثرات کارفرما نہیں ہوتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ رسولؐ اللہ کی زندگی کو خدا نے، دوسرے انسانوں کے لیے اُسوۂ حسنہ (بہترین ماڈل) قرار دیا ہے۔ اگر رسولؐ کی اپنی زندگی، مافوق الفطرت قوتوں کی کارفرمائی کا نتیجہ ہوتی تو وہ دوسرے انسانوں کے لیے (جنہیں وہ قوتیں حاصل نہیں تھیں) کس طرح ماڈل بن سکتی تھی۔ حضورؐ نے ایک انسان کی حیثیت سے جس قدر بلندئ سیرت و کردار کا نمونہ پیش کیا وہ اس حقیقت کا اعلان کر رہا ہے کہ یہ کچھ ایک انسان نے کیا تھا اِس لیے جو انسان بھی چاہے ان نقوش قدم پر چل کر، یہی کچھ کرنے کے قابل بن سکتا ہے۔ وہ مقامِ نبوت تک تو نہیں پہنچ سکتا کیونکہ وہ خالصتہً وہبی عطایا تھا۔ اس کے علاوہ وہ شرفِ انسانیت کے بلند ترین مدارج تک پہنچ سکتا ہے۔ اور یہی سیرتِ محمدیہؐ کو اپنے سامنے بطورِ ماڈل رکھنے کا مقصد ہے۔

اس نکتۂ خیال سے دیکھئے تو پیغمبرِ اسلام، دُنیائے قدیم اور دُنیائے جدید کے درمیان بطورِ حدِّ فاصل کھڑے دکھائی دیں گے۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ آپؐ کی وحی کا سرچشمہ کیا ہے تو آپؐ دُنیائے قدیم سے متعلق نظر آئیں گے لیکن اگر اس حقیقت پر نظر کی جائے کہ آپؐ کی وحی کی رُوح کیا ہے تو آپؐ کی ذاتِ گرامی دُنیائے جدید سے متعلق نظر آئے گی۔ آپؐ کی بدولت زندگی نے علم کے ان سرچشموں کا سراغ پا لیا جن کی اسے اپنی نئی شاہراہوں کے لیے ضرورت تھی۔ اسلام کا ظہور، استقرائی علم کا ظہور ہے۔ اسلام میں نبوّت اپنی تکمیل کو پہنچ گئی اور اس تکمیل سے اُس نے خود اپنی خاتمیت کی ضرورت کو بے نقاب دیکھ لیا۔ اس میں یہ لطیف نکتہ پنہاں ہے کہ زندگی کو ہمیشہ کے لیے عہدِ طفولیت کی حالت میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اسلام نے دینی پیشوائی اور وراثتی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔ قرآنِ کریم غور و فکر اور تجارب و مشاہدات پر بار بار زور دیتا ہے اور تاریخ اور فطرت دونوں کو علمِ انسانی کے ذرائع ٹھہراتا ہے۔ یہ سب اسی مقصد کے مختلف گوشے ہیں جو ختمِ نبوت کی تہ میں پوشیدہ ہے۔

پھر عقیدۂ ختمِ نبوت کی ایک بڑی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس سے لوگوں کے باطنی واردات (MYSTIC EXPERIENCES) کے متعلق ایک آزادانہ اور ناقدانہ طرزِ عمل قائم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ختمِ نبوت کے معنی یہ ہیں کہ اب نوعِ انسانی کی تاریخ میں کوئی شخص اس امر کا مدّعی نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی مافوق الفطرت اختیار (SUPERNATURAL AUTHORITY) کی بنا پر دوسروں کو اپنی اطاعت پر مجبور کر سکتا ہے۔ ختمِ نبوّت کا عقیدہ ایک ایسی نفسیاتی قوت ہے جو اس قسم کے دعوائے اقتدار کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ اب کسی کے باطنی مشاہدات کیسے ہی غیر معمولی کیوں نہ ہوں ان پر اسی طرح تنقیدی نگاہ ڈالی جا سکتی ہے جس طرح انسانی مشاہدات کے دُوسرے پہلوؤں پر۔

(علامہ اقبالؒ ــــ خطباتِ تشکیلِ جدید صفحہ ۱۲۷-۱۲۶
ایڈیشن فروری ۱۹۵۸ء، شائع کردہ منیب اقبال، وحید اقبال۔

ختمِ نبوّت

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۶/۱۱۶)

بچہ جب پہلے پہل چلنا سیکھتا ہے تو اسے اُٹھنے کے لیے بھی کسی آسرے کی ضرورت ہوتی ہے بسہارا لے کر اُٹھتا ہے اور ابھی چار قدم بھی چلنے نہیں پاتا کہ لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے۔ گرتا ہے تو ادھر اُدھر حسرت بھری نگاہوں سے مدد کی تلاش کرتا ہے۔ مایوس ہو جاتا ہے تو رو کر کسی اُٹھانے والے کو پکارتا ہے (کہ اُس وقت اس کے پاس پکار کا یہی ایک ذریعہ ہوتا ہے)۔ کوئی اُنگلی پکڑ کر اُٹھانے والا مل جائے تو پھر چار قدم چل لیتا ہے۔ ذرا اور بڑا ہو جائے تو گڈ ٹیلنے کے سہارے چلتا ہے۔ وہ ہاتھ سے چھوٹ جائے تو پھر مشکل ہو جاتی ہے

عالمِ طفولیت

اور بڑا ہو جائے تو اپنے پاؤں پر کھڑا ضرور ہو جاتا ہے لیکن چلتا پھرتا ان ہی مقامات میں ہے جن سے وہ مانوس ہوتا ہے۔ غیر مانوس مقامات کی طرف جانے سے گھبراتا ہے۔ جانا ہی پڑے تو کسی کا ساتھ ڈھونڈتا ہے۔ پھر اگر راستہ میں چھوٹی سی نالی بھی آ جائے تو اُسے دریا نظر آتی ہے۔ صحن کے نشیب سے برآمدے کا فراز، ایک پہاڑ دکھائی دیتا ہے۔ اور بڑا ہو جائے تو دن کی روشنی میں ہر طرف جا نکلتا ہے لیکن اندھیرے میں ہر سمت اسے چھلاوے نظر آتے ہیں۔ اس وقت پھر کسی رفیقِ سفر کی احتیاج محسوس کرتا ہے۔ لیکن جب وہ اس طرح اُٹھتے بیٹھتے، گرتے پڑتے، گھبراتے سنبھلتے، جوانی کو پہنچ جاتا ہے تو پھر اُسے اُنگلی پکڑنے والے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مانوس و غیر مانوس مقامات کا امتیاز اُٹھ جاتا ہے۔ روشنی اور اندھیرے کا فرق بھی باقی نہیں رہتا۔ اب وہ ہر جگہ بلا خوف و خطر چلا جاتا ہے۔ اگر کہیں ٹھوکر کھا کر گر

بھی پڑے تو خود بخود اُٹھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح یہ بتانا چاہتا ہے کہ اسے کسی خارجی مدد کی احتیاج نہیں۔ وہ اس مدد کو اپنی شانِ جوانمردی کے خلاف سمجھ کر اس میں خفّت محسوس کرتا ہے۔ وہ اپنے پاؤں آپ چلنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی حفاظت خود کرنے کا متمنی ہوتا ہے۔ وہ اپنی منزلیں آپ قطع کرنے میں لذّت محسوس کرتا ہے۔ البتہ اس مقام پر اسے ایک چیز کی ضرورت باقی رہتی ہے جس کے بغیر نہ تو وہ راستہ کی پُرخطر گھاٹیوں سے محفوظ رہ سکتا ہے اور نہ ہی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ چیز جس کی ضرورت لاینفک اور جس کی احتیاج یقینی ہے اور اس احتیاج میں وہ کوئی شرم وندامت اور سُبکی و خفّت بھی محسوس نہیں کرتا ہے، یہ ہے کہ شاہراہِ زندگی میں جہاں جہاں دوراہے آئیں وہاں نشانِ راہ (SIGN POSTS) نصب ہوں جن پر بیّن اور واضح الفاظ میں لکھا ہو کہ یہ راستہ کدھر جاتا ہے اور دوسرا راستہ کس طرف؟ اب اگر راہ رَو کی آنکھوں میں بصارت ہے اور فضا میں روشنی، کہ جس کی مدد سے یہ نشانِ راہ پڑھے جا سکیں، تو پھر راستہ قطع کرنے پر منزلِ مقصود تک پہنچ جانا یقینی ہے۔ لَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۔ ۲/۶۲

جوانی کا زمانہ

افراد کی طرح نوعِ انسان کی بھی یہی کیفیت ہے جب ذہنِ انسانی عالمِ طفولیّت میں تھا تو اسے چھوٹے چھوٹے معاملات کے فیصلوں کے لیے بھی خارجی امداد کی ضرورت پڑتی تھی۔ وہ دو قدم بھی آسرے کے بغیر نہیں چل سکتا تھا۔ خدا کے نظامِ ربوبیّت سے یہ بعید تھا کہ وہ بچّے کو یوں تنہا اور بے آسرا چھوڑ دیتا۔ جس خلّاقِ فطرت نے اس کی طبیعی زندگی کی پرورش کے لیے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ اس کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کے لیے دُودھ کے چشمے نہ نکلیں، وہ اس کی انسانی زندگی کے تقاضوں کو بلاتسکین کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے انسان کی تمدّنی زندگی کے آغاز میں کہہ دیا تھا کہ

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰی وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ (۷/۳۵)

اے نوعِ انسانی! جب تمہارے پاس تمہیں میں سے رسول آئیں جو میرے قوانین تمہارے سامنے پیش کریں، تو تم میں سے جو کوئی تقویٰ اور اصلاح اختیار کرے گا تو اُن پر کسی قسم کا خوف اور حُزن نہیں ہوگا۔

انسانی تمدّن و عمرانیت کے ابتدائی ادوار میں دیکھیے، ہدایتِ آسمانی کا یہ سلسلہ کس طرح مسلسل و متواتر

چلا آتا ہے۔

ثُمَّ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا تَتۡرَا ؕ (۲۳/۴۴)

پھر ہم نے اپنے رسول تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد متواتر بھیجے۔

ہر زمانے میں رسول، ہر قریہ میں رسول، ہر قوم میں رسول، ایک ہی زمانے میں مختلف بستیوں میں مختلف رسول۔ اس سلسلۂ رشد و ہدایت کی کیفیت یہ تھی کہ ایک رسول آتا۔ جب تک وہ اپنی قوم یا قبیلے میں رہتا لوگ رشد و ہدایت کی روشنی میں چلتے رہتے۔ جونہی وہ منہ موڑتا، وہ رفتہ رفتہ اس آسمانی روشنی کو گم کر دیتے اور پھر اندھیرے میں راستہ ٹٹولنے لگتے۔ مانوس مقامات کے جس قدر دھندلے سے نقوش ذہن میں محفوظ ہوتے ان میں کہیں کہیں چل پھر لیتے لیکن نہ حتمی طور پر راستہ کا تعین کر سکتے نہ منزل کا اندازہ۔ ایسے میں پھر ایک اور رسول آجاتا۔ پھر روشنی سامنے آجاتی تو سیدھے راستے پر ہو لیتے۔ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمۡ مَّشَوۡا فِيۡهِ ۙ وَاِذَآ اَظۡلَمَ عَلَيۡهِمۡ قَامُوۡا ؕ (۲/۲۰)۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ جس طرح بچے کی زندگی کی ضروریات سیدھی سادی اور اس کے تقاضے محدود ہوتے ہیں اسی طرح انسانی حیاتِ اجتماعیہ کے ابتدائی ادوار میں ان کے معاملاتِ زندگی سادے اور آسان اور ان کے عمرانی تقاضے محدود ہوتے تھے۔ اس لیے آسمانی ہدایت بھی ان ہی محدود مسائلِ حیات کے لیے متکفل ہوتی تھی۔ پھر ذرائع رسل و رسائل اور اسبابِ نقل و حرکت کی کمی (بلکہ اکثر حصوں میں فقدان) کی وجہ سے ان کی اجتماعی زندگی مختصر قبائل یا چھوٹی چھوٹی اقوام پر مشتمل تھی۔ اس سے آگے نہیں بڑھتی تھی۔ اس لیے اس آسمانی ہدایت کا دائرۂ اثر و نفوذ بھی اسی وسعت کے مطابق محدود و مقید ہوتا تھا۔ ذہنِ انسانی کی ناپختگی کا تقاضا تھا کہ اس تعلیم کو صرف اصولوں تک ہی محدود نہ رکھا جائے بلکہ اس کی جزئیات تک بھی خود ہی متعین کر دی جائیں کیونکہ ان میں ہنوز اس کی صلاحیت نہ تھی کہ اصولوں کی روشنی میں جزئیات خود مرتب کر لیں۔ الغرض ہوتا یہ کہ ایک رسول کی تشریف براری کے بعد کچھ وقت تک اس کی تعلیم اپنی اصلی شکل میں باقی رہتی، پھر اس میں تحریف و الحاق شروع ہو جاتا۔ اُدھر اُن کی زندگی کی ضروریات بھی بڑھ جاتیں اور احوال و ظروف کی تبدیلی سے ان کے تقاضوں میں تغیر و تبدل شروع ہو جاتا۔ اتنے میں پھر ایک رسول آجاتا۔ وہ سابقہ آسمانی ھدایت کو ذہنِ انسانی کی آمیزشوں سے پاک و صاف کرتا۔ جزئیات میں جہاں کہیں حک و اضافہ اور تغیر و تبدل کی ضرورت ہوتی اسے بھی پورا کرتا اور اس طرح بچے کو اٹھا کر پھر راستے پر لگا دیتا۔ قرآن میں آسمانی ھدایت کے نسخ و تبدل کی آیات پر غور کیجئے، یہ حقیقت واضح طور پر سامنے

آجائے گی۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔

مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَآ اَوۡ مِثۡلِهَا ؕ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ○ (۲/۱۰۶)

ہم اپنے احکامات میں سے جو کچھ بھی منسوخ کر دیتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اس کی جگہ اس سے بہتر یا اس جیسا حکم (پھر) نازل کر دیتے ہیں (پس قرآن کے نزول پر لوگوں کو حیرانی نہیں ہونی چاہیے)۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے؟[1]

سورۂ نحل میں اسی تبدیلیٔ آیات کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

وَاِذَا بَدَّلۡنَاۤ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُفۡتَرٍ ؕ بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ○ (۱۶/۱۰۱)

اور جب ہم کسی سابقہ شریعت کے حکم کی جگہ دوسرا حکم دے دیتے ہیں (اور یہ اس لیے کہ) اللہ خوب جانتا ہے کہ (کب کیا) نازل کرنا چاہیئے۔ تو یہ کہتے ہیں کہ تو (اے رسولؐ) افترا کرتا ہے۔ (کیونکہ تیری وحی سابقہ احکام سے بعض جگہ مختلف ہوتی ہے) لیکن ان میں سے اکثر (تبدیلیٔ احکام کی لِم سے) واقف نہیں۔

باقی رہی انسانی تحریف و الحاق، سو اس کے متعلق کہا۔

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِىٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلۡقَى الشَّيۡطٰنُ فِىۡۤ اُمۡنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنۡسَخُ اللّٰهُ مَا يُلۡقِى الشَّيۡطٰنُ ثُمَّ يُحۡكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ○ (۲۲/۵۲)

اور ہم نے تم سے پہلے بھی کوئی رسول نہیں بھیجا اور نہ نبی کہ (اس کے ساتھ ایسا نہ ہوا ہو کہ) جب اس نے (احکامِ الٰہیہ کی تلاوت کی تو (وحی کے دشمن) لوگوں نے اس کی تلاوت کردہ (وحی) میں کچھ ملاوٹ کر دی۔ پس اللہ (دوسرا رسول بھیج کر) ان کی اس آمیزش کو مٹا دیتا رہا اور اپنے

---

[1] اس سے مراد یہ ہے کہ سابقہ انبیائے کرامؑ کے ذریعے جو احکام دیئے گئے تھے ان کے سلسلہ میں یہ کچھ کیا جاتا تھا۔ یہ نہیں کہ قرآنِ کریم میں بھی بعض احکام منسوخ کر دیئے جاتے تھے اور ان کی جگہ دوسرے احکام دے دیئے جاتے تھے۔ قرآنِ کریم کا ہر حکم اپنی جگہ محکم اور قائم ہے۔ اس میں ایک لفظ بھی منسوخ نہیں۔

احکام کو محکم کرتا رہا۔ اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔

ہدایتِ آسمانی کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا حتّٰی کہ ذہنِ انسانی سنِ رُشد و شعور کو پہنچ گیا۔ اب اس میں پُختگی آگئی۔ اب بچہ جوان ہوگیا۔ اس کے پاؤں میں راستہ طے کرنے کی طاقت، دل میں خطرات کا مقابلہ کرنے کے حوصلے

ذہنِ انسانی کا سنِّ شعور

اور دماغ میں نشیب و فراز کے سمجھنے کی صلاحیت آگئی۔ اب ہر چار قدم پر گر گر کر کسی انگلی پکڑ کر اٹھانے والے کی احتیاج نہ تھی۔ اب صرف اس قدر ضرورت تھی کہ زندگی کے دوراہوں پر نشاناتِ راہ لگا دیئے جائیں۔ اس کے لیے ایسا انتظام کر دیا گیا کہ سفرِ حیات میں ہر شاہراہ پر، اور شاہراہ کے ہر موڑ پر ایسے محکم و استوار نشانات نصب کر دیئے کہ حوادثِ زمانہ کے سیلاب آئیں لیکن روشنی کے بلند میناروں کی طرح نشاناتِ خداوندی کے ان پختہ کھمبوں کو ذرا بھی نقصان نہ پہنچا سکیں۔ ہر شعبۂ حیات کے اصول، ہر گوشۂ زندگی کے آئین، اصولی طور پر قرآن کی دفتین میں محفوظ کر دیئے گئے۔ ان کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰـفِظُوۡنَ ۝ (۱۵/۹)

یقیناً ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

ساری دُنیا کی قوتیں جمع ہو کر کوشش کریں کہ اس صحیفۂ خداوندی میں ایک نقطے کا بھی تغیر و تبدل کر سکیں تو ناکام و نامراد رہیں۔ یہ محض ہماری خوش عقیدگی نہیں بلکہ تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں، اپنے اور بیگانے اس پر گواہ ہیں۔ ذہنِ انسانی کے سنِ رشد و شعور کے ساتھ ہی اس کی تمدنی زندگی کی وسعتوں میں بھی اضافہ ہونا شروع ہوگیا اور اس کی حدود اس قدر پھیلنے لگیں کہ وہ رفتہ رفتہ تمام نوعِ انسانی کو محیط ہونے لگیں۔ چنانچہ آج

تمدنی ضروریات کی وسعتیں

سامانِ رسل و رسائل اور ذرائع نشر و اشاعت کی ہمہ گیریت سے تمام دُنیا سمٹ کر ایک بستی اور اس کے رہنے والے ایک خاندان کے افراد بن رہے ہیں۔ اس لیے اب رسالت بھی قومی اور قبائلی ادوار و احصار سے نکل کر عالمگیر بن گئی اور جماعتوں کے بجائے اس کا تخاطب نوعِ انسانی سے ہوگیا۔ قرآن کے صفحات کو اُلٹیے اور دیکھئے کہ اس نے اس حقیقت کو کس شدت و تکرار سے نمایاں کیا ہے کہ نبی اکرمؐ تمام نوعِ انسانی کے لیے رسول اور قرآن قیامت تک کے آنے والے انسانوں کے لیے شمعِ زندگی ہے۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے میری تالیف "مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں"۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ۝ (۷/۱۵۸)

تمام نوعِ انسانی سے کہہ دو کہ میں تم سب کی طرف رسول ہوں۔

جن اقوام کی طرف پہلے رسول آچکے تھے ان کی طرف بھی یہی رسول ہیں، اس لیے کہ ان کے پاس آسمانی روشنی اپنی اصلی شکل میں کہیں موجود نہ تھی۔

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ يَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۬ۥ (۵/۱۵ نیز ۵/۱۹)

اے اہلِ کتاب! یقیناً ہمارا رسول تمہارے پاس آچکا ہے جو اس میں سے بہت کچھ کھول کر بتاتا ہے جو تم کتاب سے چھپاتے تھے اور بہت سی باتوں سے درگزر کر دیتا ہے (کیونکہ وہ منسوخ کر دی گئی ہیں اور ان کے دُہرانے کی اب ضرورت نہیں)۔

اس لیے کہ قرآن ان تمام اصولی سچائیوں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے جو انبیائے سابقہ کی وساطت سے وقتاً فوقتاً امم گزشتہ کی طرف آتی رہیں لیکن وہ اپنی اصلی شکل میں کہیں محفوظ نہ رہ سکیں۔ اسی لیے قرآن کو مھیمن کہا گیا ہے (۵/۴۸ نیز ۲۶/۱۹۶؛ ۵۳/۵۶؛ ۲۱/۲۴) اور یہی اب تمام اقوامِ عالم کے لیے ضابطۂ زندگی اور آئینِ حیات ہے۔ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ (۶/۹۰ نیز ۲۵/۱؛ ۶۸/۵۲؛ ۳۸/۸۷)۔ اور اسی لیے اب تمام نوعِ انسانی سے مطالبہ ہے کہ وہ اس ضابطۂ قوانین کو اپنا نصب العین حیات بنائیں (۲۴/۸) کہ انسان کے لیے منزلِ مقصود تک پہنچانے والی یہی صراطِ مستقیم ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی راہ نہیں۔ (۴/۱۷۵-۱۷۶)۔

جب راہرو جادۂ حیات کی ضروریات یوں پوری ہوگئیں اور زندگی کی شاہراہوں پر ایسے محکم نشاناتِ راہ نصب کر دیئے گئے تو دین مکمل ہوگیا، نبوّت کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ اس لیے کہ جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے اب انسانیت بالغ ہو رہی تھی۔ اب ضرورت صرف اس قدر تھی کہ انسان کو راستے بتا دیئے جائیں، نشانات لگا دیئے جائیں، فضا میں روشنی پیدا کر دی جائے اور اسے دیکھنے والی آنکھیں عطا کر کے کہہ دیا جائے کہ ان نشانات وحی کی روشنی میں علم و عقل کی راہ نمائی سے منازلِ زندگی طے کرتا چلا جائے۔ (قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۲/۲۵۶) صحیح اور غلط راہیں متمیز و متفارق ہوگئیں۔ (وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۹۰/۱۰) انسان کو زندگی کے ہر موڑ پر دونوں راستے الگ الگ کر کے دکھا دیئے گئے اور اسے چھوڑ دیا گیا کہ ایک مردِ جواں ہمت کی

طرح اپنا راستہ خود طے کرلے۔ اب ہر معاملہ کے جانچنے کے لیے اصُول اُس کے سامنے تھے۔ ان اصُولوں کی روشنی میں جزئی امور کے متعلق باقی لازمِ مرتب کرنے کے لیے علم و عقل اس کے پاس تھی معلّم کا کام اصول سمجھا دینا تھا، بنیادی قاعدے بتا دینا تھا۔ اگر ہر جزوی سوال کا جواب بھی وہ خود ہی بتا دے تو متعلّم میں اصابت رائے، قوتِ فیصلہ، معاملات کے افہام و تفہیم کی صلاحیت اور اعتمادِ نفس کے جوہر کبھی اُجاگر نہ ہوسکیں۔ ذہنِ انسانی کو جلا دینے اور اس کی نگاہوں میں بصیرت اور عقل و خرد میں نشوو ارتقا پیدا کرنے کے لیے چاہیئے ہی یہی تھا کہ اسے اصولوں کا مکمل ضابطۂ حیات دے کر، کارگہِ زندگی میں آزاد چھوڑ دیا جاتا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو اس کے قوائے عقلیہ مضمحل اور جوہرِ انسانیہ مفلوج ہو کر رہ جاتے۔ عقل و ہوش کا بچپن کبھی جوانی کی پختگی حاصل نہ کرسکتا اور انسانی قلب و دماغ، لاڈلے بچے کے قوائے ذہنیہ و عملیہ کی طرح، غیر نشوونما یافتہ (UN-DEVELOPED) رہ جاتا۔

اب آسروں کی ضرورت نہ تھی

لہٰذا، اگر انسانیت کے عہدِ طفولیت میں قدم قدم پر آسرے اور سہارے بہم پہنچانا ہی تقاضائے ربوبیت تھا تو جوانی کے زمانہ میں اسے اپنے پاؤں چلنے دینا اس کے حق میں رحمت و شفقت تھا۔ اس کے قوائے عقلیہ کے بڑھنے، پھولنے پھلنے کا یہی ایک ذریعہ تھا۔ اس کے جواہر مضمر میں جلا پیدا کرنے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ نہیں! بلکہ یوں کہیے کہ انسانیت کی خودداری کا یہی تقاضا تھا۔ کسی نوجوان لڑکے سے بچّوں جیسا سلوک کیجیے۔ راستے میں اس کی اُنگلی پکڑ کر چلایئے، اسے گود میں اٹھانے کی کوشش کیجیے۔ دیکھیے اس کی خودداری کو کیسے ٹھیس لگتی ہے۔ وہ کس طرح اُنگلی چھڑانے کی کوشش کرتا ہے، وہ کیسے گود سے اُچھل کر بھاگتا ہے۔ فرطِ ندامت سے اس کا چہرہ تمتما اُٹھتا ہے۔ احساسِ خودی سے اس کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔ آپ نے اندازہ لگایا کہ تکمیلِ دین اور ختمِ نبوت کا پروگرام کس طرح انسانی زندگی کے تقاضے کے عین مُطابق ہے۔ اگر نبوت کا دروازہ بند نہ کیا جاتا تو ذہنِ انسانی کی کھڑکیاں کبھی نہ کھلتیں۔ انسان اپنے پاؤں چلنا کبھی نہ سیکھتا۔ یہ بچہ کبھی جوان نہ ہونے پاتا۔ چشمِ کائنات نمودِ آدم اور بلوغِ انسانیت سے کبھی رُوشناس نہ ہوسکتی! اِسے تم جب بعثتِ حضورؐ خاتم النبییّنؐ کو حکیم الاُمّت کے الفاظ میں، "ہنگامِ نمودِ آدم" سے تعبیر کیا ہے تو یہ حقیقت کی ترجمانی ہے، شاعری نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ ختمِ نبوت کے عقیدہ نے تاریخِ انسانیت میں ایک نئے باب کا اضافہ اور ایک نئے دَور کی ابتدا کی ہے۔ پہلے عقل کا کام بھی وحی کی راہ نمائی ہی دیتی تھی کیونکہ عقلِ انسانی ہنوز ناپختہ تھی۔ اب وحی کا کام عقل کی آنکھ کے لیے روشنی بہم پہنچانا رہ گیا۔ اب عقل صرف ان مقامات میں وحی کی راہ نمائی کی محتاج رہ گئی جو اس کی سرحد

سے ماوراء تھے اور یہ مقامات وہ اصولی قوانین تھے جو قرآن کی دفتین میں محفوظ کر دیئے گئے تھے۔ یہ اصول وہ اقدارِ مستقلہ (PERMANENT VALUES) تھیں جن کی حدود کے اندر عقل کی حکمرانی منصوّ تھی۔ اس سے شخصیت پرستی کا وہ کابوس بھی ٹوٹ گیا جس کے نیچے انسان قرنہا قرن سے دبا چلا آتا تھا۔ اب انسان سے صرف اس قدر مطالبہ کیا جاتا تھا کہ وہ ان مستقل اقدار (قرآنِ کریم) کو تنقید کی حد سے بالا سمجھے جو اسے وحی کے ذریعے ملے ہیں۔ ان اصولوں کو صحیح ماننے کے بعد انسان ہر قسم کی شخصی حکومت (PERSONAL AUTHORITY) سے آزاد ہو جاتا ہے۔ آپ انسانی زندگی پر غور کیجئے۔ اس میں ایک چیز آپ کو ایسی نظر آئے گی جو شروع سے اخیر تک غیر متبدّل رہتی ہے یعنی انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) جسے یہ "میں" کہہ کر پکارتا ہے لیکن اس کے دوسرے تقاضے وہ ہیں جو ایک فرد کی عمر، یا مرورِ زمانہ سے بدلتے رہتے ہیں۔ اس طرح انسانی زندگی ثبات و تغیّر (PERMANENCE AND CHANGE) کے حسین امتزاج سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

قرآنِ کریم نے انسانی راہ نمائی کے لیے بھی یہی انداز اختیار کیا ہے۔ اس نے اس ہدایت کو، جسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غیر متبدّل رہنا تھا، قرآن کے اندر محفوظ کر دیا۔ اس کے بعد اس جماعت سے، جو قرآن کی صداقت پر ایمان لے آئے، کہہ دیا کہ تم ایسا نظامِ معاشرہ قائم کرو جس میں، قرآن کے احکام و اصولات میں کسی قسم کے تغیّر و تبدّل کا اختیار کسی کو حاصل نہ ہو لیکن ان غیر متبدّل احکام و اصولات کی حدود کے اندر رہتے ہوئے، تم زندگی کے بدلنے والے تقاضوں کے لیے، بائی لاز، باہمی مشاورت سے خود مرتّب کرو۔ قرآن کے اصول و احکام، ہمیشہ غیر متبدّل رہیں گے لیکن ان کی روشنی میں مرتّب کردہ بائی لاز، زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتے جائیں گے۔ اس کا نام ہے اسلامی نظامِ زندگی یا حکومتِ خداوندی جسے سب سے پہلے حضور نبیٔ اکرمؐ نے متشکّل فرمایا اور جسے حضورؐ کے سچے جانشینوں نے قائم رکھا اور آگے بڑھایا۔ آپ دیکھیں گے کہ اس نظام میں شخصیتیں آتی رہیں گی اور جاتی رہیں گی۔ ان کے جانے سے اس نظام پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ یہی وہ حقیقتِ کبریٰ تھی جس کا اعلان جناب صدیقِ اکبرؓ نے حضورؐ کی وفات پر فرمایا تھا۔ جہاں تک خدا سے وحی پانے کا تعلّق تھا، وہ حضورؐ کی ذات پر ختم ہو گیا۔ جہاں تک وحی کے مطابق انسانی معاشرہ کو چلانا تھا، وہ حضورؐ کے بعد بھی جاری رہا۔ اس نظام کو چلانے کے لیے کسی نبی کی ضرورت نہ تھی۔ اس لیے (قرآن کو محفوظ کر دینے کے بعد) نبوّت کا خاتمہ کر دیا گیا اور اسلامی نظام کو قائم رکھنے اور آگے چلانے کا

سلسلہ جاری کر دیا گیا۔ اس نظام کی مرکزی اتھارٹی (جسے مرکزِ ملت سے تعبیر کیا جاتا ہے)، نبی اکرمؐ کے بعد قرآنی احکام و قوانین کو نافذ کرنے کا ذریعہ تھی۔ اس کو خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کہا جاتا ہے۔ لہٰذا، قرآن اور خلافت علیٰ منہاجِ نبوت (اسلامی نظام)، کے دو بنیادی ستون ہیں جن پر دین کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ ان تصریحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی کہ قرآنِ کریم نے جو نظامِ دین عطا کیا ہے یعنی قرآن بطور اساسِ آئین اور ملت کی مرکزیت اس کی قوتِ نافذہ، اس کی موجودگی میں نبوت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ ختمِ نبوت کا عقیدہ اتنا واضح تھا کہ جس طرح توحیدِ خداوندی کے متعلق کسی بحث کی گنجائش نہ تھی اسی طرح اس کے متعلق بھی کسی سوال کی ضرورت باقی نہ تھی۔ آپ قرنِ اول کے تمام محفوظات چھان ڈالیے، آپ کو کہیں کسی جگہ بھی اس مسئلہ کے متعلق کوئی بحث نہیں ملے گی۔ اُن کے نزدیک نبوت کی ختمیت، خدا کی وحدت کی طرح مسلّم تھی۔ کسی دل میں نہ اس کے متعلق کوئی سوال پیدا ہوا نہ اُس کے متعلق۔ نبوت قرآن میں محفوظ تھی اور حضورؐ کی امامت مرکزِ ملت کی شکل میں موجود۔ اس لیے اجرائے نبوت کا سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کے نزدیک کسی "آنے والے" کا تصور ہی بے معنی تھا جب تک اسلامی نظام (خلافت علیٰ منہاجِ نبوت) کا سلسلہ قائم رہا کسی "آنے والے" کا تصور، ہمارے ہاں بار نہ پا سکا لیکن جب ہماری بدقسمتی سے، یہ سلسلہ منقطع ہو گیا تو قوم رفتہ رفتہ قعرِ مذلت میں گرتی چلی گئی اور اس کے ساتھ ہی وہ شخصیتوں کے سہارے بھی ڈھونڈنے لگی۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ بچے کو کسی اٹھانے والے کا خیال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ گر پڑتا ہے۔ جب تک وہ اپنے پاؤں چلتا رہتا ہے، اسے خیال تک بھی نہیں آتا کہ اسے اٹھانے والے کی ضرورت ہے۔ یہی کیفیت قوموں کی ہے جب تک کوئی قوم سرفرازی و سربلندی کی زندگی بسر کرتی ہے، جب تک وہ شوکت و حشمت، حکومت و سطوت کی مالک ہوتی ہے، جب تک اس کے سینے میں دل اور دل میں ایمان کی تڑپ، اس کے بازوؤں میں خون اور خون میں حرارتِ کردار موجزن ہوتی ہے، اس وقت تک اسے کسی آسرے کی تلاش نہیں ہوتی۔ وہ کوئی سہارا نہیں ڈھونڈتی۔ اس وقت تو وہ خود بے آسروں کا آسرا اور بے سہاروں کا سہارا ہوتی ہے۔ اس کی قوتِ بازو اس کا آسرا اور قانونِ خداوندی اس کا کافی سہارا ہوتا ہے۔ لیکن جب اس پہ ادبار چھا جاتا ہے، اس کی دولت و حشمت چھن جاتی ہے، اس کی سطوت و حکومت لٹ جاتی ہے، تو اس کے قوائے عملیہ مضمحل اور اس کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں، اس کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے، آرزوئیں مردہ ہو جاتی ہیں۔ وہ جہادِ زندگی میں سپر انداختہ شکست خوردہ بیٹھ جاتی ہے۔ وہ کشمکشِ حیات سے گھبراتی اور میدانِ عمل سے گریز کرتی ہے، خطرات کا مقابلہ کرنے سے جی

جُراتی ہے۔ایسی حالت میں وہ کمزور بچّے کی طرح کسی اٹھانے والے کی راہ تکنے لگتی ہے۔اس کی تمام توجہات کسی آنے والے کے پاؤں کی آہٹ پر مرتکز ہوجاتی ہیں۔وہ اپنی امیدوں کا آخری سہارا "مردے از غیب بروں آید و کارے بکُند"، کے خوش آیند تصوّر میں تلاش کرتی ہے۔وہ ہر اُٹھتی ہوئی گرد کو ہزار حسرتوں سے دیکھتی ہے کہ شاید اسی میں وہ شاہسوارِ دَوراں چھُپا چلا آرہا ہو جو اس کی نگۂ انتظار کا نقطۂ ماسکہ ہے بغرضیکہ ایسی حالت میں وہ قوم خود کچھ نہیں کرتی اور اپنے ذہن کو اس خوش فہمی کے کھلونوں سے بہلاتی رہتی ہے کہ تھوڑی دیر اور ٹھہرو آنے والا آئے گا اور تمام تباہ حالیوں اور بدبختیوں کو سرفرازیوں اور سربلندیوں میں بدل دے گا۔ایک "آنے والے" کا تصوّر ہمارے اسی دورِ نکبت دزوال کا پیدا کردہ ہے۔اس عقیدہ کی قرآنِ کریم میں کہیں گنجائش نہیں ــ اس سے ختمِ نبوّت کا اعلان بے معنی ہوکر رہ جاتا ہے۔

ختمِ نبوّت کی مہر کو توڑنے کے لیۓ "آنے والے" کے عقیدہ کے علاوہ، ایک اور عقیدہ بھی ہے جو اس سے بھی زیادہ خطرناک اور تباہ کُن ہے۔"آنے والے" کے عقیدہ کی صُورت یہ ہے کہ مُسلمان اس پر عقیدہ تو ضرور رکھتا ہے لیکن جب بھی کوئی اس کا کوئی دعوٰی کرتا ہے کہ جس "آنے والے" کا تمہیں انتظار ہے وہ میں ہوں، تو اس کے اس دعوٰے کی مخالفت شروع ہوجاتی ہے۔لیکن یہ دوسرا عقیدہ ایسا ہے جس کے مدّعی کی کہیں سے مخالفت نہیں ہوتی اور پوری اُمّت اس کے اندر ڈوبی ہوئی ہے۔یہ عقیدہ ہے کشف والہام کا جس پر تصوّف کی ساری عمارت استوار ہے اور جو ختمِ نبوّت کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے لیکن اس کے باوجود، نہ صرف یہ کہ اس کی کسی کی طرف سے کبھی مخالفت نہیں ہوتی بلکہ اسے عین دین ہی نہیں (مغزِ دین) سمجھا جاتا ہے۔اس نکتہ پر ذرا تفصیل سے گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔

کشف والہام کا عقیدہ

انسانی علم کا عام ذریعہ، اس کی عقل ہے۔انسانی حواس خارجی دُنیا کی معلومات فراہم کرکے اس کے سرچشمۂ فکر تک پہنچاتے ہیں (اس سرچشمۂ فکر کو اس کا دماغ کہہ لیجیۓ یا عام اصطلاح میں قلب (MIND)) اور وہ ان معلومات سے ایک نتیجہ اخذ کرتا ہے۔اس طرح وہ علم الادراک (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) سے تصوّرات (CONCEPTS) وضع کرتا ہے ــ مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ، سب اسی طریقۂ فکر کے ذرائع داسباب ہیں۔لیکن قرآنِ کریم کی رُو سے، انسانی علم کا ایک اور ذریعہ بھی ہے جسے وحی کہا جاتا ہے۔یہ علم،

انسان کو، اس کے مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ، عقل و فکر، غور و خوض کے بغیر، براہِ راست خدا کی طرف سے حاصل ہوتا تھا یعنی یہ علم انسانی فکر کا پیدا کردہ داخلی (SUBJECTIVE) نہیں ہوتا تھا بلکہ اُسے خارج سے (OBJECTIVELY) ملتا تھا۔ یہ مخصوص تھا حضرات انبیائے کرامؑ سے۔ یہ آخری مرتبہ حضور نبیٔ اکرمؐ کو ملا اور اس کے بعد یہ ذریعۂ علم ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا۔ اسے ختمِ نبوّت (اور حضورؐ کو اسی جہت سے خاتم النبیّین) کہتے ہیں۔ اس علم کا ماحصل قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے۔ لہٰذا ختمِ نبوت کے بعد علمِ انسانی کے سرچشمے دو ہی رہ گئے ــــ وحی کی رُو سے عطا شدہ علم، جو قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے اور انسانی عقل و فکر (جس میں مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ سب شامل ہیں)۔ لیکن تصوّف کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل کرنے کا ذریعہ اب بھی موجود ہے۔ ختمِ نبوّت سے پہلے اسے وحی کہتے تھے، اب اسے کشف و الہام کہا جاتا ہے۔

لیکن یہ فرق صرف نام کا ہے۔ حقیقت دونوں کی ایک ہی ہے۔ چنانچہ سرخیلِ گروہِ صُوفیاء، شیخِ اکبر محی الدّین ابنِ عربی، اس سلسلہ میں اپنی اہم کتاب، فصُوص الحکم، میں لکھتے ہیں۔

> جس مقام سے نبی لیتے تھے (علم حاصل کرتے تھے) اس مقام سے انسانِ کامل، صاحب الزّمان غوث، قطب، لیتے ہیں ...... اربابِ شریعت تو وہ ہیں جو قرآن و حدیث سے حکم دیتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں مصرّح حکم نہیں ملتا تو قیاس کرتے ہیں، اجتہاد کرتے ہیں مگر اس اجتہاد کی اصل وہی منقول قرآن و حدیث ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ہم میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اس چیز کو اپنے کشف و الہام کے ذریعے خود اللہ تعالیٰ سے لیتے ہیں۔ لہٰذا، خود اس حکمِ شرعی میں خلیفۃ اللہ ہوتے ہیں۔ پس ایک طور پر، مادّہ کشف و الہام اور مادّہ وحی و رسُول ایک ہے۔ صاحبِ کشف، اللہ تعالیٰ سے لینے کے طریقے سے واقف ہونے کی وجہ سے خاتم النبیّین کے موافق ہے۔ ان کا اللہ تعالیٰ سے لینا عین رسُول اللہ کا لینا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ انبیاء کی وحی اور اولیاء کے کشف و الہام میں فرق صرف اصطلاحی ہے۔ (ان حضرات کے عقیدہ کے مطابق) اصل حقیقت دونوں کی ایک ہے یعنی خدا سے براہِ راست علم حاصل کرنا۔ اور یہی وہ نکتہ ہے جس پر تفصیل سے گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔

وحی کے معنی

عربی زبان میں لفظ وحی کے لغوی معنی ہیں :

(۱) نہایت تیز اشارہ۔

(۲) کتابت (لکھنا)۔ چنانچہ اَلْوَحْیُ، کسی لکھی ہوئی چیز کو کہتے ہیں۔

(۳) حکم کرنا، حکم دینا۔ اور

(۴) ہر وہ شے جسے کسی دوسرے تک پہنچایا جائے خواہ اس کا طریقہ کچھ ہی ہو۔

لیکن جب یہ لفظ قرآنی اصطلاح کے مطابق حضرات انبیاء کرامؑ کے سلسلہ میں بولا جائے گا تو اس کے معنی ہوں گے ان حضرات کا خدا سے براہِ راست علم پانا۔ قرآنِ کریم میں یہ لفظ اپنے لغوی اور اصطلاحی دونوں معانی میں استعمال ہوا ہے۔

خدا کی طرف سے براہِ راست علم (وحی) دیئے جانے سے مقصد انسانوں کو وہ روشنی عطا کرنا تھا جو انہیں منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے ہدایت (راہ نمائی) کا کام دے۔ اسے خدا نے "انسانوں سے کلام کرنے" سے تعبیر کیا ہے اور اس کے تین طریقے بتائے ہیں۔ دو طریقے حضرات انبیاء کرامؑ سے مختص تھے اور ایک طریقہ غیر از انبیاء انسانوں کے لیے۔ سورۂ شوریٰ میں ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ..... (۴۲/۵۱)

کسی انسان کے لیے یہ ممکن نہیں کہ خدا اس سے کلام کرے بجز اس کے کہ وحی کے ذریعے — یا پس از پردہ (کلام کرکے)، یا ایک رسول بھیج کر، جو خدا کے حکم سے مشیتِ خداوندی کے مطابق، خدا کے احکام، لوگوں تک پہنچائے۔

اس آیت میں پہلے دو طریقے حضرات انبیائے کرامؑ سے مخصوص ہیں، یعنی خدا نے ان انسانوں (انبیاءؑ) سے دو طریق سے بات کی تھی۔ یا تو "وَحْيًا" اور یا پردے کے پیچھے سے کلام کے ذریعے۔ جہاں تک پس پردہ بات کرنے کا تعلق ہے، قرآنِ کریم نے صرف ایک نبی (حضرت موسیٰؑ) کا ذکر کیا ہے وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۚ (۴/۱۶۴)۔ سورۂ اعراف میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے آواز سنی تو کہا کہ میں بات کرنے والے کو دیکھنا بھی چاہتا ہوں۔ وہ بے حجابانہ سامنے آکر بات کرے۔ تو جواب ملا کہ لَنْ تَرَانِيْ (۷/۱۴۳) "تو مجھے دیکھ نہیں سکتا"۔ یہ "مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ" کلام کرنے کا طریق ہوا۔

دوسرا طریق "وحیاً" ہے۔ اس سلسلہ میں حضور نبئ اکرمؐ کے متعلق مختلف مقامات پر مختلف انداز میں تصریح کی گئی ہے۔ سورۂ بقرہ میں جبریلؑ کا نام لے کر کہا گیا ہے کہ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (2/97) اس نے باذنِ خداوندی اس قرآن کو تیرے قلب پر نازل کیا۔ دوسری جگہ ہے قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ (16/102) ان سے کہو کہ اس قرآن کو روح القدس نے خدا کی طرف سے بالحق نازل کیا ہے۔ سورۂ الشعراء میں ہے نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۙ عَلٰی قَلْبِكَ ...... بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝ (26/193-195) روح الامین نے اسے تیرے قلب پر نازل کیا ہے، واضح عربی زبان میں کہیں کہا گیا ہے وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ (27/6) یہ قرآن تجھ پر خدائے علیم و حکیم کی طرف سے القاء ہوا ہے۔ کہیں ہے اَلرَّحْمٰنُ ۙ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ (55/1-2) رحمٰن نے قرآن سکھایا۔ کہیں کہا ہے کہ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ (45/6) یہ آیاتِ خداوندی ہیں جنہیں ہم تجھے حق کے ساتھ سناتے دیا جاتے ہیں۔ نزولِ قرآنِ کریم کے سلسلہ میں یہ مختلف انداز بتائے گئے ہیں لیکن ان سب کو وحی کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ

وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ ... (6/19)

ان سے کہو کہ یہ قرآن مجھے بذریعہ وحی ملا ہے۔

وحی کی (وَحیاً، مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ ہو یا دوسرے طریقوں سے) کنہ و حقیقت کیا ہے، وہ قلبِ نبوی پر کس طرح نازل ہوتی ہے، وہ خدا سے کس طرح ملتی ہے، اس کے متعلق کوئی غیر از نبی کچھ نہیں جان سکتا حتّٰی کہ خود نبی کو بھی، وحی ملنے سے پہلے اس کا کچھ علم نہیں ہوتا۔ خود نبئ اکرمؐ کے متعلق ہے کہ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ (42/52) "تجھے اس سے پہلے پتا ہی نہیں تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کسے کہتے ہیں"۔ اس لئے یہ کسب و ہنر سے حاصل نہیں ہوتی۔ اس میں نبی کی سعی و کاوش کا کچھ دخل نہیں ہوتا۔ اس کے لیے فرمایا کہ

وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ (2/105)

اللہ اپنی رحمت کے لیے جسے چاہتا ہے مختص کر لیتا ہے۔

دوسری جگہ ہے۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰی مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (14/11)

اور اللہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اسے بطورِ احسان عطا کر دیتا ہے۔

نبی کی اپنی فکر و بصیرت کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۞ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۞ (۵۳/۳-۴)

یہ رسول اپنی خواہش و آرزو سے کچھ نہیں کہتا۔ یہ تو وحی ہے جسے اس کی طرف بھیجا جاتا ہے۔

نبی اس وحی کو خدا سے پا کر، دوسرے انسانوں تک پہنچاتا ہے (یہ فریضہ رسالت کہلاتا ہے یعنی پیغامبری)۔

یہ وہ طریقہ ہے جس سے خدا، غیر از انبیاءؑ، عام انسانوں سے کلام کرتا ہے۔ خدا جب اس طرح اپنی بات (کلام) عام انسانوں تک پہنچاتا ہے تو قرآن کریم میں اس کے لیے بھی وحی کا لفظ آیا ہے۔ (ہم دیکھ چکے ہیں کہ وحی کے معنی، کسی شے کا دوسروں تک پہنچانا ہے، خواہ اس کا طریقہ کچھ ہو۔) مثلاً حضرت عیسیٰؑ کی وساطت سے جو احکام ان کے حواریوں کو دیئے گئے ان کے سلسلہ میں کہا ہے۔

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَ بِرَسُوْلِيْ (۵/۱۱۱)

جب میں نے حواریوں تک یہ حکم پہنچایا کہ وہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لائیں۔

یا حضرت موسیٰؑ کی والدہ کے متعلق ہے۔

اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ ۔ (۲۰/۳۸)

جب ہم نے تمہاری والدہ تک یہ حکم پہنچایا (کہ تجھے صندوق میں ڈال کر دریا میں بہا دے)۔

اسی طرح جب ایک رسول اپنے متبعین کو کچھ حکم دیتا ہے تو اس کے لیے بھی وحی کا لفظ استعمال ہوا ہے مثلاً حضرت زکریاؑ کے متعلق ہے کہ وہ محراب سے نکلے فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ (۱۹/۱۱) اور انہیں حکم دیا.... ان مقامات میں یہ لفظ (وحی) اپنے لغوی معنوں میں استعمال ہوا ہے جس طرح اس قسم کی آیات میں کہ اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ (۶/۱۲۱) یہ مخالفین کے سرغنے اپنے اپنے رفقاء کو حکم دیتے ہیں کہ وہ تمہارے ساتھ جھگڑا کریں۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ

(۱) خدا انسانوں سے تین طریقوں سے بات کرتا ہے۔

(۲) ان میں سے دو طریقے حضرات انبیائے کرامؑ کے ساتھ مخصوص ہیں اور تیسرا طریق دیگر انسانوں

سے متعلق ہے۔

(۳) حضرات انبیائے کرامؑ میں سے حضرت موسیٰؑ کے ساتھ "پسِ پردہ بات کرنے" کا طریق اختیار کیا گیا تھا اور دیگر انبیائے کرامؑ کے سلسلہ میں وحی کا طریقہ۔

(۴) جب ایک رسول، خدا کی وحی دوسرے انسانوں تک پہنچا دیتا ہے اور وہ لوگ اس وحی کو پڑھتے ہیں تو خدا ان سے ہم کلام ہو رہا ہوتا ہے۔ یعنی جب ہم قرآنِ کریم پڑھتے ہیں تو گویا خدا ہم سے کلام کر رہا ہوتا ہے۔ اس نے قرآنِ کریم کو کلام اللہ کہا ہے۔

(۵) اس کے علاوہ، خدا کا انسانوں سے بات کرنے کا کوئی طریق، قرآنِ کریم میں مذکور نہیں۔ اس میں کشف و الہام کا کہیں ذکر نہیں۔

(۶) جب وحی کا سلسلہ حضور نبیٔ اکرمؐ کے بعد بند ہو گیا تو پھر خدا کا بندوں سے کلام کرنے کا ایک ہی طریقہ باقی رہ گیا۔ یعنی بذریعہ قرآنِ کریم۔

لہٰذا، ختمِ نبوت کے بعد کسی کا یہ دعویٰ کہ وہ خدا سے براہِ راست علم حاصل کرتا ہے، یا وہ خدا سے ہمکلام ہوتا ہے، قرآن کی واضح تعلیم کے یکسر خلاف اور نبوت کے بند شدہ دروازہ کو کھولنے کے مرادف ہے، خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے ـــ صاحبِ کشف و الہام اولیاء ـــ ظلی یا بروزی نبی ـــ مسیحِ موعود ـــ مجدد ـــ یا کچھ اور ـــ اصل کے اعتبار سے بات ایک ہی ہے۔

خدا سے ہم کلامی کے سلسلہ میں ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے۔ ان لوگوں کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ "یہ خدا سے کلام کرتے ہیں"۔ لیکن قرآنِ کریم میں یہ کہیں نہیں آیا کہ کوئی انسان خدا سے کلام کر سکتا ہے۔ اس میں یہی آیا ہے کہ خدا انسانوں سے کلام کرتا ہے۔ بظاہر ان دونوں باتوں میں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا لیکن درحقیقت ان میں بڑا بنیادی فرق ہے۔ جب یہ کہا جائے کہ انسان خدا سے کلام کر سکتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان کسبِ ہنر اور محنت و کاوش (چلوں، ریاضتوں یا عبادتوں) کے ذریعے اپنے اندر ایسی استعداد پیدا کر سکتا ہے کہ وہ جب جی چاہے، خدا سے باتیں کر لے۔ یعنی اس صورت میں خدا سے بات کرنے کا امکان، اختیار اور (INITIATIVE) انسان کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ لیکن جب یہ کہا جائے کہ "خدا انسان سے بات کرتا ہے" تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ بات کرنے کا اختیارِ کُلّی خدا کو حاصل ہوتا ہے۔ وہ جس سے جی چاہے بات کرتا ہے ـــ وہ انبیاء کرامؑ سے براہِ راست بات کرتا تھا اور ان کے بعد اب عام انسانوں سے اپنی

کتاب کے ذریعے بات کرتا ہے ــــ کوئی انسان، اپنے اختیار و ارادہ سے نہ پہلے خدا سے بات کر سکتا تھا نہ اب کر سکتا ہے۔

لہٰذا، خدا کی آخری (اور مکمّل) کتاب، قرآن کریم کی موجودگی میں یہ عقیدہ کہ کوئی شخص خدا سے براہِ راست علم حاصل کر سکتا ہے، ختمِ نبوّت کے منافی، قرآنی تعلیم کے خلاف اور دوسروں سے مُستعار لیا ہوا ہے۔ اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہی وجہ ہے جو علّامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ "تصوّف' اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے۔"

اور جب کشف والہام کا عقیدہ ہی اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے تو ختمِ نبوّت کے بعد، دعوائے نبوّت کا تو اسلام میں تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا ــــ یہ عجیب اتّفاق ہے کہ نبیٔ اکرمؐ کے بعد مذاہبِ عالَم کے متّبعین میں سے کسی نے بھی نبوّت کا دعویٰ نہیں کیا۔ یہ دعوٰے کیا تو خود اِسلام کے مدّعیوں نے کیا! یا للعجب۔

کشف والہام کے عقیدہ کی طرح ایک اور عقیدہ بھی "اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا" ہے۔ اور وہ عقیدہ یہ ہے کہ وحیِ نبوّت کی بھی دو قسمیں تھیں: ایک وحیِ متلو اور دوسری وحیِ غیر متلو۔ وحیِ متلو وہ تھی جو ــــ

(۱) خدا کی طرف سے الفاظ کے ساتھ رسولؐ اللہ کو عطا ہوئی تھی۔

(۲) وہ وحیٔ، بالفاظ قُرآن میں محفوظ ہے۔ اور

(۳) اس وحی کی تلاوت ہر جگہ ہوتی ہے۔

اور وحیٔ غیر متلو وہ تھی ــــ

(۱) جس کا تصوّر (بلا الفاظ) خدا کی طرف سے ملتا تھا اور پھر رسولؐ اللہ اسے اپنے الفاظ میں بیان فرماتے تھے۔

(۲) یہ وحی، کُتبِ احادیث میں لوگوں نے اپنے طور پر جمع کی ہے۔

(۳) قرآن کی طرح اس کا حرفاً حرفاً من جانب اللہ ماننا ضروری ہے۔

قرآنِ کریم میں وحی کی ان قسموں کا کوئی ذکر نہیں (حتّٰی کہ کُتبِ احادیث میں بھی ان اصطلاحات

متلو اور غیر متلو ــــ کا کہیں ذکر نہیں ملتا)۔ یہ عقیدہ یہودیوں کے ہاں مروّج تھا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں ــــ شب کتب، وحی متلو ــــ اور شب علفہ ــــ وحی غیر متلو ــــ اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہی قابلِ غور ہے کہ یہ عقیدہ کہ خدا کی طرف سے نبی کو کوئی تصوّر بلا الفاظ ملتا تھا اور اسے نبی پھر اپنے الفاظ میں بیان کرتا تھا، علم النفس و الالسنہ کے خلاف ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ انسان کے ذہن میں کوئی تصوّر (CON-CEPT) بلا لفظ (WORD) کے آسکے۔ تصوّر اور لفظ، لازم و ملزوم ہیں۔ کیا آپ نے اس پر غور نہیں کیا کہ جب قرآن نے کہا کہ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلَىٰ قَلْبِكَ (۲۶/۱۹۳-۱۹۴) اسے رُوح الامین نے تیرے قلب پر نازل کیا، تو اس کے ساتھ ہی اس کی تصریح کر دی کہ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ (۲۶/۱۹۵) "واضح عربی زبان میں"۔ یعنی وحی کا القا، ہمیشہ الفاظ کے ساتھ ہوتا تھا، الفاظ کے بغیر نہیں۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اسی لیے وحی کو کلام اللہ بھی کہا گیا ہے اور اس کی تلاوت کا حکم دیا گیا۔ رسول اللہ سے ارشاد ہوا۔

اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ (۲۹/۴۵)

یہ کتاب جو تیری طرف وحی کی گئی ہے اس کی تلاوت کر۔

یعنی مَآ اُوْحِیَ (جو کچھ بھی وحی کیا گیا تھا) وہ متلو (جس کی تلاوت کی جائے) تھا۔ غیر متلو وحی کوئی نہیں تھا۔ لہٰذا، وحی صرف قرآن کریم ہے اور خدا کی طرف سے انسانوں کے لیے آخری وحی ہے۔

حضور نبی اکرم کی بعثت کا مقصد جلیلہ یہ بتایا گیا کہ وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ (۷/۱۵۷) وہ ان بوجھل سلوں کو اُتار دے گا جن کے نیچے انسانیت دبے چلی آ رہی تھی اور ان زنجیروں کو توڑ ڈالے گا جن میں انسان جکڑا ہوا تھا۔ ختمِ نبوّت نے ان تمام زنجیروں کو ایک ایک کر کے توڑ ڈالا اور اس طرح انسان کو صحیح آزادی سے رُوشناس کرا دیا۔ قرآن انسان کے سامنے ہے جس کے متعلق اس سے کہا گیا کہ اس میں وہ قوانین مندرج و محفوظ ہیں جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے تمہیں دُنیا و آخرت کی سرفرازیاں نصیب ہو سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی اتھارٹی ایسی نہیں ہے جو تمہاری آزادی پر کسی قِسم کی پابندی عاید کر سکے۔ اب کوئی انسان تم سے آکر یہ نہیں کہہ سکے گا کہ

تمہارے خدا نے تمہیں یہ حکم دیا ہے!

خدا نے جو حکم دینا تھا وہ پہلے ہی سے تمہارے پاس موجود ہے۔ قرآن، ہمیشہ کے لیے خدا کی زندہ کتاب زندہ ہے اور اسی کی وساطت سے نبوتِ محمدیہؐ تمام نوعِ انسان کے لیے آخر تک زندہ و پایندہ ہے۔ اور یہ ہے ختمِ نبوت کا صحیح مفہوم جس نے نوعِ انسان کو حقیقی آزادی سے ہمکنار کر دیا۔ یہ انسانیت پر خدا کا احسانِ عظیم ہے۔

معراجِ انسانیت

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص میں کائناتی شعور بیدار ہو جاتا ہے .... اُس کے ادراک میں ایک ایسی نورانیت پیدا ہو جاتی ہے جسے ہم الفاظ میں بیان نہیں کر سکتے۔ اس انسان کے شعور کے سامنے، کائنات کا مقصود و مفہوم، بجلی کی سی چمک کے ساتھ، غیر مبہم طور پر بے نقاب ہو جاتا ہے۔ وہ اس حقیقت کو محض عقیدتاً نہیں مانتا بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے کہ یہ عظیم القدر کائنات، جو عام نگاہوں میں' ایک غیر ذی حیات مادہ کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں' فی الحقیقت حیاتِ مشعود ہے۔ وہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیتا ہے کہ انسانی زندگی ہمیشہ رہنے والی ہے، اسے فنا نہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر وہ محسوس کرتا ہے کہ کائنات جو کچھ دکھائی دیتی ہے' فی الحقیقت ایسی نہیں۔ اس میں جن باتوں کو درا صل اہمیت دینی چاہیے' وہ' وہ نہیں جنہیں عام طور پر اہمیت دی جاتی ہے۔ اس طرح اس کے نزدیک زندگی کی اقدار، اور حقیقت کے متعلق اس کے شعور کے تمام تصورات بدل جاتے ہیں۔ جسے اس سے پہلے اصل سمجھا جاتا تھا' وہ سراب بن جاتا ہے اور جسے سراب قرار دیا جاتا تھا' وہ اصل اور حق بن جاتا ہے۔ ....

وہ اس طرح ایک ایسے مقام پر فائز ہوتا ہے جہاں وہ ان تمام سیاسی اور معاشرتی مسائل کو جو دورِ حاضرہ میں اس طرح ہمارے گلوگیر ہو رہے ہیں، اس انداز سے حل کر کے رکھ

دیتا ہے جس کا ہم تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ اسی سے ایک ایسی ملّت تیار ہو جاتی ہے جو اپنے مقام کو پہچانتی ہے اور تمام اقوام و ملل سابقہ کے اعمال و کردار کے لیے میزان بن جاتی ہے۔

اس کائناتی شعور کی بیداری کے بغیر، زندگی میں نظم و ربط ناممکن ہے۔ ایک عرصۂ دراز سے مادّہ کے ڈھیر کے نیچے دبے ہوئے انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ محض عقل کے زور پر دنیا میں زندہ رہا جا سکتا ہے لیکن آہستہ آہستہ یہ حقیقت ان پر منکشف ہوتی جا رہی ہے جنہیں فطرت نے آنکھیں عطا کی ہیں، کہ محض عقلی منطق سے زندگی میں نظم نہیں پیدا کیا جا سکتا۔ اگر موجودہ انسان اسی روش پر قائم رہے تو وہ، اگر ان قبائل و اقوام کی طرح جن کا وجود طبیعی طور پر، دنیا سے مٹ چکا ہے فنا نہ بھی ہوئے، تو بھی اپنے لیے وہ ایسے حالات پیدا کر لیں گے (جو ابھی سے پیدا ہو چکے ہیں) جن کے ماتحت زندگی ناممکن ہو جائے گی۔ ایسے حالات جن میں ہر وہ متاع جو انسان کے پاس ہے، اس سے چھن جائے گی۔ وہ متاع جو اسے اُن انسانوں سے ملی تھی جن کا کائناتی شعور بیدار ہو چکا تھا اور وہ اپنے آپ کو پہچانتے تھے۔

اس لیے مستقبل عام انسانوں کے ہاتھ میں نہیں۔ وہ ایسے انسان کے ہاتھ میں ہے جو "فوق البشر" ہے جو ہم میں پہلے ہی پیدا ہو چکا ہے اور زندہ و پائندہ موجود ہے۔"

(OUSPENSKY -- TERTIUM ORGANUM)

سابقہ اوراق میں جو کچھ آپ کی نگاہوں سے گزر چکا ہے اس پر نگۂ بازگشت ڈالیے اور پھر دیکھئے کہ ——— (OUSPENSKY) جس "فوق البشر" کے ہاتھ میں انسانیت کا مستقبل قرار دیتا ہے، وہ اس ذاتِ گرامی (علیہ التحیۃ والسلام) کے علاوہ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے؟ لیکن وہ ان تمام خصوصیتِ کبریٰ کا حامل ہونے کے باوجود اپنے آپ کو "فوق البشر" نہیں کہتا۔

اور برگساں کے الفاظ میں۔

اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ عقل، انسان کا امتیازی نشان ہے۔ یہ بھی ہر ایک کو تسلیم ہے کہ عقل، متاعِ گراں بہا ہے، ایسے ہی جیسے فنِ لطیفہ کا کوئی شاہکار گراں قدر ہوتا ہے لیکن یہ چیز محتاجِ وضاحت ہے کہ عقل کے فیصلے کس صورت میں مطلق اور واجب التعمیل قرار پاتے ہیں عقل تو صرف دلائل فراہم کرتی ہے جن کی تردید دوسرے دلائل سے ہو سکتی ہے۔ اس لیے

اس پر اصرار کرنا غلطی ہے کہ ہماری اور آپ کی عقل ایسی گراں بہا ہے کہ وہ مجبوراً ہم سے اپنی عظمت کا اعتراف کرا لے اور اپنے فیصلوں کو منوا لے۔ ہمیں اس کے ساتھ یہ بھی کہنا ہوگا کہ عقل و بصیرت کے پیچھے وہ انسان ہیں جنہوں نے نوعِ انسانی کو خدائی رنگ میں رنگ دیا اور اس طرح عقل کو لاہوتی سند عطا کر دی۔ یہ وہ گراں قدر ہستیاں ہیں جو ہمیں ایک مثالی معاشرہ کی طرف کشاں کشاں لے جاتی ہیں۔

(BERGSON-THE TWO SOURCES OF MORALITY AND RELIGION)

اس ذاتِ اقدسؐ و اطہر کی سیرتِ طیبہ پر نگاہ ڈالیے جس نے انسانوں کو اس طرح خدائی رنگ میں رنگ دیا کہ ان کے ہاتھ خدا کی تقدیریں بن گئے اور پھر سوچیے کہ کیا دنیا میں کوئی اور انسان بھی ہے جو اتنے بلند مقام پر کھڑا، انسانیت کو اس معاشرہ کی طرف دعوت دے رہا ہے جسے برگساں جیسا صاحبِ فکر، مثالی معاشرہ قرار دیتا ہے؟ ہر چند وہ ذاتِ گرامیؐ اپنے عظمتِ مقام کے لیے انسانی تائیدات و سندات کی محتاج نہیں، لیکن جسے اس قسم کی تائید اور سند درکار ہو، وہ اس باب میں ایک اور غیر مسلم مؤرخ کی شہادت سن لے اور خود دیکھ لے کہ جنہوں نے اس بے مثال سیرت کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا ہے، وہ اس باب میں کس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ (LAMARTINE) لکھتا ہے۔

دنیا میں کسی انسان نے برضا و رغبت یا طوعاً و کرہاً، محمدؐ کے نصب العین سے بلند نصب العین اپنے سامنے کبھی نہیں رکھا۔ یہ نصب العین عام انسانی سطح سے بہت بلند تھا، مافوق البشر نصب العین۔ یہ نصب العین کیا تھا؟ خدا اور بندے کے درمیان جو توہمات کے پردے حائل ہو چکے تھے انہیں ایک ایک کر کے اٹھا دینا اور اس طرح خدا کو انسان کے سینے میں سمو دینا اور انسان کو خدائی صفات کے رنگ میں رنگ دینا اور باطل خداؤں کے ہجوم میں ایک منزّہ خدا کا مقدس اور معقول تصور پیش کرنا۔ آج تک کبھی کسی انسان نے اس کی ہمت نہیں کی کہ اس قسم کے عظیم الشان کام کا بیڑہ اٹھائے جو اس طرح انسانی مقدرت سے باہر ہو اور اس کے ذرائع اس قدر مسدود ہوں۔ اس لیے کہ نہ اُس وقت جب اُس نے اس اہم فریضہ کا تصور کیا تھا اور نہ اُس وقت جب اس کی عملی تشکیل کے لیے قدم اُٹھایا تھا، اس کے پاس اپنی ذات

یا صحرا کے ایک گوشے میں بسنے والے مٹھی بھر انسانوں سے زیادہ کوئی ساز و سامان اور ذریعہ اور وسیلہ تھا۔ اس فقدانِ ذرائع کے ساتھ آج تک کبھی کسی انسان نے دنیا میں اس قسم کا عظیم اور مستقل انقلاب پیدا نہیں کیا۔ وہ انقلاب جس کا نتیجہ یہ تھا کہ دو سو سال کے اندر اندر اسلام عملاً اور اعتقاداً تمام عرب پر حکمرانی کر رہا تھا اور اس لیے خدا کے نام پر ایران، خراسان، مغربی ہندوستان، شام، مصر، حبش، شمالی افریقہ کا تمام وہ علاقہ جو اُس وقت تک معلوم ہو سکا تھا، نیز بحرِ روم کے متعدد جزائر اور ہسپانیہ تک کو فتح کر لیا تھا۔

اگر نصب العین کی بلندی، وسائل کی کمی اور نتائج کی درخشندگی، انسانی نبوغ (HUMAN GENIUS) کا معیار ہیں تو وہ کون ہے جو اس باب میں محمدؐ کے مقابلہ میں کسی اور انسان کو پیش کرنے کی جرأت کر سکے۔ دنیا کے اور بڑے بڑے انسانوں نے صرف اسلحہ، قانون یا سلطنتیں پیدا کیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ مادی قوتوں کی تخلیق کر سکے جو اکثر اوقات خود ان کی آنکھوں کے سامنے راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئیں۔ لیکن اس انسان نے صرف جیوش و عساکر، مجالسِ قانون ساز، وسیع سلطنتوں، قوموں اور خاندانوں کو ہی حرکت نہیں دی بلکہ ان کروڑوں انسانوں (کے قلوب) کو بھی جو اُس زمانہ کی آباد دُنیا کے ایک تہائی حصّہ میں بستے تھے اور اُن سے بھی کہیں زیادہ، اس شخصیت نے قربان گاہوں، دیوتاؤں، مذاہب، مناسک، تصوّرات و معتقدات بلکہ روحوں تک کو ہلا دیا۔ اُس نے ایک ایسی کتاب کی اساس پر، جس کا ایک ایک لفظ قانون کی حیثیت رکھتا ہے، ایک ایسی قومیت کی بنیاد رکھی جس نے دنیا کی مختلف نسلوں اور زبانوں کے امتزاج سے ایک اُمّتِ واحدہ پیدا کر دی۔ یہ لافانی اُمّت اور باطل کے خداؤں سے سرکشی اور بیزاری اور ایک خدائے واحد کے لیے والہانہ جذب و عشق، یہ ہیں دنیا میں اس عظیم ہستی کی یادگاریں۔ افسانوی خداؤں کے ہجوم میں ایک خدا کے تصوّر کا اعلان، بجائے خویش ایک ایسا معجزہ تھا کہ جونہی یہ الفاظ اس منادی کی زبان سے نکلے، اس نے تمام باطل خداؤں کی عبادت گاہوں کو ختم کر دیا اور ایک تہائی دنیا میں آگ لگا دی۔ اس کی زندگی، اس کی فکری کاوشیں، توہّم پرستی کے خلاف اس کی مجاہدانہ جدّ وجہد اور باطل خداؤں کے غیظ و غضب کو استحقار کی ہنسی سے ٹھکرا دینے کی عظیم جرأت مکّی زندگی

یں متواتر تیرہ برس تک تمام مصائب و نوائب کے مقابلہ میں استقامت و استقلال، مخالفین کی تکذیب و تضحیک کا خندہ پیشانی سے استقبال، یہ تمام مشکلات اور پھر ان کے بعد اس کی ہجرت، اس کی مسلسل دعوت و تبلیغ، اس کا غیر منقطع جہاد، اپنے مقصد کی کامیابی پر یقینِ محکم اور نامساعدتِ حالات میں اس کی مافوق البشر جمعیتِ خاطر، فتح و کامرانی میں تحمل و عفو سلطنت سازی کے لیے نہیں بلکہ اپنے الوہیاتی مقصد کی کامیابی کے لیے اس کی امنگیں اور آرزوئیں وجد و کیف کی دنیا میں اس کی متواتر نمازیں اور دعائیں، اپنے اللہ سے راز و نیاز کی باتیں، اس کی حیات، اس کی ممات اور بعد از موت اس کی مقبولیت، یہ تمام حقائق کس قسم کی زندگی کی شہادت دیتے ہیں؟ کیا ایک مکذّب یا مفتری کی زندگی کی یا ایسے انسان کی زندگی کی جسے اپنے دعوے کی حقّانیت پر غیر متزلزل ایمان ہو! اس کا یہی کوہ شکن ایمان تھا جس نے اس میں ایسی لرزہ انگیز اور بے پناہ قوّت پیدا کر دی تھی کہ اس نے اپنے عقیدہ کو زندہ اور پایندہ بنا کر دکھا دیا۔ یہ عقیدہ کیا تھا؟ خدا کی توحید اور تنزیہہ۔ اوّل الذکر یہ بتانے کے لیے کہ خدا کیا ہے اور ثانی الذکر اس کی وضاحت کے لیے کہ خدا کیا نہیں۔ وہ اِلاَّ اور یہ لاَ۔ ایک حصّہ دنیا سے باطل خداؤں کو مٹانے کے لیے (خواہ اس میں تلوار کی بھی ضرورت کیوں نہ پڑے) اور دوسرا حصّہ خدائے حقیقی کی مسندِ جلال بچھانے کے لیے۔

بہت بڑا مفکر، بلند پایہ خطیب، پیغامبر، مقنّن، سپہ سالار، تصوّرات و معتقدات کا فاتح، صحیح نظریۂ حیات کو علیٰ وجہ البصیرت قائم کرنے کا ذمّہ دار، اُس نظام کا بانی جس میں باطل خدا ذہنوں تک کی دنیا میں بار نہ پا سکیں، بیس دنیاوی سلطنتوں اور ان کے اوپر ایک آسمانی بادشاہت کا بانی، یہ ہے **مُحَمَّدٌ**ؐ۔

ان تمام معیاروں اور پیمانوں کو اپنے ساتھ لے آؤ جن سے انسانی عظمت و بلندی کو ماپا اور پرکھا جا سکتا ہے اور اس کے بعد ہمارے اس سوال کا جواب دو کہ

کیا دنیا میں اس سے بڑا انسان بھی کوئی ہوا ہے؟

(LAMARTINE -- HISTORIE DE LA TURQUIE --

VOL.II -- PP.276-277)

اور ان تمام انسانی شہادتوں سے بلند شہادت، کہ جس سے بلند تر شہادت اور کوئی نہیں ہو سکتی، خود خالقِ کائنات کی شہادت ہے جس نے فرمایا کہ

وَ هُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ط (۵۳/۷)

(محمدؐ) انسانیت کے بلند ترین مقام پر فائز ہے۔

انسانیت کے معراجِ کبریٰ اور شرفِ اعلیٰ کا یہی وہ مقام ہے جس کے پیشِ نظر، خدا اور اس کے فرشتے "اس ذاتِ گرامیؐ پر ہزار تحسین و تبریک کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِىِّ ط يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ٥ (۳۳/۵۶)

جس دن انسانی ہئیتِ اجتماعیہ نے اس ذاتِ گرامیؐ کی حیاتِ طیبہ کو اپنے سامنے بطور نمونہ (اسوۂ حسنہ) رکھ لیا، یہ دنیا جنتِ ارضی میں تبدیل ہو جائے گی —— دیکھیں کہ اقوامِ عالم میں یہ سعادت سب سے پہلے کس کے حصے میں آتی ہے —— طُوْبٰى لَهُمْ وَ حُسْنُ مَاٰبٍ۔ (۱۳/۲۹)

(پرویز)